سلسلۂ ندوۃ المصنفین

(۱۰)

قصص القرآن

حصہ اول

قصص قرآنی و انبیاء علیہم السلام کے سوانح حیات اور اُن کی دعوت حق کی مستند ترین تاریخ جس میں حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات قبل عبور تک نہایت مفصل و محققانہ انداز میں بیان کیے گئے ہیں

تالیف

مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی

رفیق اعلیٰ ندوۃ المصنفین دہلی

مہتمم ندوۃ المصنفین کے اہتمام سے

جید برقی پریس دہلی میں طبع ہوئی

فہرست مضامین

ب

پیش لفظ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ الذی ھدانا بالکتاب المبین۔ وانزل علینا القرآن فی لسان عربی مبین۔ وقص فیہا احسن القصص موعظۃ وذکریٰ للمؤمنین۔ والصلوٰۃ والسلام علی النبی الصادق الامین۔ محمد رسول اللہ وخاتم النبیین۔ وعلی آلہ واصحابہ الذین ھم ھداۃ للمتقین۔

اما بعد

قرآنِ عزیز میں حق تعالیٰ نے دنیاءِ انسانی کی ہدایت کے لیے جو مختلف معجزانہ اسلوبِ بیان اختیار فرمائے ہیں اُن میں ایک یہ بھی ہے کہ گذشتہ قوموں کے واقعات و قصص کے ذریعہ اُن کے نیک و بد اعمال اور اُن اعمال کے ثمرات و نتائج کو یاد دلائے اور عبرت و بصیرت کا سامان مہیا کرے۔ اسی لیے وہ تاریخی اسلوبِ بیان کے درپے نہیں ہوتا بلکہ ابلاغِ حق اور دعوت الی اللہ کے اہم مقصد کے پیشِ نظر صرف اُن ہی وقائع کو سامنے لاتا ہے جو اس غرض و غایت کو پورا کرتے ہوں اور اسی لیے قرآنِ عزیز میں اُن کی تکرار پائی جاتی ہے تاکہ سامعین کے دل میں وہ گھر کرسکیں اور فطری اور طبعی رجحانات کو ان حقائق کی جانب متوجہ کیا جاسکے اور یہ جب ہی ممکن ہے کہ ایک بات کو مختلف پیرایۂ بیان اور مناسبِ حال اسلوبِ نگارش سے بار بار دُہرایا جائے اور خوابیدہ قوائے فکریہ کو

پے بہ پے بیدار کیا جائے۔

قرآن مجید کے قصص و واقعات کا یہ سلسلہ بیشتر گذشتہ اقوام اور اُن کی جانب بھیجے ہوئے پیغمبروں سے وابستہ ہے اور جستہ جستہ بعض اور واقعات بھی اس ضمن میں آ گئے ہیں۔ اور یہ تمام حق و باطل کے مجادلوں، اور اولیاء اللہ و اولیاء الشیطان کے معرکوں کا ایک عبرت آموز اور بصیرت خیز بے مثل ذخیرہ ہے۔

لیکن دوسروں کا کیا ذکر ہم مسلمانوں میں بھی بہت کم ہیں جو اللہ تعالیٰ کے اس مکمل ترین اور آخری قانون (قرآن عزیز) سے استفادہ کرتے اور اپنے مردہ دلوں میں ایمان و یقین کی زندگی پیدا کرتے ہوں، تلاوت کرتے ہوں اس لیے کہ یہ خدا کا قانون ہے اور ہم اس کے اقبال پر مجبور ہیں اور معانی و مطالب پر غور کرتے ہوں یہ سمجھ کر کہ یہ ہستی دنیا تک حیات ابدی سرمدی اور دارین کی فلاح و سعادت کا مکمل دستور ہے۔

نزول قرآن کے وقت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکوں اور کافروں کی معاندانہ روش سے تنگ آ کر یہ شکایت کی تھی

وَقَالَ الرَّسُولُ يَا رَبِّ إِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوا هٰذَا الْقُرْآنَ مَهْجُورًا (فرقان)

رسول اللہ نے کہا اے میرے پروردگار بے شبہ میری قوم نے قرآن کو مہجور بنا دیا ہے۔

لیکن اس چودھویں صدی میں اگر ہم اپنے دلوں کو ٹٹولیں تو بہت سے مسلمان قرآن کو کلام اللہ یقین کرنے کے باوجود کم ملتے ہیں جو اس کلام الٰہی کو اپنی زندگی کے لیے بہترین نظام عمل بنانے اور اس نقطہ سے اس کی تلاوت کرتے ہوں۔

پس اپنی قوم کی اس حالت کو دیکھتے ہوئے یہ ضروری سمجھا گیا کہ عبرت و بصیرت کو اردو میں منتقل کیا جائے تاکہ نقل سے محفوظ ہونے کے بعد خود بخود اصل کی جانب رغبت پیدا ہو

اور اس طرح سعادت دارین کا سُراغ ملے۔

"قرآنی قصص" کا یہ مجموعہ "قصص القرآن" کے نام سے شائع ہو رہا ہے اور خدا کے فضل و توفیق سے اس سلسلہ کی یہ پہلی کڑی پیش کی جا رہی ہے۔

پوری کتاب کی ضخامت کا ایک جلد میں سمانا دشوار تھا اس لیے کتاب کو دو حصوں میں شائع کیا جا رہا ہے۔ پہلے حصہ میں حضرت آدمؑ سے لیکر حضرت موسیٰؑ کے واقعات کا وہ ٹکڑا لیا گیا ہے جس کا تعلق بحرِ قلزم کے عبور تک کے واقعات سے ہے۔ عبور کے بعد کے واقعات ان شاء اللہ تعالیٰ دوسرے حصہ میں آئینگے۔

اصحابِ سِیَر نے حضرت ایوب اور حضرت یونس (علیہما السلام) کے حالات کو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے حالات سے قبل بیان کیا ہے مگر اس کتاب میں یہ واقعات دوسرے حصہ میں درج ہونگے اور اس کی وجہ اسی جگہ سپردِ قلم کی جائیگی۔

کتاب "قصص القرآن" اپنی سادہ طرزِ نگارش کے باوجود چند خصوصیات کی حامل ہے

(۱) کتاب میں تمام واقعات کی اساس و بنیاد قرآنِ عزیز کو بنایا گیا ہے اور احادیثِ صحیحہ اور صحیح واقعاتِ تاریخی سے اُن کی توضیح و تشریح کی گئی ہے۔

(۲) تاریخ اور کتبِ عہدِ قدیم کے درمیان اور قرآنِ عزیز کے "یقینِ محکم" کے درمیان اگر کہیں تعارض آپڑا ہے تو اُس کو روشن دلائل و براہین کے ذریعہ یا تطبیق دی گئی ہے اور یا پھر صداقتِ قرآن کو وضاحت سے ثابت کیا گیا ہے۔

(۳) اسرائیلی خرافات اور معاندین کے اعتراضات کی خرافت کو حقائق کی روشنی میں ظاہر کیا گیا ہے۔

(۴) خاص خاص مقامات پر تفسیری، حدیثی اور تاریخی اشکالات پر بحث و تمحیص کے بعد سلفِ

صاحبین کے مسلک کے مطابق اُن کا حل پیش کیا گیا ہے۔

(۵) ہر پیغمبر کے حالات قرآنِ عزیز کی کن کن سورتوں میں بیان ہوئے ہیں ان کو نقشہ کی شکل میں ایک جگہ دکھایا گیا ہے۔

(۶) ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ "نتائج و عبر" یا "عبر و بصائر" کے عنوان سے اصل مقصد و حقیقی غرض و غایت یعنی عبرت و بصیرت کے پہلو کو خاص طور پر نمایاں کیا گیا ہے۔

نہیں کہا جا سکتا کہ ان خصوصیات میں مجھے کہاں تک کامیابی نصیب ہوئی ہے یہ فیصلہ ارباب مطالعہ کے ہاتھ میں ہے۔ البتہ درگاہ الٰہی میں اس کے لیے ضرور دست بدعا ہوں کہ وہ میری اس محنت و کاوش کو حاسدوں کے حسد اور معاندوں کے عناد سے محفوظ رکھے "ومن شرِ حاسدٍ اذا حسد"

قرآنِ عزیز اور احادیث کے علاوہ اس کتاب کا ماخذ اور کون کون سی کتابیں ہیں؟ اس کا حال جا بجا حوالوں سے معلوم ہو سکیگا علیحدہ فہرست پیش نہیں کی گئی۔

وما توفیقی الا باللہ   وھو حسبی ونعم الوکیل

خادمِ ملت

محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی

۲۲ رجب المرجب ۱۳۵۵ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت آدم (علیہ السلام)

(۱) قرآن عزیز میں ذکر آدم (۲) خلقت [illegible] [illegible] رب العلمین سے ابلیس کا مکالمہ (۶) ملعونیت ابلیس اور تاقیام قیامت زندگی کی مہلت (۷) خلافت آدم (۸) خلافت آدم پر فرشتوں کا اظہار تعجب (۹) بارگاہ ربوبیت سے حضرت آدم کو تعلیم اور فرشتوں کو تنبیہ (۱۰) حوا کی پیدائش اور آدم و حوا کی جنت میں رہائش (۱۱) آدم و حوا، وسوسۂ ابلیس اور شجر ممنوعہ کا واقعہ (۱۲) عتاب الٰہی اور آدم و حوا کا جنت سے زمین کی جانب اخراج (۱۳) قصۂ آدم سے متعلق بعض اہم مسائل۔

ذکر آدم سے متعلق آیات قرآنی

قرآن عزیز میں حضرت آدم کا نام پچیس مرتبہ پچیس آیات میں آیا ہے جو ذیل کی جدول سے ظاہر ہوتا ہے:

نمبر سورت	سورت	آیات	شمار
۲	البقرہ	۳۱۔۳۳۔۳۴۔۳۵۔۳۷	۵
۳	آل عمران	۳۳۔۵۹	۲
۵	المائدہ	۲۷۔	۱
۷	الاعراف	۱۱۔۱۹۔۲۶۔۲۷۔۳۱۔۳۵۔۱۷۲	۷

نمبر سورت	سورت	آیات	شمار
۱۷	الاسراء	۶۱ ۔ ۶۵	۳
۱۸	الکہف	۵۰	۱
۱۹	مریم	۵۸	۱
۲۰	طٰہٰ	۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۲۰، ۱۲۱	۵
۳۶	یٰس	۶۰	۱

قرآن عزیز میں انبیاء علیہم السلام کے تذکروں میں سب سے پہلا تذکرہ ابو البشر حضرت آدم (علیہ السلام) کا ہے اور حسب ذیل سورتوں میں بیان کیا گیا ہے:

سورۂ بقرہ، اعراف، اسراء، کہف اور طٰہٰ میں نام اور صفات دونوں کے ساتھ اور سورۂ حجر و ص میں فقط ذکر صفات کے ساتھ اور آل عمران، مائدہ، مریم اور یٰس میں صرف ضمنی طور پر نام لیا گیا ہے۔

یہ واقعہ اگرچہ تمام سورتوں اور آیتوں میں آیا ہے حسب بیان [illegible] مختلف تعبیر سے اعتبارات مختلف نظر آتا ہے لیکن مقصد و واقعہ کے اعتبار سے ایک ہی حقیقت کو مختلف تعبیرات میں موعظت و عبرت کے پیش نظر اس واقعہ کو بیان کی گئی ہے۔

قرآن عزیز تاریخی واقعات کو محض اس لیے نہیں بیان کرتا کہ وہ واقعات میں جمع ایک تاریخ میں درج ہو جانا ضروری ہے بلکہ اس کا مقصد وحید یہ ہے کہ وہ ان واقعات سے پیدا شدہ نتائج کو انسانی رشد و ہدایت کے لیے موعظت و عبرت بنائے اور انسانی عقل و جذبات سے اپیل کرے کہ وہ نوامیس و قوانین فطرت کے سانچہ میں ڈھلے ہوئے ان تاریخی نتائج سے سبق حاصل کریں اور ایمان لائیں کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے وغیرہ

یہ قدرت ہی اس تمام ہست و بود پر کارفرما ہے۔ اور اُسی مذہب کے احکام کی پیروی میں فلاح و نجات اور ہر قسم کی ترقی کا راز مضمر ہے، جس کا نام مذہبِ فطرت یا اسلام ہے۔

قرآن عزیز کا یہ بھی ایک اعجاز ہے کہ وہ ایک ہی واقعہ کو مختلف سورتوں میں اُن سورتوں کے مضامین کے مناسب مختلف اور اچھوتے انداز میں بیان کرنے کے باوجود واقعہ کی اصل حقیقت اور اُس کی متانت و سنجیدگی میں ادنیٰ سا فرق بھی نہیں آنے دیتا۔ کہیں واقعہ کی تفصیل ہے، کہیں اجمال، کسی مقام پر اُس کا ایک پہلو نظر انداز کر دیا گیا ہے تو دوسرے مقام پر اُسی کو سب سے زیادہ نمایاں حیثیت دی گئی ہے۔ ایک جگہ اُسی واقعہ سے مسرت و انبساط اور لذت و سرور پیدا کرنے والے نتائج نکالے گئے ہیں تو دوسری جگہ واقعہ میں معمولی سا تغیر کیے بغیر خوف و دہشت کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ بلکہ بعض مرتبہ ایک ہی مقام پر لذت و الم دونوں کا مظاہرہ نظر آتا ہے۔ مگر موعظت و عبرت کے اس تمام دفتر میں ناممکن ہے کہ نفسِ واقعہ کی حقیقت اور متانت میں معمولی سا بھی تغیر پیدا ہو جائے۔

بلاشبہ یہ کلامِ الٰہی کے ہی شایانِ شان ہے اور اعجازِ قرآن کے عنوان سے معنون، اور متضاد صفات کے حامل "حضرتِ انسان" کی فصاحت و بلاغت کے مدارجِ علیا کی دسترس سے باہر۔

افلا یتدبرون القرآن ولو کان من — کیا وہ قرآن کے متعلق غور و فکر سے کام نہیں لیتے؟ اور
عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافًا — اگر وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی غیر کا کلام ہوتا تو بلاشبہ وہ اُس
کثیرا۔ (نساء) — میں ہر قسم کے تضاد و اختلاف پاتے۔

پیدائشِ آدم، فرشتوں کو سجدہ کا حکم، شیطان کا انکار

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو مٹی سے پیدا کیا، اور اُن کے خمیر تیار ہونے سے قبل ہی اُس نے فرشتوں کو یہ اطلاع دی کہ عنقریب وہ مٹی سے ایک

مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ ۝ وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۝ فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ ۝ فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ۝ اِلَّآ اِبْلِیْسَ ؕ اَبٰٓی اَنْ یَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِیْنَ ۝ (حجر)

ہوئی آگ سے پیدا کر چکے تھے [illegible] جب ایسا ہوا تھا کہ تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا تھا " میں خمیر اٹھے ہوئے گارے سے جو سوکھ کر بجنے لگتا ہے، ایک بشر پیدا کرنے والا ہوں (یعنی نوع انسانی پیدا کرنے والا ہوں) تو جب ایسا ہو کہ میں اُسے درست کردوں (یعنی وہ وجود تکمیل کو پہنچ جائے) اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو چاہیے کہ تم سب اس کے آگے سربسجود ہو جاؤ" چنانچہ جتنے فرشتے تھے سب اس کے آگے سربسجود ہو گئے۔ مگر ایک ابلیس۔ اس پر یہ بات شاق گذری کہ سجدہ کرنے والوں میں سے ہو۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ ؕ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ؕ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّیَّتَهٗٓ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِیْ وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ؕ بِئْسَ لِلظّٰلِمِیْنَ بَدَلًا ۝ (الکہف، آیۃ ۵۰)

اور جب ایسا ہوا تھا کہ ہم نے فرشتوں کو حکم دیا تھا " آدم کے آگے جھک جاؤ" وہ سب جھک گئے تھے، مگر ابلیس نہیں جھکا تھا۔ وہ جن میں سے تھا۔ پس اپنے پروردگار کے حکم سے باہر ہو گیا۔ پھر کیا تم مجھ چھوڑ کر (کہ تمہارا پروردگار ہوں) اسے اور اس کی نسل کو اپنا کارساز بناتے ہو، حالانکہ وہ تمہارے دشمن ہیں؟ (دیکھو ظلم کرنے والوں کے لیے کیا ہی بری تبدیلی ہوئی!

اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ ۝ فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ ۝ فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ۝ اِلَّآ اِبْلِیْسَ ؕ اِسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ ۝ (ص)

اور وہ وقت یاد کرو جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا۔ میں مٹی سے بشر کو پیدا کرنے والا ہوں، پس جب ہم نے اس کو بنا سنوار لیا اور اس میں اپنی روح پھونک دی تو سب فرشتے اس کے لیے سربسجود ہو گئے اور سب ہی نے سجدہ کیا، مگر ابلیس نے نہ مانا، گھمنڈ کیا اور وہ (علم الٰہی میں پہلے ہی) کافروں میں سے تھا۔

سجدہ سے انکار کرنے پر ابلیس کا مناظرہ

اللہ تعالیٰ اگرچہ عالم الغیب اور دلوں کے بھیدوں سے واقف ہے اور ماضی حال اور استقبال سب اُس کے لیے یکساں ہیں مگر اُس نے امتحان و آزمائش کے لیے ابلیس (شیطان) سے سوال کیا

مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ۔ کس بات نے تجھے جھکنے سے روکا جبکہ میں نے حکم دیا تھا؟" (اعراف ۱۲)

ابلیس نے جواب دیا:-

اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ۝ کہ اس بات سے کہ میں آدم سے بہتر ہوں۔ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اُسے مٹی سے" (اعراف ۱۲)

شیطان کا مقصد یہ تھا کہ میں آدم سے افضل ہوں اس لیے کہ تو نے مجھ کو آگ سے بنایا ہے اور آگ بلندی و رفعت چاہتی ہے اور آدم مخلوق خاکی، بھلا خاک کو آگ سے کیا نسبت! اے خدا! پھر یہ تیرا حکم کہ ناری خاکی کو سجدہ کرے کیا انصاف پر مبنی ہے! میں ہر حالت میں آدم سے بہتر ہوں لہٰذا وہ مجھے سجدہ کرے نہ کہ میں اُس کے سامنے سربسجود ہوں۔ مگر بدبخت شیطان اپنے غرور و تکبر میں یہ بھول گیا کہ جب تو اور آدم دونوں خدا کی مخلوق ہو۔ تو مخلوق کی حقیقت خالق سے بہتر خود وہ مخلوق بھی نہیں جان سکتی۔ وہ اپنی تمکنت اور گھمنڈ میں یہ سمجھنے سے قاصر رہا کہ مرتبہ کی بلندی و پستی اُس مادہ کی بنا پر نہیں ہے جس سے کسی مخلوق کا خمیر تیار کیا گیا ہے بلکہ اُس کی اُن صفات پر ہے جو خالق کائنات نے اُس کے اندر ودیعت کی ہیں۔

بہر حال شیطان کا جواب چونکہ غرور و کبر کی جہالت پر مبنی تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے اُس پر واضح کر دیا کہ جہالت سے پیدا شدہ بد نخوت نے تجھ کو اس قدر اندھا کر دیا ہے کہ تو اپنے خالق کے حقوق اور احترام و منقبت سے بھی منکر ہو گیا، اس لیے مجھ کو ظالم قرار دیا اور یہ نہ سمجھا کہ تیری جہالت نے

تجھ کو حقیقت کے سمجھنے سے درماندہ و عاجز بنا دیا ہے پس تو اب اس سرکشی کی وجہ سے ابدی ہلاکت کا مستحق ہے، اور یہی تیرے عمل کی قدرتی پاداش ہے۔

ابلیس کی طلب مہلت | ابلیس نے جب یہ دیکھا کہ خالقِ کائنات کے حکم کی خلاف ورزی، تکبر و رعونت، اور خدائے تعالیٰ پر ظلم کے الزام نے ہمیشہ کے لیے مجھ کو رب العلمین کی آغوش رحمت سے مردود اور جنت سے محروم کر دیا۔ تو توبہ اور ندامت کی جگہ اللہ تعالیٰ سے استدعا کی کہ تا قیامِ قیامت مجھ کو مہلت عطا کر اور اس طویل مدت کیلئے میری زندگی کی رسی کو دراز کر دے۔

حکمتِ الٰہی کا تقاضا بھی یہی تھا لہٰذا اُس کی درخواست منظور کر لی گئی، یہ سن کر اب اُس نے پھر ایک مرتبہ اپنی شیطنت کا مظاہرہ کیا کہنے لگا: جب تو نے مجھ کو راندۂ درگاہ کر ہی دیا تو جس آدم کی بدولت مجھے یہ رسوائی نصیب ہوئی ہے میں بھی بنی آدم کی راہ ماروں گا اور اُن کے پس و پیش اردگرد اور چار جانب سے ہو کر اُن کو گمراہ کروں گا، اور اُن کی اکثریت کو تیرا ناسپاس اور ناشکر گذار بنا چھوڑوں گا۔ البتہ تیرے "مخلص بندے" میرے اغوا کے تیر سے گھائل نہ ہو سکیں گے اور ہر طرح محفوظ رہیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم کو اس کی کیا پرواہ، ہماری فطرت کا قانون مکافاتِ عمل اور پاداشِ عمل اٹل قانون ہے۔ پس جو جیسا کریگا ویسا بھریگا، اور جو بنی آدم مجھ سے روگردانی کر کے تیری پیروی کریگا وہ تیرے ہی ساتھ عذابِ الٰہی (جہنم) کا سزاوار ہوگا۔ جا! اپنی ذلت و رسوائی اور شومیٔ قسمت کے ساتھ یہاں سے دور ہو۔ اور اپنی اور اپنے پیرووں کی ابدی لعنت (جہنم) کا منتظر رہو۔

قرآنِ عزیز کی حسبِ ذیل آیات انہی تفصیلات پر روشنی ڈالتی ہیں:۔

مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ۚ — کس بات نے تجھے جھکنے سے روکا جبکہ میں نے حکم دیا تھا؟

قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّ
خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ۝ قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا
فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ
اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ ۝ قَالَ اَنْظِرْنِيْٓ
اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۝ قَالَ اِنَّكَ مِنَ
الْمُنْظَرِيْنَ ۝ قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ
لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ
مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ
اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ ۭ وَلَا تَجِدُ
اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ۝ قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا
مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۭ لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ
لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝

کہا "اس بات نے کہ میں آدم سے بہتر ہوں، تو نے مجھے آگ سے
پیدا کیا۔ اُسے مٹی سے۔" فرمایا "جنت سے نکل جا۔ تیری یہ ہستی
نہیں کہ یہاں رہ کر سرکشی کرے۔ یہاں سے نکل دور ہو۔ یقیناً
تو اُن میں سے ہوا جو ذلیل و خوار ہیں!" ابلیس نے کہا "مجھے
اُس وقت تک کے لیے مہلت دے جب لوگ (مرنے کے بعد)
اُٹھائے جائیں گے۔" فرمایا "تجھے مہلت ہے" اس پر ابلیس نے
کہا "چونکہ تو نے مجھ پر راہ بند کر دی، تو اب میں بھی ایسا ضرور
کرونگا کہ تیری سیدھی راہ سے بھٹکانے کے لیے بنی آدم کی تاک
میں بیٹھوں۔ پھر سامنے سے، پیچھے سے، دہنے سے، بائیں سے (غرضکہ
ہر طرف سے) اُن پر آؤں، اور تو اُن میں سے اکثروں کو شکر گذار نہ
پائیگا۔" خدا نے فرمایا "یہاں سے نکل جا، ذلیل اور ٹھکرایا ہوا۔ بنی
آدم میں سے جو کوئی تیری پیروی کریگا، تو (وہ تیرا ساتھی ہوگا، اور
میں البتہ ایسا کرونگا کہ (پاداشِ عمل میں) تم سب سے جہنم بھر دوں!"

(اعراف)

قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا لَكَ اَلَّا تَكُوْنَ مَعَ
السّٰجِدِيْنَ ۝ قَالَ لَمْ اَكُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ
خَلَقْتَهٗ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ
مَّسْنُوْنٍ ۝ قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ
رَجِيْمٌ ۝ وَّاِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ اِلٰى
يَوْمِ الدِّيْنِ ۝ قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى

اللہ نے فرمایا "اے ابلیس! تجھے کیا ہوا کہ سجدہ کرنے والوں
میں شامل نہ ہوا؟" کہا "مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ ایسے بشر کو سجدہ
کروں جسے تو نے خمیر اُٹھے ہوئے گارے سے بنایا ہے جو سوکھ کر بجنے لگتا
ہے۔" حکم ہوا "اگر ایسا ہے تو یہاں سے نکل جا کہ تو راندہ ہوا اور جزاء
کے دن تک تجھ پر لعنت ہوئی" اُس نے کہا "خدایا! مجھے اُس
دن تک مہلت دے جب انسان (دوبارہ) اُٹھائے جائینگے

يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۝ قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ۝
اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ۝ قَالَ رَبِّ
بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ
وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ اِلَّا عِبَادَكَ
مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ۝ قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ
عَلَيَّ مُسْتَقِيْمٌ ۝ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ
عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ
الْغٰوِيْنَ ۝ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝

(حجر)

فرمایا" اُس مقررہ وقت کے دن تک تجھے مہلت دی گئی"
اُس نے کہا" خدایا! چونکہ تونے مجھ پر (نجات وسعادت کی)
راہ بند کردی، تواب میں ضرور ایسا کرونگا کہ زمین میں اُن
کے لیے جھوٹی خوشنمائیاں بنادوں اور (راہ حق سے) گمراہ
کروں۔ ہاں اُن میں جو تیرے مخلص بندے ہونگے، (میں
جانتا ہوں) میرے بہکانے میں آنے والے نہیں" فرمایا"بس
یہی سیدھی راہ ہے جو مجھ تک پہنچانے والی ہے۔ جو میرے
(مخلص) بندے ہیں اُن پر تیرا کچھ زور نہیں چلیگا۔ صرف اُنہی
پر چلیگا جو (بندگی کی) راہ سے بھٹک گئے، اور اُن سب کیلیے جہنم کے
عذاب کا وعدہ ہے (جو کبھی ٹلنے والا نہیں)

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا
اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ قَالَ ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ
طِيْنًا ۝ قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِيْ
كَرَّمْتَ عَلَيَّ لَئِنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ
الْقِيٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلًا ۝
قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَاِنَّ
جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا ۝ وَ
اسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ
وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ وَ

اور (دیکھو) جب ایسا ہوا تھا کہ ہم نے فرشتوں کو حکم دیا" آدم
کے آگے جُھک جاؤ" اس پر سب جُھک گئے مگر ایک ابلیس نہ
جھکا۔ اُس نے کہا"کیا میں ایسی ہستی کے آگے جھکوں جسے
تونے مٹی سے بنایا ہے؟" نیز اُس نے کہا" کیا تیرا یہی فیصلہ
ہوا کہ تونے اس (حقیر) ہستی کو مجھ پر بڑائی دی؟" اگر تو مجھے قیامت
کے دن تک مہلت دیدے تو میں ضرور اس کی نسل کی بیخ
بنیاد اُکھاڑ کے رہوں، تھوڑے آدمی اس ہلاکت سے بچیں،
اور کوئی نہ بچے" اللہ نے فرمایا" جا اپنی راہ لے۔ جو کوئی بھی
اِن میں سی تیرے پیچھے چلیگا، تو اُس کے لیے اور تیرے لیے

وَشَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ ۭ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ۝ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ۭ وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا ۝

(اسراء)

جہنم کی سزا ہوئی۔ پوری پوری سزا۔" ان میں سے جس کسی کو تو اپنی صدائیں سنا کر بہکا سکتا ہے بہکانے کی کوشش کر لے، اپنے لشکر کے سواروں اور پیادوں سے حملہ کر، اُن کے مال اور اولاد میں شریک ہو جا، اُن سے (طرح طرح کی باتوں کے) وعدے کر، اور شیطان کے وعدے تو اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ سرتا سر دھوکا" جو میرے (سچے) بندے ہیں، اُن پر تو قابو پانے والا نہیں۔ تیرا پروردگار کارسازی کے لیے بس کرتا ہے۔

قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ ۭ اَسْتَكْبَرْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِيْنَ ۝ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۭ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ۝ قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ ۝ وَّاِنَّ عَلَيْكَ لَعْنَتِيْٓ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ ۝ قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۝ قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ۝ اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ۝ قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ۝ قَالَ فَالْحَقُّ ۡ وَالْحَقَّ اَقُوْلُ ۝ لَاَمْلَئَنَّ

فرمایا، اے ابلیس کس چیز نے روک دیا تجھ کو کہ سجدہ کرے اُس کو جس کو میں نے بنایا اپنے (قدرت کے) ہاتھوں کر۔ یہ تو نے غرور کیا یا تو بڑا تھا درجہ میں۔ بولا میں بہتر ہوں اُس سے مجھ کو بنایا تو نے آگ سے اور اُس کو بنایا مٹی سے۔ فرمایا تو تو نکل یہاں سے کہ تو مردود ہوا۔ اور تجھ پر میری پھٹکار ہے اُس جزا کے دن تک۔ بولا، اے رب! مجھ کو ڈھیل دے جس دن تک مُردے جی اُٹھیں۔ فرمایا تو تجھ کو ڈھیل ہے۔ اُسی وقت کے دن تک جو معلوم ہے۔ بولا تو قسم ہے تیری عزت کی میں گمراہ کرونگا اُن سب کو۔ مگر جو بندے ہیں تیری اُن میں چُنے ہوئے۔

فرمایا، تو ٹھیک بات یہ ہے اور میں ٹھیک ہی کہتا ہوں۔ مجھ کو بھرنا ہے دوزخ تجھ سے اور جو اُن میں تیری

جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ راہ چلے اُن سب سے۔

خلافتِ آدم اللہ تعالیٰ نے جب حضرتِ آدم (علیہ السلام) کو پیدا کرنا چاہا تو فرشتوں کو اطلاع دی کہ میں زمین پر اپنا خلیفہ بنایا چاہتا ہوں، جو اختیار و ارادہ کا مالک ہوگا، اور میری زمین پر جس قسم کا تصرف کرنا چاہیگا کرسکیگا، اور اپنی ضروریات کے لیے اپنی مرضی کے مطابق کام لے سکیگا، گویا وہ میری قدرت اور میرے تصرف و اختیار کا "مظہر" ہوگا۔

فرشتوں نے یہ سُنا تو حیرت میں رہ گئے، اور بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا اگر اس ہستی کی پیدائش کی حکمت یہ ہے کہ وہ دن رات تیری تسبیح و تہلیل میں مصروف رہے اور تیری تقدیس و بزرگی کے گُن گائے، تو اس کے لیے ہم حاضر ہیں، جو ہر لمحہ تیری حمد و ثنا کرتے، اور بے چون و چرا تیرا حکم بجا لاتے ہیں۔ ہم کو تو اس "خاکی" سے فتنۂ و فساد کی بو آتی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ تیری زمین میں خرابی اور خونریزی بپا کردے؟ بارِالٰہا! تیرا یہ فیصلہ آخر کس حکمت پر مبنی ہے؟

بارگاہِ الٰہی سے اوّل اُن کو یہ ادب سکھایا گیا کہ مخلوق کو خالق کے معاملات میں جلدبازی سے کام نہ لینا چاہیے، اور اُس کی جانب سے حقیقتِ حال کے اظہار سے قبل ہی شک و شبہ کو سامنے نہ لانا چاہیے۔ اور وہ بھی اس طرح کہ اُس میں اپنی برتری اور بڑائی کا پہلو نکلتا ہو۔ خالق کائنات اُن حقائق کو جانتا ہے جس سے تم بے بہرہ ہو، اور اُس کے علم میں وہ سب کچھ ہے جو تم نہیں جانتے۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ	اور جب ایسا ہوا تھا کہ تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے
جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ؕ	کہا تھا: میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔ فرشتوں
قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ	نے کہا: کیا ایسی ہستی کو خلیفہ بنایا جا رہا ہے جو زمین میں خرابی
فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ	پھیلائیگی اور خونریزی کریگی، حالانکہ ہم تیری حمد و ثنا

نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۭ قَالَ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ؀ (بقرہ)

کرتے ہوئے تیری پاکی و قدوسی کا اقرار کرتے ہیں (کہ تیری مشیت بُرائی سے پاک اور تیرا کام نقصان سے منزہ ہے!) اللہ نے کہا، میری نظر جس حقیقت پر ہے، تمہیں اُس کی خبر نہیں۔

تعلیمِ آدم اور فرشتوں کا اقرارِ عجز

یہ سمجھنا سخت غلطی ہے کہ اس مقام پر فرشتوں کا سوال اس لیے تھا کہ وہ اللہ تعالےٰ سے مناظرہ کریں یا اُس کے فیصلہ کے متعلق موشگافی کریں بلکہ وہ آدم کی تخلیق کا سبب معلوم کرنا چاہتے تھے اور یہ کہ اُس کے خلیفہ بنانے میں کیا حکمت ہے، اُن کی خواہش تھی کہ اس حکمت کا راز اُن پر بھی کھل جائے۔ اس لیے اُن کے طرزِ ادا اور تعبیرِ مقصد میں کوتاہی پر تنبیہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ پسند فرمایا کہ اُن کے اس سوال کا جواب جو بظاہر حضرتِ آدم کی تحقیر پر مبنی ہے عمل و فعل کے ذریعہ اس طرح دیا جائے کہ اُن کو خود بخود آدم کی برتری، اور حکمتِ الٰہی کی بلندی و رفعت کا نہ صرف اعتراف کرنا پڑے بلکہ اپنی درماندگی اور عجز کا بھی بدیہی طور پر مشاہدہ ہو جائے۔

لہٰذا حضرت آدمؑ کو اپنی سب سے عظیم المرتبت صفت "علم" سے نوازا اور اُن کو علمِ اشیاء عطا فرمایا۔ اور پھر فرشتوں کے سامنے پیش کرکے ارشاد فرمایا کہ تم ان اشیاء کے متعلق کیا علم رکھتے ہو؟ وہ لاعلم تھے کیا جواب دیتے۔ مگر چونکہ بارگاہِ صمدیت سے قرب رکھنے والے تھے سمجھ گئے کہ ہمارا امتحان مقصود نہیں ہے کیونکہ اس سے قبل ہم کو ان کا علم ہی کب دیا گیا ہے کہ آزمائش کی جاتی بلکہ یہ تنبیہ مقصود ہے کہ "خلافت الٰہیہ" کا مدار کثرتِ تسبیح و تہلیل اور تقدیس و تمجید پر بھی نہیں بلکہ صفتِ "علم" پر ہے۔ اس لیے کہ ارادہ و اختیار، قدرتِ تصرف، اور قدرتِ اختیار یا دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ "حکومتِ ارضی" صفتِ "علم" کے بغیر ناممکن ہے۔ پس جبکہ آدم کو اللہ تعالیٰ نے اپنی صفتِ علم کا مظہرِ اتم بنایا ہے تو بلاشبہ وہی خلافتِ ارضی کا مستحق ہے نہ کہ ہم۔ اور حقیقت بھی یہ ہے کہ ملائکۃ اللہ چونکہ اپنی خدماتِ مفوضہ کے علاوہ ہر قسم کی دنیوی خواہشوں اور ضرورتوں سے بے نیاز ہیں اس لیے وہ اُن کے علم سے بھی ناآشنا تھے

اور آدم کو چونکہ ان سب سے واسطہ پڑنا تھا اس لیے اُن کا علم اُس کے لیے ایک فطری امر تھا، جو رب العلمین کی ربوبیتِ کاملہ کی بخشش و عطا سے عطا ہوا، اور اُس کو وہ سب کچھ بتا دیا گیا جو اس کے لیے ضروری تھا۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِىْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۝ قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۝

(بقرہ)

(پھر جب ایسا ہوا کہ مشیت الٰہی نے جو کچھ چاہا تھا ظہور میں آگیا) اور آدم نے (یہاں تک معنوی ترقی کی کہ) تعلیم الٰہی سے تمام چیزوں کے نام معلوم کرلیے، تو فرشتوں کے سامنے وہ (تمام حقائق) پیش کردیے اور فرمایا، اگر تم (اپنے شبہہ میں) درستی پر ہو تو بتلاؤ، اِن (حقائق) کے نام کیا ہیں؟ فرشتوں نے عرض کیا خدایا ساری پاکیاں اور بڑائیاں تیرے ہی لیے ہیں۔ ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں جتنا تونے ہمیں سکھلا دیا ہے، علم تیرا علم ہے، اور حکمت تیری حکمت! (جب فرشتوں نے اس طرح اپنے عجز کا اعتراف کرلیا، تو) حکم الٰہی ہوا۔ اے آدم، تم (اب) فرشتوں کو ان (حقائق) کے نام بتلا دو۔ جب آدم نے بتلا دیے، تو اللہ نے فرمایا کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ آسمان و زمین کے تمام غیب مجھ پر روشن ہیں، اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو وہ بھی میرے علم میں ہے اور جو کچھ تم چھپاتے ہو، وہ بھی مجھ سے مخفی نہیں!

حضرتِ آدم کے اس شرفِ علم کے متعلق مفسرین کی دو رائے ہیں ایک یہ کہ کائنات کی وہ تمام اشیاء جو ماضی سے مستقبل تک وجود میں آنے والی تھیں اُن سب کے نام اور اُن کی حقیقت کا علم حضرتِ آدم علیہ السلام کو دے دیا گیا۔ دوسری رائے یہ ہے کہ اُس وقت جس قدر اشیاء بھی

عالمِ کائنات میں موجود تھیں اور حضرتِ آدمؑ کے سامنے اُن کا مظاہرہ کیا گیا تھا اُن سب کا علم عطا کیا گیا۔ اور "اَلاَسماءَ کُلَّھا" (تمام چیزوں کے نام) کا اطلاق جس طرح کائنات کی ماضی و مستقبل کی تمام اشیاء پر ہوتا ہے اُسی طرح اُس وقت کی تمام موجودہ اشیاء پر بھی بغیر کسی تاویل کے ہو سکتا ہے۔ اور یہ کہ "انبِئُونِی بِاَسمَاءِ ھٰؤُلَاءِ" میں "ھٰؤُلاءِ" سے اکثر موجود و محسوس یعنی حاضر ہی کی جانب اشارہ مقصود ہوا کرتا ہے۔

بہرحال حضرت آدمؑ کو صفتِ "علم" سے اس طرح نوازا گیا کہ فرشتوں کے لیے بھی اُن کی برتری اور استحقاقِ خلافت کے اقرار کے علاوہ چارۂ کار نہ رہا، اور یہ ماننا پڑا کہ اگر ہم زمین پر اللہ تعالیٰ کا خلیفہ بنائے جاتے تو کائنات کے تمام بھیدوں سے ناآشنا رہتے اور قدرت نے جو خواص اور علوم ودیعت کیے ہیں اُن سے یکسر ناواقف ہوتے۔ اس لیے کہ نہ ہم خورونوش کے محتاج ہیں کہ زمین میں ودیعت شدہ رزق اور خزانوں کی جستجو کرتے، نہ ہمیں غرق کا اندیشہ کہ کشتیوں اور جہازوں کی ایجاد کرتے، نہ مرض کا خوف کہ قسم قسم کے معالجات، اشیاء کے خواص، کیمیائی مرکبات فوائدِ طبیعات وفلکیات، طبی ایجادات، علومِ نفسیات و وجدانیات، اور اسی طرح کے بیش بہا اور بیشمار علوم وفنون کے اسرار اور اُن کی حکمتوں سے واقف ہو سکتے، بلاشبہ یہ صرف حضرتِ انسان ہی کے لیے موزوں تھا کہ وہ زمین پر خدا کا خلیفہ بنے اور ان تمام حقائق ومعارف اور علوم و فنون کے رازوں سے واقف ہو کر نیابتِ الٰہی کا صحیح حق ادا کرے۔

حضرتِ آدمؑ کا قیامِ جنت اور حوّاؑ کی زوجیت

حضرتِ آدمؑ ایک عرصہ تک تنہا زندگی بسر کرتے رہے، مگر اپنی زندگی اور راحت وسکون میں ایک وحشت اور خلا محسوس کرتے تھے اور اُن کی طبیعت اور فطرت کسی مونس و ہمدم کی جویا نظر آتی تھی چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرتِ حوّاؑ کو پیدا کیا، اور حضرتِ آدمؑ اپنا ہمدم اور رفیق پا کر بیحد مسرور ہوئے اور اطمینانِ قلب محسوس کیا، حضرتِ

آدم و حضرتِ حوّا کو اجازت تھی کہ وہ "جنت" میں رہیں سہیں اور اُس کی ہر چیز سے فائدہ اُٹھائیں۔ مگر ایک درخت کو معیّن کر کے بتایا گیا کہ اُس کو نہ کھائیں بلکہ اُس کے پاس تک نہ جائیں۔

آدم کا خلد سے نکلنا

اب ابلیس کو ایک موقعہ ہاتھ آیا اور اُس نے حضرتِ آدم و حوّاء کے دِل میں یہ وسوسہ ڈالا کہ یہ شجر "شجرِ خُلد" ہے۔ اس کا پھل کھانا جنت میں سرمدی آرام اور سکونت اور قربِ الٰہی کا ضامن ہے، اور قسمیں کھا کر اُن کو باور کرایا کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں دشمن نہیں ہوں۔ یہ سُن کر حضرتِ آدم کے انسانی اور بشری خواص میں سب سے پہلے نسیان (بھول چوک) نے ظہور کیا اور وہ یہ فراموش کر بیٹھے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ حکم، حکم امتناعی تھا یا مربیانہ مشورہ۔ اور آخر کار جنت کے دائمی قیام اور قربت الٰہی کے شوق نے عزم میں لغزش پیدا کر دی اور اُنہوں نے اُس کو کھا لیا۔ اُس کو کھانا تھا کہ بشری لوازم اُبھرنے لگے، دیکھا تو ننگے ہیں اور لباس سے محروم، جلد جلد (آدم و حوا) دونوں پتوں سے ستر ڈھانکنے لگے۔ گویا انسانی تمدن کا یہ آغاز تھا کہ اُس نے تن ڈھانکنے کے لیے سب سے پہلے پتّوں کو استعمال کیا۔

اِدھر یہ ہو رہا تھا کہ خدائے تعالیٰ کا عتاب نازل ہوا اور آدم سے باز پرس ہوئی کہ ممانعت کے باوجود یہ عدم حکمی کیسی؟ آدم آخر آدم تھے، مقبول بارگاہِ الٰہی تھے، اس لیے شیطان کی طرح مناظرہ نہیں کیا اور اپنی غلطی کو تاویلات کے پردہ میں چھپانے کی سعی نامشکور سے باز رہ کر ندامت و شرمساری کے ساتھ اقرار کیا کہ غلطی ضرور ہوئی لیکن اس کا سبب تمرّدی اور سرکشی نہیں ہے بلکہ بر بنائے بشریت بھول چوک اس کا باعث ہے، تاہم غلطی ہے، اس لیے توبہ و استغفار کرتے ہوئے عفو و درگذر کا خواستگار ہوں۔

حضرتِ حق نے اُن کے اس عذر کو قبول فرما لیا اور معاف کر دیا، مگر وقت آ گیا تھا کہ حضرتِ آدم خدا کی زمین پر "حقِ خلافت" ادا کریں۔ اس لیے بہ تقاضائے حکمت یہ فیصلہ سنایا کہ تم کو

اور تمہاری اولاد کو ایک معین وقت تک زمین پر قیام کرنا ہوگا، اور تمہارا دشمن ابلیس بھی اپنے تمام سامانِ عداوت کے ساتھ وہاں موجود رہیگا اور تم کو اس طرح ملکوتی اور ابلیسی دو متضاد طاقتوں کے درمیان زندگی بسر کرنی ہوگی، اس کے باوجود اگر تم اور تمہاری اولاد مخلص بندے اور سچے نائب ثابت ہوئے تو تمہارا اصلی وطن "جنت" ہمیشہ کے لیے تمہاری ملکیت میں دے دیا جائیگا۔ لہٰذا جاؤ تم اور حوا دونوں یہاں سے زمین پر اُترو اور اس طرح انسانوں کے باپ اور خدائے تعالیٰ کے خلیفہ آدم نے اپنی رفیقۂ حیات کے ساتھ خدا کی زمین پر قدم رکھا۔

وَقُلْنَا يَا آدَمُ اسْكُنْ أَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظّٰلِمِينَ ○ فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَأَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ وَقُلْنَا اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلٰى حِينٍ ○ فَتَلَقّٰى آدَمُ مِنْ رَبِّهِ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ۗ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ○ قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا ۚ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي

پھر (ایسا ہوا کہ) ہمنے آدم سے کہا۔ اے آدم، تم اور تمہاری بیوی، دونوں جنت میں رہو، جس طرح چاہو، کھاؤ پیو، امن چین کی زندگی بسر کرو۔ مگر دیکھو، وہ جو ایک درخت ہے، تو کبھی اُس کے پاس نہ پھٹکنا۔ اگر تم اُس کے پاس گئے، تو (نتیجہ یہ نکلیگا کہ) حد سے تجاوز کر بیٹھوگے، اور اُن لوگوں میں سے ہو جاؤگے جو زیادتی کرنے والے ہیں۔ پھر (ایسا ہوا کہ) شیطان کی وسوسہ اندازی نے اُن دونوں کے قدم ڈگمگا دیے، اور یہ اُسی کا نتیجہ تھا کہ جیسی کچھ (راحت وسکون کی) زندگی بسر کر رہے تھے، اُس سے نکلنا پڑا۔ خدا کا حکم ہوا۔ یہاں سے نکل جاؤ۔ تم میں سے ہر وجود دوسرے کا دشمن ہے۔ اب تمہیں (جنت کی جگہ) زمین میں رہنا ہے اور ایک خاص وقت تک کے لیے (جو علم الٰہی میں مقرر ہو چکا ہے) اُس سے فائدہ اُٹھانا ہے۔ پھر ایسا ہوا کہ آدم نے اپنے پروردگار کے القاء سے چند کلمات معلوم کر لیے (جن کے لیے اُس کے حضور قبولیت تھی) پس اللہ نے اُس کی توبہ قبول کر لی۔ اور بلاشبہ وہی ہے جو رحمت سے درگذر کرنیوالا ہے

هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ ۳۸

(بقرہ)

اور اُس کے درگذر کی کوئی انتہا نہیں! (آدم کی توبہ قبول ہوگئی، لیکن جس زندگی سے وہ نکل چکا تھا، دوبارہ نہیں مل سکتی تھی۔ پس) ہمارا حکم ہوا، اب تم سب یہاں سے نکل چلو، (اور جس نئی زندگی کا دروازہ تم پر کھولا جا رہا ہو اُسے اختیار کر لو) لیکن (یاد رکھو) جب کبھی ایسا ہوگا کہ ہماری جانب سے تم پر راہِ (حق) کھولی جائیگی، تو تمہارے لیے دو ہی راہیں ہونگی) جو کوئی ہدایت کی پیروی کریگا، اُس کے لیے (کامیابی و سعادت ہوگی) کسی طرح کا کھٹکا نہیں، کسی طرح کی غمگینی نہیں۔

وَيَآدَمُ اسْكُنْ أَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا وَ تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظّٰلِمِينَ ۝ فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وُرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا وَقَالَ مَا نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ إِلَّآ أَنْ تَكُونَا مَلَكَيْنِ أَوْ تَكُونَا مِنَ الْخٰلِدِينَ ۝ وَقَاسَمَهُمَآ إِنِّي لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِينَ ۝ فَدَلّٰهُمَا بِغُرُورٍ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ

اے آدم! تو اور تیری بیوی، دونوں جنت میں رہو سہو، اور جس جگہ سے جو چیز پسند آئے شوق سے کھاؤ۔ مگر دیکھو، (وہ جو ایک درخت ہے، تو) اس درخت کے قریب بھی نہ جانا۔ اگر گئے، تو یاد رکھو، تم زیادتی کرنے والوں میں سے ہو جاؤ گے"۔ لیکن پھر ایسا ہوا کہ شیطان نے ان دونوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالا، تاکہ اُن کے ستر جو اُن سے چھپے تھے، اُن پر کھول دے، اُس نے کہا تمہارے پروردگار نے اِس درخت سے جو تمہیں روکا ہے، تو صرف اس لیے کہ کہیں ایسا نہ ہو، تم فرشتے بن جاؤ، یا دائمی زندگی تمہیں حاصل ہو جائے۔ اُس نے قسمیں کھا کھا کر یقین دلایا کہ میں تم دونوں کو خیر خواہی سے نیک بات سمجھانے والا ہوں۔ غرضکہ (شیطان (اس طرح کی باتیں سُنا سنا کر بالآخر) اُنہیں فریب میں لے آیا۔ پھر جونہی ایسا ہوا کہ اُنہوں نے درخت کا پھل چکھا، اُن کے ستر اُن پر کھل گئے، اور (جب اُنہیں اپنی برہنگی دیکھ کر شرم محسوس

عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ؕ وَ
نَادٰىهُمَا رَبُّهُمَآ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ
تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَاَقُلْ لَّكُمَآ
اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝
قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ٚ وَ
اِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ
مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ قَالَ اهْبِطُوْا
بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي
الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى
حِيْنٍ ۝ قَالَ فِيْهَا تَحْيَوْنَ وَفِيْهَا
تَمُوْتُوْنَ وَمِنْهَا تُخْرَجُوْنَ ۝ ۲۵ (اعراف)

ہوئی، تو) باغ کے پتے اوپر تلے رکھ کر اپنے جسم پر چپکانے لگے۔ اُس وقت
اُن کے پروردگار نے پکارا "کیا میں نے تمہیں اس درخت سے نہیں روک دیا
تھا، اور کیا میں نے نہیں کہہ دیا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے؟" اُنہوں
نے عرض کیا "پروردگار! ہم نے اپنے ہاتھوں اپنا نقصان کیا۔ اگر تو نے
ہمارا قصور نہ بخشا اور ہم پر رحم نہ فرمایا، تو ہمارے لیے بربادی کے سوا کچھ نہیں!"
فرمایا "یہاں سے نکل جاؤ۔ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو۔ اب
تمہارے لیے زمین میں ٹھکانا ہے، اور یہ کہ ایک خاص وقت تک وہاں
سروسامانِ زندگی سے فائدہ اُٹھاؤ گے۔ اور فرمایا "تم اُسی میں
جیوگے، اُسی میں مروگے، پھر اُسی سے (مرنے کے بعد) نکالے
جاؤگے!"

وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ
فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ۝ وَ
اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ
فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى ۝ فَقُلْنَا
يٰٓاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَ
لِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ
الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى ۝ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ
فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ۝ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا

اور یہ واقعہ ہے کہ ہم نے آدم کو پہلے سے جتا کر عہد لے لیا تھا، پھر وہ بھول
گیا، اور ہم نے (نافرمانی کا) قصد اُس میں نہیں پایا تھا۔ اور پھر جب ہم
نے فرشتوں کو حکم دیا تھا "آدم کے آگے جھک جاؤ" سب جھک گئے
تھے، مگر ابلیس نہیں جھکا۔ اُس نے انکار کیا۔ اس پر ہم نے کہا "اے
آدم! (دیکھ لے) یہ (ابلیس) تیرا اور تیری بیوی کا دشمن ہے۔ ایسا نہ ہو
یہ تمہیں جنت سے نکال کے رہے اور تم محنت میں پڑ جاؤ۔ تمہارے لیے
اب ایسی زندگی ہے کہ نہ تو اُس میں بھوکے رہتے ہو نہ برہنہ۔ نہ تمہارے
لیے پیاس کی جلن ہے نہ سورج کی تپش (اگر اس سے نکلے تو سرتاسر

فِيهَا وَلَا تَضْحٰى ۝ فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ	محنت میں مبتلا ہو جاؤ گے) لیکن پھر شیطان نے آدم کو وسوسہ میں ڈالا۔
الشَّيْطٰنُ قَالَ يٰاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ	اُس نے کہا "اے آدم! میں تجھے ہمیشگی کے درخت کا نشان دیدوں؟ اور
عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ۝	ایسی بادشاہی جو کبھی زائل نہ ہو؟"
فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا	چنانچہ دونوں نے (یعنی آدم اور اُس کی بیوی نے) اُس درخت کا پھل
وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ	کھالیا، اور دونوں کے ستر اُن پر کھُل گئے۔ تب اُن کی حالت ایسی
الْجَنَّةِ ۚ وَعَصٰى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ۝	ہوگئی کہ باغ کے پتے توڑنے لگے اور اُن سے اپنا جسم ڈھانکنے لگے۔
ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ	غرضکہ آدم اپنے پروردگار کے کہنے پر نہ چلا پس وہ (جنت کی زندگی سے) بے راہ
وَهَدٰى ۝ قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًا	ہوگیا۔ (لیکن) پھر اُس کے پروردگار نے اُسے برگزیدہ کیا۔ اس پر (اپنی رحمتوں
بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ فَاِمَّا	سے) لوٹ آیا۔ اُس پر (زندگی و عمل کی) راہ کھول دی۔ چنانچہ اللہ نے حکم دیا
يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى ۙ فَمَنِ	تھا "تم دونوں اکٹھے یہاں سے نکل چلو۔ تم میں سے ایک دوسرے کا دشمن ہوا
اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا	(اب تم پر ایک دوسری زندگی کی راہ کھلیگی) پھر اگر میری طرف سے تمہارے
يَشْقٰى ۝ ۱۲۳	پاس (یعنی تمہاری نسل کے پاس) کوئی پیام ہدایت آیا، تو (اس بارے میں
(طٰہٰ)	میرا قانون یاد رکھو) جو کوئی میری ہدایت پر چلیگا، وہ نہ تو راہ سے بے راہ ہوگا
	نہ دُکھ میں پڑیگا۔

واقعہ سے متعلق چند اہم مسائل — واقعہ کی اس تفصیل کے بعد چند ایسے اہم مسائل پر بھی روشنی ڈالنا ضروری ہے جو واقعہ کی تفصیلات میں بڑی حد تک معین و مددگار ثابت ہوں۔

(۱) آدم و حوا۔ عربی نام ہیں یا عجمی؟ اور یہ نام کسی مناسبت سے رکھے گئے ہیں یا صرف نام ہی کی حیثیت میں ہیں۔

پہلے سوال کے متعلق مشہور محدث حافظ ابن حجر کی رائے یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ "سریانی"

نام ہے اور بائبل میں الف کے مد اور دال کے طول کے ساتھ پڑھا جاتا ہے یعنی آدام۔ اور علامہ جوہری اور جوالیقی یہ کہتے ہیں کہ یہ عربی نام ہیں۔ اور دوسرے سوال کے متعلق ثعلبی کا قول ہے کہ عبرانی زبان میں آدام مٹی کو کہتے ہیں، چونکہ اُن کی تخلیق مٹی سے ہوئی اس لیے آدم یا آدام نام رکھا گیا۔ اور بعض کا خیال ہے کہ اُدمۃ سے ماخوذ ہے جس کے معنی "گندم گونی" کے ہیں، اور بعض نے کہا کہ ادیم سے ماخوذ ہے اس لیے کہ وہ "ادیم ارض" یعنی صفحۂ زمین سے پیدا کیے گئے ہیں، اور بعض علما، کہتے ہیں کہ اَدَمَتْ بمعنی خلطتْ سے ماخوذ ہے اور چونکہ اُن کا خمیر پانی اور مٹی کو ملا کر اور غلط ملط کر کے بنایا گیا ہے اس لیے اس مناسبت سے اُن کو آدم کہا گیا۔

اسی طرح حوّا، اس لیے نام پڑا کہ وہ ہر "انسانِ حیّ" (زندہ انسان) کی ماں ہیں اور مبالغہ کا صیغہ بنا کر اُن کا نام رکھ دیا گیا۔[1]

بہرحال نام اور معنی میں مناسبت کا یہ سوال نکتہ اور لطیفہ کی حیثیت رکھتا ہے اس لیے بیان کردہ تمام وجوہ بیک وقت صحیح ہو سکتی ہیں اور کسی ایک وجہ کو دوسرے پر ترجیح بھی دی جا سکتی ہے۔ کیونکہ یہ باب بہت وسیع ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے سجدہ کا جو حکم دیا تھا وہ فرشتوں کو دیا تھا اور ابلیس فرشتوں کی جنس میں داخل نہیں تو پھر اُس پر عتابِ الٰہی کیوں ہوا اور وہ نافرمانی کا مرتکب کس لیے قرار دیا گیا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ بلاشبہ ابلیس ملائکہ کی جنس سے نہ تھا، قرآنِ عزیز میں نصِ صریح ہے

كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ — وہ جن سے تھا پس اُس نے اپنے پروردگار کی نافرمانی کی۔

مگر جب اللہ تعالیٰ نے سجدہ کا حکم فرمایا تو اس وقت وہ اُس مجلس میں موجود تھا اور غیر معلوم مدت تک فرشتوں کے ساتھ تسبیح و تہلیل میں مشغول رہنے کی وجہ سے وہ بھی اس حکم کا مخاطب تھا اور وہ بھی

---

[1] فتح الباری جلد ۶ کتاب حدیث الانبیاء [2] چونکہ یہ تمام اقوال تخمینی ہیں اس لیے سب کو نقل کر دیا گیا اور کسی ایک قول کو ترجیح دینے کی

خود کو مخاطب سمجھتا تھا اسی لیے جب خدائے تعالیٰ نے اُس سے دریافت کیا کہ تو نے سجدہ کیوں نہ کیا تو اُس نے یہ جواب نہیں دیا کہ میں فرشتہ نہیں ہوں اس لیے اس حکم کا مخاطب ہی نہ تھا کہ سجدہ کرتا۔ بلکہ ازراہ غرور کہا تو یہ کہا کہ میں آدم سے بہتر ہوں اس لیے سجدہ سے باز رہا۔

یہی جواب صحیح اور درست ہے۔ ورنہ تو ایک ضعیف اور کمزور رائے یہ ہے کہ ملائکۃ اللہ میں سے ایک قسم کو "جن" بھی کہا جاتا ہے اور یہ اُنہی میں سے ایک تھا۔ مگر اس رائے کی تائید نہ قرآنِ عزیز سے ملتی ہے اور نہ صحیح احادیث سے

(۳) ابلیس جب جنت سے مردود ہو کر نکال دیا گیا تو پھر وہ حضرتِ آدم و حوّا (علیہما السلام) کو کس طرح بہکا سکا؟

علماء اسلام سے اس کے دو جواب منقول ہیں اور دونوں کسی تاویل کے بغیر چسپاں ہیں:۔ (۱) اگرچہ ابلیس جنت سے نکال دیا گیا لیکن پھر بھی اُس کا ایک گنہگار اور نابکار مخلوق کی حیثیت میں جنت کے اندر داخل ہونا اُس کے مردود ہونے کے منافی نہیں ہے۔ اس لیے اُس نے اسی حیثیت سے اندر جا کر حضرت آدم و حوّا سے یہ گفتگو کی اور اُن کو لغزش میں ڈال دیا۔ آیت اھبطوا منہا جمیعًا اسی کی تائید کرتی ہے کہ عاصی کی حیثیت سے ابھی تک اُس کا داخلہ ممنوع نہیں تھا۔

(۲) جس طرح ایک آواز ٹیلیفون اور ریڈیو کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ دور جا سکتی ہے یا جس طرح لاسلکی (وائرلیس) میں صرف شعاعوں اور آواز کی لہروں کے ذریعہ سے ایک پیغام ہزاروں میل پہنچایا جا سکتا ہے اسی طرح یہ بھی کیوں ممکن نہیں کہ شیطان کا وسوسہ نفس انسانی تک اسی طرح پہنچ جائے پس اُس نے باہر ہی سے حضرتِ آدمؑ کے نفس میں اپنا وسوسہ ڈالا اور اُن کو بہکانے کی کوشش کی آیت "فوسوس لھما الشیطٰن" سے یہی ظاہر ہوتا ہے

(۴) حوّا کی پیدائش کس طرح ہوئی؟ قرآنِ عزیز میں اس کے متعلق صرف اسی قدر مذکور ہے:۔

وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا اور اُس نفس سے اُس کے جوڑے کو پیدا کیا۔

یہ نظمِ قرآنی حوّا کی پیدائش کی حقیقت کی تفصیل نہیں بتاتی۔ اس لیے دونوں احتمال ہو سکتے ہیں۔ اوّل یہ کہ حوّا حضرتِ آدم کی پسلی سے پیدا ہوئی ہوں جیسا کہ مشہور ہے، اور بائبل میں بھی اسی طرح مذکور ہے۔ دوم یہ کہ اللہ تعالیٰ نے نسلِ انسانی کو اس طرح پیدا کیا کہ مرد کے ساتھ اُسی کی جنس سے ایک دوسری مخلوق بھی بنائی جس کو عورت کہا جاتا ہے اور جو مرد کی رفیقۂ حیات بنتی ہے۔

آیت کی تفسیر میں محققین کی رائے اس دوسری تفسیر کی جانب مائل ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ قرآنِ عزیز صرف حضرتِ حوّا کی تخلیق کا ذکر نہیں کر رہا ہے بلکہ "عورت کی تخلیق کے متعلق" اس حقیقت کا اظہار کرتا ہے کہ وہ بھی مرد ہی کی جنس سے ہے اور اسی طرح مخلوق ہوئی ہے۔ البتہ بخاری و مسلم کی روایتوں میں یہ ضرور آتا ہے کہ عورت پسلی سے پیدا ہوئی ہے۔ الفاظ یہ ہیں:-

استوصوا بالنساءِ فان المرأۃ عورتوں کے ساتھ نرمی اور خیر خواہی سے پیش آؤ

خلقت من ضلع (الحدیث) اس لیے کہ عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے۔

اس کا مطلب ابنِ اسحٰق نے تو یہ روایت کیا ہے کہ حوّا آدم کی بائیں پسلی سے پیدا کی گئیں مگر ابنِ اسحاق سے زیادہ محقق اور نقاد علامہ قرطبیؒ نے اس کے معنی یہ بیان کیے ہیں کہ دراصل یہاں عورت کو پسلی سے تشبیہ دی گئی ہے اور بتایا ہے کہ عورت کی خلقت کی ابتدا پسلی سے کی گئی ہے، اس لیے اُس کا حال پسلی ہی کی طرح ہے، اگر اُس کی کجی کو سیدھا کرنا چاہو گے تو وہ ٹوٹ جائیگی۔ تو جس طرح پسلی کے ترچھے پن کے باوجود اُس سے کام لیا جاتا ہے اور اُس کے خم کو دور کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی اُسی طرح عورتوں کے ساتھ نرمی اور رفق کا معاملہ کرنا چاہیے ورنہ سختی کے برتاؤ سے خوشگواری کی جگہ تعلق کی شکست و ریخت کی صورت پیدا ہو جائیگی۔

(۵) حضرت آدم (علیہ السلام) جس جنت میں مقیم تھے اور جہاں سے اُنہیں زمین پر اُترنے کا

حکم دیا گیا وہ جنت کونسی جنت ہے۔ "جنت الماویٰ؟" جو بعد قیامِ قیامت اہلِ ایمان کا مستقر ہے، یا "جنتِ ارضی؟" جو اسی سرزمین میں کسی بلند اور پُر فضا مقام پر آدمؑ کی سکونت کے لیے بنائی گئی تھی۔ جمہور علماءِ اسلام کا مسلک یہ ہے کہ یہ "جنۃ الماویٰ" ہی تھی جس کا وعدہ آخرت میں مسلمانوں کے لیے کیا گیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آیات و احادیث کا ظاہر اسی پر دلالت کرتا ہے، مثلاً

۱۔ قُلْنَا يَا آدَمُ اسْكُنْ أَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ — ہم نے کہا اے آدم تم اور تمہاری بیوی (حوّا) جنت میں رہو۔

اس جگہ جنت کو عربی قاعدہ سے "الجنۃ" الف لام کے ساتھ ذکر کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ اُسی مشہور جنت کا ذکر ہے جس کو جگہ جگہ قرآنِ عزیز میں قیامِ قیامت کے بعد مومنوں کا وطن بتایا گیا ہے۔ ورنہ اگر کسی نئے مقام کا تذکرہ ہوتا تو پہلے اُس کی حقیقت کا اظہار ہوتا پھر اُس کو جانی پہچانی چیز کی طرح ان الفاظ کے ساتھ ذکر کیا جاتا۔

۲۔ اِهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا۔ — تم سب وہاں سے ایک ساتھ اترو۔

ہبوط: (اترنا) بلندی سے پستی کی طرف ہوتا ہے۔ اس لیے یہ جنتِ ارضی نہیں ہو سکتی بلکہ جنتِ ماویٰ ہی ہو سکتی ہے۔

۳۔ مسلم میں ایک طویل حدیث ہے جس میں یہ جملہ موجود ہے۔

یجمع اللہ الناس فیقوم المؤمنون حین تزدلف لھم الجنۃ فیأتون آدم فَيَقُولُونَ يَا أَبَانَا استفتح لَنَا الجنۃ فیقول: وھل اخرجکم من الجنۃ الا خطیئۃ ابیکم (الحدیث)	اللہ تعالیٰ لوگوں کو جمع کریگا، پس اہلِ ایمان کھڑے ہونگے جب جنت اُن کے قریب ہوگی پھر وہ آدم کے پاس آئینگے اور کہینگے اے ہمارے باپ ہمارے لیے اس جنت کو کھولیے۔ اس پر حضرت آدم فرمائینگے کیا تم کو جنت سے تمہارے باپ کی خطاکاری ہی نے نہیں نکالا تھا۔

اِس کے برخلاف علما، کی ایک جماعت کہتی ہے کہ "یہ جنت" دنیا ہی کے مقامات میں سے کسی مقام پر تھی "جنۃ الماوی" نہ تھی۔ اور اپنے قول کی تائید میں یہ کہتے ہیں کہ آیاتِ قرآنی اس کو ظاہر کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آدم و حوا کو وہاں کھانے پینے کا مکلف بنایا اور ایک درخت کے نہ کھانے کی تکلیف دی، پھر وہاں آدم خوابِ راحت میں بھی رہتے تھے، اور وہاں ابلیس بھی آتا جاتا رہتا تھا اور اُس نے حضرتِ آدم کو بہکا بھی دیا، اور پھر آدم و حوا، اور ابلیس وہاں سے نکالے بھی گئے تو یہ تمام وہ امور ہیں جو دنیا کے ساتھ مخصوص ہیں اور "جنۃ الماویٰ" میں ان کا وجود نہیں ہے نہ وہ عالمِ تکلیف ہے اور نہ اُس میں داخلہ کے بعد اخراج ہے۔ یہ قول بھی بڑے بڑے علماءِ اسلام کی طرف منسوب ہے۔ اور ان دو رایوں کے علاوہ اس سلسلہ میں دو رائیں اور بھی ہیں اور اس طرح اِس مسئلہ میں چار اقوال ہو جاتے ہیں۔

۱۔ یہ جنۃ الماویٰ ہے۔

۲۔ یہ جنتِ ارضی ہے۔

۳۔ یہ جنۃ الماویٰ اور جنتِ ارضی کے علاوہ ایک اور جنت ہے جو صرف اسی غرض سے تیار کی گئی تھی۔

۴۔ اس معاملہ میں توقف اور سکوت کرنا چاہیئے، اور اسے خدا کے حوالہ کر دینا چاہیے۔

یہ بحث بہت طویل ہے اور حافظ عماد الدین بن کثیر نے اپنی تاریخ البدایۃ والنہایۃ میں اس کو بڑے شرح و بسط سے بیان کیا ہے اور تمام اقوال کے مفصل دلائل اور نظائر کو بھی نقل کیا ہے[۱] تفصیل دیکھنے کے لیے اس کی مراجعت کرنی چاہیے۔

بہر حال حقیقتِ حال کا عالم تو خدا ہی ہے لیکن تمام دلائل و براہین کے دیکھنے کے بعد میری

---

[۱] البدایۃ والنہایۃ جلد ۱ ص ۷۵ تا ۸۱۔

رائے تو یہی ہے کہ یہ معاملہ بلا شبہ "جنت الماویٰ" ہی میں پیش آیا ہے اور کھانے، سونے، اور شیطان کے وسوسہ ڈالنے کے تمام معاملات "جنت الماویٰ" میں اُس وقت پیش آئے ہیں جبکہ انسان ابھی تک عالمِ تکلیف میں نہیں آیا تھا پس یہ جو کچھ ہوا مشیتِ الٰہی کی حکمتِ بالغہ کے زیرِ اثر اس لیے ہوا کہ یہ تمام تکوینی امور انسان کے زمین پر آباد ہونے اور "خلافتِ الٰہیہ" کے حقدار بننے کے لیے ضروری تھے

ظریفانہ نکتہ

جو علماء اس کے قائل ہیں کہ یہ جنت الماویٰ ہے اُن پر دوسرے علماء کا یہ اعتراض ہے کہ اگر اسے صحیح تسلیم کر لیا جائے (اور یہ ظاہر ہے کہ اسی کا دوسرا نام جنۃ الخلد ہے) تو حضرت آدمؑ سے ابلیس کا یہ کہنا کہ میں تمہیں شجرِ خلد کا پتہ بتاؤں کیا معنی رکھتا ہے؟

لیکن اوّل الذکر علماء ان حضرات سے جو جنتِ ارضی کے قائل ہیں پلٹ کر یہ سوال کرتے ہیں کہ اگر یہ جنتِ ارضی تھی تو اس دارِ فانی میں ابلیس، حضرت آدمؑ سے ایسی بحث ہی کیسے کر سکتا تھا کہ دنیا اور اُس کی تمام اشیاء تو فانی ہیں مگر اُس میں ایک شجرِ خلد بھی ہے۔ دارِ فانی میں خلود کہاں، اس کو تو معمولی عقل کا انسان بھی تسلیم نہیں کر سکتا چہ جائیکہ حضرت آدمؑ؟

جنت ارضی علماءِ طبقات الارض کی نظر میں

جو علماء اس جنت کو "جنتِ ارضی" بتاتے ہیں اُن میں سے علماءِ طبقات الارض کا یہ دعویٰ ہے کہ ربع مسکون میں سے جس خطہ پر یہ جنت قائم تھی وہ آج کائناتِ ارضی پر موجود نہیں ہے۔ یہ حصہ "قارہ مو" کے نام سے اس دنیا میں آباد تھا مگر مختلف حوادث اور پیہم زلزلوں کے باعث بحرِ ہند میں ہزاروں سال ہوئے کہ غرق ہو گیا اور یہ کہ جب یہ حادثہ پیش آیا تھا تو اس خطہ پر بسنے والی انسانی آبادی تقریباً ساٹھ ملین (چھ کروڑ) کی تعداد میں ہلاک ہو گئی۔

اور بائیبل کے سفرِ تکوین اصحاح ۲ میں اس کا مقامِ وقوع وہ بتایا گیا ہے جہاں سے دجلہ اور فرات نکلتے ہیں۔

(۶) کیا حضرتِ آدم نبی اور رسول ہیں ؟

شریعت اسلامی میں "نبی" اُس ہستی کو کہتے ہیں جس کو حق تعالیٰ نے اپنے بندوں کی ہدایت کے لیے چُن لیا ہو اور وہ براہ راست اللہ تعالیٰ سے ہمکلام ہوتی ہو۔ اور "رسول" اس نبی کو کہا جاتا ہے جس کے پاس اللہ تعالیٰ کی جانب سے نئی شریعت اور نئی کتاب بھیجی گئی ہو۔

چونکہ حضرتِ آدم دنیاءِ انسانی کے باپ ہیں تو خود بخود یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ جس طرح اپنی نسل کی دنیوی سعادت و فلاح کے لیے راہنما اور ہادی تھے اسی طرح اخروی سعادت و فلاح کے بھی پیغامبر تھے یا نہیں ؟

اس کا جواب ایک ہی ہو سکتا ہے کہ وہ بلا شبہ خدا کے سچے پیغمبر اور نبی برحق تھے اور اس مسئلہ میں اُمت میں کبھی دو رائیں نہیں ہوئیں، اور اسی لیے کبھی یہ مسئلہ موضوعِ بحث نہیں بنا۔ مگر اس مسئلہ میں اُس وقت سے اہمیت پیدا ہوئی جبکہ حصر کے قریبہ دمنہور کے ایک شخص نے حضرت آدم کی نبوت کا انکار کیا اور اپنے دعوے کی دلیل میں یہ پیش کیا کہ قرآنِ عزیز میں کسی مقام پر بھی حضرت آدم کو دوسرے انبیاء علیہم السلام کی طرح "نبی" نہیں کہا گیا۔[۱]

اس شخص کا یہ کہنا کہ قرآنِ عزیز نے حضرت آدم کو کسی جگہ لفظ نبی سے مخاطب نہیں کیا لفظی اعتبار سے اگرچہ صحیح ہے لیکن حقیقتِ نبوت کے اعتبار سے بالکل غلط ہے۔ اس لیے کہ نبوت کے جو معنی اسلامی اصطلاح میں بیان کیے گئے ہیں بغیر کسی تاویل کے اُس کا اطلاق حضرت آدمؑ پر نظم قرآنی میں بہت سے مقامات میں موجود ہے۔ جگہ جگہ یہ ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ بغیر کسی واسطے

---

[۱] حضرت ابو ذر غفاریؓ سے مروی ہے "میں نے عرض کیا، یا رسول اللہ! مجھے بتائیے کیا آدم نبی تھے۔ حضور نے فرمایا۔ ہاں وہ نبی تھے اور رسول بھی اُنھیں اللہ رب العالمین سے شرفِ تخاطب و تکلم حاصل ہوا ہے"۔ روایت کے الفاظ یہ ہیں: ۔ عن ابی ذرؓ قال قلت یا رسول اللہ أرأیت آدم انبیا کان قال نعم نبیا رسولا یکلمہ اللہ قبیلا ۔ (ابن کثیر جلد اول ص ۱۳۴)

کے حضرتِ آدمؑ سے ہمکلام ہوتا رہا ہے۔ اور اُس تمام مخاطبت اور بات چیت میں امر و نہی اور حلال و حرام کے احکام دیتا رہا ہے اور ان احکام کے لیے آدمؑ کے پاس کسی کو نبی و رسول بنا کر نہیں بھیجا، بلکہ براہ راست اُن ہی سے خطاب فرمایا گیا۔ پس جبکہ نبوت کی حقیقت بھی یہی ہے تو حضرت آدمؑ کی نبوت کا انکار قطعاً باطل اور بے معنی ہے نیز اُن کے رسول ہونے نہ ہونے کی بحث بھی کچھ زیادہ اہم نہیں ہے۔ اس لیے کہ جب وہ پہلے انسان ہیں تو انسانی آبادی کے لیے خدا کی وحی کے ذریعہ جو پیغامات بھی اُنھوں نے سُنائے وہی اُن کی شریعت سمجھی جائیگی اور اس لیے وہ رسول بھی ہیں بہرحال اُن کی نبوت پر یقین رکھنے اور قلب میں اطمینان پیدا کرنے کے لیے نظم قرآنی کی وہ تمام آیات کافی و شافی دلیل ہیں جو حضرت آدمؑ (علیہ السلام) اور اللہ تعالیٰ کے درمیان براہِ راست گفتگو اور مکالمت و تخاطب کی شکل میں نظر آتی ہیں۔

(۷) حضرت آدمؑ جبکہ نبی ہیں تو اُن سے خدا کے حکم کی خلاف ورزی کے کیا معنی، نبی تو معصوم ہوتا ہے اور "عصمت" نافرمانی اور گناہ کے متضاد ہے؟

حضرت آدمؑ کی عصمت پر بحث کرنے سے قبل مختصر الفاظ میں "عصمت" کے معنی اور اس کا مفہوم معلوم ہو جانا ضروری ہے۔ تاکہ آئندہ بھی ایسے مقامات میں کوئی گنجلک اور ریب و شک کی گنجائش باقی نہ رہے۔

عصمت نبی کے معنی

خالقِ کائنات نے انسان کی تخلیق متضاد قوتوں کے ساتھ فرمائی ہے یعنی اُس کو نیک و بد دونوں قسم کی قوتیں عطا کی گئی ہیں، وہ گناہ بھی کر سکتا ہے اور نیکی بھی، وہ ارادۂ بد کا بھی حامل ہے اور ارادۂ خیر کا بھی اور یہی اُس کے انسانی شرف کا طغرائے امتیاز ہے۔

ان متضاد قوتوں کے حامل "انسان" میں سے حضرتِ حق، انسانی رشد و ہدایت اور وصول الی اللہ کے لیے کبھی کبھی کسی شخص کو چن لیتے، اور اُس کو اپنا رسول، نبی اور پیغمبر بنا لیتے ہیں

اور اس سلسلہ کی آخری کڑی ذاتِ اقدس محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

سو جب یہ ہستی "نبوت" کے لیے چن لی جاتی ہے تو اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ عمل ارادہ کی زندگی میں ہر قسم کے گناہ سے پاک اور ہمہ قسم کی نافرمانیوں سے منزہ ہو تا کہ پیغام الٰہی کے منصب میں خدا کی صحیح نیابت ادا کر سکے۔ اور "او خویشتن گم است کرا رہبری کند" کا مصداق نہ ثابت ہو۔ اس طرح وہ ایک انسان اور بشر بھی ہے کہ کھاتا ہے، پیتا ہے، سوتا ہے اور اہل وعیال کی زندگی سے بھی وابستہ ہے اور وہ ہر قسم کے عملی اور ارادی گناہوں سے پاک بھی ہے کیونکہ وہ ہر قسم کی نیکی کے لیے ہادی و مرشد اور خدا کا نائب ہے، اگرچہ وہ دوسرے انسانوں کی طرح متضاد قوتوں کا حامل ضرور ہے لیکن عمل اور ارادہ میں اُس سے ہر قسم کی بدی کے ظہور کو ناممکن اور محال کر دیا گیا ہے تا کہ اُس کا ہر ارادہ ہر عمل، اور ہر قول غرض ہر حرکت وسکون کائنات کے لیے اسوہ اور نمونہ بن سکے۔ البتہ بشریت و انسانیت سے متصف ہونے کی بنا پر سہو، نسیان، اور لغزش کا امکان باقی رہتا اور کبھی کبھی عملی شکل بھی اختیار کر لیتا ہے مگر فوراً ہی اُس پر متنبہ کر دیا جاتا ہے اور وہ اُس سے کنارہ کش ہو جاتا ہے

سہو اور نسیان تو اپنے مفہوم میں ظاہر ہیں مگر زَلّۃ (لغزش) کیا ہے؟ تو اس کا اطلاق ایسی حقیقت پر ہوتا ہے کہ جہاں عمل اور کردار میں نافرمانی، تمرد اور سرکشی کا دخل ہو، اور نہ قصد وارادہ کے ساتھ حکم کی خلاف ورزی کا اور ساتھ ہی وہ عمل اپنی حقیقت اور ماہیت کے اعتبار سے قبیح، بد، اور شر بھی نہ ہو۔ اور ان تمام امور کے پیشِ نظر وہ اپنی ذات میں اباحت اور جواز کا درجہ رکھتا ہو، مگر کرنے والے کی ہستی کے شایانِ شان نہ ہو بلکہ اُس کے عظیم رتبہ کے سامنے نازل اور ہلکا نظر آتا ہو۔ بااینہمہ اس لیے عمل میں آ گیا کہ عمل کرنے والے کی نگاہ میں اُس کا اُس طرح کرنا خدائے تعالیٰ کی مرضی کے خلاف نہ تھا۔ لیکن نبی پر چونکہ خدائے تعالیٰ کی مستقل حفاظت ونگرانی رہتی ہے اس لیے فوراً ہی اس کو متنبہ کر دیا جاتا ہے کہ یہ عمل تمہاری جلالت قدر اور عظمتِ مرتبہ کے شایان شایان نہیں ہے اور

قطعی غیر مناسب ہے۔ اسی فرقِ مراتب کو عربی کی اس مثل میں ظاہر کیا گیا ہے۔

حسنات الابرار سیأت المقربین۔ نکوکار انسانوں کی عام خوبیاں مقربین بارگاہِ الٰہی کے حق میں برائیاں ہوتی ہیں۔

مگر اس لیے کہ ایک مقرب بارگاہِ الٰہی کو خدا کی مرضی کے سمجھنے میں بھی یہ لغزش کیوں پیش آئی سنۃ اللہ یہ جاری ہے کہ وہ انبیاء و مرسلین (علیہم الصلوٰۃ والسلام) کی اس قسم کی لغزشوں پر جب اُن کو متنبہ کرتا ہے تو اول نہایت سخت اور مجرمانہ عمل کی حیثیت میں اُس لغزش کا ذکر کرتا ہے مگر پھر کسی دوسرے مقام پر اُس معاملہ کی اصل حقیقت کو ظاہر کر کے "نبی و رسول" کے عمل کو لغزش ہی کی حد میں لے آتا اور اُن کی جانب سے خود ہی معذرت کر دیتا ہے تاکہ کسی ملحد اور زندیق کو کسی بھی نبی و رسول کی جانب گناہ کے الزام لگانے کی بیجا جرأت نہ ہو سکے۔

اسی مجموعہ حقیقت کا نام "عصمتِ انبیاء" ہے اور یہی اسلامی عقائد میں سے ایک بنیادی عقیدہ ہے۔ یہ مسئلہ اگرچہ بحث و کاوش کے اعتبار سے بہت اہم اور معرکۃ الآرا مسئلہ ہے، مگر دلائل و براہین اور بحث و نظر کے بعد مسئلہ کی حقیقت اور اُس کا خلاصہ یہی ہے جو یہاں سپردِ قلم کیا گیا اور اس مقام پر اسی قدر کافی و شافی ہے۔

حضرت آدم کی عصمت اس حقیقت کے واضح ہو جانے کے بعد اب حضرت آدم کے واقعہ پر نظر ڈالیے تو آپ یہ پائیں گے کہ جب اس واقعہ کو سورۂ "بقرہ" میں بیان کیا گیا تو یہ واضح کر دیا گیا کہ حضرت آدم کی یہ غلطی نہ گناہ تھی اور نہ نافرمانی بلکہ معمولی قسم کی لغزش تھی۔

فازلھما الشیطان شیطان نے اُن دونوں سے لغزش کرادی۔

اور اس کے بعد سورۂ "اعراف" اور "طٰہٰ" میں دو جگہ اس واقعہ کو نقل کرتے ہوئے "وسوسہ" سے تعبیر کیا

وسوس الیہ الشیطان شیطان نے اُن کو پھسلایا۔

اور طٰہٰ میں تیسری جگہ اس لغزش اور وسوسہ کا خود ہی سبب بیان کر کے حضرت آدم کو ہر قسم کے ارادی اور عملی گناہ سے پاک ظاہر کیا اور اور اُن کی عصمت کے مسئلہ کو زیادہ سے زیادہ محکم اور مضبوط بنا دیا۔

ولقد عهدنا الیٰ — اور بلاشبہ ہم نے آدم سے ایک اقرار لیا تھا پس وہ اُس کو
آدم فنسی ولم نجد — بھول گیا اور ہم نے اُس کو پختہ ارادہ کا نہیں پایا (یا، ہم نے
لہ عزما۔ — اُس کو اس اقرار کے پورا کرنے میں اُس کے ارادہ اور قصد کا دخل نہیں)

یہ آیات صاف طور پر واضح کرتی ہیں کہ حضرت آدم نے کسی قسم کا کوئی گناہ نہیں کیا اور جس حد تک معاملہ پیش آیا اُس میں اُن کے قصد و ارادہ سے خلاف ورزی کا مطلق کوئی دخل نہیں ہے، بلکہ وہ ایک وسوسہ تھا جو لغزش کی شکل میں اُن سے صادر ہو گیا اور وہ بھی نسیان اور بھول چوک کے ساتھ۔

ان تمام تصریحات کے بعد اب سورۂ طٰہٰ کی مسطورۂ ذیل آیت کا مقصد خود بخود صاف ہو جاتا ہے۔

وعصیٰ آدم ربہ فغویٰ — اور آدم نے اپنے پروردگار کا حکم پورا نہ کیا اور وہ بہک گیا

ہم نے اس جگہ عصیان اور غوایت کے وہ معنی نہیں لیے جو عام بول چال میں بولے جاتے ہیں یعنی "گناہ" اور "گمراہی" اور ایسا تاویل بعید یا دور از کار توجیہ کے لیے نہیں کیا گیا بلکہ لغت اور علم معانی کے عام اصول کے زیر نظر ہی کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ لغت عربی کی مشہور کتاب "لسان العرب" اور "اقرب الموارد" وغیرہ میں ہے "المعصیۃ: مصدر، وقد تطلق علی الزلۃ مجازاً" (معصیت مصدر ہے اور کبھی مجاز کے طور پر لغزش کے معنی میں استعمال ہوتا ہے) اسی طرح غوی کے معنی یہاں ضلّ یا خاب کے ہیں۔ پس اگر یہاں ضلّ مراد ہیں تو اُس کا اردو ترجمہ "بہک گیا" کیا جائیگا، اور اگر خاب مراد ہیں تو "نقصان میں پڑ گیا" صحیح ترجمہ ہے۔

بہرحال [illegible] متعلق اِن تمام آیات کو اور اُن آیات کو جو حضرتِ آدم کی جلالتِ قدر صفوت و برگزیدگی، اور خلعتِ خلافت سے سرفرازی کو ظاہر کرتی ہیں۔ جُدا جُدا کر کے نہ دیکھا جائے جیسا کہ معترضین کا عام قاعدہ ہے اور جو اکثر قرآن فہمی میں گمراہی کا سبب بنتا ہے —— اور سب کو یکجا جمع کر کے مطالعہ کیا جائے تو یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ حضرتِ آدم کی "عصمت" کا مسئلہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے اور اُس میں قطعی کسی شائبہ ریب و شک کی گنجائش نہیں ہے

اور بالفرض اگر عصیٰ اور غویٰ کو عام استعمالی معنی میں لیا جائے تب بھی وہ اصول پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے جو مسئلہ "عصمت" کی حقیقت کے سلسلہ میں ابھی بیان ہو چکا ہے کہ جب نصوصِ قرآن حضرت آدم کی نبوت، صفوت اور خلافت جیسے عظیم الشان مراتب کا اظہار کرتی جاتی ہیں تو اس آیت میں اُن کی اس لغزش کو ان سخت الفاظ کے ساتھ اس لیے یاد کیا گیا کہ آدم جیسے مقربِ بارگاہِ الٰہی کے لیے کہ جس کو خود اللہ تعالیٰ کی براہِ راست ہمکلامی کا شرف حاصل ہے یہ لغزش اور نسیان بھی اُس کے مرتبہ سے نازل اور غیر موزوں ہے لہٰذا زیادہ سے زیادہ قابلِ گرفت ہے اگرچہ ابرار و نیکوکار انسانوں کے حق میں اس قسم کی غلطی ایک معمولی بات ہی کیوں نہ ہو۔

(۷) حضرت آدم، دنیاءِ انسانی میں پہلے انسان اور کائناتِ بشری کے پہلے ابو البشر ہیں یا اس سے بھی پہلے اس قسم کی دنیاءِ انسانی کا وجود اس کائنات میں رہا ہے اور اُس کے لیے بھی اسی طرح ایک آدم ابو البشر کی ہستی رہی ہے؟

اس مسئلہ کے متعلق اگرچہ بعض علماءِ طبقات الارض نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ موجودہ انسانی دنیا سے قبل بھی ربع مسکوں پر عالمِ انسانی کا وجود رہا ہے اور آج سے تیس ہزار سال قبل کی اس جنس بشری کا نام "نیانڈرتھال" تھا اور اس کا موجودہ نسلِ انسانی سے قطعاً کوئی تعلق نہ تھا بلکہ وہ مستقل نسل تھی جو ہلاک ہو گئی، اور اُس کے بعد موجودہ نسلِ انسانی نے جنم لیا مگر ان

کی یہ تحقیق تخمینی اور قیاسی ہے جو انسانی ڈھانچوں اور اُن کی ہڈیوں کی تحقیق (ریسرچ) پر مبنی ہو اور کسی یقین اور علم حقیقی پر مبنی نہیں ہے اور قرآن عزیز نے ہم کو اس کے متعلق کوئی اطلاع نہیں دی نہ کسی موقع پر اُس کے بارہ میں کوئی اشارہ کیا اور نہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس مسئلہ میں کوئی تصریح موجود ہے۔ لہٰذا ہمارے یقین اور اعتقاد کے لیے اُسی قدر کافی ہے جو ہم کو قرآن کے یقینی علم اور وحی الٰہی کے صاف اور صریح اطلاع سے حاصل ہوا ہے۔

دراصل اس قسم کے مباحثِ علمیہ کے لیے اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ جو مسائل علم یقین اور مشاہدہ کی حد تک پہنچ چکے ہیں، اور قرآنی علوم وحی الٰہی کی معرفت سے اُن حقائق کا اُس انکار نہیں کرتے جس طرح آج وہ مشاہدہ اور بداہت کے درجہ میں نظر آتے ہیں۔ اُن کو بلا شبہ تسلیم کیا جائے اور اُن کا انکار بیجا تعصب اور تنگ نظری کے سوا کچھ نہیں۔ اور جو مسائل ابھی تک یقین اور جزم کی اُس حد تک نہیں پہنچے جس کو مشاہدہ اور بداہت کہا جا سکے مثلاً مسئلۂ "ریرکٹ" تو اُن کے متعلق قرآن عزیز کے مطالب میں تاویلات نہیں کرنی چاہئیں اور خواہ مخواہ اُن کو جدید تحقیقات کے سانچہ میں ڈھالنے کی سعی ہرگز جائز نہیں، بلکہ وقت کا انتظار کرنا چاہیے کہ وہ مسائل اپنی حقیقت کو اس طرح آشکارا کر دیں کہ اُن کے انکار سے مشاہدہ اور بداہت کا انکار لازم آجائے اس لیے کہ حقیقت ہے کہ مباحثِ علمیہ کو تو بارہا اپنی جگہ سے ہٹنا پڑا ہے۔ مگر علوم قرآنی کو کبھی ایک مرتبہ بھی اپنی جگہ سے ہٹنے کی ضرورت پیش نہیں آئی اور جب کبھی مسائل علمیہ بحث و نظر کے بعد یقینیات اور مشاہدات کی حد تک پہنچے ہیں وہ ایک نقطہ بھی اُس سے آگے نہیں گئے جس کو قرآن نے پہلے سے واضح کر دیا ہے۔

البتہ اگر کسی مفسر نے ایک آیت کی ایسی تفسیر کر دی ہے جو اُس مسئلہ کی اصل حقیقت کے خلاف پڑتی ہے تو بلا شبہ اُس کے بیان کردہ معانی کو نظر انداز کر دینا اور آیتِ قرآن کو اصل حقیقت

کے مطابق ظاہر کرنا قرآنِ عزیز کا اپنا مطالبہ ہے جو تعقل، تفکر اور تدبر کی بار بار دعوت سے ظاہر ہوتا ہے۔ أفلا تعقلون، افلا یتدبرون، افلا تتفکرون۔

لیکن ساتھ ہی یہ حقیقت بھی واضح رہے کہ یہ بحث صرف ان ہی مسائل سے متعلق ہے جو تاریخی، جغرافی، اور طبعی حقائق سے تعلق رکھتے ہیں اور قرآنِ عزیز نے اُس حد تک ان کی طرف توجہ کی ہے جس سے اُس کے مقصدِ ارشاد و ہدایت کو مدد مل سکے۔ باقی وہ تمام مسائل جن کا تعلق ایک مسلمان کے "مسلم" ہونے اور عقائد و اعمال کے اعتبار سے اُس کے "مومن" کہلانے سے ہے سو اُن کو قرآنِ عزیز نے حس یقین اور علم حقیقی (وحی الٰہی) کے ذریعہ بیان کر دیا ہے اُن میں مطلق کسی قسم کے تغیر و تبدل کی گنجائش نہیں ہے، اور نہ وہ کسی تحقیق و ریسرچ کے محتاج۔ مثلاً خدا کی ہستی، آخرت کے وجود، ملائکۃ اللہ، تقدیر اور انبیاء و رسل سے متعلق ایمان و اعتقاد یا نماز و روزہ کی اصل حقیقت، حج و زکوٰۃ کے معنی و مفہوم وغیرہ یہ تمام مسائل ایک مسلمان کے لیے مطلق کسی جدید تحقیق کے محتاج نہیں ہیں بلکہ اُن کے حقائق کے متعلق نصوص نے ہم کو دوسروں سے قطعی بے نیاز کر دیا ہے اور اُس کا دیا ہوا علم علم یقین (وحی الٰہی) پر مبنی ہے جو اپنی ابدیت کے ساتھ اٹل اور غیر متبدل ہے۔

(۸) توراۃ و انجیل (بائبل) میں اس قصہ سے متعلق جو واقعات مذکور ہیں مثلاً سانپ اور طاؤس کا قصہ یا اسی قسم کی اور باتیں جو قرآنِ عزیز اور صحیح روایاتِ حدیثی میں نہیں پائی جاتیں اُن کے متعلق کیا حکم ہے؟

یہ سب اسرائیلیات کہلاتی ہیں اور بے اصل ہیں، ان کی پشت پر نہ علم یقین اور علم صحیح (وحی الٰہی) کی سند ہے اور نہ عقل و تاریخ کی شہادت، اس لیے من گھڑت اور بے سرو پا باتیں ہیں بعض مفسرین بھی ایسی روایات کے نقل میں سہل انکاری برتتے ہیں جس سے بہت بڑا نقصان

یہ پیدا ہوتا ہے کہ عوام نہیں بلکہ خواص بھی یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ان روایات کو اسلامی روایات میں دخل ہے اور یہ بھی صحیح روایات کی طرح صحیح اور قابل قبول ہیں۔ اس لیے ازبس ضروری ہے کہ تردید کے ارادہ سے علاوہ تفسیر قرآن میں ہرگز ان کو جگہ نہ دی جائے اور نہ صرف کتب تفسیر و حدیث بلکہ کتب سیرت کو بھی ان سے پاک رکھا جائے۔

(۹) حضرت آدم کے واقعہ میں "ملک" (فرشتہ) اور "جن" کا ذکر بھی آیا ہے۔ یہ دونوں خدائے تعالیٰ کی مستقل مخلوق ہیں یا صرف دو قوتوں کا نام ہے جو قوتِ ملکوتی اور قوتِ شیطانی سے موسوم ہیں؟

فرشتہ قرآن عزیز اور احادیث رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جو کچھ ہم کو بتایا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ ہم "فرشتہ" کی نہ حقیقتِ تخلیقی سے واقف کیے گئے ہیں اور نہ وہ ہم کو نظر آتے ہیں۔ البتہ ہمارے لیے یہ یقین و اعتقاد ضروری قرار دیا گیا ہے کہ ہم ان کے وجود کو تسلیم کریں اور ان کو مستقل مخلوق یقین کریں، اس لیے کہ قرآن عزیز اور احادیث صحیح نے ان میں سے بعض کے ناموں کی تصریح کی ہے اور جنس ملائکہ کی جن صفات کا تذکرہ فرمایا ہے وہ ان کے ایک مستقل مخلوق ہونے کی صراحت کرتی ہیں۔ ذیل کی آیات ان ہی حقائق کو واضح کرتی ہیں۔

قُلْ من کان عدوًّا لجبریل فانہ نزّلہ علی قلبك باذن اللہ (بقرہ)	تو کہہ دے، جو کوئی دشمن ہو جبریل کا سو اس نے تو اتارا ہے یہ کلام تیرے دل پر اللہ کے حکم سے۔
من کان عدوًّا للہ وملٰئکتہ ورسلہ وجبریل ومیکال فان اللہ عدوٌّ للکٰفرین۔	جو کوئی دشمن ہو اللہ کا اور اس کے فرشتوں کا اور اس کے پیغمبروں کا اور جبریل اور میکائیل کا تو اللہ دشمن ہے ان کافروں کا۔
ینزّل الملٰئکۃ بالروح من امرہٖ علی	وہ اتارتا ہے فرشتوں کو بھید دے کر اپنے حکم سے جس پر چاہے اپنے

من یشاء من عبادہ (النحل) — اپنے بندوں میں سے۔

الحمد للہ فاطر السمٰوٰت والارض — سب خوبی اللہ کو ہے جس نے بنائے آسمان اور زمین، جس نے
جاعل الملٰئکۃ رسلاً اولی اجنحۃ — ٹھہرایا فرشتوں کو پیغام لانے والا جن کے پر ہیں دو دو اور تین تین
مثنیٰ و ثلٰث و ربٰع یزید فی الخلق — اور چار چار۔ بڑھا دیتا ہے وہ پیدائش میں وہ جو چاہے۔ بیشک
ما یشاء ان اللہ علیٰ کل شیء قدیر (فاطر) — اللہ ہر چیز کر سکتا ہے۔

تعرج الملٰئکۃ والروح الیہ (المعارج) — پیش ہونگے فرشتے اور روحیں اُس کے آگے۔

والملک علیٰ ارجائہا ویحمل عرش — اور فرشتے ہونگے (قیامت کے دن) اُس (آسمان) کے کناروں پر
ربک فوقھم یومئذٍ ثمانیۃ (الحاقہ) — اور اُٹھائینگے عرش تیرے رب کا اپنے اوپر اُس دن آٹھ (فرشتے)

واذ قال ربک للملٰئکۃ انی جاعلٌ — اور جب کہا تیرے پروردگار نے فرشتوں سے میں بنانے والا
فی الارض خلیفۃ قالوا اتجعل فیہا — ہوں زمین میں خلیفہ تو اُنہوں نے کہا کیا تو اُس میں ایسے کو بنائیگا
من یفسد فیہا (البقرہ) — جو اس زمین میں فساد پھیلائیگا۔

ان آیات کو غور سے پڑھنے کے بعد خود انصاف کیجیے کہ جن ملحدوں نے فرشتوں کے مستقل مخلوق ہونے سے انکار کیا ہے اُن کی باطل تاویلات اور قرآنِ عزیز میں معنوی تحریفات کس حد تک قابل قبول بلکہ قابل ذکر ہیں؟

قرآنِ عزیز میں ملک اور ملائکہ کا ذکر ۸۶ آیات میں ۸۸ مرتبہ آیا ہے۔ جو ذیل کی جدول سے ظاہر ہے:-

نمبر سورۃ	سورۃ	تعداد آیات	نمبر سورۃ	سورۃ	تعداد آیات
۲	البقرہ	۳۰-۳۱-۳۴-۹۸-۱۰۲-۱۶۱-۱۷۷-۲۱۰-۲۴۸-۲۸۵	۴	النساء	۹۷-۱۳۶-۱۶۶-۱۷۲
۳	آل عمران	۱۸-۳۹-۴۲-۴۵-۸۰-۸۷-۱۲۴-۱۲۵	۶	الانعام	۹۸-۵۰-۹۳-۱۱۱-۱۵۸

نمبر سورۃ	سورۃ	تعداد آیات	نمبر سورۃ	سورۃ	تعداد آیات
۷	الاعراف	۱۱-۲۰	۳۵	فاطر	۱
۸	الانفال	۹-۱۲-۵۰	۳۷	الصافات	۱۴۹
۱۱	ہود	۱۲-۳۱	۳۸	صٓ	۷۱-۷۳
۱۲	یوسف	۳۱	۳۹	الزمر	۷۵
۱۳	الرعد	۱۳-۲۳	۴۱	فصلت	۱۴
۱۵	الحجر	۶-۸-۲۸-۳۰	۴۲	الشوریٰ	۵
۱۶	النحل	۲-۲۸-۳۲-۳۳-۴۹	۴۳	الزخرف	۱۹-۵۳-۶۰
۱۷	الاسراء	۴۰-۶۱-۹۲-۹۵	۴۷	محمدؐ	۲۷
۱۸	الکہف	۵۰	۵۳	النجم	۲۶-۲۷
۲۰	طٰہٰ	۱۱۶	۶۶	التحریم	۶۴
۲۱	الانبیاء	۱۰۳	۶۹	الحاقۃ	۱۷
۲۲	الحج	۷۵	۷۰	المعارج	۴
۲۳	المومنون	۲۴	۷۴	المدثر	۳۱
۲۵	الفرقان	۷-۲۱-۲۲-۲۵	۷۸	النباء	۳۸
۳۲	السجدہ	۱۱	۷۹	الفجر	۲۲
۳۳	الاحزاب	۴۳-۵۶	۸۷	القدر	۴
۳۴	سباء	۴۰			

نیز احادیثِ صحیحہ اور قدیم آسمانی کتابوں توراۃ، زبور، انجیل وغیرہ میں بھی فرشتوں کا تذکرہ موجود ہے اور اُن کو

مستقل مخلوق ہی بتایا گیا ہے خصوصاً بخاری اور مسلم کی روایات میں بکثرت اس کی شہادتیں موجود ہیں۔

جن اسی طرح "جن" بھی خدائے تعالیٰ کی مستقل مخلوق ہے جس کی حقیقتِ تخلیق سے ہم پوری طرح آگاہ نہیں ہیں اور نہ عام انسانی آبادی کی طرح وہ ہم کو نظر آتے ہیں، لیکن قرآنِ عزیز نے جو تصریحات اس مخلوق کے متعلق کی ہیں وہ ہمارے لیے ضروری قرار دیتی ہیں کہ ہم یہ اعتقاد اور یقین رکھیں کہ وہ بھی انسان کی طرح مستقل مخلوق ہیں، اور اُسی کی طرح شریعت کے مکلف بھی، اُن میں توالد و تناسل کا بھی سلسلہ ہے اور اُن میں نیک و بد بھی ہیں۔

قرآنِ عزیز کی یہ آیات ان ہی حقائق کو واضح اور ظاہر کرتی ہیں :-

وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون۔ (الذاریات)

اور نہیں پیدا کیا میں نے جن اور انسان کو مگر تاکہ وہ عبادت گذار رہوں۔

قُلْ اُوحِیَ اِلَیَّ اَنَّہٗ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فقالوا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا یَّھْدِیْ اِلَی الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِہٖ وَلَنْ نُّشْرِکَ بِرَبِّنَا اَحَدًا (جن)

اور اے پیغمبر سب لوگوں کو جتادو کہ میرے پاس خدا کی طرف سے اس بات کی وحی آئی ہے کہ جنات میں سے چند شخصوں نے مجھے قرآن پڑھتے سنا اور سننے پیچھے اپنے لوگوں سے جا کر کہا کہ ہم نے عجیب طرح کا قرآن سنا جو نیک راہ دکھاتا ہے سو ہم اس پر ایمان لے آئے اور ہم تو کسی کو اپنے پروردگار کا شریک ٹھہرائینگے نہیں۔

واناّ منا المسلمون ومنا القاسطون (جن)

اور بلاشبہ کچھ ہم میں سے فرمانبردار ہیں اور کچھ بے انصاف

اَنّہٗ یراکم ھو وقبیلہ من حیث لاترونھم (اعراف)

بیشک وہ (شیطان) اور اُس کی ذریات تم کو اُدھر سے دیکھتے ہیں جدھر سے تم اُن کو نہیں دیکھتے۔

وکان من الجن ففسق عن امر ربہ (البقرہ)

اور تھا (ابلیس) جنات میں سے پس نافرمانی کی اُس نے اپنے رب کی

ان آیات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شیطان بھی "جن" ہی کی نسل میں سے ہے اور ابلیس

(شیطان) نے خدائے تعالیٰ کے سامنے یہ اقرار کیا کہ اُس کی تخلیق نار (آگ) سے ہوئی ہے۔

مسطورۂ بالا آیات کے علاوہ لفظِ جن، جان اور جِنّہ بتیس مرتبہ قرآنِ حکیم کی اکتیس آیات میں مذکور ہوئے ہیں جو ذیل کی جدول سے ظاہر ہیں۔

نمبر سورۃ	سورۃ	نمبر آیات	نمبر سورۃ	سورۃ	نمبر آیات
۶	الانعام	۱۰۰-۱۱۲-۱۲۸-۱۳۰	۳۴	السباء	۱۲-۱۴-۴۱
۷	الاعراف	۳۸، ۱۹۷	۳۷	الصافات	۱۵۸
۱۱	ہود	۱۱۹	۴۱	فصلت	۳۵، ۳۶
۱۵	الحجر	۲۷	۴۶	الاحقاف	۱۸، ۲۹
۱۷	الاسراء	۸۸	۵۱	الذاریات	۵۶
۱۸	الکہف	۵۰	۵۵	الرحمٰن	۱۵، ۳۳، ۳۹، ۵۶، ۷۴
۲۷	النمل	۱۷-۳۹	۷۲	الجن	۱-۵-۶
۳۲	السجدہ	۱۳	۱۱۴	الناس	۶

حاصل کلام یہ ہے کہ قرآنِ عزیز اور نبی معصوم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو یہ اطلاع دی ہے کہ "ملائکہ" اور "جن" اگرچہ ہماری ان نگاہوں سے پوشیدہ ہیں لیکن بلاشبہ وہ مستقل مخلوق ہیں، اور حقیقت ہے کہ مشاہدہ میں تو غلطی کا امکان بھی ہے اور بارہا ہوتا رہتا ہے، لیکن "وحی الٰہی" اور "نبی معصوم" کی اطلاع میں غلطی کی مطلق گنجائش نہیں۔ لہٰذا ہمارا ایمان ہے کہ وہ خدا کی مستقل مخلوق ہیں۔ اس کے علاوہ عقلی اعتبار سے بھی ان کا مستقل مخلوق ہونا ناممکن نہیں ہے بلکہ امکان عقلی کے دائرہ میں ہے۔

پس جو چیز عقل کے نزدیک ناممکن نہ ہو اور نقل یعنی "وحی الٰہی" اس کا یقین دلاتی ہو تو اُس کا انکار "علم" اور "حقیقت" کا انکار ہے۔ اور تنگ نظری اور ہٹ دھرمی کی زندہ مثال۔

رہا یہ امر کہ وہ ہمارے مشاہدات و محسوسات سے باہر ہیں اور ہم ان کو نہیں دیکھتے تو یہ بھی انکار کی کوئی معقول وجہ نہیں ہو سکتی اس لیے کہ آج کی دوربینوں اور سائنس کے آلات سے پہلے ہزاروں برس تک ہم کو وہ بہت سی اشیاء نہ محسوس ہوتی تھیں اور نہ آنکھیں اُن کو دیکھ سکتی تھیں، جن کا وجود اُس وقت بھی موجود تھا مگر آج وہ نظر بھی آتی ہیں اور محسوس بھی ہوتی ہیں تو کیا ہزاروں سال پہلے جن لوگوں نے اُن کے وجود کا انکار کیا وہ حقیقی علم پر مبنی تھا یا کوتاہیِ علم اور ذرائع معلومات و تحقیقات سے ناواقفیت کا نتیجہ۔ اسی طرح ہم آج بھی بجلی، مقناطیس اور روشنی کی صحیح حقیقت سے ناآشنا ہیں اور ان کو صرف اُن کے آثار و علامات ہی سے پہچانتے ہیں۔

اسی طرح مادیین اور ملاحدہ کا انکار کسی علم اور یقین پر مبنی نہیں ہے بلکہ محسوسات و مشاہدات میں نہ آنے کی بنا پر "عدم علم" کی وجہ سے ہے جو کسی طرح عدم وجود کی دلیل نہیں بن سکتا۔ نیز علم دو ہی طرح حاصل ہو سکتا ہے ایک علوم و فنون کے ذریعہ جو کسب و اکتساب کا محتاج ہے اور دوسرے موہبت اور عطیۂ الٰہی کی راہ سے اور اس کا سب سے بلند درجہ وحی الٰہی ہے پس اگر کوئی شے علوم و فنون کی راہ سے ہم نہ معلوم کر سکیں مگر عقل اُس کے وجود کو ناممکن نہ سمجھتی ہو اور "وحی الٰہی" اُس کے وجود کا اعلان کرتی ہے تو ہر ذی ہوش اور ذی عقل کا فرض ہے کہ وہ علوم و فنون کی درماندگی کے اعتراف کے ساتھ اُس کو تسلیم کرے۔ البتہ اگر اُس کو اُس اطلاع کے وحی الٰہی ہونے ہی میں انکار ہو یا وہ سرتاسر وحی الٰہی کا ہی منکر ہو تو اب اُس کے لیے اس اطلاع پر ایمان لانے سے قبل اُن دلائل کا مطالعہ ضروری ہے جو اس سلسلہ میں قرآنِ عزیز نے بیان کیے ہیں۔ اور جن میں بتایا گیا ہے کہ وہ بلاشبہ کلام اللہ اور وحی الٰہی ہے۔

قصۂ آدم میں چند اہم عبرتیں

یوں تو حضرت آدم کے واقعہ میں بے شمار نصائح، عبرتیں، اور مسائل کا ذخیرہ موجود ہے، اور اُن کا احاطہ اس مقام پر ناممکن ہے۔ تاہم چند اہم عبرتوں کی جانب

اشارہ کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

۱۔ اللہ تعالیٰ کی حکمتوں کے بھید بے شمار اور ان گنت ہیں اور یہ ناممکن ہے کہ کوئی ہستی بھی خواہ وہ کتنی ہی مقربین بارگاہِ الٰہی میں سے کیوں نہ ہو ان تمام بھیدوں پر واقف ہو جائے اسی لیے ملائکۃ اللہ انتہائی مقرب ہونے کے باوجود خلافتِ آدم کی حکمت سے آشنا نہ ہو سکے اور جب تک معاملہ کی پوری حقیقت سامنے نہ آگئی وہ حیرت ہی میں غرق رہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کی عنایت و توجہ اگر کسی حقیر شے کی جانب بھی ہو جائے تو وہ بڑے سے بڑے مرتبہ اور جلیل القدر منصب پر فائز ہو سکتی اور خلعتِ شرف و مجد سے نوازی جا سکتی ہے۔ ایک مشتِ خاک کو دیکھیے اور پھر "خلیفۃ اللہ" کے منصب پر نظر ڈالیے اور پھر اُس کے منصبِ نبوت و رسالت کو ملاحظہ فرمائیے۔ مگر اُس کی توجہ کا فیضان بخت و اتفاق سے یا خالی از حکمت نہیں ہوتا بلکہ اُس شے کی استعداد کے مناسب بے نظیر حکمتوں اور مصلحتوں کے نظام سے منظم ہوتا ہے۔

۳۔ انسان کو اگرچہ ہمہ قسم کا شرف عطا ہوا اور ہر طرح کی جلالت و بزرگی نصیب ہوئی تاہم اُس کی خلقی اور طبعی کمزوری اپنی جگہ اُسی طرح قائم رہی، اور بشریت و انسانیت کا وہ نقص پھر بھی باقی رہا یہی وہ چیز تھی جس نے حضرتِ آدم پر بایں جلالتِ قدر و منصبِ عظیم نسیان طاری کر دیا، اور وہ ابلیس کے وسوسہ سے متاثر ہو گئے۔

۴۔ خطا کار ہونے کے باوجود اگر انسان کا دل ندامت و توبہ کی طرف مائل ہو تو اُس کے لیے بابِ رحمت بند نہیں ہے اور اُس درگاہ تک رسائی میں نا اُمیدی کی تاریک گھاٹی نہیں پڑتی، البتہ خلوص اور صداقت شرط ہے۔ اور جس طرح حضرتِ آدم (علیہ السلام) کے نسیان و لغزش کا عفو اسی دامن سے وابستہ ہے اسی طرح اُن کی تمام نسل کے لیے بھی

عفو و رحمت عام کا دامن وسیع ہے۔

قُل یا عبادی الذین اسرفوا	کہہ دے اے میرے وہ بندو جو اپنے نفسوں کے بارہ
علیٰ انفسهم لا تقنطوا من	میں حد سے گذر گئے ہو (گناہ کر کے نفسوں پر ظلم کیا ہے)
رحمة الله ان الله یغفر	تم اللہ کی رحمت سے نا اُمید نہ ہو بیشک اللہ سب
الذنوب جمیعا انه هو الغفور	گناہوں کو بخش دینے والا ہے۔ بیشک وہ بخشنے والا
الرحیم ۔ (الزمر)	رحم کرنے والا ہے۔

(۵) بارگاہِ الٰہی میں گستاخی یا بغاوت بڑی سے بڑی نیکی اور بھلائی کو بھی تباہ کر دیتی، اور ابدی ذلت و خسران کا باعث بنجاتی ہے۔ ابلیس کا واقعہ عبرتناک واقعہ ہے اور اُس کی ہزاروں سال کی عبادت گذاری کا جو حشر بارگاہِ الٰہی میں گستاخی اور بغاوت کی وجہ سے ہوا وہ بلاشبہ سرمایہ صد ہزار عبرت ہے۔

فاعتبروا یا اولی الابصار ۔ پس عبرت حاصل کرو اے چشم عبرت رکھنے والو

قابیل و ہابیل

اِن دونوں کا واقعہ بھی چونکہ حضرت آدم (علیہ السلام) کے واقعہ کا ایک حصّہ ہے اس لیے یہاں قابلِ ذکر ہے۔

قرآنِ عزیز نے حضرت آدم کے ان دونوں صاجزادوں کا نام ذکر نہیں کیا صرف "ابنی ادمؑ" کہہ کر مجمل چھوڑ دیا ہے۔ البتہ توراۃ میں ان کے یہی نام بیان کیے گئے ہیں جو عنوان میں درج ہیں۔ ان کے واقعہ کے متعلق حافظِ حدیث عماد الدین بن کثیر نے اپنی تاریخ

ؔ آدم کے دو بیٹے۔

میں سُدّی سے سند کے ساتھ ایک روایت نقل کی ہے جو حضرت عبداللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) اور بعض دوسرے صحابہ (رضی اللہ عنہم) سے منقول ہے۔ اُس کا مضمون یہ ہے۔

دنیائے انسانی میں اضافہ کے لیے حضرتِ آدم کا یہ دستور تھا کہ حوا سے توام (جوڑیا) پیدا ہونے والے لڑکے اور لڑکی کا عقد دوسرے پیٹ سے پیدا ہونے والے توام بچوں کے ساتھ کر دیا کرتے تھے۔ اسی دستور کے مطابق قابیل اور ہابیل کی شادی کا معاملہ پیش تھا۔ قابیل عمر میں بڑا تھا اور اُس کی ہمشیر ہابیل کی ہمشیر سے زیادہ حسین و خوبرو تھی۔ اس لیے قابیل کو یہ انتہائی ناگوار تھا کہ دستور کے مطابق ہابیل کی ہمشیر سے اُس کی شادی ہو اور ہابیل کی اُس کی ہمشیر سے۔ معاملہ کو ختم کرنے کے لیے حضرت آدم نے یہ فیصلہ فرمایا کہ دونوں اپنی اپنی قربانی حق تعالیٰ کی جناب میں پیش کریں، جس کی قربانی منظور ہو جائے وہی اپنے ارادہ کے پورا کر لینے کا مستحق ہو۔

جیسا کہ توراۃ سے معلوم ہوتا ہے اُس زمانہ میں قربانی (نذر) کی قبولیت کا یہ الہامی دستور تھا کہ نذر و قربانی کی چیز کسی بلند جگہ پر رکھ دی جاتی تھی اور آسمان سے آگ نمودار ہو کر اُس کو جلا دیتی تھی۔ اس قانون کے مطابق ہابیل نے اپنے ریوڑ میں سے ایک بہترین دُنبہ خدا کی نذر کیا اور قابیل نے اپنی کھیتی کے غلہ میں سے ردی قسم کا غلّہ قربانی کے لیے پیش کیا، دونوں کی حُسنِ نیت اور نیتِ بد کا اندازہ اسی عمل سے ہو گیا۔ لہٰذا حسب دستور آگ نے آکر ہابیل کی نذر کو جلا دیا اور اس طرح قبولیت کا شرف اُس کے حصہ میں آیا۔

قابیل اپنی اس توہین کو کسی طرح برداشت نہ کر سکا اور اُس نے غیظ و غضب میں آکر ہابیل سے کہا کہ میں تجھ کو قتل کیے بغیر نہ چھوڑونگا تاکہ تو اپنی مراد کو نہ پہنچ سکے، ہابیل نے جواب دیا میں تو کسی طرح تجھ پر ہاتھ نہیں اُٹھاؤنگا، باقی تیری جو مرضی آئے وہ کر، رہا قربانی کا معاملہ سو خدا کے یہاں تو نیک نیت ہی کی نذر قبول ہو سکتی ہے، وہاں بدنیت کی نہ دھمکی کام آسکتی

ہے اور نہ بے وجہ کا غم وغصہ۔ قابیل پر اس نصیحت کا اُلٹا اثر پڑا اور اُس نے غصہ سے مشتعل ہو کر اپنے بھائی ہابیل کو قتل کر دیا۔[1]

مگر قرآنِ عزیز میں شادی کا قصہ مذکور نہیں ہے، صرف قربانی (نذر) کا ذکر ہے اور اس روایت سے زاید ہابیل کی نعش کے دفن کے متعلق یہ اضافہ ہے۔

قتل کے بعد قابیل حیران تھا کہ اس نعش کا کیا کرے، ابھی تک نسلِ آدم موت سے دوچار نہیں ہوئی تھی اور اسی لیے حضرت آدم نے مردہ کے بارہ میں کوئی حکم الٰہی نہیں سُنایا تھا۔ یکایک اُس نے دیکھا کہ ایک کوّے نے زمین کُرید کرید کر گڑھا کھودا قابیل کو تنبہ ہوا کہ مجھے بھی اپنے بھائی کے لیے اسی طرح گڑھا کھودنا چاہیے۔ اور بعض روایات میں ہے کہ کوّے نے ایک دوسرے مُردہ کوّے کو اُس گڑھے میں چھپا دیا۔

قابیل نے یہ دیکھا تو اپنی ناکارہ زندگی پر بیحد افسوس کیا اور کہنے لگا کہ میں اس حیوان سے بھی گیا گذرا ہوں کہ اپنے اس جرم کو چھپانے کی بھی اہلیت نہیں رکھتا۔ ندامت سے سر جُھکا لیا اور پھر اُسی طرح اپنے بھائی کی نعش کو سپردِ خاک کر دیا۔

واتل علیھم نبأ ابنی اٰدم بالحق اذ	اور سُنا اُن کو حالِ واقعی آدم کے دو بیٹوں کا جب نذر کی
قرّبا قربانًا فتقبّل من احدھما	دونوں نے کچھ نذر اور مقبول ہوئی ایک کی اور نہ مقبول
ولم یتقبّل من الاٰخر قال لاقتلنك	ہوئی دوسرے کی، کہا: میں تجھ کو مار ڈالونگا، وہ بولا اللہ
قال انما یتقبّل اللہ من المتقین	قبول کرتا ہے پرہیزگاروں سے، اگر تو ہاتھ چلاویگا مجھ پر
لئن بسطتَ الیّ یدك لتقتلنی	مارنے کو میں نہ ہاتھ چلاؤنگا تجھ پر مارنے کو، میں ڈرتا ہوں
ما انا بباسطٍ یدی الیك لاقتلك	اللہ سے جو پروردگار ہے سب جہان کا، میں چاہتا
انّی اخاف اللہ رب العٰلمین انی	ہوں کہ (اس اقدام پر) تو میرا گناہ بھی حاصل کرے

[1] البدایۃ والنہایۃ جلد ۱ ص ۹۳

اريد ان تبوء باثمي و اثمك فتكون
من اصحاب النار وذلك جزاء
الظلمين فطوعت له نفسه قتل اخيه
فقتله فاصبح من الخاسرين فبعث
الله غرابا يبحث في الارض ليريه
كيف يواري سوأة اخيه قال
يا ويلتى اعجزت ان اكون مثل هذا
الغراب فأواري سوأة اخي فاصبح
من الندمين من اجل ذلك كتبنا
على بني اسرائيل انه من قتل نفسا
بغير نفس او فساد في الارض فكانما
قتل الناس جميعا ومن احياها
فكانما احيا الناس جميعا (مائدہ)

اور اپنا گناہ بھی پھر ہو جائے تو دوزخ والوں میں سے۔
اور یہی سزا ہے ظالموں کی۔ پس اس کو راضی کیا اس
کے نفس نے خون پر اپنے بھائی کے پھر اس کو مار ڈالا
سو ہو گیا نقصان اٹھانے والوں میں۔ پھر بھیجا اللہ نے
ایک کوا جو کریدتا تھا زمین کو تاکہ اس کو دکھلاوے کس
طرح چھپاتا ہے لاش اپنے بھائی کی۔ بولا ہائے افسوس
مجھ سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ اس کوے جیسا ہی ہوتا کہ چھپا
لیتا لاش اپنے بھائی کی۔ پھر لگا پچھتانے۔
اسی سبب سے لکھا ہم نے بنی اسرائیل پر کہ جو کوئی قتل
کرے ایک جان کو بلا عوض جان کے یا بغیر فساد
کرنے کے ملک میں تو گویا قتل کر ڈالا اس نے سب
لوگوں کو اور جس نے زندہ رکھا ایک جان کو تو گویا زندہ
کر دیا سب لوگوں کو۔

امام احمد نے اپنی مسند میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ایک روایت کی ہے

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم
لا تقتل نفس ظلما الا كان على
ابن آدم الاول كفل من دمها
لانه كان اول من سن القتل
(مسند احمد)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دنیا میں
جب بھی کوئی ظلم سے قتل ہوتا ہے تو اس کا گناہ
حضرت آدم کے پہلے بیٹے (قابیل) کی گردن پر
ضرور ہوتا ہے اس لیے کہ وہ پہلا شخص ہے جس نے
ظالمانہ قتل کی ابتدا کی اور یہ ناپاک سنت جاری کی۔

دمشق کے شمال میں جبل قاسیون پر ایک زیارتگاہ بنی ہوئی ہے جو مقتل ہابیل کے نام سے مشہور ہے۔ اور اس کے متعلق ابن عساکرؒ نے احمد بن کثیر کے تذکرہ میں اُن کا ایک خواب بھی نقل کیا ہے جس میں مذکور ہے کہ انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا اور آپ کے ساتھ ہابیل بھی تھے۔ ہابیل نے بقسم کہا کہ میرا مقتل یہی ہے۔ اور آپ نے اُن کے قول کی تصدیق فرمائی۔ بہرحال یہ خواب ہی کی باتیں ہیں اور خواب کے سچے ہونے کے باوجود بھی اُس سے کوئی شرعی یا تاریخی حکم ثابت نہیں ہوسکتا۔

مقامِ عبرت | سورۂ مائدہ کی بیان کردہ آخری آیت اور مسطورۂ بالا حدیث ہم پر یہ حقیقت آشکارا کرتی ہے کہ انسان کو اپنی زندگی میں ہرگز کسی گناہ کی ایجاد نہ کرنی چاہیے تاکہ وہ کل کو بدکاروں اور ظالموں کے لیے ایک نئے حربہ کا کام نہ دے۔ ورنہ نتیجہ یہ ہوگا کہ کائنات میں جو شخص بھی آئندہ اس "بدعت" کا اقدام کریگا تو بانی بدعت بھی برابر اُس گناہ کا حصہ دار بنتا رہیگا، اور موجد ہونے کی وجہ سے ابدی ذلت وخسران کا مستحق ٹھہریگا۔ گناہ بہرحال گناہ ہے لیکن گناہ کی ایجاد موجد کے لیے ہمیشہ ہمیشہ کا وبال سر سے باندھ دیتی ہے۔

۲۔ ہابیل خدائے تعالیٰ کا مقبول بندہ تھا اور قابیل بارگاہِ الٰہی کا راندہ ہوا، اس لیے ضرورت تھی کہ ہابیل کے پاک جسم کی توہین نہ ہو، اور نسلِ آدم کی کرامت وبزرگی قائم رکھنے کے لیے بعد مُردن "تدفین" کی سُنّت قائم ہوجائے۔ اور تقاضائے انصاف تھا کہ قابیل کی اس کمینہ حرکت پر اُس کو دنیا میں بھی ذلیل کیا جائے، اور اس قابل بنا دیا جائے کہ خود اُس کو اپنی مانگی عقل ودانش اور کمینگی کا احساس ہوجائے اس لیے نہ اُس کو الہام بخشا گیا اور نہ اس کمینہ حرکت کو چھپانے کے لیے عقل کی روشنی عطا کی گئی بلکہ ایک ایسے حیوان کو اُس کا رہنما بنایا گیا جو عیاری ومکاری میں طاق اور دنائتِ طبع میں ضرب المثل ہے، اور آخر کار قابیل کو یہ

کہتے ہی بنا۔

یا ویلتا اعجزت ان اکون	ہائے افسوس کیا میں ایسا گیا گذرا ہوگیا کہ اس
مثل ھذا الغراب۔	کوّے جیسا بھی نہ بن سکا۔

نوٹ:۔ارباب سیر و تاریخ کی عام روش یہ ہے کہ وہ حضرت آدم کے بعد حضرت ادریس کا ذکر کرتے ہیں اور حضرت نوح کا اس کے بعد، مگر ہم نے اُن اختلافات کے پیش نظر جو حضرت ادریس سے متعلق عنقریب ذکر ہونے والے ہیں عام روش کے خلاف اُن کا تذکرہ حضرت نوح کے تذکرہ کے بعد کیا ہے تاہم جن ارباب ذوق کو یہ گراں گذرے وہ حضرت آدم کے تذکرہ کے بعد حضرت ادریس کے تذکرہ کا مطالعہ کریں اور پھر حضرت نوح علیہ السلام کا۔

حضرت نوح علیہ السّلام

حضرت نوح پہلے رسول ہیں۔ نسب نامہ۔ قرآن عزیز میں حضرت نوح کا تذکرہ۔ قوم نوح۔ دعوت و تبلیغ اور قوم کی نافرمانی۔ بنارِ سفینہ۔ پسر نوح۔ کوہِ جودی۔ طوفانِ نوح عام تھا یا خاص۔ پسر نوح کی نسبی بحث۔ ایک اخلاقی مسئلہ۔ چند ضمنی مسائل۔

حضرت نوح (علیہ السلام) پہلے رسول ہیں

حضرت آدم (علیہ السلام) کے بعد یہ پہلے نبی ہیں جن کو "رسالت[1]" سے نوازا گیا۔ صحیح مسلم باب شفاعت میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک طویل روایت ہے، اُس میں یہ تصریح ہے۔

یا نوح انت اول الرسل الی الارض — اے نوح تو زمین پر سب سے پہلا رسول بنایا گیا

نسب نامہ

علم الانساب کے ماہرین نے حضرت نوح کا نسب نامہ اس طرح بیان کیا ہے۔

نوح بن لامک بن متوشلح بن اخنوخ یا خنوخ بن یارُدْ بن مہلئیل بن قینان ابن انوش بن شیث (علیہ السلام) بن آدم (علیہ السلام)

اگرچہ مورخین اور تورات (سفر تکوین) نے اسی کو صحیح مانا ہے لیکن ہم کو اس کی صحت میں شک اور تردد ہے، بلکہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت آدم (علیہ السلام) اور حضرت نوح علیہ السلام کے درمیان ان بیان کردہ سلسلوں سے زیادہ سلسلے ہیں۔ تورات میں خلقِ آدم (علیہ السلام) اور ولادت حضرت نوح (علیہ السلام) نیز وفاتِ آدم اور ولادتِ نوح کی درمیانی

---

[1] جس انسان پر خدا کی "وحی" نازل ہوتی ہے وہ "نبی" ہے۔ اور جس کو جدید شریعت بھی عطا کی گئی ہو وہ "رسول" ہے۔

مدت کا جو تذکرہ ہے ہم اُس کو بھی نقل کر دینا مناسب سمجھتے ہیں۔ البتہ یہ بات پیشِ نظر رہے کہ تورات کے عبرانی، سامی، اور یونانی زبان کے نسخوں میں بہت زیادہ اختلاف ہے اور اس مبحث پر علامہ شیخ رحمۃ اللہ ہندی (کیرانہ ضلع مظفر نگر) کی مشہور کتاب "اظہارِ حق" قابلِ مطالعہ ہے۔ بہرحال توراۃ سے منقول نقشہ حسبِ ذیل ہے:-

سال	عمر بوقت پیدائشِ ابن	سال	عمر بوقت پیدائشِ ابن
۱۳۰	عمرِ آدم بوقت ولادت شیث	۶۵	عمرِ اخنوخ بوقت پیدائشِ متوشالح
۱۰۵	″ شیث ″ انوش	۱۸۷	″ متوشالح ″ لامک
۹۰	″ انوش قینان	۱۸۲	″ لامک ″ نوح
۷۰	″ قینان ″ مہلئیل	۱۰۵۶	مدت درمیان خلقِ آدم و ولادت نوح
۶۵	″ مہلئیل ″ یارد	۹۳۰	مجموعی عمرِ آدم علیہ السلام
۱۶۲	″ یارد ″ اخنوخ	۱۰۲۶	مابین وفات آدم و ولادت نوحؑ

قرآنِ عزیز میں حضرت نوحؑ کا تذکرہ

قرآنِ عزیز کے معجزنما نظمِ کلام کی یہ سُنت ہے کہ وہ تاریخی واقعات میں سے جب کسی واقعہ کو بیان کرتا ہے تو اپنے اصل مقصد "وعظ و تذکیر" کے پیشِ نظر واقعہ کی اُسی قدر جزئیات کو نقل کرتا ہے جو مقصد کے لیے ضروری ہیں اور اجمال و تفصیل اور تکرار و عدم تکرارِ واقعہ میں بھی صرف ایک ہی مقصد اُس کے سامنے ہوتا ہے اور وہ یہی موعظت و عبرت کا مقصد ہے۔ چنانچہ اسی اسلوبِ بیان کے مطابق قرآنِ عزیز نے حضرت نوح علیہ السلام کے واقعہ کا اجمالی و تفصیلی ذکر تینتالیس جگہ کیا گیا ہے۔ جس کا ثبوت مسطورۂ ذیل جدول سے ہوتا ہے۔

سورة	آیت	سورة	آیت	سورة	آیت
آل عمران	۲۳	مریم	۵۸	غافر	۵، ۳۱
النساء	۱۶۳	الانبیاء	۷۶	الشوریٰ	۱۳
انعام	۸۴	الحج	۴۲	قٓ	۱۲
اعراف	۵۹، ۶۹	المومنون	۲۳	الذاریات	۴۶
التوبہ	۷۰	الفرقان	۳۷	النجم	۵۲
یونس	۷۱	الشعراء	۱۰۵، ۱۰۶، ۱۱۶	القمر	۹
ہود	۲۵، ۳۲، ۳۶، ۴۲	العنکبوت	۱۴	الحدید	۲۶
	۴۵، ۴۶، ۴۸، ۸۹	الاحزاب	۷۰	التحریم	۱۰
ابراہیم	۹	الصافات	۷۵، ۷۹	نوح	۱، ۲۱، ۲۶
الاسراء	۳ - ۱۷	ص	۱۲	-	۰

لیکن اس واقعہ کی اہم تفصیلات صرف سورۂ اعراف، ہود، مومنون، شعراء، قمر اور سورۂ نوح ہی میں بیان ہوئی ہیں۔ اِن سے حضرت نوحؑ اور ان کی قوم کے متعلق جس قسم کی تاریخ بنتی ہے وہی ہمارا موضوعِ بیان ہے۔

قومِ نوح حضرتِ نوحؑ کی بعثت سے پہلے تمام قوم خدا کی توحید اور صحیح مذہبی روشنی سے یکسر ناآشنا ہو چکی تھی اور حقیقی خدا کی جگہ خود ساختہ بتوں نے لے لی تھی، غیر اللہ کی پرستش اور اصنام پرستی ان کا شعار تھا۔

دعوت و تبلیغ اور قوم کی نافرمانی آخر سنت اللہ کے مطابق اُن کے رُشد و ہدایت کے لیے بھی اُن ہی میں سے ایک ہادی اور خدا کے سچے رسول نوح (علیہ السلام) کو معبوث کیا گیا۔

حضرت نوحؑ نے اپنی قوم کو راہِ حق کی طرف پکارا اور سچے مذہب کی دعوت دی، لیکن

قوم نے نہ مانا اور نفرت وحقارت کے ساتھ انکار پر اصرار کیا۔ امراء و رؤسائے قوم نے اُن کی تکذیب و تحقیر کا کوئی پہلو نہ چھوڑا اور اُن کے پیروؤں نے اُن ہی کی تقلید و پیروی کے ثبوت میں ہر قسم کی تذلیل و توہین کے طریقوں کو حضرتِ نوحؑ پر آزمایا، انہوں نے اس بات پر تعجب کا اظہار کیا کہ جس کو نہ ہم پر دولت و ثروت میں برتری حاصل ہے اور نہ وہ انسانیت کے رتبہ سے بلند "فرشتہ ہیکل" ہے، اُس کو کیا حق ہے کہ وہ ہمارا پیشوا بنے، اور ہم اُس کے احکام کی تعمیل کریں؟

وہ غریب اور کمزور افرادِ قوم کو جب حضرتِ نوح علیہ السلام کا تابع اور پیرو دیکھتے تو مغرورانہ انداز میں حقارت سے کہتے "ہم ان کی طرح نہیں ہیں کہ تیرے تابع فرمان بن جائیں اور تجھ کو اپنا مقتدا مان لیں"۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ کمزور اور پست لوگ نوح (علیہ السلام) کے اندھے مقلد ہیں، نہ یہ ذی رائے ہیں کہ ہماری طرح اپنی جانچی پرکھی رائے سے کام لیتے، اور نہ ذی شعور ہیں کہ حقیقتِ حال کو سمجھ لیتے۔ اور اگر وہ حضرتِ نوح کی بات کی طرف کبھی توجہ بھی دیتے تو اُن سے اصرار کرتے کہ پہلے ان پست اور غریب افرادِ قوم کو اپنے پاس سے نکال دے، تب ہم تیری بات سُنینگے کیونکہ ہم کو اُن سے گھن آتی ہے، اور ہم اور یہ ایک جگہ نہیں بیٹھ سکتے۔"

حضرت نوحؑ اس کا ایک ہی جواب دیتے کہ ایسا کبھی نہ ہوگا کیونکہ یہ خدا کے مخلص بندے ہیں۔ اگر میں ان کے ساتھ ایسا معاملہ کروں جس کے تم خواہشمند ہو تو خدا کے عذاب سے میرے لیے کوئی جائے پناہ نہیں ہے، میں اُس کے دردناک عذاب سے ڈرتا ہوں، اُس کے یہاں اخلاص کی قدر ہے، امیر و غریب کا وہاں کوئی سوال نہیں ہے۔ نیز ارشاد فرماتے کہ میں تمہارے پاس خدا کی ہدایت کا پیغام لے کر آیا ہوں نہ میں نے غیب دانی کا دعویٰ کیا ہے اور نہ فرشتہ ہونے کا۔ خدا کا برگزیدہ پیغمبر اور رسول ہوں اور دعوت و ارشاد میرا مقصد و نصب العین ہے۔ اس کو سرمایہ دارانہ بلندی، غیب دانی، یا فرشتہ ہیکل ہونے سے کیا واسطہ؟ یہ کمزور و نادار افرادِ قوم جو خدا پر سچے دل سے ایمان

لائے ہیں تمہاری نگاہ میں اس لیے حقیر و ذلیل ہیں کہ وہ تمہاری طرح صاحبِ دولت و مال نہیں ہیں، اور اسی لیے تمہارے خیال میں یہ نہ خیر حاصل کر سکتے ہیں اور نہ سعادت، کیونکہ یہ دونوں چیزیں دولت و حشمت کے ساتھ ہیں نہ کہ نکبت و افلاس کے ساتھ۔

سو واضح رہے کہ خدا کی سعادت و خیر کا قانون ظاہری دولت و حشمت کے تابع نہیں ہے اور نہ اُس کے یہاں سعادت و ہدایت کا حصول و ادراک سرمایہ کی رونق کے زیر اثر ہے، بلکہ اس کے برعکس طمانیتِ نفس، رضاءِ الٰہی، غناءِ قلب، اور اخلاصِ نیت و عمل پر موقوف ہے۔

حضرت نوحؑ نے یہ بھی بارہا تنبیہ کی کہ مجھ کو اپنی اس ابلاغِ دعوت و ارسالِ ہدایت میں نہ تمہارے مال کی خواہش ہے نہ جاہ و منصب کی میں اُجرت کا طلبگار نہیں ہوں، اس خدمت کا حقیقی اجر و ثواب تو اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے، اور وہی بہترین قدر دان ہے۔

غرض سورۂ ہود حق و تبلیغ کے ان تمام مکالموں، مناظروں اور پیغاماتِ حق کے ان ہی ارشاداتِ عالیہ کا ایک غیر فانی ذخیرہ ہے۔

فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَوْمِهِ مَا نَرَاكَ إِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرَاكَ اتَّبَعَكَ إِلَّا الَّذِينَ هُمْ أَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّأْيِ وَمَا نَرَىٰ لَكُمْ عَلَيْنَا مِن فَضْلٍ بَلْ نَظُنُّكُمْ كَاذِبِينَ ۝ قَالَ يَا قَوْمِ أَرَأَيْتُمْ إِن كُنتُ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّي وَآتَانِي رَحْمَةً مِّنْ عِندِهِ فَعُمِّيَتْ

اس پر قوم کے اُن سرداروں نے جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی بھی کہا "ہم تو تم میں اس کے سوا کوئی بات نہیں دیکھتے کہ ہماری ہی طرح کے ایک آدمی ہو اور جو لوگ تمہارے پیچھے چلے ہیں اُن میں بھی اُن لوگوں کے سوا کوئی دکھائی نہیں دیتا جو ہم میں ذلیل و حقیر ہیں اور بے سوچے سمجھے تمہارے پیچھے ہو لیے ہیں۔ ہم تو تم لوگوں میں اپنے سے کوئی برتری نہیں پاتے۔ بلکہ سمجھتے ہیں کہ تم جھوٹے ہو"۔ نوح نے کہا "اے میری قوم کے لوگو تم نے اس بات پر بھی غور کیا کہ اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے ایک دلیل روشن پر ہوں

عَلَيْكُمْ ۖ أَنُلْزِمُكُمُوهَا وَأَنْتُمْ
لَهَا كَارِهُونَ ۝ وَيَا قَوْمِ لَا أَسْأَلُكُمْ
عَلَيْهِ مَالًا ۖ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا
عَلَى اللَّهِ ۚ وَمَا أَنَا بِطَارِدِ
الَّذِينَ آمَنُوا ۚ إِنَّهُمْ مُلَاقُوا
رَبِّهِمْ وَلَٰكِنِّي أَرَاكُمْ قَوْمًا
تَجْهَلُونَ ۝ وَيَا قَوْمِ مَنْ يَنْصُرُنِي
مِنَ اللَّهِ إِنْ طَرَدْتُهُمْ ۚ أَفَلَا
تَذَكَّرُونَ ۝ وَلَا أَقُولُ لَكُمْ
عِنْدِي خَزَائِنُ اللَّهِ وَلَا أَعْلَمُ
الْغَيْبَ وَلَا أَقُولُ إِنِّي مَلَكٌ
وَلَا أَقُولُ لِلَّذِينَ تَزْدَرِي
أَعْيُنُكُمْ لَنْ يُؤْتِيَهُمُ اللَّهُ خَيْرًا ۖ
اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا فِي أَنْفُسِهِمْ ۖ
إِنِّي إِذًا لَمِنَ الظَّالِمِينَ ۝

اور اُس نے اپنے حضور سے ایک رحمت بھی مجھے بخش دی ہو (یعنی راہِ حق
دکھا دی ہو) مگر وہ تمہیں دکھائی نہ دے، تو (میں اسکے سوا کیا کرسکتا ہوں
جو کر رہا ہوں ؟) کیا ہم جبراً تمہیں راہ دکھا دیں، حالانکہ تم اُس سے
بیزار ہو۔ لوگو! یہ جو کچھ میں کر رہا ہوں، تو اس پر مال و دولت کا تم سے
طالب نہیں۔ میری خدمت کی مزدوری جو کچھ ہے، صرف اللہ پر ہے
اور یہ بھی سمجھ لو کہ جو لوگ ایمان لائے ہیں (وہ تمہاری نظروں میں کتنے
ہی ذلیل ہوں مگر) میں ایسا کرنیوالا نہیں کہ اپنے پاس سے انہیں نکال دوں
اُنہیں بھی اپنے پروردگار سے (ایک دن) ملنا ہے (اور وہ ہم سب کے اعمال
کا حساب لینے والا ہے) لیکن (میں تمہیں سمجھاؤں تو کس طرح سمجھاؤں)
میں دیکھتا ہوں کہ تم ایک جماعت ہو (حقیقت سے) جاہل۔ اے میری
قوم کے لوگو! مجھے بتاؤ، اگر میں ان لوگوں کو اپنے پاس سے نکال باہر
کروں (اور اللہ کی طرف سے مواخذہ ہو جس کے نزدیک معیارِ قبولیت
ایمان و عمل ہے، نہ تمہاری گھڑی ہوئی شرافت و رذالت) تو اللہ کے مقابلہ
میں کون ہے جو میری مدد کریگا؟ (افسوس تم پر!) کیا تم غور نہیں کرتے؟
"اور دیکھو، میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں نہ
یہ کہتا ہوں کہ میں غیب کی باتیں جانتا ہوں، نہ میرا یہ دعویٰ ہے کہ
میں فرشتہ ہوں میں یہ بھی نہیں کہتا کہ جن لوگوں کو تم حقارت کی
نظر سے دیکھتے ہو، اللہ اُنہیں بھلائی نہیں دیگا۔ (جیسا کہ تمہارا
اعتقاد ہے) اللہ ہی بہتر جانتا ہے جو کچھ ان لوگوں کے دلوں میں ہے

اگر میں تمہاری خواہش کے مطابق ایسا کہوں، تو جونہی ایسی بات کہی میں ظالموں میں سے ہو گیا!"

بہرحال حضرتِ نوحؑ نے انتہائی کوشش کی کہ بدبخت قوم سمجھ جائے اور رحمتِ الٰہی کی آغوش میں آجائے مگر قوم نے نہ مانا اور جس قدر اس جانب سے تبلیغِ حق میں جد و جہد ہوئی اسی قدر قوم کی جانب سے بغض و عناد میں سرگرمی کا اظہار ہوا، اور ایذا رسانی اور تکلیف دہی کے تمام وسائل کا استعمال کیا گیا اور اُن کے بڑوں نے عوام سے صاف صاف کہہ دیا کہ تم کسی طرح وَدّ، سُواع، یغوث یعوق اور نسر جیسے بتوں کی پرستش کو نہ چھوڑو۔

یہی وہ مباحث ہیں جن کو سورۂ نوح میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اور جو بلاشبہ ہدایت و ضلالت کے مہم مسائل کو آشکارا کرتے ہیں۔

اِنَّآ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖٓ اَنْ اَنْذِرْ قَوْمَكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيْعُوْنِ ۝ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُؤَخِّرْكُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ اِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ اِذَا جَاۗءَ لَا يُؤَخَّرُ ۘ لَوْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ قَالَ رَبِّ اِنِّىْ دَعَوْتُ قَوْمِيْ لَيْلًا وَّنَهَارًا ۝ فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَاۗءِيْٓ	ہم نے بھیجا نوح کو اُس کی قوم کی طرف کہ ڈرا اپنی قوم کو اس سے پہلے کہ پہنچے اُن پر عذاب دردناک۔ بولا اے قوم میری میں تم کو ڈر سُناتا ہوں کھول کر کہ بندگی کرو اللہ کی، اور اُس سے ڈرو اور میرا کہا مانو۔ تاکہ بخشے وہ تم کو کچھ گناہ تمہارے اور ڈھیل دے تم کو ایک مقرر وعدہ تک۔ وہ جو وعدہ کیا ہے اللہ نے جب آپہنچیگا اُس کو ڈھیل نہ ہوگی اگر تم کو سمجھ ہے۔ بولا اے رب میں بلاتا رہا اپنی قوم کو رات اور دن پھر میرے بلانے سے اور زیادہ بھاگنے لگے۔

اِلَّا فِرَارًاo وَاِنِّیْ کُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْٓا اَصَابِعَهُمْ فِیْٓ اٰذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا ثِیَابَهُمْ وَاَصَرُّوْا وَاسْتَکْبَرُوا اسْتِکْبَارًاo ثُمَّ اِنِّیْ دَعَوْتُهُمْ جِهَارًاo ثُمَّ اِنِّیْٓ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَاَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًاo فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّکُمْ اِنَّهٗ کَانَ غَفَّارًاo (نوح)	اور میں نے جب کبھی اُن کو بلایا تاکہ تو اُن کو بخشے ڈالنے لگے انگلیاں اپنے کانوں میں، اور پیٹنے لگے اپنے اوپر کپڑے، اور ضد کی اور غرور کیا بڑا غرور۔ پھر میں نے اُن کو بلایا برملا۔ پھر میں نے اُن کو کھول کر کہا اور چھپ کر کہا چپکے سے۔ تو میں نے کہا گناہ بخشواؤ اپنے رب سے بے شک وہ ہے بخشنے والا۔
وَقَالُوا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَکُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا وَّلَا یَغُوْثَ وَیَعُوْقَ وَنَسْرًاo (نوح)	اور اُنہوں نے اپنے عوام سے کہا ہرگز اپنے معبودوں کو نہ چھوڑو اور ودّ، سواع، یغوث، یعوق اور نسر کو نہ چھوڑو۔

اور آخر میں زچ ہو کر کہنے لگے "اے نوح! اب ہم سے جنگ وجدل نہ کر، اور ہمارے اس انکار پر اپنے خدا کا جو عذاب لا سکتا ہے لے آ"

قَالُوا یٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَکْثَرْتَ جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ کُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ o (ہود)	وہ کہنے لگے "اے نوح! تو نے ہم سے جھگڑا کیا اور بہت جھگڑا کیا "اب اس کو ختم کر" اور جو تو نے ہم سے (عذابِ الٰہی کا) وعدہ کیا ہے وہ لے آ۔

حضرت نوح علیہ السلام نے یہ سُن کر اُن کو جواب دیا کہ عذابِ الٰہی میرے قبضہ میں نہیں وہ تو اُس کے قبضہ میں ہے جس نے مجھ کو رسول بنا کر بھیجا ہے، وہ چاہیگا تو یہ سب کچھ بھی ہو جائیگا۔

قَالَ اِنَّمَا یَاْتِیْکُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَآءَ	نوح نے کہا ضرور اگر اللہ چاہیگا تو اُس عذاب کو بھی لے

وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِیْنَ ۔ (ہود) آئیگا اور تم اُس کو تھکا دینے والے نہیں ہو۔

بہرحال جب قوم کی ہدایت سے حضرت نوح علیہ السلام بالکل مایوس ہوگئے اور اُس کی باطل کوشی اور عناد اور ہٹ دھرمی اُن پر واضح ہوگئی اور اُنہوں نے قرآنی تصریح کے مطابق ساڑھے نوسو سال کی پیہم دعوت و تبلیغ کا اُن پر کوئی اثر نہ دیکھا تو سخت ملول اور پریشان خاطر ہوئے۔ تب خدائے تعالیٰ نے اُن کی تسلّی کے لیے فرمایا:۔

وَاُوْحِیَ اِلٰی نُوْحٍ اَنَّہٗ لَنْ یُّؤْمِنَ مِنْ اور نوح پر وحی کی گئی کہ جو ایمان لے آئے وہ لے آئے۔
قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ اب ان میں سے کوئی ایمان لانے والا نہیں ہے۔ پس
بِمَا كَانُوْا یَفْعَلُوْنَ ۔ (ہود) اُن کی حرکات پر غم نہ کر۔

جب حضرتِ نوحؑ کو یہ معلوم ہوگیا کہ اُن کے ابلاغِ حق میں کوئی کوتاہی نہیں ہے بلکہ خود نہ ماننے والوں کی استعداد کا قصور ہے، اور اُن کی اپنی سرکشی کا نتیجہ، تب اُن کے اعمال اور کمینہ حرکات سے متاثر ہوکر اللہ تعالیٰ کی درگاہ میں یہ دعا فرمائی:۔

رب لا تذر علی الارض من الکفرین اے پروردگار تو کافروں میں سے کسی کو بھی زمین پر باقی نہ
دیّارا ، اِنّك اِن تذرھم یضلّوا چھوڑ۔ اگر تو ان کو یونہی چھوڑ دیگا تو یہ تیرے بندوں کو بھی
عبادك ولا یلدوا الا فاجرا کفّارا (نوح) گمراہ کرینگے اور اُن کی نسل بھی انہی کی طرح نافرمان پیدا ہوگی۔

بنائے سفینہ | اللہ تعالیٰ نے حضرتِ نوحؑ کی دعا قبول فرمائی، اور اپنے قانون جزاء اعمال کے مطابق سرکشوں کی سرکشی اور متمردوں کے تمرد کی سزا کا اعلان کردیا، اور حفظ ماتقدم کے لیے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کو ہدایت فرمائی کہ وہ ایک کشتی طیار کریں، تاکہ اسبابِ ظاہری کے اعتبار سے وہ اور مومنین قانتین اس عذاب سے محفوظ رہیں جو خدا کے نافرمانوں پر نازل ہونے والا ہے۔ حضرت نوحؑ نے جب حکمِ رب میں کشتی بنانی شروع کی تو کفار نے ہنسی اُڑانا اور مذاق بنانا شروع کردیا اور جب کبھی اُنکا اُدھر سے گذر

ہوتا تو کہتے کہ خوب! جب ہم غرق ہونے لگینگے تب تو اور تیرے پیرو اس کشتی میں محفوظ رہ کر نجات پا جائینگے، کیسا احمقانہ خیال ہے"۔ حضرت نوح (علیہ السلام) بھی اُن کی انجام کار سے غفلت اور خدا کی نافرمانی پر جرأت دیکھ کر اُن کو ان ہی کے طرز پر جواب دیتے اور اپنے کام میں مشغول رہتے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی اُن کو حقیقتِ حال سے آگاہ کر دیا تھا۔

واصنع الفلک باعیننا ووحینا ولا تخاطبنی فی الذین ظلموا انھم مغرقون ۔ (ہود)

اے نوح تو ہماری حفاظت میں ہماری وحی کے مطابق سفینہ تیار کیے جا اور اب مجھ سے ان کے متعلق کچھ نہ کہو یہ بلاشبہ غرق ہونے والے ہیں۔

آخر سفینۂ نوح (علیہ السلام) بن کر تیار ہو گیا۔ اب خدا کے وعدۂ عذاب کا وقت قریب آیا، اور حضرتِ نوح نے اُس پہلی علامت کو دیکھا جس کا ذکر اُن سے کیا گیا تھا یعنی زمین کی تہ میں سے پانی کا چشمہ اُبلنا شروع ہو گیا۔ تب وحی الٰہی نے اُن کو حکم سُنایا کہ کشتی میں اپنے خاندان کو بیٹھنے کا حکم دو اور تمام جانداروں میں سے ہر ایک کا ایک جوڑا بھی کشتی میں پناہ گیر ہو۔ اور وہ مختصر جماعت (تقریباً چالیس نفر) بھی جو تجھ پر ایمان لا چکی ہے کشتی میں سوار ہو جائے۔

جب وحی الٰہی کی تعمیل پوری ہو گئی تو اب آسمان کو حکم ہوا کہ پانی برسنا شروع ہو اور زمین کے چشموں کو امر کیا گیا کہ وہ پوری طرح اُبل پڑیں۔

خدا کے حکم سے جب یہ سب کچھ ہوتا رہا تو کشتی بھی اُس کی حفاظت میں پانی پر ایک مدت تک محفوظ تیرتی رہی تا آنکہ تمام منکرین و معاندین غرقِ آب ہو گئے۔ اور خدائے تعالیٰ کے قانون "جزاءِ اعمال" کے مطابق اپنے کیفرِ کردار کو پہنچ گئے۔

پسرِ نوح اس مقام پر ایک مسئلہ خاص طور پر قابلِ توجہ ہے وہ یہ کہ حضرت نوح (علیہ السلام) نے طوفانی عذاب کے وقت خدائے تعالیٰ سے اپنے بیٹے کی نجات کے متعلق سفارش کی اور خدائے تعالیٰ نے اُن کو

اس سفارش سے روک دیا۔ اس مسئلہ کی اہمیت قرآنِ عزیز کی حسب ذیل آیات سے پیدا ہوتی ہے۔

ونادیٰ نوح ربہٗ فقال رب ان ابنی من اھلی وان وعدک الحق وانت احکم الحکمین ۔ قال ینوح انہ لیس من اھلک انہ عملٌ غیر صالحٍ فلا تسئلن ما لیس لک بہ علم انی اعظک ان تکون من الجھلین ۔ قال رب انی اعوذ بک ان اسئلک ما لیس لی بہ علم ط والا تغفر لی وترحمنی اکن من الخسرین ۔ قیل ینوح اھبط بسلام منا وبرکٰت علیک وعلی امم ممن معک ۔ (ہود)

اور نوح نے اپنے رب کو پکارا اور کہا اے پروردگار میرا بیٹا میرے اہل ہی میں سے ہے اور تیرا وعدہ سچا ہے اور تو بہترین حاکموں میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کہا اے نوح یہ تیرے اہل میں سے نہیں ہے یہ بدکردار ہے پس تجھ کو ایسا سوال نہ کرنا چاہیے جس کے بارہ میں تجھ کو علم نہ ہو میں بلاشبہ تجھ کو نصیحت کرتا ہوں کہ تو نادانوں میں سے نہ بن، نوح نے کہا "اے رب میں بلاتردد اس بارہ میں کہ جس کے متعلق مجھے علم نہ ہو میں تجھ سے سوال کروں تیری پناہ چاہتا ہوں۔ اور اگر تو نے معاف نہ کیا اور رحم نہ کیا تو میں نقصان اُٹھانے والوں میں ہونگا۔ نوح سے کہہ دیا گیا "اے نوح ہماری جانب سے تو اور تیرے ہمراہی ہماری سلامتی اور برکتوں کے ساتھ زمین پر اُترو۔"

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نوح (علیہ السلام) سے خدا کا وعدہ تھا کہ وہ ان کے اہل کو نجات دیگا۔ اس لیے حضرت نوح نے اپنے بیٹے (کنعان) کے لیے دعا مانگی جس پر رب العالمین کی جانب سے عتاب ہوا کہ تم کو جس شے کا علم نہ ہو اُس کے متعلق اس طرز سے سوال کرنے کا حق نہیں ہے اس پر حضرت نوح نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور خدائے تعالیٰ سے مغفرت و رحمت طلب کی اور اُس کی جانب سے بھی خواہش کے مطابق جواب ملا۔

تو اب غور طلب بات یہ ہے کہ حضرت نوح (علیہ السلام) کا سوال کس وعدہ پر مبنی تھا اور آیا وہ

وعدہ پورا ہوا یا نہیں، اور حضرت نوحؑ کو اُس وعدہ کے سمجھنے میں کس قسم کی غلط فہمی ہوئی اور اللہ تعالےٰ کی تنبیہ پر اُنھوں نے کس طرح اصل حقیقت کو سمجھ لیا؟

اس سوال کے جواب میں حسب ذیل آیت قابل توجہ ہے۔

حتیٰ اذا جاء امرنا وفار التنور	تا آنکہ جب ہمارا حکم (عذاب) آپہنچا اور تنور پانی سے اُبل پڑا
قلنا احمل فیھا من کل زوجین	تو ہم نے (نوحؑ سے) کہا کہ ہر جاندار میں سے ایک ایک جوڑ
اثنین واھلك الا من سبق علیہ	کشتی میں اُٹھا لو اور اُس کے علاوہ جس پر خدا کا فرمان ناطق
القول ومن اٰمن وما اٰمن معہ	ہو چکا ہے اپنے اہل کو بھی اور جو تجھ پر ایمان لائے ہیں اُن کو
الا قلیل۔ (ہود)	بھی اور وہ بہت تھوڑے ہیں۔

اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت نوحؑ سے حق تعالیٰ نے یہ فرمایا تھا کہ تم اپنی اس کشتی میں جو اہل نجات کے لیے تیار کی گئی ہے اپنے اہل کو بٹھا لو لیکن تمہارا پورا کنبہ نجات یافتہ نہیں ہے۔ بلکہ بعض ایسے بھی ہیں جن پر خدا کے عذاب کا فیصلہ ہو چکا ہے "الا من سبق علیہ القول"۔

چونکہ حضرت نوح علیہ السلام اپنی بیوی کے سابقہ کافرانہ عقائد و اعمال کی بنا پر اس بات سے مایوس ہو چکے تھے کہ وہ خدائے برحق پر ایمان لائے اور توحید کی آواز پر لبیک کہے، اس لیے اس استثناء کا مصداق صرف اُسی کو سمجھے اور بیٹے کی محبت میں یہ خیال کرتے ہوئے کہ یہ نوعمر ہے شاید کشتی میں مومنین کی صحبت سے فائدہ اُٹھا کر ایمان لے آئے اور کافروں کی مجالس کے اثرات کو محو کر دے۔ خدائے تعالیٰ کے ارشاد "واھلك" سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے درگاہِ الٰہی میں کنعان کی نجات کی دعا کی مگر اللہ تعالیٰ کو اپنے جلیل القدر پیغمبر کا یہ "قیاس" پسند نہ آیا اور اُن کو تنبیہ کی کہ جو ہستی خدا کی "وحی" سے ہر وقت مستفیض ہوتی رہتی ہو اُس کو جذبۂ محبت پدری میں اس قدر سرشار نہ ہو جانا چاہیے کہ "وحی الٰہی" کا انتظار کئے بغیر خود ہی قیاس آرائی کر کے انجام تک کا فیصلہ کر بیٹھے؟ حالانکہ وعدۂ نجات صرف مومنین کے لیے

مخصوص ہے اور کنعان کافروں کے ساتھ کافر ہی رہیگا۔ بلاشبہ تمہارا اس قسم کا سوال منصبِ رسالت و نبوت کے شایانِ شان نہیں ہے۔

گویا حضرت نوحؑ سے خدائے تعالیٰ کا یہ خطاب دراصل "عتاب" نہیں تھا بلکہ مشاہدۂ حقیقت کے لیے ایک پکار تھی جس کو اُنہوں نے سُنا اور اپنی بشریت و عبدیت کے اعتراف کے ساتھ ساتھ مغفرت کے طالب ہوئے اور خُدا کی سلامتی اور برکت حاصل کر کے شادکام و بامُراد بنے۔ پس یہ سوال نہ معصیت کا سوال تھا اور نہ عصمتِ انبیاء کے منافی، اس لیے خطابِ الٰہی نے اس کو "نادانی" سے تعبیر کیا نہ کہ گناہ اور نافرمانی سے۔

بہرحال حضرت نوحؑ کے سامنے یہ حقیقت آشکارا ہوگئی کہ وعدۂ نجات کا منشاء "نسل و خاندان" نہیں ہے، بلکہ "ایمان باللہ" ہے۔ اس لیے اُنہوں نے اپنا رُخ بدل کر کنعان کو مخاطب کیا اور اپنا منصبِ دعوت ادا کرتے ہوئے چاہا کہ وہ بھی "مومن" بن کر "نجاتِ الٰہی" سے بہرہ ور ہو۔ مگر اُس بدبخت نے جواب دیا:۔

قال ساٰوی الی جبل یعصمنی من الماء (ہود) کہا میں بہت جلد کسی پہاڑ کی پناہ لیتا ہوں کہ وہ مجھ کو غرقابی سے بچالیگا۔

حضرتِ نوحؑ نے یہ سُن کر فرمایا:

قال لا عاصم الیوم من امر اللہ الا من رحم وحال بینھما الموج فکان من المغرقین۔ (ہود) آج کوئی خدا کے حکم سے بچانے والا نہیں ہے صرف وہی بچیگا جس پر خدا کا رحم ہو جائے اس درمیان میں اُن دونوں کے درمیان موج حائل ہوگئی اور وہ غرق ہونے والوں میں کا ایک ہوگیا۔

کوہِ جودی | غرض جب حکمِ الٰہی سے عذاب ختم ہوا تو سفینۂ نوحؑ "جودی" پر جا کر ٹھہر گیا۔

وقضی الامر واستوت علی الجودی وقیل بعدا للقوم الظلمین ؐ (ہود) اور حکم پورا ہوا اور کشتی جودی پر جا ٹھہری اور اعلان کر دیا گیا کہ قومِ ظالمین کے لیے ہلاکت ہے۔

توراۃ میں جودی کو ارارات کے پہاڑوں میں سے بتایا گیا ہے ارارات درحقیقت جزیرہ کا نام ہے یعنی اُس علاقہ کا نام جو فرات و دجلہ کے درمیان دیارِ بکر سے بغداد تک مسلسل چلا گیا ہے۔

پانی آہستہ آہستہ خشک ہونا شروع ہو گیا اور ساکنانِ کشتی نے دوسری بار امن و سلامتی کے ساتھ خدا کی سرزمین پر قدم رکھا۔ اسی بنا پر حضرت نوح (علیہ السلام) کا لقب "ابوالبشر ثانی" یا "آدم ثانی" (یعنی انسانوں کا دوسرا باپ) مشہور ہوا۔ اور غالباً اس اعتبار سے حدیث میں ان کو "اول الرسل" کہا گیا۔

اگرچہ یہاں پہنچ کر واقعہ کی تفصیلات ختم ہو جاتی ہیں تاہم اس اہم واقعہ میں جو علمی اور تاریخی سوالات پیدا ہوتے ہیں یا پیدا کیے گئے ہیں وہ بھی قابل ذکر و مذاکرہ ہیں جو ترتیب وار درج ذیل ہیں۔

۱۔ طوفان نوح عام تھا یا خاص

کیا طوفانِ نوح تمام کرۂ ارضی پر آیا تھا یا کسی خاص خطہ پر؟

اس کے متعلق علماءِ قدیم و جدید میں ہمیشہ سے دو رائے رہی ہیں۔ علماءِ اسلام میں سے ایک جماعت، علماءِ یہود و نصاریٰ، اور بعض ماہرین علوم فلکیات، طبقات الارض، اور تاریخِ طبیعات کی یہ رائے ہے کہ یہ طوفان تمام کرۂ ارضی پر نہیں آیا تھا بلکہ صرف اُسی خطہ میں محدود تھا جہاں حضرتِ نوح کی قوم آباد تھی اور یہ علاقہ مساحت کے اعتبار سے ایک لاکھ چالیس ہزار کیلومیٹر مربع ہوتا ہے۔

ان کے نزدیک طوفانِ نوح کے خاص ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اگر یہ طوفان عام تھا تو اس کے آثار کرۂ ارضی کے مختلف گوشوں اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر ملنے چاہئیں تھے، حالانکہ ایسا نہیں ہے نیز اُس زمانہ میں انسانی آبادی بہت ہی محدود تھی اور وہ وہی خطہ تھا جہاں حضرت نوح (علیہ السلام) اور اُن کی قوم آباد تھی۔ ابھی حضرت آدم (علیہ السلام) کی اولاد کا سلسلہ اس سے زیادہ وسیع نہ ہوا تھا جو کہ اس علاقہ میں آباد تھا۔ لہذا وہی مستحق عذابِ الٰہی تھے اور اُن ہی پر طوفان کا یہ عذاب بھیجا گیا۔ باقی کرۂ زمین کو اس سے کوئی علاقہ نہ تھا۔

اور بعض علمارِ اسلام، اور ماہرینِ طبقات الارض و تاریخِ طبیعیات کے نزدیک یہ طوفان تمام کرۂ ارضی پر حاوی تھا، اور ایک یہی نہیں بلکہ اُن کے خیال میں اس زمین پر متعدد ایسے طوفان آئے ہیں اُن ہی میں سے ایک یہ بھی تھا۔ وہ پہلی رائے کے تسلیم کرنے والوں کو "آثار" سے متعلق سوال کا یہ جواب دیتے ہیں کہ "جزیرہ" یا عراقِ عرب کی اس سرزمین کے علاوہ بلند پہاڑوں پر بھی ایسے حیوانات کے ڈھانچے اور ہڈیاں کثرت پائی گئی ہیں جن کے متعلق ماہرینِ علمِ طبقات الارض کی یہ رائے ہے کہ یہ حیوانات مائی ہیں اور صرف پانی ہی میں زندہ رہ سکتے ہیں۔ پانی سے باہر ایک لمحہ بھی ان کی زندگی دشوار ہے۔ اس لیے کرۂ ارض کے مختلف پہاڑوں کی اِن بلند چوٹیوں پر ان کا ثبوت اس کی دلیل ہے کہ کسی زمانہ میں پانی کا ایک ہیبتناک طوفان آیا جس نے پہاڑوں کی ان چوٹیوں کو بھی اپنی غرقابی سے نہ چھوڑا۔

ان ہر دو خیالات و آراء کی اُن تمام تفصیلات کے بعد جن کا مختصر خاکہ مضمون زیرِ بحث میں درج ہے اہلِ تحقیق کی یہ رائے ہے کہ صحیح مسلک یہی ہے کہ طوفان خاص تھا، عام نہ تھا۔

البتہ قرآنِ عزیز نے "سُنّت اللہ" کے مطابق صرف اُن ہی تفصیلات پر توجہ کی ہے جو موعظت وعبرت کے لیے ضروری تھے اور باقی مباحث سے قطعًا کوئی تعرض نہیں کیا۔ اور اُن کو انسانی علوم کی ترقی کے حوالہ کر دیا۔ وہ تو صرف یہ بتانا چاہتا ہے کہ تاریخ کا یہ واقعہ اہلِ عقل و شعور کو فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ آج سے ہزاروں سال قبل ایک قوم نے خدا کی نافرمانی پر اصرار کیا اور اُس کے بھیجے ہوئے ہادی حضرت نوح علیہ السلام کے رشد و ہدایت کے پیغام کو جھٹلایا، ٹھکرایا، اور قبول کرنے سے انکار کر دیا تو خدائے تعالیٰ نے اپنی قدرت کا مظاہرہ کیا اور ایسے سرکشوں اور متمردوں کو طوفانِ باد و باراں میں غرق کر کے تباہ و برباد کر دیا اور اسی حالت میں حضرت نوح اور مختصر سی ایماندار جماعت کو محفوظ رکھ کر نجات دی۔ ان فی ذٰلك لعبرۃ لاولی الابصار۔

۲۔ پسرِ نوح کی نسبی بحث | بعض علماء نے حضرتِ نوح کے اِس بیٹے کے متعلق یہ کہا ہے کہ یہ حقیقی بیٹا نہ تھا

اور پھر اس بارہ میں دو جدا جدا دعوے کیے۔ ایک جماعت کہتی ہے کہ وہ "ربیب" تھا یعنی حضرت نوح کی بیوی کے پہلے شوہر کا لڑکا تھا جو حضرتِ نوح سے نکاح کے بعد اُن کی آغوش میں پلا بڑھا۔ اور دوسری جماعت حضرتِ نوح کی اُس کافرہ بیوی پر خیانتِ عصمت کا الزام لگاتی ہے۔

ان علماء کو ان غیر مستند اور دور از صواب تاویلوں کی ضرورت اس لیے پیش آئی ہے کہ ان کے خیال میں پیغمبر کا بیٹا کافر ہو یہ بہت مستبعد اور عجیب معلوم ہوتا ہے؟

مگر تعجب ہے کہ وہ اس نصِ قرآنی کو کیوں فراموش کر جاتے ہیں کہ حضرتِ ابراہیم کے باپ "آذر" بت تراش و بت پرست کافر تھے۔ پس اگر ایک جلیل القدر پیغمبر کے باپ کے کفر سے رسولِ خدا کی جلالت و عظمت اور منصبِ رسالت و نبوت میں مطلق فرق نہیں آتا تو پھر عظیم المرتبت رسول و نبی کے بیٹے کے کفر سے اُس پیغمبر کی عظمت و جلالتِ قدر میں کیا نقص آسکتا ہے بلکہ ایک حقیقت نگاہ اور حقیقت شناس کے نزدیک تو یہ رب العالمین اور خالقِ کائنات کی قدرتِ کاملہ کا مظہرِ اتم ہے کہ وہ بنجر زمین میں گلاب اُگا دیتا، اور گلاب کے مہکتے ہوئے پھولوں کے ساتھ خار پیدا کر دیتا ہے۔ فتبارك الله احسن الخالقين۔

پس جبکہ قرآنِ عزیز نے یہ تصریح کی ہے کہ کنعان حضرتِ نوح کا بیٹا تھا تو بلا وجہ ان رکیک اور بے سند تاویلات کی کیا حاجت؟

ایک اخلاقی مسئلہ اس مقام پر اگرچہ علامہ عبدالوہاب نجار نے قرآنِ عزیز کی تصریح ہی کو تسلیم کیا ہے۔ تاہم اُن کے نزدیک حضرتِ نوح کی بیوی بصراحتِ قرآن اگر کافر ہوسکتی ہے تو اُس پر خیانتِ عصمت کا الزام عائد کرنا بھی کوئی ناواجب بات نہیں ہے۔

مگر مجھ کو ان جیسے تمام مقامات میں ان بزرگوں سے ہمیشہ اختلاف رہتا ہے اور میں ورطۂ حیرت و تعجب میں پڑ جاتا ہوں کہ ان علماء کے پیشِ نظر "نبی و رسول" کے معاملہ میں ان تمام نزاکتوں کا لحاظ کیوں نہیں

جو اخلاق، معاشرت، اور تہذیب و تمدن کی زندگی سے وابستہ ہیں۔

مثلاً اسی مقام کو لیجیے کہ صاحبِ قصص الانبیاء اور بعض دوسرے علما، کہتے ہیں کہ حضرت نوحؑ کی بیوی جب کافر ہوسکتی ہے تو خائنِ عصمت کیوں نہیں ہوسکتی۔ اِس لیے کہ دوسرا عمل پہلے سے کم درجہ رکھتا ہے؛ جواب یہ ہے کہ اس کو تسلیم کر لینے کے بعد کہ کفر زنا سے بہت زیادہ بُرا اور قبیح عمل ہے مجھے اس سے سخت اختلاف ہے کہ کسی پیغمبر و نبی کی بیوی اُن کے حبالۂ عقد میں رہتے ہوئے خائنِ عصمت ہو اور نبی و رسول اُس کی اس حرکت سے غافل رہے۔ اس لیے کہ اگر کسی نیک اور صالح انسان کی بیوی شوہر سے چھپ کر اس قسم کی بدعملی میں مبتلا ہو جائے تو یہ ممکن ہے کیونکہ وہ ناواقف رہ سکتا ہے اور جب تک اُس کے علم میں یہ بدعملی نہ آئے اُس کی ثقاہت و تقویٰ پر مطلق کوئی حرف نہیں آتا۔

مگر ایک نبی و رسول کا معاملہ اس سے جُدا ہے اُس کے پاس صبح و شام خدائے برتر کی وحی آتی ہے اور وہ خدائے برتر کی ہمکلامی سے مشرف ہوتا ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ نبی کے گھر میں ایک فاحشہ و زانیہ اُس کی رفیقِ حیات بھی رہے اور خدا کی وحی اُس سے قطعاً خاموش ہو۔

خدا کے برگزیدہ پیغمبر جب اصلاح و ہدایت کے لیے بھیجے جاتے ہیں تو ظاہری و باطنی ہر قسم کے عیوب سے معصوم اور پاک رکھے جاتے ہیں تاکہ کوئی ایک شخص بھی اُن کے حسب و نسب، اخلاق و معاشرت پر نکتہ چینی نہ کر سکے۔ لہٰذا یہ کیسے جائز ہوسکتا ہے کہ وحیِ الٰہی اور ہمکلامیِ ربِ اکبر کے مدعی کے گھر میں بد اخلاقی کا جرثومہ مستقل ہو رہا ہو اور اُس کو بیخبر اور غافل چھوڑ دیا جائے۔

ہمارے سامنے عائشۂ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ دلیلِ راہ ہے۔ ان ہونی کو ہونی کرنے والوں اور بے پر کی اُڑانے والوں نے کیا کچھ نہیں کیا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سمعِ مبارک نے بھی سُنا، چند روز بدبخت و خوش بخت بننے والوں کے لیے آزمائش کے بھی ملے۔ مگر آخرِ کار وحیِ الٰہی نے معاملہ کو ایسا صاف کر دیا کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو کر رہ گیا۔

یہ ہوسکتا ہے کہ (العیاذ باللہ) پیغمبر اور نبی کی بیوی سے زنا سرزد ہوجائے کیونکہ وہ نبی کی طرح معصوم نہیں ہے لیکن یہ محال اور ناممکن ہے کہ اس ارتکاب کے بعد وہ نبی کی بیوی رہے اور وحیِ الٰہی نبی اور پیغمبر کو اس کی بداخلاقی سے غافل رکھے۔

کفر بلاشبہ سب سے بڑا جرم اور گناہ ہے لیکن وہ معاشرتی اور اخلاقی بول چال میں بداخلاقی اور فحش نہیں ہے بلکہ ایک عقیدہ ہے جو عقیدۂ بد کہلانے کا مستحق ہے۔ اس لیے بعض اسلامی مصالح کی بنا پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل کی شریعتوں اور خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی میں کافر سے مناکحت کو ممنوع قرار نہیں دیا گیا مگر مدنی زندگی کے دور میں قرآنِ عزیز کی نص نے مشرک و مسلم کے درمیان رشتۂ مناکحت کو ہمیشہ کے لیے ممنوع قرار دے دیا۔ لیکن زنا کسی حال اور کسی وقت میں بھی جائز نہیں کہا گیا۔

پس اس معاملہ میں کفر و زنا کے تقابل کا سوال صحیح نہیں ہوسکتا، بلکہ معاشرتی بدکرداری و نیک کرداری کی بقاء و قیام کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا میرے نزدیک حضرت نوحؑ کی زندگیِ پاک کے ساتھ زانیہ رفیقہ کا تعلق ناممکن تھا۔ اگر امرأۃِ نوحؑ ایک مرتبہ بھی ایسا اقدام کرتی تو وحیِ الٰہی فوراً نبی کو مطلع کر کے تفریق کرا دیتی۔ یا کم از کم توبۃً نصوحاً پر جا کر معاملہ ٹھہرتا۔ میں تو اس سے آگے بڑھ کر یہ جرأت کرتا ہوں کہ اگر خدانہ کردہ کسی روایت میں بھی اس قسم کے معاملات کا اشارہ پایا جاتا تو بھی ہمارا فرض تھا کہ اس کی صحیح توجیہ تلاش کر کے اصل حقیقت کو سامنے لایا جاتا چہ جائیکہ نہ قرآنِ عزیز اس کے متعلق کچھ کہتا ہے اور نہ صحیح و ضعیف روایات میں سے کوئی روایتِ حدیث و سیرت اس کا ذکر کرتی ہے تو پھر خواہ مخواہ اس قسم کی دور از کار تاویلات سے عوام و متوسطین اور موافقین و مخالفین کے دل و دماغ پر غلط نقوش نقش کرنے سے بجز مضرت و نقصان کے اور کیا حاصل ہے۔

بہرحال صحیح یہی ہے کہ کنعان حضرت نوحؑ ہی کا بیٹا تھا مگر اس پر حضرتِ نوحؑ کی ہدایت و رشد کی جگہ اپنی کافرہ والدہ کی آغوشِ تربیت اور خاندان و قوم کے ماحول نے بُرا اثر ڈالا اور وہ نبی کا بیٹا ہونے

کے باوجود کافر ہی رہا۔

پسرِ نوح بابداں بنشست　　خاندانِ نبوتش گم شد

نبی و پیغمبر کا کام فقط رشد و ہدایت کا پیغام پہنچانا ہے۔ اولاد، بیوی، خاندان، قبیلہ اور قوم پر اس کو زبردستی عائد کرنا اور اُن کے قلوب کو پلٹ دینا نہیں ہے۔

لستَ علیھم بمصیطر (غاشیہ)　　تو ان (کافروں) پر مسلط نہیں کیا گیا۔

وما انتَ علیھم بجبّار (ق)　　اور تو ان کو (قبول حق کے لیے) مجبور نہیں کر سکتا۔

اربابِ تاریخ نے حضرتِ نوحؑ کے اس بیٹے کا نام کنعان بتایا ہے یہ تورات کی روایت کے مطابق ہے۔ قرآنِ عزیز اس کے نام کی صراحت سے ساکت ہے جو نفسِ واقعہ کے لیے غیر ضروری تھا۔

چند ضمنی مسائل (۱) طوفانِ نوح علیہ السلام، خاص حصۂ زمین سے وابستہ رہا ہو یا تمام کرۂ زمین سے مذاہبِ عالم کی تاریخ اور علم آثارِ ارض سے یہ قطعی ثابت ہو چکا ہے کہ یہ واقعہ تاریخی حیثیت رکھتا ہے اور اس کی حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

چنانچہ تورات کے علاوہ قدیم ہندو مذہب کی کتابوں میں بھی اس کا تذکرہ موجود ہے۔ اور اگرچہ قرآنِ عزیز کے بیان کیے ہوئے سادہ اور صاف واقعات کے مقابلہ میں اُن میں کچھ اختلاف پایا جاتا ہے۔ تاہم نفسِ واقعہ کے اظہار میں یہ سب متفق نظر آتی ہیں۔

مولانا سید ابو نصر احمد حسین بھوپالی نے اپنی کتاب "تاریخ الادب الہندی"[1] میں تفصیل کے ساتھ اس واقعہ کو نقل کیا ہے جس کا عنوان ہے "برہمانا داو بانیشاد" اس میں حضرتِ نوح (علیہ السلام) کو مانو کہا گیا ہے جس کے معنی "خدا کا بیٹا" یا "نسلِ انسانی کا جدِّ اعلیٰ" بتلائے جاتے ہیں۔

(۲) قرآنِ عزیز نے صراحت کی ہے کہ حضرتِ نوح علیہ السلام نے اپنی قوم میں ساڑھے نو سو (۹۵۰) سال تبلیغ و دعوت کا فرض انجام دیا۔

(۱) صفحہ ۳۴ و ۳۵

ولقد ارسلنا نوحًا الیٰ قومہ فلبث فیھم الف سنۃٍ الا خمسین عامًا (عنکبوت) اور بلاشبہ ہم نے نوح کو اس کی قوم کی جانب رسول بنا کر بھیجا پس وہ ان میں پچاس کم ایک ہزار سال۔

یہ عمر موجودہ عمر طبعی کے اعتبار سے بعید از عقل معلوم ہوتی ہے لیکن محال اور ناممکن نہیں ہے اس لیے کہ کائنات کی ابتدا میں ہموم و افکار اور امراض کی یہ فراوانی نہیں تھی جو چند ہزار برسوں میں انسانی تمدن کی مصنوعی سامانوں نے پیدا کر دی ہے۔ اور تاریخ قدیم بھی یہ اقرار کرتی ہے کہ چند ہزار سال قبل کی عمر طبعی کا تناسب موجودہ تناسب سے بہت زیادہ تھا۔ نیز حضرت نوحؑ کی عمر طبعی کا معاملہ اسی قسم کی مستثنیات میں سے ہے۔ جو انبیاء علیہم السلام کی تاریخ میں موہبتِ الٰہی اور آیۃ اللہ کی فہرست میں شمار ہوتی ہیں، اور جن کی حکمت و غایت کا معاملہ خود خدائے تعالیٰ کے سپرد ہے۔

قرآنِ عزیز نے کسی نبی اور پیغمبر کی دعوت و تبلیغ کی مدت کا صراحت کے ساتھ اس طرح تذکرہ نہیں فرمایا جیسا کہ حضرت نوح کے واقعہ میں مذکور ہے۔ لہٰذا آج تقریبًا سات ہزار سال قبل کی طویل عمر کے تاریخی شواہد کے اعتبار سے اگر اس کو صحیح تسلیم کیا جائے تو اس کی پوری گنجائش ہے اور اگر تاریخ کی ان شہادتوں کو غیر وقیع مان کر انکار کر دیا جائے تب بھی اس واقعہ کو مخصوص حالات کے زیر اثر ایک عطیۂ الٰہی سمجھنا چاہیے جو ایک رسول اور پیغمبر کی دعوت و تبلیغ کی حکمتوں سے وابستہ ہے۔ حق اور صحیح مسلک یہی ہے اور اس مدت کو گھٹانے کے لیے دور از کار تاویلات کی قطعًا ضرورت نہیں۔

مشہور شاعر ابو العلاء معری اپنے چند اشعار میں یہ بیان کرتا ہے کہ قدیم زمانہ میں دستور تھا کہ لوگ سنہ، عام (سال) بول کر شہر (مہینہ) مراد لیا کرتے تھے۔ اس قول کے پیشِ نظر بعض مورخین کا یہ خیال ہے کہ حضرت نوح (علیہ السلام) کی تبلیغی خدمات کی عمر اسّی سال ہوتی ہے اور ان کی کل عمر ڈیڑھ سو سال سے آگے نہیں بڑھتی۔

لیکن یہ صحیح نہیں ہے اس لیے کہ اگر ابو العلاء کا یہ قول تسلیم بھی کر لیا جائے تو یہ عرب کے

کسی غیر معروف حساب کا تذکرہ سمجھا جائیگا کیونکہ قرآنِ عزیز کے نزول کے وقت عرب کے کسی قبیلہ کے متعلق یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ "سنۃ" یا "عام" بول کر "شہر" (مہینہ) مُراد لیا کرتے تھے۔ لہٰذا قرآنِ عزیز کی بیان کردہ تعبیر پر اس قول کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا۔

نیز سب سے زیادہ قابلِ غور بات یہ ہے کہ قرآنِ عزیز نے جس انداز میں اس مدت کا ذکر کیا ہے اُس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ تبلیغِ نوح کی غیر معمولی مدت کے اظہار کو بہت اہم سمجھ رہا ہے ورنہ قرآنِ عزیز کی عام سُنت یہ ہے کہ وہ سخت اہم ضرورت کے بغیر واقعات و حالات کی اس قسم کی جزئیات سے بہت ہی کم تعرض کرتا ہے۔

(۳) بعض مفسرین نے اسرائیلیات (توراۃ و یہود کی روایات) سے یہ نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے طوفانِ نوح سے چالیس سال قبل — قومِ نوح کی عورتوں کو بانجھ کر دیا تھا تاکہ جدید نسل عالمِ وجود میں نہ آئے، مگر یہ روایت "غپ شپ" سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی اور غالباً اسے اس لیے گھڑا گیا ہے کہ یہ اعتراض پیدا نہ ہو کہ طوفانِ نوح کی صورت میں معصوم بچوں نے کیا قصور کیا تھا کہ وہ بھی لقمۂ اجل ہو گئے۔

ان احتیاط پسند حضرات کو شاید یہ بات فراموش ہو گئی کہ اللہ تعالیٰ کا قانون جس کا نام "عادۃ اللہ" ہے، اس بارہ میں کیا ہے؟ ورنہ اُن کو ایسی لایعنی روایت کے بیان کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی جو اکثر یہود کے غلط افکار و عقائد کی مخلوق ہوتی ہیں۔

کائناتِ ہست و بود میں "عادت اللہ" یہ جاری ہے کہ امراض، وبا، طوفان اور زلزلے جیسے امور جب بھی کسی سبب سے نمودار ہوتے ہیں "خواہ وہ عذاب کے لیے ہوں یا عام حالاتِ زندگی کے اعتبار سے کسی خارجی سبب کے ذریعہ ظاہر ہوئے ہوں" تو جس مقام پر وہ نازل ہوتے ہیں وہاں کی آبادی میں نیک و بد، ولی و شیطان، زاہد و عابد اور فاسق و فاجر کے مابین کوئی تمیز نہیں کرتے

بلکہ اسبابِ عادیہ کے زیرِ اثر مسببات کو وجود میں لانے کے لیے من جانب اللہ مامور ہیں۔ اور دنیوی زندگی کے اعتبار سے اُن کی لپیٹ میں ہر وہ انسان آجاتا ہے جو کسی نہ کسی وجہ سے ان اسباب کا سبب بن گیا ہے۔

البتہ عالمِ آخرت کے اعتبار سے یہ امتیاز نمایاں رہتا ہے کہ فاسق و فاجر اور خدا کے دشمن کے لیے یہ اسباب عذاب الٰہی بنتے اور مطیع و فرمانبردار اور نیک کردار انسان کے لیے موجبِ سعادت اور درجاتِ عالیہ کا مستوجب ہوتے ہیں۔

کیا ہماری نگاہیں روزمرّہ یہ مشاہدہ نہیں کرتیں کہ جب زلزلہ آتا ہے تو نیک و بد دونوں پر یکساں اثر کرتا ہے، وبا پھیلتی ہے تو نیک کردار و بدکردار دونوں ہی اُس کی زد میں آجاتے ہیں۔ اور دونوں کے رشتۂ حیات کے لیے وہ یکساں مہلک ثابت ہوتی ہے۔

البتہ یہ بات فراموش نہ کرنی چاہیے کہ جب کبھی اس قسم کا عذاب نبی اور پیغمبر کی پیہم نافرمانی کی وجہ سے کسی قوم پر نازل ہوتا ہے تو پیغمبر کو بذریعہ وحی اُس کی اطلاع دیدی جاتی ہے اور یہ حکم ہو جاتا ہے کہ وہ مع اپنے اُن پیروؤں کے جو اسلام کے دامن سے وابستہ ہو گئے ہیں عذاب کی اُس بستی سے باہر چلا جائے، اور یا بانگِ دہل یہ کہہ کر جائے کہ یا قوم اُس کے لائے ہوئے احکام کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دے ورنہ خدا کے عذاب کو قبول کرے۔ اور اس طرح مومنین اُس عذاب کی زد سے محفوظ رہتے ہیں

بہرحال مفسرین نے جس احتیاط کی خاطر اسرائیلیات کے اس ذخیرہ سے مدد لینی چاہی ہے وہ قطعاً بے ضرورت ہے۔

پس طوفانِ نوح میں قومِ نوح کے مرد و عورت، بوڑھے اور جوان، بچے اور بچیاں سب ہی طوفان کی ہلاکت خیز کا شکار ہوئے اور دنیا رکفر کا وہ حصہ سب ہی برباد کر دیا گیا۔ اب یہ معاملہ خدا کے سپرد ہے کہ جن عاقل و بالغ انسانوں نے نافرمانی کی تھی اُن کے حق میں یہ دائمی اور سرمدی

عذاب بنے اور جو معصوم اور غیر عاقل تھے وہ آخرت کے عذاب سے مامون و محفوظ قرار پائیں۔

(۴) سفینۂ نوحؑ طوفان کے بعد کس مقام پر ٹھہرا؟ توراۃ نے اس کا نام اراراط بتایا ہے۔

حضرتِ نوح کی دعوت و تبلیغ اُس سرزمین سے وابستہ تھی جو دجلہ اور فرات کے درمیان واقع ہے اور یہ دونوں دریا آرمینیا کے پہاڑوں سے نکلے ہیں، اور جُدا جُدا بہہ کر عراق کے حصۂ زیریں میں آکر مل گئے ہیں۔ پھر خلیجِ فارس میں سمندر میں جا گرے ہیں۔ آرمینیا کے یہ پہاڑ اراراط کے علاقہ میں واقع ہیں، اسی لیے توراۃ میں ان کو اراراط کا پہاڑ کہا ہے۔ مگر قرآنِ عزیز نے اس پورے علاقہ کی بجائے صرف اُس خاص مقام کا تذکرہ کیا ہے جہاں کشتی جا کر ٹھہری تھی، یعنی جودی کا۔ توراۃ کے شارحین کا یہ خیال ہے کہ جودی اُس سلسلۂ کوہ کا نام ہے جو اراراط اور جارجیا کے پہاڑی سلسلہ کو باہم ملاتا ہے، اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ سکندر اعظم کے زمانہ کی یونانی تحریرات بھی اس کی تصدیق کرتی ہیں۔ اور اس تاریخی واقعہ کا تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آٹھویں صدی مسیحی تک اس جگہ ایک معبد اور ہیکل موجود تھا، جو "کشتی کا معبد" کہا جاتا تھا۔

(۵) ایک مفسر نے حضرتِ نوح (علیہ السلام) کے بیٹے کنعان کے نجات نہ پانے کے متعلق لطیف اشارہ کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ حضرت نوح (علیہ السلام) جلیل القدر پیغمبر اور مستجاب الدعوات تھے اُنھوں نے دعا اور بددعا، دونوں حالتوں میں خود اپنے بیٹے کو فراموش کر دیا اور نتیجہ یہ نکلا کہ کافر بیٹے کا تمرد اور اُس کی سرکشی، پاداشِ عمل کی صورت میں نمودار ہوئی اور وہ بھی ہالکین کے ساتھ غرقِ دریا ہو کر رہ گیا۔

حضرت نوح (علیہ السلام) نے جبکہ وہ قوم کو راہ راست پر لانے سے عاجز آگئے تھے سب سے پہلے یہ دعا کی:-

رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكَافِرِيْنَ — اے پروردگار تو اس زمین پر کسی بسنے والے کافر کو زندہ

دیّارا. إنّک إن تذرھم یضلّوا عبادک ولا یلدوا الّا فاجرا کفّارا. (نوح)

نہ چھوڑ، اس لیے کہ اگر تو ان کو زندہ چھوڑیگا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کرتے رہینگے اور ان کی اولاد کا سلسلہ بھی گمراہی اور کفر ہی پر قائم رہیگا۔

اور یہ قطعاً فراموش کر دیا کہ اس موقع پر کنعان کو مستثنیٰ کر کے اُس کے لیے قبول ہدایت کی دعاء مانگنا چاہیے یا شاید اُس وقت تک اُن کو بیٹے کے کفر کا علم ہی نہ تھا

دوسری مرتبہ جناب باری میں یہ دعاء کی :۔

رب اغفر لی ولوالدیّ ولمن دخل بیتی مؤمنا وللمؤمنین والمؤمنات. (نوح)

اے پروردگار مجھ کو اور میرے ماں باپ کو بخش دے اور اُس شخص کو بھی بخشش سے نواز جو مومن ہو کر میرے گھر میں داخل ہوا اور مومنین و مومنات کو بھی بخش دے۔

اور اس موقعہ پر بھی اُنھوں نے کنعان کا استثناء نہیں کیا اور یا اُس کے مومن ہو کر گھر میں داخل ہونے کی دعاء نہیں فرمائی۔

تیسری مرتبہ پھر یہ دعاء کی۔

ولا تزد الظّٰلمین الّا تبارا

اور ظالموں کے لیے ہلاکت کے سوا کچھ اضافہ نہ کر

کنعان ظالم تھا اس لیے کہ کافر تھا، موقعہ تھا کہ استثناء کر کے اُس کے لیے ظالم نہ رہنے کی دعاء بھی فرمالیتے اور اگر معلوم نہ تھا تو یہ بدقسمت بیٹے کی بدقسمتی پر ازلی مُہر تھی جو ثبت ہو کر رہی۔

پس جب وقت قبولیتِ دعاء آپہنچا اور کنعان کی سرکشی بدستور رہی تو اب محبتِ پدری کا جوش خدا کے عادلانہ فیصلہ کے سامنے نہ ٹھہر سکا، اور اُس کی نجات کی دعاء پر اپنی نادانی کے اعتراف کے ساتھ عذر خواہی کرنی پڑی، اور بایں ہمہ جلالتِ قدر خدا کے سامنے اپنی بندگی کے اظہار ہی کو بہتر سمجھ کر عبدِ کامل ہونے کا ثبوت پیش فرمایا، اور درگاہِ الٰہی سے شرفِ مغفرت اور قربتِ الٰہی کو حاصل کیا

اہم نتائج (۱) ہر ایک انسان اپنے کردار و عمل کا خود ہی جوابدہ ہے، اس لیے باپ کی بزرگی بیٹے کی نافرمانی کا مداوا اور علاج نہیں بن سکتی اور نہ بیٹے کی سعادت باپ کی سرکشی کا بدل ہوسکتی ہے حضرت نوح (علیہ السلام کی نبوت و پیغمبری کنعان کے کفر کی پاداش کے آڑے نہ آسکی، اور حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی پیغمبرانہ جلالتِ قدر شرکِ آذر کے لیے نجات کا باعث نہ ہوسکی۔

کلٌ یعمل علیٰ شاکلتہ — ہر شخص اپنے اپنے ڈھنگ پر کام کرتا ہے۔

(۲) بری صحبت زہر ہلاہل سے بھی زیادہ قاتل ہے، اور اس کا ثمرہ و نتیجہ ذلت، خسران، اور تباہی کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ انسان کے لیے جس طرح نیکی ضروری شے ہے اس سے زیادہ صحبتِ نیکاں ضروری ہے، اور جس طرح بدی سے بچنا اس کی زندگی کا نمایاں امتیاز ہے، اس سے کہیں زیادہ بروں کی صحبت سے خود کو بچانا ضروری ہے۔

پسرِ نوح با بداں بنشست — خاندانِ نبوتش گم شد
سگِ اصحابِ کہف روزی چند — پۓ نیکاں گرفت مردم شد

صحبتِ صالح ترا صالح کند — صحبتِ طالح ترا طالح کند

(۳) خدائے تعالیٰ پر صحیح اعتماد اور بھروسہ کے ساتھ ظاہری اسباب کا استعمال توکل کے منافی نہیں ہے بلکہ توکل علی اللہ کے لیے صحیح طریق کار ہے۔ تب ہی تو طوفان نوح سے بچنے کے لیے کشتیِ نوح ؑ ضروری ٹھہری۔

(۴) انبیاء علیہم السلام سے پیغمبرِ خدا اور معصوم ہونے کے باوجود بہ تقاضائے بشریت لغزش ہوسکتی ہے مگر وہ اس پر قائم نہیں رہتے بلکہ فوراً منجانب اللہ اُن کو تنبیہ کردی جاتی ہے اور اُس سے ہٹا لیا جاتا ہے حضرت آدم ؑ اور حضرت نوح ؑ کے واقعات اس کے لیے شاہدِ عدل ہیں۔ نیز وہ عالم الغیب بھی نہیں

ہوتے جیساکہ اسی واقعہ میں " فلا تسئلنِ ما لیس لك بہ علم" سے واضح ہے۔

(۵) اگرچہ پاداشِ عمل کا خدائی قانون کائنات کے ہر گوشہ میں اپنا کام کر رہا ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر جرم اور ہر طاعت کی سزا یا جزا، اسی عالم میں مل جائے، کیونکہ یہ کائنات عمل کی کشتِ زار ہے اور پاداشِ کردار کے لیے معاد اور عالم آخرت کو مخصوص کیا گیا ہے تاہم ظلم اور غرور ان دو بدعملیوں کی سزا کسی نہ کسی نہج سے یہاں دنیا میں بھی ضرور ملتی ہے۔

امام ابوحنیفہؒ فرمایا کرتے تھے کہ ظالم اور متکبر اپنی موت سے قبل ہی اپنے ظلم و کبر کی کچھ نہ کچھ سزا ضرور پاتا، اور ذلت و نامرادی کا منہ دیکھتا ہے۔ چنانچہ خدا کے سچے پیغمبروں سے اُلجھنے والی قوموں اور تاریخ کی ظالم و مغرور ہستیوں کی عبرتناک ہلاکت و بربادی کی داستانیں اس دعوے کی بہترین دلیل ہیں۔

حضرت ادریس (علیہ السلام)

قرآنِ عزیز میں ذکرِ مبارک۔ نام، نسب، اختلافِ روایات، نبوت، تبلیغ و تعلیم۔ فلاسفہ کی بے سند باتیں، محاکمہ۔

حضرت ادریس کا ذکر قرآن میں

قرآنِ عزیز میں حضرت ادریس کا ذکر صرف دو جگہ آیا ہے، سورۂ مریم میں اور سورۂ انبیاء میں۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِدْرِيسَ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَبِيًّا وَرَفَعْنَاهُ مَكَانًا عَلِيًّا (مریم)

اور یاد کر قرآن میں ادریس کو بلاشبہ وہ تھے سچے نبی اور بلند کیا ہم نے اُن کا مقام۔

وَإِسْمَاعِيلَ وَإِدْرِيسَ وَذَا الْكِفْلِ كُلٌّ مِّنَ الصَّابِرِينَ

اور اسمٰعیل اور ادریس اور ذوالکفل ان میں سے ہر ایک تھا صبر کرنے والا۔

نام و نسب اور زمانہ

حضرتِ ادریس کے نام، نسب اور زمانہ کے متعلق مورخین کو سخت اختلاف ہے اور تمام اختلافی وجوہ کو سامنے رکھنے کے بعد بھی کوئی فیصلہ کن یا کم از کم راجح رائے نہیں قائم کی جا سکتی، وجہ یہ ہے کہ قرآنِ عزیز نے تو اپنے مقصدِ رشد و ہدایت کے پیشِ نظر تاریخی بحث سے جدا ہو کر صرف ان کی نبوت، رفعتِ مرتبت اور اُن کی صفاتِ عالیہ کا ذکر کیا ہے اور اسی طرح حدیثی روایات بھی اس سے آگے نہیں جاتیں، اس لیے اس سلسلہ میں جو کچھ بھی ہے وہ اسرائیلی روایات ہیں اور وہ بھی تضاد و اختلاف سے معمور ہیں ایک جماعت کہتی ہے کہ وہ جدِ نوح علیہ السلام ہیں اور ان کا نام اخنوخ ہے اور ادریس لقب یا عربی ادریس ہے اور عبرانی یا سریانی اخنوخ اور ان کا نسب نامہ یہ ہے۔

خنوخ یا اخنوخ (ادریس) بن یارد بن مہلائیل بن قینان بن انوش بن شیث بن آدم علیہ السلام۔ ابنِ اسحٰق کا رجحان اسی جانب ہے اور دوسری جماعت کا خیال ہے کہ وہ انبیاء بنی اسرائیل میں سے ہیں اور الیاس و ادریس ایک ہی ہستی کے نام اور لقب ہیں اور ان دونوں روایات کے پیشِ نظر بعض علماء نے یہ تطبیق دینے کی سعی کی ہے کہ جدِ نوح علیہ السلام کا نام اخنوخ ہے اور ادریس لقب اور نبی اسرائیل کے پیغمبر کا نام ادریس ہے اور الیاس لقب۔ مگر یہ رائے بے سند اور بے دلیل ہے بلکہ قرآنِ عزیز کا الیاس اور ادریس کو جدا جدا بیان کرنا شاید اس کو متحمل نہ ہو سکے۔۱؎ صحیح ابن حبّان میں روایت ہے کہ حضرت ادریس وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے قلم کو استعمال کیا۔ ایک حدیث میں ہے کہ نبی اکرم سے کسی نے رمل کے خطوط کے متعلق سوال کیا تو آپ نے فرمایا کہ یہ علم ایک نبی کو

۱؎ ان اختلافات کے مطالعہ کے بعد غالباً آپ اس نوٹ سے اتفاق فرمائیں گے جو صفحہ ۳۲ پر درج ہے، حضرت ادریس سے متعلق مزید اختلافی بحث کے لیے فتح الباری جلد ۹ ص ۲۸۸ اور البدایہ والنہایہ ابن کثیر ص ۱۳۱، ۱۰۲ قابلِ مطالعہ ہیں۔

دیا گیا تھا پس اگر کسی شخص کے نقوش اُس کے مطابق آجاتے ہیں تو نشانہ صحیح بیٹھ جاتا ہے ورنہ نہیں۔

حافظ عماد الدین ابن کثیر ان روایات کے ساتھ یہ بھی نقل فرماتے ہیں کہ بہت سے علماء تفسیر و احکام کا یہ خیال ہے کہ حضرت ادریسؑ ہی پہلے شخص ہیں جنہوں نے رمل کے کلمات ادا کیے[1] اور وہ ان کو "ہرمس الہرامسہ" کا لقب دیتے ہیں اور اُن کی جانب بہت سی غلط باتیں اُسی طرح منسوب کرتے ہیں جس طرح اُن کے علاوہ بہت سے انبیاء، علماء، حکماء اور اولیاء اللہ کے متعلق منسوب کی گئی ہیں۔

معراج کی صحیحین[2] والی حدیث میں صرف اسی قدر ذکر ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ادریس علیہ السلام سے چوتھے آسمان پر ملاقات کی۔

مگر اس کے علاوہ مشہور مفسر ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں ہلال بن یساف کی سند سے ایک روایت نقل کی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے کعب احبار سے دریافت کیا کہ حضرت ادریس سے متعلق اس آیت " ورفعنٰہ مکانا علیا " کا کیا مطلب ہے؟ تو کعب نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ادریس پر ایک مرتبہ یہ وحی نازل فرمائی۔ اے ادریس روزانہ تمام اہلِ عالم جس قدر نیک عمل کریں گے میں اُن سب کے برابر تجھ کو ہر دن اجر عطا کروں گا حضرت ادریس نے یہ سُنا تو اُن کو یہ خواہش پیدا ہوئی کہ میرے اعمال میں روز افزوں اضافہ ہو اور اس لیے عمر کا حصہ طویل ہو جائے تو اچھا ہے۔ اُنھوں نے وحی الٰہی اور اپنے اس خیال کو ایک رفیق فرشتہ پر ظاہر کر کے کہا کہ اس معاملہ میں فرشتۂ موت سے گفتگو کرو تاکہ مجھ کو نیک اعمال کے اضافہ کا زیادہ سے زیادہ موقعہ ملے۔ اس فرشتہ نے جب یہ سُنا تو حضرت ادریس کو اپنے بازوؤں پر بٹھا کر لے اُڑا، جب یہ چوتھے آسمان سے گذر رہے تھے تو فرشتۂ موت زمین کے لیے اُتر رہا تھا۔ وہیں دونوں کی ملاقات ہو گئی۔ دوست فرشتہ نے فرشتۂ موت سے

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ابن کثیر جلد اول ص ۹۹ ؎ ہرمس علم نجوم کے ماہر عالم کو کہتے ہیں، اس لیے ہرمس الہرامسہ کے معنی یہ ہیں کہ ماہرین علم نجوم کا اُستاذ اول۔ ہرمیس یونان کا ایک مشہور منجم گذرا ہے۔

[2] صحیح بخاری باب الاسراء و مسلم جلد اول باب الاسراء

حضرت ادریس کے معاملہ کے متعلق گفتگو کی۔ فرشتۂ موت نے دریافت کیا۔ ادریس ہیں کہاں؟ اُس نے کہا کہ میری پشت پر سوار ہیں، فرشتۂ موت کہنے لگا درگاہِ الٰہی سے یہ حکم ہوا ہے کہ ادریس کی روح چوتھے آسمان پر قبض کروں۔ اس لیے میں سخت حیرت و تعجب میں تھا کہ یہ کیسے ممکن ہے جبکہ ادریس زمین میں ہیں، اسی وقت فرشتۂ موت نے حضرت ادریس کی روح قبض کرلی"۔

یہ واقعہ نقل کر کے کعبِ احبار نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد ورفعنٰہ مکاناً علیّاً کی یہی تفسیر ہے۔

ابنِ جریر کی طرح ابن ابی حاتم نے بھی اپنی تفسیر میں اسی قسم کی روایت نقل کی ہے۔

اِن ہر دو نقول کو روایت کرنے کے بعد حافظ عماد الدین ابنِ کثیر فرماتے ہیں کہ یہ سب اسرائیلی خرافات ہیں اور ان میں روایتی اعتبار سے بھی "نکارت" یعنی ناقابلِ اعتبار اچنبھا ہے۔

اس لیے صحیح تفسیر وہی ہے جو آیت کے ترجمہ میں بیان کی گئی۔

امام بخاریؒ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے یہ منقول ہے کہ الیاس نبی کا ہی نام ادریس ہے اور اُن کے اس قول کی وجہ حضرت انس کی وہ روایت ہے جو زہری نے معراج کے سلسلہ میں بیان کی ہے اُس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور انبیاء علیہم السلام کی آسمان پر ملاقات کا جو ذکر ہے اُس میں کہا گیا ہے کہ جب آپ کی ملاقات حضرت ادریس سے ہوئی تو اُنہوں نے فرمایا "مرحبا بالاخ الصالح" (برادرِ نیک تمہارا آنا مبارک) پس اگر حضرت ادریس اخنوخ ہوتے تو حضرت آدم و حضرت ابراہیم کی طرح "بالابن الصالح" کہتے یعنی نیک بھائی کی جگہ "نیک بیٹے" کے ساتھ خطاب کرتے۔

اس روایت کو نقل کرنے کے بعد ابنِ کثیر فرماتے ہیں کہ یہ دلیل کمزور ہے اس لیے کہ اوّل تو یہ امکان ہے کہ اس طویل حدیث میں راوی الفاظ کی پوری حفاظت نہ کرسکا ہو، دوم ہوسکتا ہے کہ

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جلالتِ قدر اور رفعتِ مرتبت کے پیشِ نظر اُنہوں نے پدری انتساب کو نمایاں نہ کیا ہو اور ازرہِ تواضع برادرانہ حیثیت کو ہی ظاہر کرنا مناسب سمجھا ہو۔

رہا حضرتِ آدم و حضرتِ ابراہیم کا معاملہ سو ایک ابو البشر ہیں اور دوسرے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے زیادہ جلیل القدر اور رفیع الشان پیغمبر جن کے متعلق قرآن نے کہا ہے "فاتبعوا ملة ابراهيم حنيفا"[1] لہٰذا ان کا "ابن" کے ساتھ خطاب کرنا ہر طرح موزوں اور برمحل ہے۔

ابنِ کثیر نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ بعض کہتے ہیں کہ حضرتِ ادریس حضرتِ نوح سے قبل کے نبی نہیں ہیں بلکہ انبیارِ بنی اسرائیل میں سے ایک نبی ہیں۔ اور الیاس ہی ادریس ہیں۔

توراۃ میں ان مقدس نبی کے متعلق صرف اسی قدر لکھا ہے

"اور حنوک (اخنوخ) پینسٹھ برس کا ہوا کہ اُس سے متوشلح پیدا ہوا اور متوشلح کی پیدائش کے بعد حنوک تین سو برس خدا کے ساتھ چلتا تھا، اور اُس سے بیٹے اور بیٹیاں پیدا ہوئیں، اور حنوک کی ساری عمر تین سو پینسٹھ برس کی ہوئی اور حنوک خدا کے ساتھ ساتھ چلتا تھا اور غائب ہو گیا۔ اس لیے کہ خُدا نے اُسے لے لیا۔"[2]

حضرت ادریس حکماء و فلاسفہ کی نظر میں

اور علامہ جمال الدین قطفی نے تاریخ الحکماء[3] میں حضرت ادریس کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے حضرت ادریس کے متعلق علمارِ تفسیر اور اربابِ تاریخ و قصص نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ بہت مشہور ہے، اس لیے اُس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ البتہ حکماء اور فلاسفہ نے خصوصیت کے ساتھ اُنکے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ پیش کیا جاتا ہے۔

حضرت ادریس کا مولد و منشاء (جائے ولادت و پرورش) کہاں ہے، اور انہوں نے نبوت سے

---

[1] آل عمران [2] باب پیدائش آیت ۲۱-۲۴

[3] اس تاریخ کا پورا نام "المنتخبات الملتقطات من کتاب اخبار العلماء باخبار الحکماء" ہے اور علامہ جمال الدین ابو الحسن علی بن یوسف قطفی کی تصنیف ہے اور مختصر زوزنی کے نام سے مشہور ہے۔

پہلے کس سے علم حاصل کیا؟ حکماء اور فلاسفہ کے اقوال ان مسائل میں مختلف ہیں۔

ایک فرقہ کی رائے کہ ان کا نام ہرمس الہرامسہ ہے اور مصر کے قریہ منف میں پیدا ہوئے۔ یونانی ہرمس کو ارمیس[1] کہتے ہیں، ارمیس کے معنی عطارد ہیں۔

اور دوسری جماعت کا خیال ہے کہ ان کا نام یونانی میں طرمیس، عبرانی میں خنوخ اور عربی میں اخنوخ ہے۔ اور قرآنِ عزیز میں ان کو اللہ تعالیٰ نے ادریس کہا ہے یہی جماعت کہتی ہے کہ ان کے استاذ کا نام غوثاذیمون یا اغوثاذیمون (مصری) ہے۔ وہ غوثاذیمون کے متعلق اس سے زیادہ اور کچھ نہیں بتاتے کہ وہ یونان یا مصر کے انبیاء میں سے ایک نبی ہیں اور یہ جماعت ان کو اورینِ دوم اور حضرت ادریس کو اورین سوم کا لقب دیتی ہے۔ اور غوثاذیمون کے معنی "سعد اور بہت نیک بخت" ہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہرمس نے مصر سے نکل کر اقطارِ عالم کی سیر کی اور تمام دنیا کو چھان ڈالا اور جب مصر واپس ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے اُن کو بیاسی سال کی عمر میں اپنی جانب اُٹھا لیا۔

ایک تیسری جماعت یہ کہتی ہے کہ ادریس بابل میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما پائی اور اوائل عمر میں اُنھوں نے حضرت شیث بن آدم سے علم حاصل کیا۔ علمِ کلام کے مشہور عالم علامہ شہرستانی کہتے ہیں کہ اغثاذیمون حضرت شیث علیہ السلام ہی کا نام ہے۔

اور جب حضرت ادریس سِنِ شعور کو پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے اُن کو نبوت سے سرفراز فرمایا، تب اُنھوں نے شریر اور مفسدوں کو راہِ ہدایت کی تبلیغ شروع کی مگر مفسدوں نے اُن کی ایک نہ سُنی اور حضرت آدم و شیث کی شریعت کے مخالف ہی رہے۔ البتہ ایک چھوٹی سی جماعت ضرور مشرف باسلام ہوگئی۔

---

[1] ارمیس یا ہرمیس یونان کا ایک مشہور منجم اور ماہر فلکیات حکیم تھا اسی لیے اُس کو ارمیس (عطارد) کہتے تھے یونانی غلطی سے ادریس اور ارمیس کو ایک ہی شخص تسلیم کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ ایسی فاش غلطی ہے جس کے لیے کوئی دلیل نہیں۔

حضرت ادریس نے جب یہ رنگ دیکھا تو وہاں سے ہجرت کا ارادہ کیا اور اپنے پیروؤں کو بھی ہجرت کی تلقین فرمائی، متبعین نے جب یہ سُنا تو ان کو ترکِ وطن بہت شاق گذرا اور کہنے لگے کہ بابل جیسا وطن ہم کو کہاں نصیب ہو سکتا ہے[1]۔ حضرت ادریس نے تسلّی دیتے ہوئے فرمایا کہ اگر تم یہ تکلیف اللہ کی راہ میں اُٹھاتے ہو تو اُس کی رحمتِ وسیع اس کا نعم البدل ضرور عطا کریگی، پس ہمت نہ ہارو اور خدا کے حکم کے سامنے سرِ نیاز جُھکا دو۔

مسلمانوں کی رضامندی کے بعد حضرت ادریس اور اُنکی جماعت مصر کی جانب ہجرت کر گئی۔ جماعت نے جب نیل کی روانی اور اُس کی سرزمین کی شادابی دیکھی تو بہت خوش ہوئی۔ اور حضرت ادریس نے یہ دیکھ کر اپنی جماعت سے فرمایا۔ بابلیون[2] (تمہارے بابل کی طرح شاداب مقام) اور ایک بہترین جگہ منتخب کر کے نیل کے کنارے بس گئے۔ حضرت ادریس کے اس جملہ "بابلیون" نے ایسی شہرت پائی کہ عرب کے علاوہ قدیم اقوام اس سرزمین کو بابلیون ہی کہنے لگیں۔ البتہ عرب نے اس کا نام مصر بتایا اور اس کی وجہ تسمیہ یہ سنائی کہ طوفانِ نوح کے بعد یہ مصر بن حام کی نسل کا مسکن و موطن بنا ہے۔

حضرت ادریس اور اُن کی پیرو جماعت نے جب مصر میں سکونت اختیار کر لی تو یہاں بھی پیغامِ الٰہی اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض انجام دینا شروع کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے زمانہ میں بہتر زبانیں بولی جاتی تھیں، اور خدائے تعالیٰ کی عطا و بخشش سے یہ وقت کی تمام زبانوں کے زباں داں تھے۔ اور ہر ایک جماعت کو اُسی کی زبان میں تبلیغ فرمایا کرتے تھے[3]۔

حضرت ادریس نے دینِ الٰہی کے پیغام کے علاوہ سیاستِ مُدن اور شہری زندگی اور بود و ماند کے متمدن طریقوں کی بھی تعلیم و تلقین کی اور اس کے لیے اُنھوں نے ہر ایک فرقہ و جماعت سے

---

[1] بابل کے معنی نہر کے ہیں اور چونکہ بابل دجلہ و فرات کی نہروں سے سرسبز و شاداب تھا اس لیے اس نام سے موسوم ہوا۔ یہ عراق کا مشہور شہر تھا جو فنا ہو گیا۔ [2] بابلیون کے معنی میں مختلف اقوال ہیں۔ مثلاً تمہاری طرح کی نہر، مبارک نہر۔ مگر سب سے بہتر قول یہ ہے کہ "یون" سریانی میں تفضیل کی علامت ہے اور معنی ہیں "بڑی نہر"

طلبا، جمع کیے اور اُن کو مدنی سیاست اور اُس کے اصول و قواعد سکھائے۔ جب یہ طلبہ کامل و ماہرین کر اپنے قبائل کی طرف لوٹے تو اُنہوں نے شہر اور بستیاں آباد کیں جن کو مدنی اصول پر بسایا، ان شہروں کی تعداد کم و بیش دو صد کے قریب تھی، جن میں سب سے چھوٹا شہر رُہا[1] تھا۔

حضرت ادریس نے ان طلبہ کو دوسرے علوم کی بھی تعلیم دی جس میں علمِ حکمت اور علم نجوم جیسے علوم بھی شامل ہیں۔

حضرت ادریس پہلی ہستی ہیں جنہوں نے علم حکمت و نجوم کی ابتدا کی۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو افلاک اور اُن کی ترکیب، کواکب اور اُن کے اجتماع و افتراق کے نقاط اور اُن کے باہم کشش کے اسرار اور بھیدوں کی تعلیم دی اور اُن کو علمِ عدد و حساب کا عالم بنایا۔ اور اگر اس پیغمبر کے ذریعہ ان علوم کا انکشاف نہ ہوتا تو انسانی طبائع کی وہاں تک رسائی مشکل تھی۔ انہوں نے مختلف گروہوں اور اُمتوں کے لیے اُن کے مناسبِ حال قوانین و قواعد مقرر فرمائے اور اقطاعِ عالم کو چار حصوں پر منقسم کر کے ہر ربع کے لیے ایک حاکم مقرر کیا جو اس حصہ زمین کی سیاست و ملکیت کا ذمہ دار قرار پایا۔ اور ان چاروں کے لیے ضروری قرار دیا کہ تمام قوانین سے مقدم شریعت کا وہ قانون رہیگا جس کی تعلیم وحی الٰہی کے ذریعہ میں نے تم کو دی ہے۔

اس سلسلے کے سب سے پہلے چار بادشاہوں کے نام حسب ذیل ہیں :-

(۱) ایلاوس (بمعنی رحیم) (۲) زوس (۳) اسقلیبوس (۴) زوس امون یا ایلاوس امون یا بسیلوخس

حضرت ادریس کی تعلیم کا خلاصہ

خدا کی ہستی اور اُس کی توحید پر ایمان لانا، صرف خالقِ کائنات کی پرستش کرنا، آخرت کے عذاب سے رستگاری کے لیے اعمال صالحہ کو ڈھال بنانا، دنیا سے بے التفاتی اور تمام امور میں عدل و انصاف کو پیشِ نظر رکھنا اور مقررہ طریقہ پر عبادتِ الٰہی ادا کرنا، اور ایام بیض[2]

[1] یہ شہر صفحۂ عالم سے مٹ گیا مگر اس کے کھنڈرات باقی ہیں۔ [2] ہر ماہ قمری کی ۱۴، ۱۵، ۱۶ تاریخ۔

کے روزے رکھنا، دشمنانِ اسلام سے جہاد کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، اور طہارت و نظافت سے رہنا خصوصیت کے ساتھ جنابت، کتے اور سُوّر سے اجتناب کرنا، ہر نشہ آور شے سے پرہیز کرنا اُن کی تعلیم کا لبِ لباب ہے۔

انہوں نے اپنے پیرووں کے لیے بحکم الٰہی سال میں چند دن عید کے مقرر فرمائے اور چند مخصوص اوقات میں نذر اور قربانی دینا فرض قرار دیا۔ ان میں سے بعض رویتِ ہلال پر ادا کی جاتی تھیں اور بعض اُس وقت جبکہ سورج کسی بُرج میں داخل ہونے لگا ہو۔ اور بعض جبکہ سیارے اپنے بیوت و بُرجِ شرف میں داخل ہوں اور بعض سیارے بعض سیاروں کے مقابل آجائیں۔

نذرِ الٰہی کے طریقے اللہ تعالیٰ کے سامنے نذر و قربانی پیش کرنے کے لیے اُن کے یہاں تین چیزیں اہمیت رکھتی تھیں۔ خوشبوؤں کی دُھونی، جانوروں کی قربانی، اور شراب[1]۔ اور ان کے علاوہ میووں پھلوں اور پھولوں وغیرہ میں سے موسم کی پہلی چیز کی نذر ضروری تھی۔ اور میووں میں سے سیب کو اناج میں سے گیہوں کو اور پھولوں میں سے گلاب کو ترجیح حاصل تھی۔

بعد میں آنے والے نبیوں کے متعلق بشارت حضرت ادریسؑ نے اپنی امت کو یہ بھی بتایا کہ میری طرح اس عالم کی دینی و دنیوی اصلاح کے لیے بہت سے انبیاء علیہم السلام تشریف لائینگے اور اُن کی نمایاں خصوصیات یہ ہونگی۔ (۱) وہ ہر ایک بُری بات سے بری اور پاک ہونگے (۲) قابلِ ستائش اور فضائل میں کامل ہونگے، زمین و آسمان کے احوال سے اور ان امور سے کہ جن میں کائنات کے لیے شفا ہے یا مرض وحی الٰہی کے ذریعہ اس طرح واقف ہونگے کہ کوئی سائل تشنہ کام نہ رہیگا۔ وہ مستجاب الدعوات ہونگے، اور اُن کی اور اُن کے مذہب کی دعوت کا خلاصہ "اصلاحِ کائنات" ہوگا۔

حضرت ادریسؑ کی خلافت ارضی جب حضرت ادریسؑ خدا کی زمین کے مالک بنا دیے گئے تو اُنھوں نے

---

[1] حکما کا یہ تضادِ بیان حیرت میں ڈالتا ہے کہ ایک جانب تو وہ شریعت ادریسی میں شراب کو حرام بتاتے ہیں اور دوسری جانب خدا کی جناب میں شراب کی قربانی و نذر کو مقبول کہتے ہیں۔ ان ھٰذا لشیٔ عجاب۔

علم و عمل کے اعتبار سے خدا کی مخلوق کو تین طبقات میں تقسیم کر دیا، کاہن، بادشاہ، رعیت اور حسب ترتیب اُن کے مراتب مقرر فرمائے، کاہن سب سے پہلا اور بلند درجہ قرار پایا، اس لیے کہ وہ خدائے تعالیٰ کے سامنے اپنے نفس کے علاوہ بادشاہ اور رعیت کے معاملات میں بھی جوابدہ ہے۔ اور بادشاہ دوسرا درجہ رکھا گیا اس لیے کہ وہ اپنے نفس اور امورِ مملکت کے متعلق جوابدہ ہے، اور رعیت صرف اپنے نفس ہی کے لیے جوابدہ ہے۔ اس لیے وہ تیسرے طبقہ میں شامل ہے لیکن یہ طبقات فرائض کے اعتبار سے تھے نہ کہ نسل و خاندان کے امتیازات کے لحاظ سے۔ بہرحال حضرت ادریسؑ "رفع الی اللہ" تک ان ہی قوانینِ شریعت و سیاست کی تبلیغ فرماتے رہے۔

مذکورہ بالا چار بادشاہوں میں سے اسقلیبوس بہت پختہ عزم و ارادہ کا بادشاہ تھا اُس نے حضرتِ ادریس کے کلمات کی حفاظت اور قوانینِ شریعت کی نگہداشت خوب کی، اور حضرت ادریسؑ کے اُٹھا لیے جانے پر بے حد حزن و ملال کا اظہار کیا اور ہیکلوں میں اُن کی اور اُن کے رفع کی حالت کی تصاویر بنوائیں۔

اسقلیبوس اُس خطہ پر حکومت کرتا تھا جو طوفانِ نوح کے بعد خطۂ یونان کہلایا، یونانیوں نے طوفان کی تباہ کاریوں سے بچے ہوئے ٹوٹے پھوٹے ہیکلوں میں جب حضرت ادریس کے مجسمہ اور اُن کے رفع کی تصویر کو دیکھا اور ساتھ ہی اسقلیبوس کی عظمت اور ہیاکل میں حکمت و فلسفہ کی تدوین کا شہرہ سُنا تو اُن کو یہ غلط فہمی ہو گئی کہ اسقلیبوس ہی وہ ہستی ہے جس کا "رفع" ہوا، حالانکہ یہ صریح غلطی ہے جو محض اٹکل و تخمین سے اُنہوں نے اختیار کی۔

حضرت ادریس کا حلیہ حضرت ادریس کا حلیہ یہ ہے: گندم گوں رنگ، پورا قد و قامت، سر پر بال کم، خوبصورت و خوبرو، گھنی داڑھی، رنگ و روپ اور چہرہ کے خطوط میں ملاحت، مضبوط بازو، چوڑے مونڈھے، مضبوط ہڈی، دُبلے پتلے، سرگیں چمکدار آنکھیں، گفتگو باوقار، خاموشی پسند، سنجیدہ اور متین، چلتے ہوئے نیچی نظر

انتہائی فکر و خوض کے عادی، غصہ کے وقت سخت غضبناک، باتیں کرنے میں شہادت کی انگلی سے بار بار اشارہ کے عادی، اور بیاسی سال کی عمر پائی۔

اُن کی انگوٹھی پر یہ عبارت کندہ تھی۔

الصبر مع الایمان باللہ یورث الظفر — اللہ پر ایمان کے ساتھ ساتھ صبر فتحمندی کا باعث ہے

اور کمر سے باندھنے والے پٹکہ پر یہ تحریر تھا۔

الاعیاد فی حفظ الفروض، والشریعۃ من تمام الدین وتمام الدین کمال المروۃ۔ — حقیقی عیدیں اللہ تعالیٰ کے فرائض کی حفاظت میں پوشیدہ ہیں، اور دین کا کمال شریعت سے وابستہ ہے اور مروت میں کمال، دین کی تکمیل ہے

اور نماز جنازہ کے وقت جو پٹکہ باندھتے اُس پر حسب ذیل جملے ثبت ہوتے

السعید من نظر لنفسہ، وشفاعتہ عند ربہ اعمالہ الصالحہ — سعادت مند وہ ہے جو اپنے نفس کی نگرانی کرے اور پروردگار کے سامنے انسان کے شفیع اُس کے اپنے نیک اعمال ہیں۔

حضرت ادریسؑ کے بہت سے پند و نصائح اور آداب اخلاق کے جملے مشہور ہیں جو مختلف زبانوں میں ضرب المثل اور رموز و اسرار کی طرح مستعمل ہیں۔ اُن میں سے بعض درج ذیل ہیں۔

(۱) خدا کی بیکراں نعمتوں کا شکریہ انسانی طاقت سے باہر ہے۔

(۲) جو علم میں کمال اور عمل صالح کا خواہشمند ہو اُس کو جہالت کے اسباب اور بدکرداری کے قریب بھی نہ جانا چاہیے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ ہر فن مولا کاریگر اگر سینے کا ارادہ کرتا ہے تو سوئی ہاتھ میں لیتا ہے نہ کہ برما۔ پس ہر وقت یہ پیش نظر رہے۔

ہم خدا خواہی وہم دنیائے دوں — ایں خیال ست و محال ست و جنوں

(۳) دنیا کی بھلائی "حسرت" ہے اور بُرائی "ندامت"

(۴) خدا کی یاد، اور عملِ صالح کے لیے خلوصِ نیت شرط ہے۔

(۵) نہ جھوٹی قسمیں کھاؤ، نہ اللہ تعالیٰ کے نام کو قسموں کے لیے تختۂ مشق بناؤ، اور نہ جھوٹوں کو قسمیں کھانے پر آمادہ کرو، کیونکہ ایسا کرنے سے تم بھی شریکِ گناہ ہو جاؤ گے۔

(۶) ذلیل پیشوں کو اختیار نہ کرو (جیسے سینگی لگانا، جانوروں کے جفتی کرانے پر اُجرت لینا وغیرہ)

(۷) اپنے بادشاہوں کی (جو کہ پیغمبر کی جانب سے احکامِ شریعت کے نفاذ کے لیے مقرر کیے جاتے ہیں) اطاعت کرو اور اپنے بڑوں کے سامنے پست رہو، اور ہر وقت حمدِ الٰہی میں اپنی زبان کو تر رکھو

(۸) حکمت، روح کی زندگی ہے۔

(۹) دوسروں کی خوش عیشی پر حسد نہ کرو اس لیے کہ اُن کی یہ مسرور زندگی چند روزہ ہے۔

(۱۰) جو ضروریاتِ زندگی سے زیادہ طالب ہوا وہ کبھی قانع نہ رہا۔

تاریخ الحکماء کے صفحہ ۳۴۵ پر ہرمس ثالث کے تذکرہ میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ علماء کی ایک جماعت کا یہ عقیدہ ہے کہ طوفانِ نوح سے قبل دنیا میں جس قدر علوم شائع ہوئے اُن سب کے معلّم اول یہی ہرمس اول ہیں جو مصر کے حصّۂ اعلیٰ کے متوطن تھے اور عبرانی حضرات اُن کو خنوخ نبی مانتے ہیں اور جو اپنے نسب میں حضرت آدم کے پروتے ہیں۔ یعنی خنوخ (ادریس) بن یارد بن مہلائیل بن قینان، بن انوش، بن شیث، بن آدم (علیہم السلام)

اُن کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ فلسفہ کی کتابوں میں جن علمی جواہر اور حرکاتِ نجوم کا تذکرہ آتا ہے سب سے پہلے اُن کا ذکر ان ہی کی زبان سے ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے ہیکلوں کی تعمیر، علمِ طب کی ایجاد، ارضی و سماوی اشیاء کے متعلق موزوں قصائد کے ذریعہ اظہارِ خیال بھی ان ہی کی اولیات میں سے ہیں۔ اور اُنہوں نے ہی سب سے پہلے طوفان کی اطلاع دے کر بندگانِ خدا کو ڈرایا اور بتایا کہ اُن کو دکھایا گیا ہے کہ ایک آسمانی آفت ہے جو زمین کو پانی اور آگ میں لپیٹ رہی ہے۔ انہیں یہ دیکھ کر علوم کی

بربادی اور صنعت و حرفت کی تباہی کا خوف ہوا اور اس لیے اُنھوں نے مصر میں اہرام اور برابی بنائے اور ان میں تمام صنائع اور نوایجاد آلات کی تصاویر بنوائیں اور تمام علوم کے حقائق و اوصاف کو منقش کیا تاکہ یہ علوم و صناعات تا ابد باقی رہیں اور فنا کا ہاتھ اُن کو گزند نہ پہنچا سکے۔[1]

محاکمہ حکما اور حکمت و فلسفہ کی کتب قدیمہ کی ان یاوہ گویوں اور بے سروپا باتوں کا یہ خلاصہ ہے جو حضرت ادریس کے متعلق افسانوی حیثیت میں گھڑا گیا ہے کہ جس کو نہ عقل تسلیم کرتی ہے اور نہ نقل اُس کی تائید میں ہے۔ بلکہ تحقیق اور صحیح علمِ تاریخ کے شواہد ان میں سے اکثر باتوں کی خرافات کو آج اس طرح ظاہر کر رہے ہیں کہ جس کا انکار حقیقت کے انکار کے مرادف ہے مثلاً اہرام و برابی کی تاریخ آج جدید اکتشافات کی بدولت ہمارے سامنے بے نقاب ہے اور اہرام اور ان مقابر کی کھدائی نے علوم و نقوش، اور صنائع کی تصاویر کے بنانے والوں، اور اُن کے مختلف زمانوں میں مختلف مدارج کے ترقی دینے والوں کے نام اُن کے اجسام اور اُن کے زر و جواہر کے خزانوں، اور مختلف زمانوں کی تحریروں، اور رسم الخط کی ترکیبوں کو سامنے لاکر روزِ روشن کی طرح آشکارا کر دیا ہے۔ کہاں وہ حقیقتیں اور کہاں یہ دور از کار باتیں۔ آج مینا، خوفو، منقرع اور طوطامن خامن وغیرہ بادشاہوں کے حالات سے کون آشنا نہیں ہے۔

تاہم ان بے سروپا باتوں کو بھی نقل کر دینا اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ یہ آگاہی رہے کہ اِن پیغمبر کے متعلق حکما کی کتابوں میں بھی کس قسم کی دور از کار باتیں درج ہیں۔

اس سلسلہ میں بس اُسی قدر سچ اور حق ہے جس کو ہم قرآنِ عزیز اور احادیث صحیحہ سے نقل کر آئے ہیں یا توقف کے درجہ میں وہ چند جملے جو توراۃ سے نقل کیے گئے ہیں۔ یا وہ اقوال جو پیغمبرانہ تعلیمات کے شایانِ شان ہیں۔

---

[1] تاریخ الحکماء، جلد ۱ (نوٹ) برابی ایسے ہیکل جو چلہ کشی کیلیے چہار جانب سے بند ہوں۔

حضرت ہُود (علیہ السلام)

قرآنِ عزیز میں ہود (علیہ السلام) کا ذکر، ہود کا نسب، عاد کی بستیاں، اُن کا طریقِ عبادت، عاد کی ہلاکت، ہود اور قومِ ہود کے واقعہ سے اخذِ عبرت۔

قرآنِ عزیز میں ہود کا ذکر

قرآنِ عزیز میں حضرت ہود (علیہ السلام) کا سات جگہ ذکر آیا ہے جو ذیل کے نقشہ سے ظاہر ہوتا ہے۔

نمبر شمار	سورۃ	آیات
۱	اعراف	۶۵
۲	ہود	۵۰، ۵۳، ۵۸، ۶۰، ۸۹۔
۳	شعراء	۱۲۴

قرآنِ عزیز میں عاد کا ذکر

اور عاد کا ذکر نو سورتوں میں ہوا ہے یعنی اعراف، ہود، مؤمنون، شعراء، فصّلت، احقاف، الذاریات، القمر اور الحاقہ میں۔

قومِ عاد

اس سے قبل کہ ہم عاد کے متعلق تفصیلی بحث کریں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ قرآنِ عزیز کے علاوہ کوئی تاریخ کی کتاب یا توراۃ عاد کے متعلق روشنی نہیں ڈالتی۔ اس لیے اس قوم کے حالات کا نقشہ یا قرآنِ عزیز کے ذریعہ بن سکتا ہے اور یا پھر اُن اثریات کے ذریعہ جو محققینِ علم الآثار نے اس راہ میں حاصل کی ہیں

پہلا ذریعہ قطعی اور یقینی ہے اس لیے اُس کے بیان کردہ حصّہ کو بھی بلا شبہ قطعیت حاصل ہے

اور دوسرا ذریعہ تخمینی اور قیاسی، اس لیے اُس کے بیان کردہ واقعات کی حیثیت ظن و تخمین سے آگے نہیں جاتی۔

عاد، عرب کے قدیم قبیلہ یا امم سامیہ کے صاحبِ قوت و اقتدار افرادِ جماعت کا نام ہے۔ تاریخ قدیم کے بعض یورپی مصنفین عاد کو ایک فرضی کہانی (میتھالوجی) یقین کرتے ہیں۔ مگر اُن کا یہ تیقن بالکل غلط اور سراسر وہم ہے۔ اس لیے کہ جدید تحقیقات کا یہ مسلّم فیصلہ ہے کہ عرب کے قدیم باشندے کثرتِ افراد و قبائل کے اعتبار سے ایک باعظمت و سطوت جماعت تھی جو عرب سے نکل کر شام، مصر اور بابل کی طرف بڑھی اور وہاں زبردست حکومتوں کی بنیاد ڈالی۔ اب فرق صرف اس قدر ہے کہ عرب ان باشندوں کو امم بائدہ (ہلاک ہو جانے والی قومیں) یا عربِ عاربہ (خالص عرب) اور ان کی مختلف جماعتوں کے افراد کو عاد، ثمود، طسم، اور جدیس کہتے ہیں[1]۔ اور مستشرقین یورپ (امم سامیہ) نام رکھتے ہیں۔ پس اصطلاحات و تعبیرات کے فرق سے حقیقت و واقعہ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ اس لیے قرآنِ عزیز نے ان کو عادِ اولیٰ کہا ہے کہ یہ واضح ہو جائے کہ عرب کی قدیم قوم بنو سام اور عاد اولیٰ ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔

اہل جغرافیہ کا قول ہے کہ لفظ عرب دراصل عربہ تھا جس کے معنی صحرا اور بادیہ کے ہیں خود عربی زبان میں اعراب اہل بادیہ کو کہتے ہیں اور عرابہ کے معنی بدویت کے آتے ہیں۔

اور بعض اہل تحقیق کی رائے یہ ہے کہ عرب اصل میں غرب (غین معجمہ کے ساتھ) تھا۔ اور چونکہ اس کا جائے وقوع فرات کے غرب میں ہے اس لیے وہ آرامی قومیں (امم سامیہ) جو کہ فراتِ غربی پر آباد تھیں وہ اول غرب اور پھر غین کے نقطہ کے سقوط کے بعد عرب کہلائیں۔

ان میں سے عرب کی وجہ تسمیہ جو بھی صحیح ہو یہ حقیقت ہے کہ یہ "مقام" قدیم امم سامیہ یا بدوی جماعتوں یا عاد کا مسکن تھا۔ اس لیے عاد بغیر کسی اختلاف کے عرب نژاد تھے۔ اور لفظ عاد عربی ہے نہ کہ عجمی جس کے معنی

---

[1] معجم البلدان ص ۱۲۹ جلد ۶

عبرانی میں "بلند و مشہور" کے ہیں۔ قرآنِ عزیز میں عاد کے ساتھ ارم کا لفظ لگا ہوا ہے اور ارم (سام) کے معنی بھی "بلند و مشہور" ہی کے ہیں۔ ان ہی عاد کو توراۃ کی غلط پیروی میں کہیں کہیں عمالقہ بھی کہا گیا ہے۔

عاد کا زمانہ عاد کا زمانہ تقریباً دو ہزار قبل حضرت مسیح علیہ السلام مانا جاتا ہے۔ اور قرآنِ عزیز میں عاد کو "من بعد قوم نوح" کہہ کر قومِ نوح کے خلفاء میں سے شمار کیا ہے۔ اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ شام کی دوبارہ آبادی کے بعد امم سامیہ کی ترقی عاد ہی سے شروع ہوتی ہے۔

عاد کا مسکن عاد کا مرکزی مقام ارضِ احقاف ہے یہ حضرموت کے شمال میں اس طرح واقع ہے کہ اس کے شرق میں عمان ہے اور شمال میں ربع الخالی۔ مگر آج یہاں ریت کے ٹیلوں کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اور بعض مورخین کہتے ہیں کہ اُن کی آبادی عرب کے سب سے بہترین حصہ حضرموت اور یمن میں خلیج فارس کے سواحل سے حدود عراق تک وسیع تھی اور یمن اُن کا دارالحکومت تھا۔

عاد کا مذہب عاد بُت پرست تھے اور اپنے پیشرو قومِ نوح کی طرح صنم پرستی اور صنم تراشی میں ماہر تھے۔ تاریخ قدیم کے بعض ماہرین کہتے ہیں کہ اُن کے معبودانِ باطل بھی قومِ نوح کی طرح وُدّ، سواع، یغوث، یعوق، اور نسر ہی تھے۔ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک اثر مروی ہے۔ اُس میں ہے کہ اُن کے ایک صنم کا نام صمود اور ایک کا نام ہتار تھا۔

حضرت ہود عاد اپنی مملکت کی سطوت و جبروت، جسمانی قوت و صولت کے غرور میں ایسے چمکے کہ انہوں نے خدائے واحد کو بالکل بھلا دیا اور اپنے ہاتھوں کے بنائے ہوئے بتوں کو اپنا معبود مان کر ہر قسم کے شیطانی اعمال بے خوف و خطر کرنے لگے تب اللہ تعالیٰ نے ان ہی میں سے ایک پیغمبر حضرت ہود کو مبعوث فرمایا۔

---

[1] عبدالوہاب نجار کہتے ہیں کہ مجھ سے سید عبداللہ بن احمد بن عمر بن یحییٰ علوی نے (جو حضرموت کے باشندہ ہیں) بیان کیا کہ وہ ایک جماعت کے ساتھ ان ہلاک شدہ قوموں کے قدیم مساکن کے کھوج میں حضرموت کے شمالی میدان میں مقیم تھے، طویل جدوجہد کے بعد ہم نے مرمر کے بعض ظروف کو ریت کے ٹیلوں کی کھدائی میں حاصل کیا جن پر خط مسماری میں تحریر تھا۔ مگر افسوس کہ مالیہ کی کمی نے اس عظیم الشان مہم کو پورا نہ ہونے دیا۔ قصص الانبیاء صفحہ ۷۱

حضرت ہود عاد کے سب سے زیادہ معزز قبیلہ خلود کے ایک فرد تھے۔ سُرخ وسپید رنگ اور وجیہ تھے۔ اُن کی داڑھی بڑی تھی۔

تبلیغ اسلام — انہوں نے اپنی قوم کو اللہ تعالیٰ کی توحید اور اُس کی عبادت کی طرف دعوت دی اور لوگوں پر ظلم وجور کرنے سے منع فرمایا۔ مگر عاد نے ایک نہ مانی اور اُن کو سختی کے ساتھ جھٹلایا اور غرور وتکبر کے ساتھ کہنے لگے "من اشدّ منّا قوۃ" آج دنیا میں ہم سے زیادہ شوکت وجبروت کا کون مالک ہے؟ مگر حضرت ہود مسلسل اسلام کی تبلیغ میں لگے رہے، وہ اپنی قوم کو عذابِ الٰہی سے ڈراتے، غرور وسرکشی کے نتائج بتاتے، قوم نوح کے واقعات یاد دلاتے۔ اور کبھی ارشاد فرماتے:۔

اے قوم! اپنی جسمانی طاقت اور حکومت کے جبروت پر گھمنڈ نہ کر بلکہ خدا کا شکر ادا کر کہ اُس نے تجھ کو یہ دولت بخشی، قوم نوح کی تباہی کے بعد تجھ کو زمین کا مالک بنایا، خوش عیشی، فارغ البالی اور خوشحالی عطا کی لہذا اُس کی نعمتوں کو نہ بھول اور خود ساختہ بتوں کی پرستش سے باز آ جو نہ نفع پہنچا سکتے ہیں، اور نہ دکھ دے سکتے ہیں، موت وزیست، نفع وضرر سب ایک خدا ہی کے ہاتھ میں ہے اے افرادِ قوم! مانا، کہ تم عرصہ تک سرکشی اور اُس کی نافرمانی میں مبتلا رہے ہو، مگر آج بھی اگر توبہ کر لو، اور باز آ جاؤ تو اُس کی رحمت وسیع ہے اور دروازۂ توبہ بند نہیں ہوا۔ اُس سے مغفرت چاہو وہ بخش دیگا، اُس کی طرف رجوع ہو جاؤ، وہ معاف کر دیگا۔ تقویٰ وطہارت کی زندگی اختیار کر لو وہ تم کو دن دونی رات چوگنی ترقی عطا کریگا، بیش از بیش عزت دیگا، اور مال وعزت میں سرفرازی بخشیگا۔

حضرت ہود اپنی تبلیغ اور پیغام حق کے ساتھ ساتھ بار بار یہ بھی دُہراتے کہ میں تم سے کسی اجر وعوض کا خواہاں نہیں ہوں۔ میرا اجر تو خدا ہی کے پاس ہے۔ اور یہ نبی کی زندگی کا طرۂ امتیاز ہے، اُس کو کوئی یہ تہمت نہیں لگا سکتا کہ وہ مال کی طلب میں ایسا کرتے ہیں، یا عزت وجاہ اور ریاست کے طالب ہیں۔ وہ نہ قوم سے اپنی ریاست وعزت کے طالب ہوتے ہیں اور نہ مال ومنال کے۔ اُن کے

سامنے تو صرف ایک ہی نقطہ ہوتا ہے اور وہ ادائے فرض اور اپنے مالک حقیقی کے احکام کی پیغامبری۔

عاد میں ایماندار تو چند ہی تھے باقی تمام سرکش اور متمرد انسانوں کا گروہ تھا، اُن کو حضرت ہود کی یہ نصائح سخت شاق گذرتی تھیں، اور وہ یہ نہیں برداشت کر سکتے تھے کہ اُن کے خیالات، اُن کے عقائد و اعمال، غرض اُن کے کسی ارادہ میں بھی کوئی شخص حائل ہو اور اُن کے لیے ناصح مشفق بنے۔ اس لیے اب اُنہوں نے یہ روش اختیار کی کہ حضرت ہود کی مذاق اُڑائی، اُن کو بے وقوف گردانا اور اُن کی معصومانہ حقانیتوں اور صداقتوں کی تمام یقینی دلائل و براہین کو جھٹلانا شروع کر دیا اور حضرت ہود سے کہنے لگے۔

يٰهُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ وَمَا نَحْنُ — اے ہود۔ تو ہمارے پاس ایک دلیل بھی نہ لایا، اور تیری
بِتَارِكِيْٓ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَمَا — کہنے سے ہم اپنے خداؤں کو چھوڑنے والے نہیں، اور
نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ۔ (ہود) — نہ ہم تجھ پر ایمان لانے والے۔

ہم اس ڈھونگ میں آنے والے نہیں کہ تجھ کو خدا کا رسول مان لیں اور اپنے خداؤں کی عبادت چھوڑ کر یہ یقین کر لیں کہ وہ خدائے اکبر کے سامنے ہمارے سفارشی نہیں ہونگے۔

حضرت ہود نے اُن سے کہا کہ نہ میں بے وقوف ہوں اور نہ پاگل۔ بلاشبہ خدا کا "رسول" اور پیغمبر ہوں، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی ہدایت کے لیے بے وقوف کو منتخب نہیں کیا کرتا کہ اُس کا نقصان اُس کے نفع سے بڑھ جائے اور ہدایت کی جگہ گمراہی آجائے وہ اس عظیم الشان خدمت کے لیے اپنے بندوں میں سے ایسے شخص کو چُنتا ہے جو ہر طرح اُس کا اہل ہو اور اس خدمتِ حق کو بخوبی انجام دے سکے۔

اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ — اور اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا ہے کہ اپنے منصب رسالت کو کس جگہ رکھے۔

مگر قوم کی سرکشی اور مخالفت بڑھتی ہی رہی اور اُن پر آفتاب سے زیادہ روشن دلائل و نصائح کا مطلق

اثر نہ ہوا۔ اور وہ حضرت ہودؑ کی تکذیب و تذلیل کے اور زیادہ درپے ہو گئے اور (العیاذ باللہ) مجنون اور خبطی کہہ کر اور زیادہ مذاق اُڑانے لگے۔ اور کہنے لگے کہ جب سے تو نے ہمارے معبودوں کو بُرا کہنا اور ہم کو اُن کی عبادت سے باز رہنے کے لیے تلقین کرنا شروع کیا ہے ہم دیکھتے ہیں اُس وقت سے تیرا حال خراب ہو گیا ہے اور ہمارے خداؤں کی بددُعا سے تو پاگل و مجنوں ہو گیا ہے تو اب ہم اس کے علاوہ تجھ کو اور کیا سمجھیں۔

اُن کو اپنی اس گستاخانہ جرأت و ہمت سے یہ خیال ہو چلا تھا کہ اب کوئی شخص اس کی طرف دھیان نہ دیگا، اور اس کی باتوں کو توجہ سے نہ سُنیگا۔

حضرت ہودؑ نے یہ سب کچھ نہایت ضبط و صبر سے سُنا اور پھر اُن سے یوں مخاطب ہوئے۔

میں خدا کو اور تم سب کو گواہ بنا کر سب سے پہلے یہ اعلان کرتا ہوں کہ میں اس اعتقاد سے قطعاً بری ہوں کہ ان بتوں میں یہ قدرت ہے کہ مجھ کو یا کسی کو کسی قسم کی بھی کوئی بُرائی پہنچا سکتے ہیں۔ اس کے بعد تم کو اور تمہارے ان معبودانِ باطل کو تحدّی (چیلنج) کرتا ہوں کہ اگر اُن میں ایسی قدرت ہے تو وہ مجھ کو نقصان پہنچانے میں جلدی سے اقدام کریں۔ میں اپنے خدا کے فضل و کرم سے صاحبِ عقل و خرد ہوں، فراست و کیاست کا مالک ہوں، اور حکمت و دانائی کا حامل۔

میں تو صرف اپنے اُس خدا ہی پر بھروسہ کرتا اور اُسی پر وثوق رکھتا ہوں جس کے قبضہ و قدرت میں کائنات کے تمام جانداروں کی پیشانیاں ہیں اور جو حیات و ممات کا مالک ہے، وہ ضرور میری مدد کریگا، اور ہر نقصان پہنچانے والے کے نقصان سے محفوظ رکھیگا۔

آخر حضرتِ ہودؑ نے اُن کی مسلسل بغاوت و سرکشی کے خلاف یہ اعلان کر دیا کہ اگر عاد کا رویہ یہی رہا اور حق سے اعراض و روگردانی کی روش میں اُنھوں نے کوئی تبدیلی نہ کی، اور میری پند و نصائح کو گوشِ دل سے نہ سُنا تو میں تو اپنے مفوضہ خدمت کے لیے ہر وقت چست کمر اور باہمت ہوں

مگر اُن کے لیے ہلاکت یقینی ہے، اللہ تعالیٰ عنقریب اُن کو ہلاک کر دیگا، اور ایک دوسری قوم کو زمین کا مالک بنا کر اُن کی جگہ قائم کر دیگا۔ اور بلاشبہ وہ اللہ تعالیٰ کو ذرّہ برابر بھی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ وہ تو ہر شے پر قادر و مسلط اور ہر شے کا حافظ و نگہبان ہے۔ اور تمام کائنات اُس کے یدِ قدرت میں مسخر ہے۔

اے قوم! اب بھی سمجھ، عقل و ہوش سے کام لے، قومِ نوح کے حالات سے عبرت حاصل کر اور خدا کے پیغام کے سامنے سرِ نیاز جھکا دے۔ ورنہ قضا و قدر کا ہاتھ ظاہر ہو چکا ہے اور بہت قریب ہے وہ زمانہ کہ تمہارا یہ سارا غرور و گھمنڈ خاک میں ملجائیگا، اور اُس وقت ندامت سے بھی کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

حضرتِ ہودؑ نے بار بار اُن کو یہ بھی باور کرایا کہ میں تمہارا دشمن نہیں ہوں، دوست ہوں، تم سے زر و سیم اور ریاست کا طالب نہیں ہوں تمہاری فلاح و نجاح کا طالبِ مخلص ہوں، اللہ تعالیٰ کے پیغام کے بارہ میں خائن نہیں بلکہ امین ہوں۔ وہی کہتا ہوں جو مجھ سے کہا جاتا ہے۔ جو کچھ کہتا ہوں قوم کی سعادت اور حسنِ حال و مآل کے لیے کہتا ہوں اور دائمی و سرمدی نجات کے لیے کہتا ہوں۔

تم کو اپنی ہی قوم کے ایک انسان پر خدا کے پیغام نازل ہونے سے اچنبھا نہیں ہونا چاہیے کیونکہ یہ قدیم سے خدا کی سنّتِ جاریہ ہے کہ انسانوں کی ہدایت و سعادت کے لیے اُن ہی میں سے ایک شخص کو چُن لیتا اور اپنا رسول بنا کر اُس کو خطاب کرتا ہے اور اپنی مرضیات و نامرضیات سے اُس کی معرفت اپنے بندوں کو مطلع کرتا رہتا ہے۔ اور فطرت کا تقاضا بھی تو یہی ہے کہ کسی قوم کے رشد و ہدایت کے لیے ایسے شخص کا ہی انتخاب کیا جائے جو بول چال میں اُن ہی کی طرح ہو، اُن کے اخلاق و عادات کا واقف و دانا ہو۔ اُن کے خصوصی امتیازات سے آشنا، اور اُن ہی کے ساتھ زندگی گذارتا رہا ہو کہ اُس سے قوم مانوس ہو سکتی ہے اور وہی اُن کا صحیح ہادیِ مشفق بن سکتا ہے،

عاد نے جب یہ سُنا تو وہ عجیب حیرت میں پڑ گئے اُن کی سمجھ میں نہ آیا کہ ایک خدا کی پرستش کے کیا معنی؟ وہ غم و غصہ میں آ گئے کہ کس طرح ہم باپ دادا کی ریت "اصنام پرستی" کو چھوڑ دیں؟ یہ تو ہماری اور ہمارے باپ دادا کی سخت توہین ہے۔ اُن کا غیظ و غضب بھڑک اُٹھا کہ اُن کو کافر و مشرک کیوں کہا جاتا ہے جبکہ وہ بتوں کو خدا کے سامنے اپنا شفیع مانتے ہیں؟ اُن کے نزدیک ہود (علیہ السلام) کی بات مان لینے میں اُن کے اُن معبودوں اور بزرگوں کی توہین و تحقیر تھی جن کو وہ خدائے اکبر کی بارگاہ میں اپنا وسیلہ اور شفیع مانتے تھے اور اسی لیے اُن تصویروں اور مجسموں کو پوجتے تھے کہ وہ خوش ہو کر ہماری سفارش کرینگے اور عذابِ الٰہی سے نجات دلائینگے۔

آخر وہ شعلہ کی طرح بھڑک اُٹھے اور حضرتِ ہود (علیہ السلام) سے بگڑ کر کہنے لگے۔ تو نے ہم کو اپنے خدا کے عذاب کی دھمکی دی اور ہم کو اُس سے یہ کہہ کر ڈرایا:۔

اِنِّیۡۤ اَخَافُ عَلَیۡکُمۡ عَذَابَ یَوۡمٍ عَظِیۡمٍ۔ (الشعراء) — میں تمہارے او پر بڑے دن کے عذاب آنے سے ڈرتا ہوں (کہ کہیں تم اُس کے مستحق نہ ٹھہر جاؤ)

تو اے ہود! اب ہم سے تیری روز روز کی نصیحتیں نہیں سُنی جاتیں، ہم ایسے ناصحِ مشفق سے باز آئے۔ اگر تو واقعی اپنے قول میں سچا ہے تو وہ عذاب جلد لے آ کہ ہمارا تیرا قصہ پاک ہو۔

فَأۡتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنۡ کُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِیۡنَ۔ (الاعراف) — پس لا تو ہمارے پاس اُس شے کو جس کا تو ہم سے وعدہ کرتا ہے اگر تو واقعی سچوں میں سے ہے۔

حضرتِ ہود (علیہ السلام) نے جواب دیا کہ اگر میری مخلصانہ اور صادقانہ نصائح کا یہی جواب ہے تو بسم اللہ تم کو عذاب کا اگر اتنا ہی شوق ہے تو وہ بھی کچھ دور نہیں ہے۔

قَدۡ وَقَعَ عَلَیۡکُمۡ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ رِجۡسٌ وَّغَضَبٌ (الاعراف) — بلاشبہ تمہارے پروردگار کی جانب سے تم پر عذاب و غضب آ پہنچا۔

تم کو شرم نہیں آتی کہ تم چند خود ساختہ بتوں کو اُن کے نام گھڑ کر پکارتے اور تم اور تمہارے آباء و اجداد اُن کو خدا کی دی ہوئی دلیل کے بغیر من گھڑت طریقہ پر اُن کو اپنا شفیع اور سفارشی مانتے ہو، اور میری روشن دلائل سے انحراف اور سرکشی کرکے عذاب کے طالب ہوتے ہو۔ اگر ایسا ہی شوق ہے تو اب تم بھی انتظار کرو اور میں بھی انتظار کرتا ہوں کہ وقت قریب آپہنچا۔

اتجادلوننی فی اسماء سمیتموھا	کیا تم مجھ سے اُن من گھڑت ناموں (بتوں) کے بارہ
انتم وآباؤکم ما نزّل اللہ	میں جھگڑتے ہو جس کو تم نے اور تمہارے باپ دادوں
بھا من سلطٰن فانتظروا انی	نے گھڑ لیا ہے کہ جس کے متعلق تمہارے پاس خدا کی
معکم من المنتظرین۔	کوئی حجت نہیں آئی پس اب تم (عذابِ الٰہی کا) انتظار
(الاعراف)	کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں۔

الحاصل قومِ ہود "عاد" کی انتہائی شرارت و بغاوت اور اپنے پیغمبر کی تعلیم سے بے پناہ بغض و عناد کی پاداشِ عمل اور قانونِ جزاء کا وقت آپہنچا، اور غیرتِ حق حرکت میں آئی اور عذابِ الٰہی نے سب سے پہلے "خشک سالی" کی شکل اختیار کی، عاد سخت گھبرائے، پریشان ہوئے، اور عاجز و درماندہ نظر آنے لگے تو حضرتِ ہود کو جوشِ ہمدردی نے اُکسایا اور مایوسی کے بعد پھر ایک مرتبہ اُن کو سمجھایا کہ راہِ حق اختیار کرلو، میری نصائح پر ایمان لے آؤ کہ یہی نجات کی راہ ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی ورنہ پچھتاؤ گے، لیکن بدبخت و بدنصیب قوم پر کوئی اثر نہ ہوا اور بغض و عناد دوبالا ہوگیا۔ تب ہولناک عذاب نے اُن کو آگھیرا، آٹھ دن اور سات راتیں پیہم تیز و تند ہوا کے طوفان اُٹھے اور اُن کو اور اُن کی آبادی کو تہ و بالا کرکے رکھ دیا۔ تنومند اور قوی ہیکل انسان جو اپنی جسمانی قوتوں کے گھمنڈ میں سرمستِ سرکشی تھے اس طرح بے حس و حرکت پڑے نظر آتے تھے جس طرح آندھی سے تناور درخت بے جان ہوکر گر جاتا ہے غرض اُن کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا گیا تاکہ آنے والی نسلوں کے لیے عبرت بنیں، اور دنیا و آخرت کی لعنت اور

عذاب اُن پر مسلط کر دیا گیا کہ وہ اس کے مستحق تھے۔ اور حضرت ہود اور اُن کے مخلص پیروانِ اسلام خدا کی رحمت و نعمت میں عذابِ الٰہی سے محفوظ و مامون رہے اور سرکش قوم کی سرکشی و بغاوت سے نجات پائی

یہ ہے عاد اولیٰ کی وہ داستانِ عبرت جو اپنے اندر چشمِ عبرت بین کے لیے بے شمار پند و نصائح رکھتی اور خدائے برتر کے احکام کی تعمیل، اور تقویٰ و طہارت کی زندگی کی جانب دعوت دیتی ہے شرارت، سرکشی، اور خدا کے احکام سے بغاوت کے انجامِ بد سے آگاہ کرتی، اور وقتی خوش عیشی پر گھمنڈ کر کے نتیجہ کی بدبختی پر مذاق اُڑانے سے ڈراتی اور باز رکھتی ہے۔

پس حضرتِ ہود کے اس تفصیلی واقعہ کا ذکر قرآنِ عزیز کی اِن آیات میں تلاوت کیجیے، اور موعظت و عبرت، اور گرانمایہ پند و نصائح کا سامان فراہم کیجیے کہ دنیا و آخرت کی سعادت و فلاح کا یہی بہترین ذخیرہ ہے

وَإِلَىٰ عَادٍ أَخَاهُمْ هُودًا ۚ قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۚ أَفَلَا تَتَّقُونَ ‎(٦٥) قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَوْمِهِ إِنَّا لَنَرَاكَ فِي سَفَاهَةٍ وَإِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكَاذِبِينَ ‎(٦٦) قَالَ يَا قَوْمِ لَيْسَ بِي سَفَاهَةٌ وَلَٰكِنِّي رَسُولٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ ‎(٦٧) أُبَلِّغُكُمْ رِسَالَاتِ رَبِّي وَأَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ أَمِينٌ ‎(٦٨)

اور اسی طرح ہم نے قوم عاد میں اُس کے بھائی بندوں میں سے ہود کو بھیجا۔ اُس نے کہا "اے قوم! اللہ کی بندگی کرو، اُس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ کیا تم (انکار و بدعملی کے نتائج سے) نہیں ڈرتے؟ اس پر قوم کے سربرآوردہ لوگوں نے جنہوں نے کفر کا شیوہ اختیار کیا تھا، کہا "ہمیں تو ایسا دکھائی دیتا ہے کہ تم حماقت میں پڑ گئے ہو، اور ہمارا خیال یہ ہے کہ تم جھوٹ بولنے والوں میں سے ہو۔ ہود نے کہا بھائیو! میں احمق نہیں ہوں میں تو اُس کی طرف سے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے فرستادہ ہوں، میں اُس کا پیام تمہیں پہنچاتا ہوں، اور یقین کرو

---

[۱] ان ہلاک شدگان کی تعداد مفسرین نے تین سے چار ہزار تک بتائی ہے جیسا کہ روح المعانی وغیرہ میں مذکور ہے لیکن قرآنِ عزیز نے جس طرح ان کی شوکت و حکومت کا تذکرہ کیا ہے اور بنو سام کی قدیم تاریخ سے جیسا پتہ چلتا ہے اُس اعتبار سے یہ تعداد بہت زیادہ ہونی چاہیے۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال

أَوَعَجِبْتُمْ أَنْ جَاءَكُمْ ذِكْرٌ مِّن رَّبِّكُمْ
عَلَىٰ رَجُلٍ مِّنكُمْ لِيُنذِرَكُمْ
وَاذْكُرُوا إِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاءَ مِن
بَعْدِ قَوْمِ نُوحٍ وَزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ
بَسْطَةً فَاذْكُرُوا آلَاءَ اللَّهِ لَعَلَّكُمْ
تُفْلِحُونَ (۶۹) قَالُوا أَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ
اللَّهَ وَحْدَهُ وَنَذَرَ مَا كَانَ
يَعْبُدُ آبَاؤُنَا فَأْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا
إِن كُنتَ مِنَ الصَّادِقِينَ (۷۰)
قَالَ قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُم مِّن
رَّبِّكُمْ رِجْسٌ وَغَضَبٌ أَتُجَادِلُونَنِي
فِي أَسْمَاءٍ سَمَّيْتُمُوهَا أَنتُمْ وَ
آبَاؤُكُم مَّا نَزَّلَ اللَّهُ بِهَا
مِن سُلْطَانٍ فَانتَظِرُوا إِنِّي
مَعَكُم مِّنَ الْمُنتَظِرِينَ (۷۱)
فَأَنجَيْنَاهُ وَالَّذِينَ مَعَهُ بِرَحْمَةٍ
مِّنَّا وَقَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِينَ
كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَمَا كَانُوا
مُؤْمِنِينَ (۷۲) (اعراف)

کہ تمہیں دیانتداری کے ساتھ نصیحت کرنے والا ہوں کیا تمہیں
اس بات پر اچنبھا ہو رہا ہے کہ ایک ایسے آدمی کے ذریعہ
تمہارے پروردگار کی نصیحت تم تک پہنچی جو خود تم ہی میں سے
ہے۔ خدا کا یہ احسان یاد کرو کہ قومِ نوح کے بعد تمہیں اُس کا
جانشین اور تمہاری نسل کو زیادہ وسعت و توانائی بخشی۔
پس چاہیے کہ اللہ کی نعمتوں کی یاد سے غافل نہ ہو۔ تاکہ ہر طرح کامیاب
ہو" اُنہوں نے کہا "کیا تم اس لیے ہمارے پاس آئے کہ ہم صرف
ایک ہی خدا کے پجاری ہو جائیں، اور اُن معبودوں کو چھوڑ دیں
جنہیں ہمارے باپ دادا پوجتے آئے ہیں؟ اگر تم سچے ہو تو وہ بات
لا دکھاؤ جس کا ہمیں خوف دلا رہے ہو۔ ہود نے کہا "یقین کرو
تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر عذاب اور غضب واقع
ہو گیا ہے (کہ عقلیں ماری گئی ہیں اور اپنے ہاتھوں اپنے کو تباہی
کے حوالے کر رہے ہو) کیا ہے جس کی بنا پر تم مجھ سے جھگڑ رہے ہو!
محض چند نام جو تم نے اور تمہارے بزرگوں نے اپنے جی سے
گھڑ لیے ہیں، اور جن کے لیے خدا نے کوئی سند نہیں اُتاری
اچھا (آنے والے وقت کا) انتظار کرو۔ میں بھی تمہارے ساتھ انتظار
کروں گا" پھر ایسا ہوا کہ ہم نے ہود کو اور اُس کے ساتھیوں کو اپنی
رحمت سے بچا لیا، اور جنہوں نے ہماری نشانیاں جھٹلائی تھیں
اُن کی بیخ و بنیاد تک اُکھاڑ دی حقیقت یہ ہے کہ وہ کبھی ایمان
لانے والے نہیں

والیٰ عادٍ اخاھم ھودا قال یٰقوم اعبدوا اللہ ما لکم من الٰہٍ غیرہ ان انتم الا مفترون (۵۰) یٰقوم لا اسئلکم علیہ اجرا ان اجری الا علی الذی فطرنی افلا تعقلون (۵۱) ویٰقوم استغفروا ربکم ثم توبوا الیہ یرسل السماء علیکم مدرارا ویزدکم قوۃً الیٰ قوتکم ولا تتولوا مجرمین (۵۲) قالوا یٰھود ماجئتنا ببینۃ وما نحن بتارکی الھتنا عن قولک وما نحن لک بمؤمنین (۵۳) ان نقول الا اعترٰک بعض الھتنا بسوء قال انی اشھد اللہ واشھدوا انی بریٓء مما تشرکون (۵۴) من دونہ فکیدونی جمیعا ثم لا تنظرون (۵۵) انی توکلت

اور ہم نے (قوم) عاد کی طرف، اُس کے بھائی بندوں میں سے ہود کو بھیجا۔ ہود نے کہا "اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو، اُس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں یقین کرو تم اس کے سوا کچھ نہیں ہو کہ (حقیقت کے خلاف) افترا پردازیاں کررہے ہو" "اے میری قوم کے لوگو! میں اس بات کے لیے تم سے کوئی بدلہ نہیں مانگتا، میرا بدلہ تو اُسی پر ہے جس نے مجھے پیدا کیا۔ پھر کیا تم (اتنی صاف بات بھی) نہیں سمجھتے؟" "اور اے میری قوم کے لوگو! اپنے پروردگار سے (اپنے قصوروں کی) مغفرت مانگو اور (آئندہ کے لیے) اُس کی جناب میں توبہ کرو، وہ تم پر برستے ہوئے بادل بھیجتا ہے (جس سے تمہارے کھیت اور باغ شاداب ہوجاتے ہیں) اور تمہاری قوتوں پر نئی نئی قوتیں بڑھاتا ہے (کہ روز بروز گھٹنے کی جگہ بڑھتے جاتے ہو) اور (دیکھو) جرم کرتے ہوئے اُس سے منہ نہ موڑو۔" اُن لوگوں نے کہا "اے ہود تو ہمارے پاس کوئی کوئی دلیل لے کر تو آیا نہیں (جسے ہم دلیل سمجھیں) اور ہم ایسا کرنے والے نہیں کہ تیرے کہنے سے اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں ہم تجھ پر ایمان لانے والے نہیں" "ہم جو کچھ کہہ سکتے ہیں، وہ تو یہ ہے کہ ہمارے معبودوں میں سے کسی معبود کی تجھ پر مار پڑ گئی ہے۔ (اسی لیے اس طرح کی باتیں کرنے لگا ہے) ہود نے کہا "میں اللہ کو گواہ ٹھہراتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ جن ہستیوں کو تم نے اُس کا شریک بنا

علی اللّٰہِ ربی وربکم ما من دابّۃٍ الّا ھو اٰخذٌ بناصیتھا اِنّ ربی علیٰ صراطٍ مستقیم (٥٦) فان تولّوا فقد ابلغتکم ما اُرسلتُ بہ الیکم ویستخلف ربی قومًا غیرکم ولا تضرونہ شیئًا اِنّ ربی علیٰ کل شیءٍ حفیظ (٥٧) ولمّا جاء امرنا نجینا ھودًا والذین اٰمنوا معہ برحمۃٍ منّا ونجینٰھم من عذابٍ غلیظ (٥٨) وتلک عادٌ جحدوا باٰیٰتِ ربھم وعصوا رسلہ واتبعوا امر کل جبّارٍ عنید (٥٩) واُتبعوا فی ھٰذہ الدنیا لعنۃً ویوم القیٰمۃ اَلا ان عادًا کفروا ربھم اَلا بُعدًا لعادٍ قوم ھود (٦٠)

(ہود)

رکھا ہے، مجھے اُن سے کوئی سروکار نہیں۔ تم سب مل کر میرے خلاف جو کچھ تدبیریں کر سکتے ہو ضرور کرو، اور مجھے (ذرا بھی مہلت نہ دو (پھر دیکھ لو، نتیجہ کیا نکلتا ہے؟)" میرا بھروسہ اللہ پر ہے جو میرا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی۔ کوئی چلنے والا وجود نہیں ہے مگر یہ کہ اللہ نے اُسے اُس کی پیشانی کے بالوں سے پکڑ رکھا ہے (یعنی کوئی حرکت کرنے والی ہستی نہیں کہ اُس کے قبضے سے باہر ہو) میرا پروردگار (حق و عدل کی سیدھی راہ پر ہے (یعنی اُس کی راہ ظلم کی راہ نہیں ہو سکتی)۔ پھر اگر (اس پر بھی) تم نے روگردانی کی تو جس بات کے لیے میں بھیجا گیا تھا، وہ میں نے پہنچا دی (اس سے زیادہ میرے اختیار میں کچھ نہیں ہے) اور مجھے تو نظر آ رہا ہے کہ میرا پروردگار کسی دوسرے گروہ کو تمہاری جگہ دے دیگا، اور تم اُس کا کچھ بگاڑ نہ سکوگے۔ یقیناً میرا پروردگار ہر چیز کا نگران حال ہے"

اور (دیکھو) جب ہماری ٹھہرائی ہوئی بات کا وقت آ پہنچا، تو ہم نے اپنی رحمت سے ہود کو بچا لیا جو اُس کے ساتھ (سچائی پر) ایمان لائے تھے، اور ایسے عذاب سے بچا لیا کہ بڑا ہی سخت عذاب تھا! یہ ہے سرگذشت عاد کی، اُنہوں نے اپنے پروردگار کی نشانیاں (ہٹ دھرمی اور سرکشی کرتے ہوئے) جھٹلائیں اور اُس کے رسولوں کی نافرمانی کی، اور ہر متکبر و سرکش کے حکم کی پیروی کی! اور ایسا ہوا کہ دنیا میں بھی اُن کے پیچھے لعنت پڑی (یعنی رحمت الٰہی کی برکتوں سے محرومی ہوئی) اور قیامت کے دن بھی۔ تو سن رکھو کہ قوم عاد نے اپنے

ثم انشأنا من بعدهم قرنًا
اٰخرين ۝۳۱ فارسلنا فيهم رسولًا
منهم ان اعبدوا الله ما لكم
من الٰهٍ غيره افلا تتقون ۝۳۲
وقال الملاء من قومه الذين
كفروا وكذبوا بلقاء الاٰخرة
واترفنٰهم في الحيوة الدنيا
ما هٰذا الّا بشر مثلكم يأكل
ممّا تأكلون منه ويشرب
مما تشربون ۝۳۳ ولئن اطعتم
بشرًا مثلكم انكم اذًا الخاسرون ۝۳۴
ايعدكم انكم اذا متّم وكنتم ترابًا
وعظامًا انكم مخرجون ۝۳۵ هيهات
هيهات لما توعدون ۝۳۶ ان هي
الّا حياتنا الدنيا نموت ونحيا
وما نحن بمبعوثين ۝۳۷ ان هو الّا
رجل افترٰى على الله كذبًا ونحن له
بمؤمنين ۝۳۸ قال رب انصرني بما
كذبون ۝۳۹ قال عما قليل ليصبحن

پھر ہم نے قوم نوح کے بعد قوموں کا ایک دوسرا دور پیدا کر دیا
اُن میں بھی اپنا رسول بھیجا جو خود انہی میں سے تھا (اس کی پکار
بھی یہی تھی) کہ "اللہ کی بندگی کرو، اُس کے سوا تمہارا کوئی معبود
نہیں کیا تم (انکار و فساد کے نتائجِ بد سے) ڈرتے نہیں؟ اس کی
قوم کے جن سرداروں نے کفر کی راہ اختیار کی تھی اور آخرت کے
پیش آنے سے منکر تھے اور جنہیں دنیا کی زندگی میں ہم نے آسودگی
دے رکھی تھی کہنے لگے" اس سے زیادہ اس کی کیا حیثیت ہے
کہ تمہارے ہی جیسا ایک آدمی ہے، جو کچھ تم کھاتے ہو یہ بھی کھاتا ہے
جو کچھ تم پیتے ہو یہ بھی پیتا ہے، اگر تم نے اپنے ہی جیسے ایک آدمی
کی اطاعت کر لی تو بس سمجھ لو تم تباہ ہوئے۔ تم سُنتے ہو یہ کیا
کہتا ہے؟ یہ تمہیں اُمید دلاتا ہے کہ جب مرنے کے بعد محض
مٹی اور ہڈیوں کا چورا ہو جاؤ گے تو پھر تمہیں موت سے نکالا
جائیگا۔ کیسی انہونی بات ہے جس کی تمہیں توقع باقی ہے،
زندگی تو بس یہی زندگی ہے جو دنیا میں ہم بسر کرتے ہیں یہیں
مرتے ہیں یہیں جیتا ہے۔ ایسا کبھی ہونے والا نہیں کہ مر کر پھر
جی اُٹھینگے، کچھ نہیں یہ ایک مفتری آدمی ہے جس نے اللہ کے نام
سے جھوٹ موٹ بات بنا دی، ہم کبھی اس پر یقین لانے والے
نہیں" اس پر اُس رسول نے دعا مانگی "خدایا! انہوں نے
مجھے جُھٹلایا ہے، پس تو میری مدد کر" حکم ہوا "عنقریب ایسا ہونے والا ہے کہ

نٰدمین ۴۰ؔ فاخذتھم الصیحۃ
یہ اپنے کیے پر شرمسار ہونگے"۔ چنانچہ فی الحقیقۃ ایک ہولناک آواز نے

بالحق فجعلنٰھم غثاءً فبعدًا
اُنہیں آپکڑا اور ہم نے خس و خاشاک کی طرح انہیں پامال کردیا، تو محرومی

للقوم الظٰلمین ۴۱ؔ (المومنون)
ہو اس گروہ کے لیے کہ ظلم کرنے والا ہے۔

کذبت عاد المرسلین ۱۲۳ؔ اذ
عاد نے (اللہ کے) پیغام لانے والوں کو جھٹلایا جب اُن کے

قال لھم اخوھم ھود الا
بھائی ہود نے اُن کو کہا "کیا تم کو (خدا کا ڈر نہیں! میں تمہارے

تتقون ۱۲۴ؔ انی لکم رسول امین ۱۲۵ؔ
پاس پیغام لانے والا معتبر ہوں، سو ڈرو اللہ سے اور

فاتقوا اللہ واطیعون ۱۲۶ؔ وما
میرا کہا مانو " اور نہیں مانگتا ہیں تم سے اس پر بدلہ

اسئلکم علیہ من اجر ان اجری
میرا بدلہ اُس جہاں کے مالک پر ہے۔ کیا بناتے ہو تم ہر اونچی

الا علی رب العٰلمین ۱۲۷ؔ اتبنون
زمین پر ایک نشان کھیلنے کو، اور بناتے ہو کاریگریاں

بکل ریع اٰیۃ تعبثون ۱۲۸ؔ و
شاید تم ہمیشہ رہوگے اور جب ہاتھ ڈلتے ہو تو ظلم کا پنجہ

تتخذون مصانع لعلکم
ہی مارتے ہو۔ سو ڈرو اللہ سے اور میرا کہا مانو، اور

تخلدون ۱۲۹ؔ واذا بطشتم
ڈرو اُس سے جس نے تم کو پہنچائیں وہ چیزیں جو تم

بطشتم جبارین ۱۳۰ؔ فاتقوا اللہ
جانتے ہو۔ پہنچائے تم کو چوپائے اور بیٹے، اور باغ اور

واطیعون ۱۳۱ؔ واتقوا الذی
چشمے، میں ڈرتا ہوں تم پر ایک بڑے دن کی آفت سے

امدکم بما تعلمون ۱۳۲ؔ امدکم
وہ بولے "ہم کو برابر ہے تو نصیحت کرے یا نہ کرے، اور

بانعام وبنین ۱۳۳ؔ وجنٰت وعیون ۱۳۴ؔ
کچھ نہیں ہیں یہ باتیں عادت ہے اگلے لوگوں کی اور ہم

انی اخاف علیکم عذاب یوم عظیم ۱۳۵ؔ
پر آفت آنے والی نہیں۔ پھر اُس کو جھٹلانے لگے۔

قالوا سواءٌ علینا اوعظت ام لم تکن
تب ہم نے اُن کو غارت کردیا اس بات میں البتہ نشانی

من الواعظین ۱۳۶ؔ ان ھٰذا الا خلق
ہے اور اُن میں بہت لوگ ماننے والے نہیں۔ اور

الاولین ٥ۘ‏ وما نحن بمعذبین ٥ۚ فکذبوہ فاھلکنھم ان فی ذلک لاٰیۃ وما کان اکثرھم مؤمنین ٥ وان ربک لھو العزیز الرحیم ٥

تیرا رب وہی ہے زبردست رحم والا۔

(الشعراء)

فاما عاد فاستکبروا فی الارض بغیر الحق وقالوا من اشد منا قوۃ اولم یروا ان اللہ الذی خلقھم ھو اشد منھم قوۃ وکانوا باٰیٰتنا یجحدون ٥ فارسلنا علیھم ریحا صرصرا فی ایام نحسات لنذیقھم عذاب الخزی فی الحیوۃ الدنیا ولعذاب الاٰخرۃ اخزٰی وھم لا ینصرون ٥ (حٰم سجدہ)

سو وہ جو عاد تھے وہ تو غرور کرنے لگے ملک میں ناحق، اور کہنے لگے "کون ہے ہم سے زیادہ زور و قوت میں" کیا دیکھتے نہیں کہ اللہ جس نے اُن کو بنایا وہ زیادہ ہے اُن سے زور میں؟ اور تھے ہماری نشانیوں سے منکر، پھر بھیجی ہم نے اُن پر ہوا بڑے زور کی کئی دن جو مصیبت کے تھے، تاکہ چکھائیں اُن کو رسوائی کا عذاب دنیا کی زندگانی میں، اور آخرت کے عذاب میں تو پوری رسوائی ہے۔

واذکر اخا عاد اذ انذر قومہ بالاحقاف وقد خلت النذر من بین یدیہ ومن خلفہ الا تعبدوا الا اللہ انی اخاف علیکم عذاب یوم عظیم ٥ قالوا اجئتنا لتافکنا عن اٰلھتنا فاتنا بما تعدنا ان کنت من الصدقین ٥ قال انما العلم عند اللہ وابلغکم ما ارسلت بہ

اور یاد کر عاد کے بھائی کو، جب ڈرایا اُس نے اپنی قوم کو احقاف میں اور گذر چکے تھے ڈرانے والے اُس کے سامنے سے اور پیچھے سے (یہ کہتے ہوئے) کہ بندگی نہ کرو کسی کی اللہ کے سوائے۔ میں ڈرتا ہوں تم پر آفت سے ایک بڑے دن کی۔ بولے: کیا تو آیا ہمارے پاس کہ پھیر دے ہم کو ہمارے معبودوں سے! سو لے آ ہم پر جو وعدہ کرتا ہے اگر ہے تو سچا۔ کہا! یہ خبر تو اللہ ہی کو ہے اور میں تو پہنچا دیتا ہوں جو کچھ بھیج دیا ہے میرے ہاتھ، لیکن میں دیکھتا ہوں

ولكني اراكم قوما تجهلون ۝ فلما
راوه عارضا مستقبل اوديتهم
قالوا هذا عارض ممطرنا بل هو
ما استعجلتم به ريح فيها عذاب
اليم ۝ تدمر كل شيء بامر ربها
فاصبحوا لا يرى الا مسكنهم
كذلك نجزي القوم المجرمين ۝ ولقد
مكنهم فيما ان مكنكم فيه وجعلنا
لهم سمعا وابصارا وافئدة فما اغنى
عنهم سمعهم ولا ابصارهم ولا
افئدتهم من شيء اذ كانوا يجحدون
بايت الله وحاق بهم ما كانوا
به يستهزءون ۝ (احقاف)

کہ تم لوگ نادانی کرتے ہو، پھر جب دیکھا اُس (عذاب) کو
ابر سامنے آیا ہوا اپنی وادیوں کے، بولے! یہ ابر ہے ہمارے
اوپر برسیگا "کوئی نہیں" یہ تو وہ چیز ہے جس کی تم جلدی
کرتے تھے۔ ہوا ہے جس میں عذاب ہے دردناک۔ اُکھاڑ
پھینکے ہر چیز کو اپنے رب کے حکم سے پھر کل کے دن رہ گئے
کہ کوئی نظر نہیں آتا تھا سوائے ان کے گھروں کے، یوں
ہم سزا دیتے ہیں گنہگار لوگوں کو، اور ہم نے مقدور دیا تھا
اُن کو اُن چیزوں کا جن کا تم کو مقدور نہیں دیا اور ہم نے
اُن کو دیے تھے کان اور آنکھیں اور دل، پھر کام نہ آئے
کان اُن کے اور نہ آنکھیں اُن کی، اور نہ دل اُن کے کسی
چیز میں۔ اس لیے کہ منکر ہوتے تھے اللہ کی باتوں سے اور
اُلٹ پڑی اُن پر جس بات سے کہ وہ ٹھٹھا کرتے تھے۔

وفي عاد اذ ارسلنا عليهم الريح
العقيم ۝ ما تذر من شيء
اتت عليه الا جعلته كالرميم ۝
(الذاريات)

اور قوم عاد (کے ہلاک ہونے میں بھی قدرت خدا کی بہتیری نشانیاں
ہیں) جب ہم نے اُن پر ایک منحوس آندھی چلائی جس چیز پر
ہو کر گذرتی اُس کو بوسیدہ ہڈی کی طرح (چورا) کیے بدون نہ
چھوڑتی۔

كذبت عاد فكيف كان عذابي
ونذر ۝ انا ارسلنا عليهم

جھٹلایا عاد نے پھر کیسا ہوا میرا عذاب اور میرا کھڑکھڑانا
ہم نے بھیجی اُن پر ہوا تند، ایک نحوست کے دن جو

ریحاً صرصراً فی یوم نحس مستمر ۝ [۱۹] ٹلنے والی نہ تھی اُکھاڑ پھینکا لوگوں کو گویا وہ جڑیں ہیں کھجور
تنزع الناس کانّھم اعجاز نخل کی اُکھڑی پڑی ۔ پھر کیسا رہا میرا عذاب اور میرا کھڑکھڑانا؟
منقعر ۝ [۲۰] فکیف کان عذابی ونذر ۝ [۲۱] (القمر)

واما عاد فاھلکوا بریح صرصر اور وہ جو عاد تھے سو برباد ہوئے ٹھنڈی سناٹے کی ہوا سے کہ
عاتیۃ ۝ سخرھا علیھم سبع لیال نکلی جائے ہاتھوں سے، مقرر کر دیا اُس کو اُن پر سات
وثمانیۃ ایام حسوماً فتری القوم رات اور آٹھ دن تک لگاتار، پھر تو دیکھے کہ وہ لوگ اُس
فیھا صرعیٰ کانّھم اعجاز نخل خاویۃ ۝ میں پچھڑ گئے گویا وہ جڑیں ہیں کھجور کی کھوکھلی، پھر تو دیکھتا ہے
فھل تریٰ لھم من باقیۃ ۝ (الحاقۃ) کوئی اُن میں کا بچا؟

الم ترکیف فعل ربک بعاد ارم تو نے نہ دیکھا، کیسا کیا تیرے رب نے عاد ارم کیساتھ
ذات العماد ۝ التی لم یخلق مثلھا جو ...... تھے بڑے ستونوں والے کہ اُن جیسی......
فی البلاد ۝ (الفجر) سارے شہروں میں نہیں بنائی گئیں۔

حضرت ہودؑ کی وفات اہل عرب حضرت ہود (علیہ السلام) کی وفات اور اُن کی قبر مبارک کے متعلق مختلف دعوے کرتے ہیں، مثلاً اہل حضرموت کا دعویٰ ہے کہ عاد کی ہلاکت کے بعد وہ حضرموت کے شہروں میں ہجرت کر آئے تھے۔ وہیں اُن کی وفات ہوئی اور وادی برہوت کے قریب حضرموت کے مشرقی حصہ میں شہر تریم سے قریباً دو مرحلے پر دفن ہوئے۔

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک اثر مروی ہے کہ اُن کی قبر حضرموت میں کثیب احمر (سُرخ ٹیلہ) پر ہے اور اُن کے سرہانے جھاؤ کا درخت کھڑا ہے۔

اور اہل فلسطین کا دعویٰ ہے کہ وہ فلسطین میں دفن ہیں، اور اُنھوں نے وہاں اُن کی قبر بھی بنا رکھی ہے اور اُس کا سالانہ عُرس بھی کرتے ہیں[۱]۔

[۱] قصص الانبیاء ص ۴۴

مگران تمام روایات میں سے حضرموت کی روایت صحیح اور معقول معلوم ہوتی ہے اس لیے کہ عاد کی بستیاں حضرموت ہی سے قریب تھیں، لہٰذا قرینہ یہی چاہتا ہے کہ اُن کی تباہی کے بعد قریب ہی کی آبادیوں میں حضرت ہود (علیہ السلام) نے قیام فرمایا ہوگا اور وہیں پیغام اجل کو لبیک کہا اور وہ یہی حضرموت کا مقام ہے۔

چند عبرتیں علاوہ اُس خاص عبرت کے جس کا ذکر اس طویل واقعہ میں ہو چکا ہے، یہ چند عبرتیں بھی قابلِ توجہ اور لائقِ نظرِ التفات ہیں۔

(۱) جو شخص قومِ عاد کے واقعہ کو پڑھتا ہے اُس کی آنکھوں کے سامنے ایک ایسی ہستی کا تصور آجاتا ہے جو وقار اور متانت کا مکمل مجسمہ ہے اور شرافت و نجابت چہرہ سے عیاں، جو کچھ کہتا ہے پہلے اُس کو وزن کر لیتا ہے کہ اس کا انجام نیک ہے یا بد، قوم کی درشتی، تمسخر و استہزاء کا جواب ضبط و صبر سے دیتا، اور پھر بھی اُن کی بھلائی کا جویاں نظر آتا ہے، اخلاص، حُسنِ نیت اُس کی پیشانی سے عیاں ہے اُس کی قوم کہتی ہے:-

انا لنراك فی سفاهة وانا لنظنك كذبين ۝	بےشک ہم تجھ کو بے وقوف پاتے ہیں اور بیشک ہم تجھ کو جھوٹوں میں شمار کرتے ہیں۔

مگر وہ اس کا جواب یہ دیتا ہے:-

یقوم لیس بی سفاهة ولکنی رسول من رب العلمین ابلغکم رسلت ربی وانا لکم ناصح امین ۝	اے قوم! میں بے وقوف نہیں ہوں، البتہ میں جہانوں کے پروردگار کی جانب سے رسول ہوں تم تک اپنے پروردگار کے پیغامات پہنچاتا ہوں اور میں تمہارے لیے امانتدار خیرخواہ ہوں۔

یہ سوال و جواب ہم کو توجہ دلاتے ہیں کہ خدا کے برگزیدہ انسان جب کسی کی نیک خواہی کرتے، اور کج رووں کی کجی کو سیدھا کرنے کے لیے نصیحت فرماتے ہیں تو کور چشموں اور بد باطنوں کی ہرزہ سرائی، تمسخر

تحقیر کی پرواہ نہیں کرتے، دلگیر ورنجیدہ ہو کر امر حق سے مُنہ نہیں موڑتے، ناراض ہو کر خیر خواہی اور نصیحت کوشی کو نہیں چھوڑتے، اور بلندیِ اخلاق اور نرمی و مہربانی کے ساتھ روحانی مریضوں کے علاج میں مشغول رہتے ہیں اور اُن کی ان تمام خصوصیات میں نمایاں امتیاز یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی اس نصیحت و نیک خواہی کے لیے قوم سے مطلق کسی قسم کے نفع کے خواہشمند نہیں ہوتے اور اُن کی زندگی بدلہ اور عوض سے یکسر بلند اور برتر ہوتی ہے۔

وما اسئلکم علیہ من اجر ان اجری الا علی اللہ۔ — اور میں تم سے اس نصیحت پر اُجرت نہیں مانگتا میرا اجر تو صرف اللہ کے ذمہ ہے اور بس۔

(۲) حضرت ہود نے لطف و مہربانی کے ساتھ اپنی قوم کو خدا کی وحدانیت پر ایمان لانے کی ترغیب دی، اُس کی لازوال نعمتوں کو یاد دلایا اور آئندہ کے لیے وعدہ کیا مگر بدبخت قوم نے کسی طرح مان کر نہ دیا۔ اس کا سب سے بڑا سبب وہ جاہلانہ عقیدہ تھا کہ باپ دادا کی ریت و رسم اور اُن کے خود ساختہ اصنام کی قہرمانیت کے خلاف جو شخص بھی آواز اُٹھائیگا وہ اُن بتوں کی پھٹکار میں آجائیگا یہ مہلک عقیدہ جن قوموں کے اندر اپنے جراثیم پیدا کر دیتا ہے ان قوموں کا اپنے مصلح اور اپنے نبی و پیغمبر دونوں کے ساتھ وہی سلوک ہوتا ہے جو قوم ہود اور قوم نوح کے تذکروں میں نظر آتا ہے، اپنے مصلحین اور انبیائے صادقین کے خلاف قوموں کا بغض و عناد اسی ایک عقیدہ پر مبنی رہا ہے کہ ہمارے باپ دادا کی ریت رسم اور اُن کے خود ساختہ اصنام کی قہرمانیت کے خلاف کیوں کچھ کہا جاتا ہے۔ یونان کے مشہور حکیم سقراط کو زہر کا پیالہ اسی لیے پینا پڑا کہ وہ اپنی قوم کے معبودانِ باطل کی قہرمانیت کا کیوں انکار کرتا اور اُن کو کس لیے ان کے غلبہ و اقتدار کا مخالف بناتا ہے پس یہ جرثومہ اقوام کی روحانی زندگی کے لیے تباہ کُن اور اُن کی فلاح و سعادت ابدی کے لیے ہلاکت آفریں ہے۔

(۳) حضرتِ ہود علیہ السلام اور دیگر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی یہ سنت بہترین اُسوہ ہے کہ تبلیغ و

پیغامِ حق کی راہ میں بدی کا بدلہ نیکی سے دیا جائے، اور تلخی کا جواب شیریں کلامی سے پورا کیا جائے، البتہ اُن کی بدکرداری اور مسلسل سرکشی پر اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے قانون جزائے عمل یا پاداشِ عمل کو ضرور یاد دلائے اور آنے والے انجامِ بد پر یقیناً اُن کو تنبیہ کرے۔ اور یہ حقیقت بار بار سامنے لائے کہ جب کوئی قوم اجتماعی سرکشی، ظلم اور بغاوت پر آمادہ ہو جاتی اور پیہم اصرار کرتی رہتی ہے تو پھر خدائے تعالیٰ کا قہر و غضب اُس کو صفحۂ عالم سے مٹا دیا کرتا ہے اور اُس کی جگہ دوسری قوم لے لیتی ہے چنانچہ قومِ نوح اور قومِ ہود اس کی عبرت زا مثالیں ہیں۔

حضرت صالح (علیہ السلام)

حضرت صالح (علیہ السلام) کا ذکر قرآنِ عزیز میں۔ حضرت صالح اور ثمود کا نسب نامہ۔ ثمود کی آبادیاں
اہل ثمود کا دین۔ قرآنِ عزیز میں قصص کا مطلب۔ معجزہ کی حقیقت۔ ناقہ کا واقعہ۔ ناقہ ثمود کے لیے خدا
کا ایک نشان تھی۔ ثمود کے ہاتھوں ناقہ کی ہلاکت۔ واقعہ سے متعلق چند عبرتیں۔

حضرتِ صالح کا نام قرآن عزیز میں

قرآنِ عزیز میں صالح علیہ السلام کا نام آٹھ جگہ آیا ہے۔ حسب ذیل اعداد اس کی تصدیق کرتے ہیں:۔

سورت	آیات
اعراف	۷۳ - ۷۵ - ۷۷
ہود	۶۱ - ۶۲ - ۶۶ - ۸۹
شعراء	۱۴۲

حضرت صالح جس قوم میں پیدا ہوئے اُس کو ثمود کہتے ہیں۔

حضرت صالح اور ثمود کا نسب نامہ

علماءِ انساب قومِ ثمود کے پیغمبر حضرت صالح (علیہ السلام) کے نسب نامہ میں مختلف نظر آتے ہیں۔ مشہور حافظِ حدیث امام بغوی نے آپ کا نسب اس طرح بیان کیا ہے۔ صالح بن عُبَید بن آسف بن ماشخ بن عُبَید بن حاذِر بن ثمود اور وہب بن منبہ مشہور تابعی اس طرح نقل کرتے ہیں۔ صالح بن عُبَید بن جابر بن ثمود[1]۔

اگرچہ بغویؒ زمانہ کے اعتبار سے وہبؒ سے بہت بعد میں ہیں اور وہب تورات کے بہت

[1] ابن کثیر سورۂ اعراف۔

بڑے عالم بھی ہیں، تاہم حضرت صالح سے ثمود تک نسب کی جو کڑیاں بغوی نے ملائی ہیں علماءِ انساب کے نزدیک وہی تاریخی حیثیت سے راجح اور قرینِ ثواب ہیں۔

اس نسب نامہ سے یہ واضح ہوگیا کہ اس قوم کو (جس کے ایک فرد حضرتِ صالح (علیہ السلام) بھی ہیں) ثمود اس لیے کہا جاتا ہے کہ اُن کے نسب نامہ کا جدِ اعلیٰ ثمود ہے، اور اسی کی جانب یہ قبیلہ یا قوم منسوب ہے۔

ثمود سے حضرت نوح (علیہ السلام) تک بھی دو قول ہیں۔ اوّل ثمود بن عامر بن ارم بن سام دوم۔ ثمود بن عاد بن عوص بن ارم بن سام بن نوح علیہ السلام۔

سید محمود آلوسی صاحبِ تفسیر روح المعانی فرماتے ہیں کہ امام ثعلبی دوسرے قول کو راجح سمجھتے ہیں[1]

بہرحال اِن دونوں روایتوں سے یہ باتفاق ثابت ہوتا ہے کہ قوم ثمود بھی سامی اقوام ہی کی ایک شاخ ہے اور غالباً بلکہ یقیناً یہی وہ افرادِ قوم ہیں جو عادِ اولیٰ کی ہلاکت کے وقت حضرت ہود کے ساتھ بچ گئے تھے اور یہی نسل عادِ ثانیہ کہلائی۔ اور بلاشبہ یہ قوم بھی عرب بائدہ (ہلاک شدہ عربی نسل) میں سے ہے۔

ثمود کی بستیاں ثمود کہاں آباد تھے اور کس خطہ میں پھیلے ہوئے تھے؟ اس کے متعلق یہ طے شدہ امر ہے کہ ان کی آبادیاں حِجر میں تھیں۔ حجاز اور شام کے درمیان وادی قریٰ تک جو میدان نظر آتا ہے یہ سب اُن کا مقامِ سکونت ہے۔ اور آج کل "فج الناقہ" کے نام سے مشہور ہے۔ ثمود کی بستیوں کے کھنڈرات و آثار آج تک موجود ہیں۔ اور اس زمانہ میں بھی بعض مصری اہلِ تحقیق نے اُن کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اُن کا بیان ہے کہ وہ ایک ایسے مکان میں داخل ہوئے جو "شاہی حویلی" کہی جاتی ہے۔ اس میں متعدد کمرے ہیں اور اُس حویلی کے ساتھ ایک بہت بڑا حوض ہے اور یہ پورا مکان پہاڑ کاٹ کر بنایا گیا ہے۔

عرب کا مشہور مؤرخ مسعودی لکھتا ہے۔

[1] جلد ۹ ص ۱۴۲

ودمهم باقية وآثارهم بادية فی طريق من ورد من الشام (ج ۳ ص ۱۳) جو شخص شام سے حجاز کو آتا ہے اُس کی راہ میں ان کے مٹے نشان اور بوسیدہ کھنڈرات پڑتے ہیں۔

حجر کا یہ مقام جو حجرِ ثمود کہلاتا ہے شہر مدین سے جنوب مشرق میں اس طرح واقع ہے کہ خلیج عقبہ اُس کے سامنے پڑتی ہے۔ اور جس طرح عاد کو عادِ ارم کہا گیا ہے (حتیٰ کہ قرآنِ عزیز نے تو ارم کو اُن کی مستقل صفت ہی بنا دیا) اُسی طرح اُن کی ہلاکت کے بعد ان کو ثمودِ ارم یا عادِ ثانیہ کہا جاتا ہے۔

عرب اور مشرق کے بارہ میں یورپ کے مستشرقین[1] جس طرح اپنی حذاقت و مہارتِ تاریخ کا ثبوت دیا کرتے ہیں اور تحقیق کے نام سے غلط دعاوی کرنے کے عادی ہیں اسی طرح اُنھوں نے ثمود کو بھی اپنی تحقیق کا تختۂ مشق بنایا ہے۔ وہ سوال کرتے ہیں کہ ثمود کی اصل کیا ہے اور اُن کا وجود کب ہوا اور کس زمانہ میں؟ اس سوال کے جواب میں اُن کے دو گروہ ہیں ایک فریق کہتا ہے کہ یہ یہود کا ایک گروہ تھا جو فلسطین میں داخل نہیں ہوا تھا اور یہیں بس گیا تھا۔ مگر یہ قول نہ صرف پایۂ تحقیق سے گرا ہوا ہے بلکہ قطعاً غلط اور مہمل ہے، اس لیے کہ تمام مورخین باتفاقِ آراء یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ابھی وہ زمانہ قریب بھی نہ آیا تھا کہ حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو مصر سے لے کر نکلتے کہ ثمود کی آبادیاں ہلاک و تباہ ہو چکی تھیں اور اُن کا قلع قمع ہو چکا تھا نیز قرآنِ عزیز تصریح کرتا ہے کہ جب حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو قومِ فرعون نے جھٹلایا تو آلِ فرعون ہی میں سے ایک مردِ مومن نے یہ کہہ کر اپنی قوم کو ڈرایا کہ تمہاری اس تکذیب کا نتیجہ کہیں وہی نہ ہو جو تم سے پہلے قومِ نوح، عاد اور ثمود اور اُن کے بعد کی قوموں کا اپنے پیغمبروں کی تکذیب کی وجہ سے ہوا تھا۔

مستشرقین کی دوسری جماعت کہتی ہے کہ یہ عمالقہ میں سے تھے اور فرات کے مغربی ساحل سے اُٹھ کر یہاں آباد ہو گئے تھے۔

---

[1] یورپ میں جو علماء مشرق کی تاریخ اور مشرقی علوم سے شغف رکھتے، اور اُن کے متعلق مباحث و نظریات قائم کرتے ہیں اُن کو مستشرق کہتے ہیں، ان میں سے بعض اگرچہ حقیقۃً حذاقت و مہارت رکھتے ہیں، مگر اکثر محض ظنی اور تخمینی بلکہ من گھڑت نظریے قائم کر کے مشرق سے یا تعصب کا ثبوت دیتے ہیں یا اپنی کم مائگی علم کا۔

ان میں سے بعض کا یہ خیال ہے کہ یہ اُن عمالقہ میں سے تھے جن کو مصر کے بادشاہ احمس نے خارج البلد کر دیا تھا۔ اور چونکہ مصر کے زمانۂ قیام میں فنِ سنگ تراشی میں انہوں نے کمال حاصل کر لیا تھا اس لیے حجر جا کر پہاڑوں اور پتھروں کو تراش کر بھی بے نظیر عمارات تعمیر کیں اور عام رائج طریقہ پر بھی عالیشان محل بنائے۔

مگر ہم عاد کے واقعہ میں یہ ثابت کر آئے ہیں کہ عاد و ثمود سامی اقوام میں سے ہیں۔ اہلِ عرب اِن کو محض یہود کی غلط تقلید میں عمالقہ میں سے کہہ دیتے ہیں، حالانکہ عملیق بن آد کا اس نسل سے کوئی رشتہ نہیں ملتا۔ اس لیے یہ قول بھی صحیح نہیں ہے۔

اِن تمام آرا کے خلاف محققین کی یہ رائے ہے کہ یہ عاد کا بقیہ ہیں اور یہی صحیح اور راجح قول ہے۔

اور اہلِ حضرموت کا یہ دعویٰ کہ ثمود کی آبادیاں اور محلات عاد کی صناعی کا نتیجہ ہیں اس قول کا مخالف نہیں ہے کہ ثمود فنِ تعمیر میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے اور یہ عمارات اُن کی اپنی تعمیر ہیں۔ اس لیے کہ عادِ اولیٰ اور عادِ ثانیہ بہرحال عاد ہیں۔ حضرتِ صالح کا اپنی قوم سے یہ خطاب بھی اسی کا مؤید ہے۔

واذکروا اذ جعلکم خلفاء من	اور تم اُس وقت کو یاد کرو کہ تم کو خدا نے عاد کے بعد
بعد عادٍ وبوّأکم فی الارض	اُن کا قائم مقام بنایا اور تم کو زمین پر جگہ دی کہ تم
تتخذون من سهولها قصوراً	اُس کی سطح اور نرم حصوں پر محلات بناتے ہو اور
وتنحتون الجبال بیوتاً.	سنگ تراشی کر کے پہاڑوں میں مکان تراشتے ہو۔

رہا ثمود کے زمانہ کا مسئلہ سو اس کے متعلق کوئی فیصلہ کن منضبط وقت نہیں بتایا جا سکتا اس لیے کہ تاریخ اس بارہ میں غیر مطمئن ہے، البتہ یہ یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اُن کا زمانہ حضرت ابراہیم (علیہ

السلام سے پہلے کا زمانہ ہے، اور وہ اس جلیل القدر پیغمبر کی بعثت سے بہت پہلے ہلاک ہو چکے تھے۔
یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ ثمود کی آبادیوں کے قریب بعض ایسی قبریں پائی جاتی ہیں کہ جن پر آرامی خط کے کتبے لگے ہوئے ہیں اور ان کتبوں پر جو تاریخ کندہ ہے وہ حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) کی ولادت سے پہلے کی ہے تو اس سے یہ مغالطہ ہوتا ہے کہ یہ قوم حضرت موسیٰ کے بعد وجود میں آئی ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔
یہ دراصل اُن لوگوں کی قبریں ہیں جو اس قوم کی ہلاکت کے ہزاروں برس کے بعد اتفاقاً یہاں آکر بس گئے ہیں اور اُنہوں نے اپنے بزرگوں کے آثار کی قدامت ظاہر کرنے کے لیے آرامی خط میں (جو کہ قدیم خط ہے) اپنے کتبے لکھ کر لگا دیے تاکہ یادگار رہیں۔ نہ وہ قبریں ثمود کی ہیں اور نہ اُن کا یہ زمانہ ہے۔
مصر کا مشہور عیسائی مورخ جورجی زیدان اپنی کتاب "العرب قبل الاسلام" میں اسی کے قریب قریب لکھتا ہے۔ کہتا ہے۔

> آثار و کتبات کے پڑھنے سے جو کچھ ظاہر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ صالح (علیہ السلام) کی قوم کی بستیاں ولادتِ مسیح سے کچھ پہلے نبطیوں کے اقتدار میں آگئی تھیں یہ لوگ بطرہ کے ساکنین میں سے تھے (جن کا ذکر عنقریب کتاب میں آنے والا ہے) اور ان کے آثار اور ٹیلوں کو بہت سے مستشرقین نے خود دیکھا ہے اور مقدمۂ کتاب میں اس کا ذکر تفصیل سے کر چکا ہوں۔ ان ہی کے آثار کو اُنھوں نے پڑھا ہے جو پتھروں پر کندہ ہیں ان میں سے سب سے زیادہ اہم وہ کھنڈر ہیں جو قصرِ بنت، قبر باشا قلعہ اور برج کے ناموں سے موسوم ہیں۔ ان پر جو کچھ تحریر ہے وہ نبطی تحریریں ہیں اور ان میں سے بعض یا سب کی سب وہی تحریریں ہیں جو قبروں پر کندہ ہیں۔
>
> مستشرقین نے یہاں جو کچھ پایا اُن میں سے حسب ذیل ایک کتبہ بھی ہے جو پتھر پر نبطی حروف میں کندہ ہے اور ولادت مسیح علیہ السلام سے قریب زمانہ کا مکتوب ہے (کندہ عبارت کا مضمون یہ ہے)
>
> "یہ مقبرہ کمکم بنتِ وائلہ بنتِ حرم نے اور کمکم کی بیٹی کلیبہ نے اپنے لیے اور اپنی اولاد کے لیے بنوایا ہے۔

اس کی بنا بہت اچھے مہینوں میں شروع کی گئی ہے یہ نبطیوں کے بادشاہ حارث کی تخت نشینی کا نواں سال ہے وہ حارث جو اپنے قبیلہ کا عاشق صادق ہے۔

پس "عمی ذوالشریٰ[1] وعرشہ[2]" لات، عمند[1]، منوت[2] اور قیس[3] کی اُن پر لعنت ہو جو ان قبروں کو فروخت کرے یا رہن رکھے، یا اُن سے کسی جسم کو یا عضو کو نکالے، یا لکم اُس کی بیٹی اور اُس کی اولاد کے علاوہ کسی کو دفن کرے۔

اور جو شخص بھی اس پر لکھے ہوئے کی مخالفت کرے اُس پر ذوالشریٰ، ہُبل، منوت کی پانچ لعنتیں ہوں۔ اور جو ساحر اس کے خلاف کرے اُس پر ایک ہزار درہم حارثی کا تاوان واجب کرے مگر یہ کہ اُس کے ہاتھ میں لکم کلیبہ یا اُس کی اولاد میں سے کسی کے ہاتھ کی تحریر ہو جس میں اس اجنبی قبر کے لیے صاف اور صریح الفاظ میں اجازت موجود ہو، اور وہ اصلی ہو جعلی نہ ہو۔

اس مقبرہ کو وہب اللاہ بن عبد عبادہ نے بنایا[1]۔

اہل ثمود کا مذہب ثمود اپنے بت پرست پیشروؤں کی طرح بت پرست تھے، وہ خدائے واحد کے علاوہ بہت سے معبودانِ باطل کے پرستار اور شرک میں مبتلا تھے۔ اس لیے اُن کی اصلاح اور احقاقِ حق کے لیے ان ہی کے قبیلہ میں سے حضرت صالح کو ناصح پیغمبر اور رسول بنا کر بھیجا گیا تاکہ وہ اُن کو راہِ راست پر لائیں، اُن کو خدا کی نعمتیں یاد دلائیں جن سے صبح و شام وہ محظوظ ہوتے رہتے ہیں اور اُن پر واضح کریں کہ کائنات کی ہر شے خدا کی توحید اور یکتائی پر شاہد ہے اور یقینی دلائل اور مُسکت براہین کے ساتھ اُن کی گمراہی کو ظاہر کریں اور بتائیں کہ پرستش و عبادت کے لائق ذاتِ احد کے علاوہ دوسرا کوئی نہیں ہے

قرآن عزیز میں قصص کا مطلب قرآنِ عزیز کی یہ سُنت ہے کہ وہ انسانوں کی ہدایت کے لیے گذشتہ اقوام اور اُن کے

---

[1] سوالیہ نشان زدہ عربی عبارت کتبہ پر صاف نہیں پڑھی جاسکی اس لئے اصل الفاظ نقل کر دیئے گئے [2] ص ۸۰۔

ہادیوں کے قصص بیان کر کے نصیحت و موعظت کا سامان مہیا کرتا ہے۔ اس کا موضوع حکایات و قصص بیان کرنا نہیں ہے بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ خدائے تعالیٰ نے جبکہ انسان کو عقل کی روشنی عطا فرمائی ہے تو اُس کی ہدایت و نجات اُخروی کا کیا سامان کیا ہے تاکہ وہ ان اسباب کی مدد سے اپنی عقل سے کام لے اور خدا کی مرضیات و نامرضیات کو پہچانے۔ اُس نے بتایا کہ خدائے تعالیٰ کی یہ سُنت جاریہ ہے کہ وہ انسانوں کی ہدایت کے لیے اُن ہی میں سے پیغمبر و رسول بھیجتا ہے، وہ اُن کو حق کی راہ بتاتے اور ہر قسم کی گمراہی سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں اور تائیدیں اقوام و اُمم کے واقعات بیان کرنا اور تاریخ ماضی کو دُہراتا ہے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ جن اقوام نے اپنے رسولوں کی ہدایات کو تسلیم کیا اُنھوں نے دنیا و آخرت کی فلاح پائی اور جن اُمتوں نے اُن کی تلقین کا انکار کیا، اُن کا مذاق اُڑایا اور اُن کو جھٹلایا تو خدائے تعالیٰ نے اپنے سچے رسول کی تصدیق کے لیے کبھی بطور خود اور کبھی قوم کے مطالبہ پر ایسی نشانیاں نازل فرمائیں جو نبیوں اور رسولوں کی تصدیق کا باعث بنیں اور "معجزہ" کہلائیں۔

لیکن اگر قوم نے اس نشانی "معجزہ" کے بعد بھی تکذیب کو نہ چھوڑا اور بغض و عناد سے وہ انکار پر اڑے رہے تو پھر "عذاب الٰہی" نے آکر اُن کو تباہ و ہلاک کر دیا اور اُن کے واقعات کو آنے والی اقوام کے لیے عبرت و موعظت کا سامان بنا دیا۔

وما كان ربك مهلك القرىٰ حتى	اور تیرا رب بستیوں کو اُس وقت تک ہلاک کرنے والا
يبعث في امها رسولاً يتلوا عليهم	نہیں جب تک نہ بھیجے اُن کے صدر مقام میں اپنا
اٰيٰتنا ۚ وما كنا مهلكي القرىٰ الا و	رسول جو پڑھ کر سنائے اُن کو ہماری آیات اور ہم
اهلها ظٰلمون ۝ (قصص)	(اُس وقت تک) بستیوں کو ہلاک نہیں کرتے جب تک
	اُن کے بسنے والے خود ہی ظلم پر نہ اتر آئیں۔

معجزہ کی حقیقت "معجزہ" لغت میں عاجز کر دینے اور تھکا دینے والی چیز کو کہتے ہیں۔ اور اسلامی اصطلاح میں ایسے

عمل کا نام ہے جو سلسلۂ اسباب کے بغیر عالم وجود میں آجائے۔ اس کو عام بول چال میں "خرقِ عادت" بھی کہتے ہیں، اور اسی بنا پر اس جگہ یہ سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ "کیا عادت اللہ" (کہ جس کو ناموسِ فطرت بھی کہا جاتا ہے) کا ٹوٹنا ممکن ہے؟

دوسرے الفاظ میں اس سوال کی تعبیر اس طرح کی جاسکتی ہے کہ کیا قانونِ قدرت میں تبدیلی ممکن ہے؟

اس سوال کا حل یہ ہے کہ معجزہ کی یہ تعبیر کہ وہ خارقِ عادت شے کا نام ہے، غلط تعبیر ہے اس لیے کہ خدائے تعالیٰ کے قوانینِ قدرت یا نوامیسِ فطرت دراصل دو قسموں میں تقسیم ہیں، عادتِ عام اور عادت خاص۔ عادتِ عام سے قدرت کے وہ قوانین مُراد ہیں جو باہم اسباب و مسببات کے سلسلہ میں جکڑے ہوئے ہیں مثلاً آگ جلاتی ہے اور پانی خنکی پہنچاتا ہے اور عادتِ خاص کا مطلب یہ ہے کہ اسباب و مسببات میں علاقہ پیدا کرنے والے قدرت کے ہاتھ نے کسی خاص مقصد کے لیے سبب اور مسبب کے درمیانی رشتہ کو کسی شے سے الگ کر دیا یا بغیر سبب کے مسبب کو وجود بخش دیا۔ جیسا کہ جلنے کے اسباب موجود ہونے کے باوجود کسی جسم کا آگ سے نہ جلنا، یا دو تین انسانوں کے قابل خوراک سے سو دو سو انسانوں کی شکم سیری ہو جانا اور اپنی اصل مقدار کی حد تک پھر بھی باقی بچ جانا۔

یہ دونوں باتیں چونکہ عام نگاہوں میں قانونِ قدرت کے خلاف ہیں اس لیے جب یہ اور اسی طرح کی کوئی شے رونما ہوتی یا اُس کے وجود پذیر ہو جانے کی اطلاع دی جاتی ہے تو یہ کہا جاتا ہے کہ یہ قدرت کے قانون یا عادت اللہ کے خلاف ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ وہ قوانینِ فطرت کی پہلی قسم یعنی عام عادت کے خلاف تو ہوتا ہے مگر عادتِ خاص کے خلاف نہیں ہوتا اور وہ بھی قانونِ قدرت ہی کی ایک کڑی ہوتی ہے جو عام حالات سے الگ کسی خاص مقصد کے پورا کرنے کے لیے ظاہر کی جاتی ہے۔

اور اس جگہ وہ مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس طرح خدائے تعالیٰ اپنے سچے رسول اور پیغمبر کی صداقت وحقانیت کی تصدیق کرتا اور جھٹلانے والوں کو یہ باور کراتا ہے کہ اگر یہ مدعی رسالت اپنے دعوی میں صادق نہ ہوتا تو خدا کی تائید کبھی اُس کے ساتھ نہ ہوتی، پس عام قانونِ قدرت سے جُدا رسول وپیغمبر کا یہ عمل ظاہر کرتا ہے کہ درحقیقت یہ اس کا اپنا فعل نہیں ہے بلکہ یہ خدا کا اپنا فعل ہے جو عادتِ خاص کی صورت میں نبی کے ہاتھوں ظہور پذیر ہوا تاکہ اُس کی صداقت کی دلیل بن سکے۔

اور اس میں شک نہیں کہ اگر کسی نبی اور پیغمبر کو معجزہ نہ بھی دیا جاتا تب بھی عقلی دلائل وبراہین کی روشنی میں اُس کی صداقت کا ثبوت اظہر من الشمس ہوتا اور اُس کا انکار محض بغض وعناد سمجھا جاتا، اور بے دلیل انکار مانا جاتا اور اگرچہ آفتاب صبح سے زیادہ روشن دلائل وبراہین خواص وعوام کو قائل کرنے کے لیے کافی وشافی ہیں مگر عوام عموماً اُس وقت تک اُن کی جانب متوجہ نہیں ہوتے اور اُن کا قلب ودماغ اُس وقت تک اُن سے متاثر نہیں ہوتا، جب تک اِن دلائل کے ساتھ ساتھ ایسی کوئی نشانی بھی نہ ہو جو یکلخت اُن کو مرعوب کردے اور وہ یقین کرلیں کہ ایسی طاقت کا مالک وہی ہوسکتا ہے جس کو خُدا کی تائید حاصل ہو۔ اس لیے ہر خاص وعام کے لیے یہ اعتقاد ضروری ہے کہ انبیاء ورسل سے جو معجزات ثبوت ودلالت کے اعتبار سے قطعی اور یقینی ثابت ہوچکے ہیں اُن پر ایمان لائے اور اُن کے وجود اور اُن کی حقیقت کا اعتراف کرے ۔اس لیے کہ ان میں سے کسی ایک کا بھی انکار درحقیقت اسلام سے انکار ہے

البتہ یہ حقیقت کبھی فراموش نہ ہونی چاہیے کہ کسی شخص سے اس قسم کے خارق عادت عمل صادر ہونے کا نام معجزہ نہیں ہے اور محض اس عمل کے بروئے کار لانے سے وہ نبی نہیں ہوسکتا اس لیے کہ نبی اور رسول کے لیے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اُس کی تمام زندگی اس طرح آزمائش وامتحان کی کسوٹی پر اُتر چکی ہو کہ اُس کا کوئی شعبۂ زندگی ناقص اور قابلِ اعتراض نہ ہو بلکہ اُس کی تمام تر زندگی میں اخلاق کی بلندی، گناہوں سے معصومیت اور صداقتِ گفتار وکردار کا کمال ہی پایا جاتا ہو۔ پھر اگر ایسا شخص دعوے

نبوت کرتا اور اپنے دعوے کی صداقت میں علمی دلائل و براہین کے علاوہ خدا کے نشانات (معجزات) بھی پیش کرتا ہے تو بلاشبہ وہ نبی ہے اور بلا ریب اُس کا یہ فعل "معجزہ" ہے۔

ہم نے ابھی کہا کہ "معجزہ" درحقیقت نبی کا اپنا عمل نہیں ہوتا بلکہ وہ خدائے تعالیٰ کا فعل ہے جو نبی کے ہاتھوں سے ظاہر ہوتا ہے اور معجزہ کہلاتا ہے۔ یہ اس لیے کہ نبی و رسول بھی ایک انسان اور بشر ہی ہوتا ہے، اور کسی انسان کی قدرت میں یہ نہیں ہے کہ وہ خدائے تعالیٰ کے قوانینِ عام و خاص میں دخل اندازی یا دراندازی کر سکے۔ یہ تو خدا ہی کی مرضی پر ہے کہ اگر وہ چاہے اور مناسبِ حال اور تقاضاءِ وقت سمجھے تو نبی اور رسول کے ہاتھ پر ایسے فعل کا ظہور کرا دے جو اُس کے قوانینِ فطرت کی عادتِ خاص کی قسم میں داخل ہوں۔ اور اگر نہ چاہے تو نبی و رسول کے لیے بھی اُس کا اظہار ناممکن اور محال ہے۔

غزوۂ بدر میں جبکہ تین سو تیرہ کے مقابلہ میں ساز و سامان سے مسلح ایک ہزار دشمنوں کا لشکر مسلمانوں پر یلغار کر کے آیا تھا تو آپ نے اُن کی جانب مٹھی بھر خاک پھینکی جس کی وجہ سے ہر لشکری کی آنکھ میں خاک کے ریزے پہنچے اور وہ بے چین ہو کر آنکھیں ملنے لگے اور اس طرح مسلمانوں کو حملہ کر کے فتح حاصل ہو گئی۔ اس واقعہ کا مختصر اور معجزانہ انداز میں جو تذکرہ قرآنِ عزیز نے کیا ہے وہ ہمارے اس دعوے کی قوی اور یقینی دلیل ہے۔

وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ۔ (انفال)	اور تم نے (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) وہ مٹھی بھر خاک نہیں پھینکی تھی جو تم نے (اپنے ہاتھ سے) پھینکی لیکن وہ تو (حقیقت میں) اللہ تعالیٰ نے پھینکی تھی۔

اس جگہ نبی کے اُس عمل کا جو اُن کے ہاتھوں انجام پایا تھا کس عجیب و غریب انداز سے معجزہ ہونا ثابت کیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مٹھی بھر خاک بیشک تمہارے ہاتھ سے پھینکی گئی اس لیے کہ تمہارے ہاتھ میں تھی لیکن مٹھی

بھر خاک کا یہ اثر کہ دشمن کے محاذ کی دوری اور دشمن کے اتنی بڑی تعداد میں ہونے کے باوجود ان سب کی آنکھوں میں جھونک دی گئی تمہارے ہاتھ سے ناممکن تھا، یہ درحقیقت خدا کا فعل تھا کہ اُس کے یدِ قدرت نے ان تمام دشواریوں کو یکلخت ختم کر کے اُس مٹھی بھر خاک کو اس حالت تک پہنچا دیا۔

یہی وہ حقیقت ہے جس کو آپ کے سامنے اس انداز سے کہا گیا کہ معجزہ نبی کا اپنا فعل نہیں ہوتا بلکہ وہ براہِ راست خدا کا فعل ہوتا ہے جو نبی کے ہاتھوں سے اس کی تائید میں کیا جاتا ہے۔

وما کان لرسول ان یأتی بآیۃ	اور کسی رسول کی طاقت میں نہیں کہ وہ کوئی نشانی (معجزہ)
الّا باذن اللّٰہ فاذا جاء امر	لاسکے خدا کی اجازت بغیر پس جب خدا کا حکم آپہنچتا ہے تو
اللّٰہ قضی بالحق وخسر ھنالك	حق کے ساتھ فیصلہ کر دیا جاتا ہے اور اس موقع پر جھٹلانے
المبطلون ۔ (المؤمن)	والے خسارہ میں پڑ جاتے ہیں۔
واقسموا باللّٰہ جھد ایمانھم	اور وہ اللہ کی سخت قسمیں کھاتے ہیں کہ اگر اُن کے پاس کوئی
لئن جاءتھم اٰیۃ لیؤمنن بھاط	نشانی آجائے تو اُس پر ضرور ایمان لے آئینگے۔ (اے محمد
قل انما الاٰیٰت عند اللّٰہ وما	صلی اللہ علیہ وسلم آپ کہہ دیجیے کہ نشانیاں تو اللہ ہی کے
یشعرکم انھا اذا جاءت لا	قبضہ میں ہیں۔ اور (اے مسلمانو) تم کو خبر نہیں کہ ان کے پاس
یؤمنون (الانعام)	اگر یہ نشانیاں آبھی جائیں تو یہ ایمان لانیوالے نہیں ہیں۔

معجزہ سے متعلق ہماری یہ بحث اُسی شخص کے لیے باعثِ تسکین ہوسکتی ہے جو مذہب کے اس بنیادی عقیدہ کا قائل ہو کہ تمام اشیاء کے خواص اُن کے اپنے ذاتی خواص نہیں ہیں بلکہ کسی پیدا کرنے والے نے اُن کو عطا کیے ہیں۔ پس جو شخص اس عقیدہ کا حامی ہے وہ بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ آگ میں جلانے کی خاصیت پیدا کرنے والے نے عام قانونِ قدرت اُس کے لیے یہی رکھا ہے کہ جو شے اُس سے مل جائے وہ جل جائے لیکن یہ عقلاً ناممکن نہیں ہے کہ وہ کسی اہم مقصد کی تکمیل کے لیے آگ کی اس

خاصیت کو کسی خاص حالت میں سلب کرلے اور وہ اُس کے قانونِ قدرت کی خاص حالت یا خاص عادت شمار ہو۔

لیکن جو شخص اس بنیاد ہی کو تسلیم نہیں کرتا اور ہر شے کے خواص کو اس طرح اُس کے ذاتی خواص مانتا ہے کہ کسی حالت اور کسی وقت میں بھی اُس خاصیت کا اُس شے سے جُدا ہونا ممکن نہیں ہے تو اس شخص سے اول یہ طے کرنا چاہیے کہ کیا عقل یہ باور کرسکتی ہے کہ جو شے خود اپنے وجود میں دوسرے کی محتاج ہو اُس کا کوئی خاصّہ بھی ذاتی اور غیر منفک ہوسکتا ہے؟ گذشتہ سال لندن[1] اور امریکہ میں خدا بخش کشمیری نے دہکتی ہوئی آگ پر چلنے کا اس طرح مظاہرہ کیا کہ خود بھی چلا اور دوسرے اشخاص کو بھی اپنے ساتھ آگ پر سے گذارا، اور اس کے بعد تمام سائنسدانوں نے اُس کے جسم کا طرح طرح سے تجربہ کرکے یہ معلوم کرنا چاہا کہ شاید وہ فائر پروف ہو، مگر ناکام رہے اور اُن کو اقرار کرنا پڑا کہ اُس کا جسم اور آگ پر گذرنے والے دوسرے اشخاص کا جسم عام انسانوں کے جسم سے زیادہ کوئی خاص کیفیت نہیں رکھتا اور انتہائے حیرت و استعجاب کے ساتھ اس کا اعتراف کیا کہ وہ اس حقیقت کے سمجھنے سے عاجز ہیں کہ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ آگ موجود ہے اور نہیں جلاتی، تو اس کا اس کے پاس کیا جواب ہے۔

پس علم کی فراوانی کے باوجود جبکہ ہمارے عجز کا یہ عالم ہے تو ہم کو کیا زیبا ہے کہ علم الیقین (وحی) کی بیان کردہ حقیقت (معجزہ) کا اس لیے انکار کردیں کہ ہماری عقل عام حالات میں سبب کے بغیر کسی مسبب کو دیکھنے کی عادی نہیں ہے۔

بہرحال ایسے شخص کو خدا اور اس کی صفات خصوصاً صفتِ قدرت پر پہلے بحث کرنی چاہیے اس کے بعد اس مسئلہ کی نوبت آسکتی ہے، مگر اس کا اصل مقام یہ نہیں بلکہ "علم کلام" ہے۔

ناقة الله | الحاصل، حضرت صالح (علیہ السلام) قومِ (ثمود) کو بار بار سمجھاتے اور نصیحت فرماتے رہے، مگر قوم پر مطلق اثر نہیں ہوا بلکہ اُس کا بغض و عناد ترقی پاتا رہا، اور اُن کی مخالفت بڑھتی ہی رہی اور وہ کسی طرح بت پرستی سے باز نہ آئی۔ اگرچہ ایک مختصر اور کمزور جماعت نے ایمان قبول کرلیا اور وہ مسلمان ہوگئی، مگر قوم کے سردار

[1] لندن ٹائمز

اور بڑے بڑے سردار اُسی طرح باطل پرستی پر قائم رہے۔ اور اُنھوں نے خُدا کی دی ہوئی ہر قسم کی خوش عیشی اور رفاہیت کا شکریہ ادا کرنے کی بجائے کفرانِ نعمت کو شعار بنا لیا اور حضرتِ صالحؑ کا مذاق اُڑاتے ہوئے کہا کرتے کہ صالح! اگر ہم باطل پرست ہوتے، خدا کے صحیح مذہب کے منکر ہوتے، اور اُس کے پسندیدہ طریقہ پر قائم نہ ہوتے تو آج ہم کو یہ دھن دولت، سرسبز و شاداب باغات کی فراوانی، سیم و زر کی بہتات، بلند و عالیشان محلات کی رہائش، میوہ جات اور پھلوں کی کثرت، شیریں نہروں اور عمدہ مرغزاروں کی افزائش حاصل نہ ہوتی، تو خود کو اور اپنے پیروں کو دیکھ اور پھر ان کی تنگ حالی اور غربت پر نظر کر اور بتا کہ خدا کے پیارے اور مقبول کون ہیں، ہم یا تم؟

حضرتِ صالح فرماتے کہ تم اپنی اس رفاہیت اور عیش سامانی پر شیخی نہ مارو اور خدا کے سچے رسول اور اُس کے دینِ برحق کا مذاق نہ بناؤ۔ اگر تمہارے کبر و غرور اور عناد کا یہی حال رہا تو پل بھر میں یہ سب کچھ فنا ہو جائیگا اور پھر نہ تم رہوگے اور نہ تمہارا یہ ساز و سامان۔ بیشک یہ سب خدا کی نعمتیں ہیں اگر ان کو حاصل کرنے والے اُس کا شکر ادا کریں اور اُس کے سامنے سرِ نیاز جھکائیں۔ اور بلاشبہ یہی سامان عذاب و لعنت ہے اگر ان کا استقبال شیخی اور غرور کے ساتھ کیا جائے۔ اس لیے یہ سمجھنا سخت غلطی ہے کہ ہر سامانِ عیش خشنودیِ الٰہی کا ثمرہ ہے۔

ثمود کو یہ بھی حیرانی تھی کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم ہی میں کا ایک انسان خدا کا پیغمبر بن جائے اور وہ خدا کے احکام سُنانے لگے، وہ سخت تعجب سے کہتے۔

أَؤُنْزِلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ مِنْ بَيْنِنَا کیا ہماری موجودگی میں اس پر (خدا کی نصیحت) اُترتی ہے۔

یعنی اگر ایسا ہونا ہی تھا تو اس کے اہل ہم تھے نہ کہ صالح۔ اور کبھی اپنی قوم کے کمزور افراد کو (جو کہ مسلمان ہو گئے تھے) خطاب کر کے کہتے:۔

أَتَعْلَمُونَ أَنَّ صَالِحًا مُرْسَلٌ مِنْ رَبِّهِ کیا تم کو یقین ہے کہ بلاشبہ صالح اپنے پروردگار کا رسول ہے؟

اور مسلمان جواب دیتے :-

قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ   اُنہوں نے کہا بیشک ہم تو اُس کے لائے پیغام پر ایمان رکھتے ہیں

تب یہ متکبرین غصہ میں کہتے :

اِنَّا بِالَّذِیْٓ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ   بلاشبہ ہم تو اُس شے کا جس پر تمہارا ایمان ہے انکار کرتے ہیں

بہر حال حضرت صالح علیہ السلام کی مغرور اور سرکش قوم نے انکی پیغمبرانہ دعوت و نصیحت کو یوں تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور خدا کے نشان (معجزہ) کا مطالبہ کیا تب صالح (علیہ السلام) نے درگاہِ الٰہی میں دعا کی اور قبولیت کے بعد اپنی قوم سے فرمایا کہ تمہارا مطلوبہ نشان اونٹنی کی شکل میں یہ موجود ہے۔ دیکھو اگر تم نے اس سے کچھ تعرض نہ کیا اور یہ صحیح و سلامت رہی تو تم بھی محفوظ و مامون رہو گے اور اگر تم نے اس کو ایذا پہنچائی تو پھر یہی تمہاری ہلاکت کا نشان ثابت ہو گی۔ اور خدائے تعالیٰ نے تمہارے اور اس کے درمیان پانی کے لیے باری مقرر فرما دی ہے ایک دن تمہارا ہے اور ایک دن اس کا۔ لہذا اس میں فرق نہ آئے

قرآنِ عزیز نے اس کو "ناقۃ اللہ" (خدا کی اونٹنی) کہا ہے تاکہ یہ پیشِ نظر رہے کہ یوں تو تمام مخلوق خدا ہی کی ملکیت ہے، مگر ثمود نے چونکہ اس کو خدا کی ایک نشانی کی شکل میں طلب کیا تھا اس لیے اس کی موجودہ خصوصیت اور اعزاز نے اُس کو "ناقۃ اللہ" کا لقب دلایا[1]۔ اور نیز اس کو "لکم اٰیۃ"

---

[1] قرآنِ عزیز سے اس سلسلہ میں صرف دو باتیں ثابت ہیں ایک یہ کہ ثمود نے حضرت صالح سے نشان (معجزہ) طلب کیا اور حضرت صالح نے "ناقہ" کو بطور نشانی پیش کیا، دوسرے یہ کہ حضرت صالح نے قوم کو یہ ہدایت کر دی تھی کہ وہ اس کو ضرر نہ پہنچائے اور پانی کی باری مقرر کرلے کہ ایک روز ناقہ کا   اور دوسرا قوم کا اور اگر اس کو نقصان پہنچایا تو یہی قوم کی ہلاکت کا نشان ہو گی۔ چنانچہ اُنہوں نے "ناقہ" کو ہلاک کر دیا اور خدا کے عذاب سے خود بھی ہلاک ہو گئے۔

اس سے زائد جو کچھ ہے اُس کا مدار یا اُن روایاتِ حدیثی پر ہے جو اخبارِ آحاد کے درجہ میں شمار ہیں اور یا بائیبل اور تاریخ قدیم کی روایات پر۔   جہاں تک اخبارِ آحاد کا تعلق ہے۔ محدثین کے نزدیک اُن میں سے بعض صحیح روایات ہیں اور بعض ضعیف، حافظ عماد الدین بن کثیر نے سورۂ اعراف کی تفسیر میں "ناقۃ اللہ" کے وجود میں آنے کی روایات گو سندِ روایات کے اصول پر نقل نہیں فرمایا بلکہ ایک تاریخی واقعہ کی طرح تحریر فرمایا ہے۔

واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ قومِ ثمود جب حضرت صالح کی تبلیغِ حق سے اُکتا گئی تو اس کے سرخیل اور سرگروہ افراد نے

(بقیہ بر صفحہ ۱۲۰)

کہہ کر یہ بھی بتایا کہ یہ نشانی اپنے اندر خاص اہمیت رکھتی ہے، لیکن بدقسمت قومِ ثمود زیادہ دیر تک اس کو برداشت نہ کرسکی اور ایک روز سازش کرکے قدار بن سالف کو اس پر آمادہ کرلیا کہ وہ اس کے قتل میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۹)
قوم کی موجودگی میں مطالبہ کیا کہ اے صالح! اگر تو واقعی خدا کا فرستادہ ہے تو کوئی نشانی دکھا تاکہ ہم تیری صداقت پر ایمان لے آئیں۔ حضرت صالح نے فرمایا کہ ایسا نہ ہو کہ نشان آنے کے بعد بھی انکار پر مصر اور سرکشی پر قائم رہو، قوم کے ان سرداروں نے بتاکید وعدہ کیا کہ ہم فوراً ایمان لے آئینگے۔ تب حضرت صالح نے انہی سے دریافت کیا کہ وہ کس قسم کا نشان چاہتے ہیں؟ اُنہوں نے مطالبہ کیا کہ سامنے والے پہاڑ میں سے یا بستی کے اُس پتھر میں سے جو کنارہ پر نصب ہے ایک ایسی اونٹنی ظاہر کرکہ جو گابھن ہو اور فوراً بچہ دے۔ حضرت صالح (علیہ السلام) نے درگاہِ الٰہی میں دعا کی اور اُسی وقت اُن سب کے سامنے پہاڑ یا پتھر میں سے حاملہ اونٹنی ظاہر ہوئی اور اس نے بچہ دیا۔ یہ دیکھ کر ان سرداروں میں سے جندع بن عمرو تو اُسی وقت مشرف باسلام ہو گیا اور دوسرے سرداروں نے بھی جب اُس کی پیروی میں اسلام لانے کا ارادہ کیا تو اُن کے ہیاکل و منادر کے مہنتوں ذؤاب بن عمرو اور خباب نے اور اُن کے کاہن رُباب بن صعر نے اُن کو اس سے باز رکھا اور اسی طرح باقی دوسروں کو بھی اسلام لانے سے روکا۔

اب حضرت صالح (علیہ السلام) نے قوم کے تمام افراد کو تنبیہ کی کہ دیکھو یہ نشانی تمہاری طلب پر بھیجی گئی ہے۔ خدا کا یہ فیصلہ ہے کہ پانی کی باری مقرر ہو، ایک دن اس ناقہ کا ہوگا اور ایک دن ساری قوم اور اس کے سارے چوپاؤں کا، اور خبردار اس کو کوئی اذیت نہ پہنچے، اگر اس کو آزار پہنچا تو پھر تمہاری بھی خیر نہیں ہے۔

قوم نے اگرچہ اس حیرت زا معجزہ کو دیکھ کر ایمان قبول نہ کیا لیکن دلوں کے اقرار نے اُس کو آزار پہنچانے سے باز رکھا اور یہ دستور جاری رہا کہ پانی کی باری ایک روز ناقہ کی رہتی اور تمام قوم اُس کے دودھ سے فائدہ اُٹھاتی اور دوسرے روز قوم کی باری ہوتی، اور ناقہ اور اُس کا بچہ بغیر روک ٹوک چراگاہوں میں چرتے اور آسودہ رہتے، مگر آہستہ آہستہ یہ بات بھی اُن کو کھٹکنے لگی اور آپس میں صلاح و مشورے ہونے لگے کہ اس ناقہ کا خاتمہ کردیا جائے تو اس باری والے قصہ سے نجات ملے، کیونکہ ہمارے چوپاؤں کے لیے اور خود ہمارے اپنے لیے یہ قید ناقابلِ برداشت ہے۔ یہ باتیں اگرچہ ہوتی رہتی تھیں لیکن کسی کو اس کے قتل کرنے کی ہمت نہ پڑتی تھی مگر ایک حسین و جمیل مالدار عورت صدوق نے خود کو ایک شخص مصدع کے سامنے اور ایک مالدار عورت عُنیزہ نے اپنی ایک خوبصورت لڑکی کو قیدار کے سامنے یہ کہہ کر پیش کیا کہ اگر وہ دونوں ناقہ کو ہلاک کردیں تو یہ تمہاری ملک ہیں تم ان کو بیوی بنا کر عیش کرو۔ آخر قیدار بن سالف اور مصدع کو اس کے لیے آمادہ کرلیا گیا۔ اور طے پایا کہ وہ راہ میں چھپ کر بیٹھ جائینگے اور ناقہ جب چراگاہ جانے لگے تو اس پر حملہ کردینگے، اور چند دوسرے آدمیوں نے بھی مدد کا وعدہ کیا۔

پہل کرے اور باقی اعانت کریں۔ اور اس طرح ناقہ کو ہلاک کرڈالا۔ حضرت صالح (علیہ السلام) کو جب یہ معلوم ہوا تو آبدیدہ ہو کر فرمانے لگے۔ بدبخت قوم! آخر تجھ سے صبر نہ ہو سکا، اب خدا کے عذاب کا انتظار کر۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۰)

غرض ایسا ہی کیا گیا اور ناقہ کو اس طرح سازش کر کے قتل کرڈالا اور پھر آپس میں حلف کیا کہ رات ہونے پر ہم سب صالح اور اس کے اہل وعیال کو بھی قتل کر دینگے اور پھر اُس کے اولیاء کو قسمیں کھا کر یقین دلائینگے کہ یہ کام ہمارا نہیں ہے۔

اور بچہ یہ دیکھ کر بھاگ کر پہاڑ پر چڑھ گیا اور چیختا اور بولتا ہوا پہاڑی میں غائب ہو گیا۔

صالح علیہ السلام کو جب یہ خبر ہوئی تو حسرت وافسوس کے ساتھ قوم سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ آخر وہی ہوا جس کا مجھ کو خوف تھا، اب خدا کے عذاب کا انتظار کرو جو تین دن کے بعد تم کو تباہ کر دیگا، اور پھر بجلی کی چمک اور کڑک کا عذاب آیا اور اُس نے رات میں سب کو تباہ کر دیا، اور آنے والے انسانوں کے لیے تاریخی عبرت کا سبق دے گیا۔

اس واقعہ کے ساتھ ساتھ محدث ابن کثیر نے چند روایات حدیثی بھی بیان فرمائی ہیں مثلاً:۔

غزوۂ تبوک کے موقعہ پر جب آپ کا گذر حجر پر ہوا تو صحابہ نے ثمود کے کنویں سے پانی بھرا اور آٹا گوندھ کر روٹیاں تیار کرنے لگے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو پانی گرا دینے اور ہانڈیاں اوندھی کر دینے، اور آٹا بیکار کر دینے کا حکم فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ یہ وہ بستی ہے جس پر خدا کا عذاب ہوا، یہاں نہ قیام کرو اور نہ یہاں کی اشیاء سے فائدہ اُٹھاؤ آگے بڑھ کر پڑاؤ ڈالو ایسا نہ ہو کہ تم بھی کسی بلا میں مبتلا ہو جاؤ۔ اور ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ تم ان حجر کی بستیوں میں خدا سے ڈرتے، عجز وزاری کرتے، اور روتے ہوئے داخل ہوا کرو، ورنہ۔ ان میں داخل ہی نہ ہوا کرو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم بھی اپنی غفلت کی وجہ سے عذاب کی مصیبت میں مبتلا ہو جاؤ۔

اور ایک روایت میں ہے کہ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حجر میں داخل ہوئے تو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے نشانیاں طلب نہ کیا کرو۔ دیکھو صالح (علیہ السلام) کی قوم نے نشان طلب کیا تھا اور وہ ناقہ پہاڑ کی کھوہ سے نکلتی اور اپنی باری میں کھا پی کر وہیں واپس چلی جاتی اور جو اُس کی باری کا دن تھا اُس میں قوم ثمود کو اپنے دودھ سے سیراب کرتی تھی مگر ثمود نے آخر کار سرکشی کی اور ناقہ کی کونچیں کاٹ کر اُس کو ہلاک کر دیا اور نتیجہ یہ نکلا کہ خدا نے اُن پر "چیخ کا عذاب" مسلط کر دیا اور وہ اُس آواز سے گھروں کے اندر ہی مردہ ہو کر رہ گئے، صرف ایک شخص ابو رغال نامی باقی بچا جو حرم میں گیا ہوا تھا لیکن جب وہ حدود حرم سے باہر آیا تو فوراً اُسی عذاب کا شکار ہو گیا۔

حافظ ابن کثیر نے یہ تینوں روایات سند کے ساتھ مسند احمد سے نقل کر کے اُن کی توثیق کی ہے۔[1]

اس پوری تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ قرآن عزیز سے یہ تو یقین کے ساتھ ثابت ہے کہ "ناقۃ اللہ" خدا کا ایک نشان تھی

[1] تاریخ ابن کثیر جلد ۱ ص ۱۳۸-۱۳۹۔

تین روز کے بعد وہ نہ ٹلنے والا عذاب آئیگا اور تم سب کو ہمیشہ کے لیے تہس نہس کر جائیگا۔

سید آلوسی اپنی تفسیر روح المعانی[۱] میں تحریر فرماتے ہیں کہ ثمود پر عذاب آنے کی علامات اگلی صبح ہی سے شروع ہو گئیں یعنی پہلے روز اُن سب کے چہرے اس طرح زرد پڑ گئے جیسا کہ خوف کی ابتدائی حالت میں ہو جایا کرتا ہے اور دوسرے روز سب کے چہرے سُرخ تھے گویا خوف و دہشت کا یہ دوسرا درجہ تھا، اور تیسرے روز اُن سب کے چہرے سیاہ تھے اور تاریکی چھائی ہوئی تھی یہ خوف و دہشت کا وہ تیسرا مقام ہے جس کے بعد موت ہی کا درجہ باقی رہجاتا ہے۔ تین دن کی ان علاماتِ عذاب نے اگرچہ اُن کے چہروں کو واقعی زرد، سُرخ اور تاریک بنا دیا تھا لیکن ان رنگوں کی ترتیبی خصوصیت یہ صاف بتا رہی ہے کہ اُن کے دلوں کو صالح علیہ السلام کے سچے ہونے کا یقین تھا اور صرف حسد و بغض سے انکار کرتے تھے۔ اب جبکہ خدا کے حکم کے خلاف "جرم" کر چکے اور اُس کی پاداش میں صالح (علیہ السلام) سے عذاب کی ہولناک خبر سُنی تو اُن پر خوف و دہشت کے وہ فطری رنگ اور نقوش نمایاں ہونے لگے جو موت کے یقین کے وقت خوف و دہشت سے پیدا ہوا کرتے ہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۹)

اور اپنے اندر ضرور کوئی ایسی خصوصیت رکھتی تھی جس کی وجہ سے وہ ایسا نشان کہلا سکے جس کا ذکر قرآن عزیز اس اہمیت کے ساتھ کر رہا ہے "هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً" یہ ناقۃ اللہ تمہارے لیے نشان ہے۔ اور پھر پانی کی باری جس طرح ناقہ اور قوم ثمود کے درمیان تقسیم فرمائی وہ خود ایک مستقل دلیل ہے کہ یہ "ناقہ" ضرور اپنے اندر ایسی حیثیت رکھتی تھی جو نشانِ الٰہی کہلا سکے لیکن یہ بات کہ "ناقہ" کا وجود کس طرح ہوا اور کن وجوہ سے وہ "نشانِ الٰہی" یا معجزہ بنی، قرآن عزیز اس سے ساکت ہے۔ البتہ مختلف صحیح اخبار آحاد سے اُس واقعہ پر ضرور روشنی پڑتی ہے جس کی تفصیل ابن کثیر سے ابھی نقل ہو چکی گر واقعہ کی تفصیلی صراحت و وضاحت وہاں بھی موجود نہیں ہے بلکہ کتب تفسیر میں اسرائیلیات سے منقول ہے یا ضعیف روایات سے اخذ کی گئی ہے۔ لہٰذا مناسب یہی ہے کہ واقعہ کے اجمال و تفصیل میں فرقِ مراتب کا ضرور خیال رکھا جائے۔ جس قدر قرآن عزیز نے تصریح کی ہے وہ بغیر کسی تاویل کے واجب الاعتقاد ہے اور جس قدر صحیح روایات سے "اگرچہ وہ آحاد ہی کے درجہ کی ہیں" اس اجمال کی تفصیل کا پتہ ملتا ہے وہ اجمال کی تفصیل کی حیثیت سے قابل قبول ہیں، گو قرآن عزیز کی تصریحات کے درجہ کو نہ پہنچ سکیں اور ان سے زیادہ باقی تفصیلات کی حیثیت وہی ہے جو عام تاریخی وقائع اور اسرائیلیات کی حیثیت ہے۔

[۱] جلد ۸ ص ۱۴۵-۱۴۶

بہر حال ان تین دن کے بعد وقتِ موعود آپہنچا اور رات کے وقت ایک "ہیبتناک آواز" نے ہر شخص کو اُسی حالت میں ہلاک کر دیا جس حالت میں وہ تھا۔ قرآنِ عزیز نے اس ہلاکت آفریں آواز کو کسی مقام پر صاعقہ (کڑک دار بجلی) فرمایا اور کسی جگہ رجفہ (زلزلہ ڈال دینے والی شے) اور بعض جگہ طاغیہ (دہشتناک) اور بعض جگہ صیحہ (چیخ) فرمایا۔ اس لیے کہ یہ تمام تعبیرات ایک ہی حقیقت کے مختلف اوصاف کے اعتبار سے کی گئی ہیں تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ خدائے تعالیٰ کے اس عذاب کی ہولناکیاں کیسی گوناگوں تھیں۔ تم ایک ایسی کوندنے والی بجلی کا تصور کرو جو بار بار اضطراب کے ساتھ چمکتی، کڑکتی اور گرجتی ہو اور اس طرح کوند رہی ہو کہ کبھی مشرق میں ہے تو کبھی مغرب میں اور جب ان تمام صفات کے ساتھ چمکتی، کوندتی، گرجتی، لرزتی لرزاتی ہوئی کسی مقام پر ایک ہولناک چیخ کے ساتھ گرے تو اُس مقام اور اُس کے نواح کا کیا حال ہوگا؟ یہ ایک معمولی اندازہ ہے اُس عذاب کا جو ثمود پر نازل ہوا اور اُن کو اور اُن کی بستیوں کو تباہ و برباد کر کے سرکشوں کی سرکشی اور مغروروں کے غرور کا انجام ظاہر کرنے کے لیے آنے والی نسلوں کے سامنے عبرت کے لیے پیش کیا گیا۔

ایک طرف ثمود پر یہ عذاب نازل ہوا اور دوسری جانب صالح علیہ السلام اور اُن کے پیرو مسلمانوں کو خدا نے اپنی حفاظت میں لے لیا اور ان کو اس عذاب سے محفوظ رکھا۔

حضرت صالح (علیہ السلام) حزن و ملال کے ساتھ ہلاک شدگان کو مخاطب کرتے ہوئے فرمانے لگے:-

يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ ۔	اے قوم! بلاشبہ میں نے اپنے پروردگار کا پیغام تم تک پہنچایا اور تم کو نصیحت کی لیکن تم تو نصیحت کرنے والوں کو دوست ہی نہ رکھتے تھے۔

ہلاک شدہ قوم کی جانب حضرت صالح (علیہ السلام) کا یہ خطاب اسی طرح کا خطاب تھا جس طرح

بدر میں مشرکینِ مکہ کے سرداروں کی ہلاکت کے بعد مُردہ نعشوں کے گڑھے پر کھڑے ہو کر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔

یا فلان بن فلان وفلان بن	اے فلاں بن فلاں اور فلاں بن فلاں کیا تم کو
فلان ایسرکم انکم اطعتم اللہ و	اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت پسند آئی؟ بلاشبہ
رسولہ فانا قد وجدنا ما وعدنا	ہم نے وہ سب کچھ پالیا جو ہمارے رب نے ہم سے وعدہ
ربنا حقاً فھل وجدتم ما وعد ربکم	کیا تھا۔ پس کیا تم نے بھی وہ پایا جو تمہارے رب نے
حقاً۔[1] (الحدیث)	تم سے وعدہ کیا تھا۔

اس قسم کے خطاب کے بارہ میں علماء کی چند رائیں ہیں۔

(۱) اس قسم کا خطاب انبیاء علیہم السلام کی خصوصیات میں سے ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اُن کے اس کلام کو بلاشبہ مُردوں کو سُنوا دیتا ہے اگرچہ وہ جواب دینے سے قاصر ہیں۔ اسی لیے جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین کی لاشوں کو اس طرح مخاطب کیا تو حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے تعجب سے پوچھا کیا یہ سُن رہے ہیں؟ آپ نے فرمایا "ہاں! تم سے زیادہ مگر جواب سے عاجز ہیں"۔

(۲) یہ طریقِ خطاب حُزن و ملال کے اظہار کے لیے ہوتا ہے۔ مثلاً تم نے کسی شخص کو متنبہ کیا کہ اس باغ میں نہ جانا سانپ بڑی کثرت سے ہیں ڈسے جانے کا خطرہ ہے۔ مگر وہ شخص باغ میں گیا اور ڈسا گیا، تو جب یہ تنبیہ کرنے والا اُس کی نعش پر پہنچتا ہے تو بیساختہ کہہ اُٹھتا ہے۔ افسوس کیا میں نے تجھ سے نہ کہا تھا کہ باغ میں نہ جانا ورنہ ڈسا جائیگا آخر وہی ہوا۔

(۳) اس قسم کے خطاب کے اصل مخاطب وہ زندہ انسان ہوتے ہیں جو ان مردہ نعشوں کو دیکھ رہے ہیں تاکہ اُن کو عبرت حاصل ہو اور وہ اس قسم کی سرکشی کی جرأت نہ کرسکیں۔

اقامتِ صالحؑ بعد ہلاکتِ قوم یہ ایک تاریخی سوال ہے کہ جب ثمود ہلاک و برباد ہو گئے تو صالح علیہ السلام اور اُن

[1] بخاری جلد ۲ باب المغازی

پر ایمان لانے والے مسلمانوں نے کہاں سکونت اختیار کی؟

اس سوال کا جواب یقینی اور حتمی طور پر دینا تو قریب قریب ناممکن ہے۔ البتہ غالب گمان یہ ہے کہ وہ قوم کی ہلاکت کے بعد علاقۂ فلسطین میں آکر آباد ہوئے اس لیے کہ حجر کے قریب ہی مقام ایسا تھا جو سرسبز و شاداب اور مویشیوں کے پانی اور چارہ کے لیے بہترین تھا۔ اور فلسطین کے علاقہ میں یہ جگہ نواحی رملہ ہوگی یا کوئی دوسرا مقام۔ علماء تفسیر اس کے جواب میں بھی متعدد اقوال پیش فرماتے ہیں۔

(۱) وہ فلسطین کے علاقہ میں رملہ کے قریب آباد ہوئے۔ خازن نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔

(۲) وہ حضرموت میں آکر آباد ہوئے اس لیے کہ اُن کا اصل وطن یہی تھا۔ یا اس لیے کہ یہ احقاف ہی کا ایک حصہ ہے۔ یہاں ایک قبر ہے جس کے متعلق مشہور ہے کہ یہ صالح علیہ السلام کی قبر ہے۔

(۳) وہ ثمود کی ہلاکت کے بعد اُن ہی بستیوں میں آباد رہے۔ یہ عام مورخین کی رائے ہے۔

(۴) وہ قوم کی ہلاکت کے بعد مکۂ معظمہ تشریف لے آئے اور وہیں مقیم ہو گئے اور وہیں انتقال فرمایا، اور اُن کی قبرِ مبارک کعبہ سے غربی جانب حرم ہی میں ہے۔ سید آلوسی اسی کو راجح سمجھتے ہیں۔

سید آلوسی نے اپنی تفسیر میں ایک قول نقل کیا ہے جس میں بتایا ہے کہ صالح علیہ السلام پر ایمان لانے والے جو مسلمان اُن کے ساتھ عذاب سے محفوظ اور نجات یافتہ رہے اُن کی تعداد تقریباً ایک سو بیس تھی اور ہلاک شدہ قریباً ڈیڑھ ہزار گھرانے تھے۔

اب اس تمام این و آں کے بعد اُس کلام بلاغت نظام "قرآنِ عزیز" کی آیات کا مطالعہ فرمائیے جو ان واقعات کا حقیقی سرچشمہ ہیں اور عبرت و موعظت کا بے نظیر سامان۔

وَاِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاھُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ یٰقَوْمِ	اور (اسی طرح) ہم نے قومِ ثمود کی طرف اُس کے بھائی بندوں
اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ ؕ	میں سے صالح کو بھیجا۔ اُس نے کہا "اے میری قوم کے لوگو! اللہ
قَدْ جَآءَتْکُمْ بَیِّنَۃٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ ؕ ھٰذِہٖ	کی بندگی کرو۔ اُس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ دیکھو، تمہارے

نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ
فِيْۤ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ
فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ وَاذْكُرُوْۤا
اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّ
بَوَّاَكُمْ فِي الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ
سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّتَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ
بُيُوْتًا ۚ فَاذْكُرُوْۤا اٰلَآءَ اللّٰهِ وَلَا
تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۝
قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ
قَوْمِهٖ لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ
اٰمَنَ مِنْهُمْ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا
مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قَالُوْۤا اِنَّا بِمَاۤ
اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ۝ قَالَ
الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْۤا اِنَّا بِالَّذِيْۤ
اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝ فَعَقَرُوا
النَّاقَةَ وَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ
وَقَالُوْا يٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ
اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝
فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا

پروردگار کی طرف سے ایک واضح دلیل تمہارے سامنے آچکی ہے۔
یہ خدا کے نام پر چھوڑی ہوئی اونٹنی تمہارے لیے ایک (فیصلہ کن) نشانی
ہے۔ پس اُسے کھُلا چھوڑ دو کہ خدا کی زمین میں جہاں چاہے چرے۔ اسے
کسی طرح کا نقصان نہ پہنچاؤ کہ (اس کی پاداش میں) عذابِ جانکاہ
تمہیں آپکڑے۔ اور وہ وقت یاد کرو کہ خدا نے تمہیں قومِ عاد کے بعد
اُس کا جانشین بنایا، اور اس سرزمین میں اس طرح بسا دیا کہ میدانوں
سے محل بنانے کا کام لیتے ہو اور پہاڑوں کو بھی تراش کر اپنا گھر بنا
لیتے ہو (یہ اُس کا تم پر احسان ہے) پس اللہ کی نعمتیں یاد کرو، اور مُلک
میں سرکشی کرتے ہوئے، خرابی نہ پھیلاؤ" قوم کے جن سربرآوردہ
لوگوں کو (اپنی دولت وطاقت کا) گھمنڈ تھا، اُنھوں نے مومنوں سے
کہا، اور یہ اُن لوگوں میں سے تھے جنہیں (افلاس وبیچارگی کی وجہ سے)
کمزور وحقیر سمجھتے تھے: "کیا تم نے سچ مچ کو معلوم کرلیا ہے کہ صالح
خدا کا بھیجا ہوا ہے؟" (یعنی نہیں تو ایسی کوئی بات اُس میں دکھائی دیتی
نہیں) اُنھوں نے کہا "ہاں! بیشک، جس پیامِ حق کے ساتھ وہ بھیجا
گیا ہے، ہم اُس پر پورا یقین رکھتے ہیں" اس پر گھمنڈ کرنے والوں نے
کہا "تمہیں جس بات کا یقین ہے، ہمیں اُس سے انکار ہے" غرضکہ اُنھوں
نے اونٹنی کو کاٹ ڈالا، اور اپنے پروردگار کے حکم سے سرکشی کی۔ اُنھوں
نے کہا "اے صالح! اگر تم واقعی پیغمبروں میں سے ہو، تو اب وہ بات
ہم پر لا دکھاؤ جس کا تم نے ہمیں خوف دلایا تھا" پس ایسا ہوا کہ لرزا دینے والی

فِیْ دَارِھِمْ جٰثِمِیْنَ ۝ فَتَوَلّٰی عَنْھُمْ	ہولناکی نے اُنھیں آلیا۔ اور جب اُن پر صبح ہوئی تو گھروں میں اوندھے
وَقَالَ یٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُکُمْ	مُنہ پڑے تھے! پھر صالح اُن سے کنارہ کش ہوگیا۔ اُس نے کہا "اے
رِسَالَۃَ رَبِّیْ وَنَصَحْتُ لَکُمْ	میری قوم کے لوگو! میں نے اپنے پروردگار کا پیام تمہیں پہنچایا اور نصیحت
وَلٰکِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِیْنَ ۝ (اعراف)	کی، مگر (افسوس تم پر!) تم نصیحت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے"۔
(۲) وَاِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاھُمْ صٰلِحًا ؕ	اور ہم نے قومِ ثمود کی طرف اس کے بھائی بندوں میں سے صالح
قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ	کو بھیجا۔ اُس نے کہا "اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو۔ اُس
مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ ؕ ھُوَ اَنْشَاَکُمْ	کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ وہی ہے جس نے تمہیں زمین سے پیدا
مِّنَ الْاَرْضِ وَاسْتَعْمَرَکُمْ فِیْھَا	کیا، اور پھر اُسی میں تمہیں بسا دیا۔ پس چاہیے کہ اُس سے بخشش مانگو
فَاسْتَغْفِرُوْہُ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَیْہِ ؕ	اور اُس کی طرف رجوع ہوکر رہو۔ یقین کرو میرا پروردگار (ہر ایک کے)
اِنَّ رَبِّیْ قَرِیْبٌ مُّجِیْبٌ ۝ قَالُوْا	پاس ہے۔ اور (ہر ایک کی) دُعاؤں کا جواب دینے والا ہے!" لوگوں نے
یٰصٰلِحُ قَدْ کُنْتَ فِیْنَا مَرْجُوًّا	کہا "اے صالح پہلے تو تو، ایک ایسا آدمی تھا کہ ہم سب کی اُمیدیں تجھ
قَبْلَ ھٰذَآ اَتَنْھٰنَآ اَنْ نَّعْبُدَ	سے وابستہ تھیں۔ پھر کیا تو ہمیں روکتا ہے کہ اُن معبودوں کی پوجا نہ کریں
مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا وَاِنَّنَا لَفِیْ	جنہیں ہمارے باپ دادا پوجتے چلے آئے ہیں! (یہ کیسی بات ہے؟)
شَکٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَیْہِ مُرِیْبٍ	ہمیں تو اس بات میں بڑا ہی شک ہے جس کی طرف تم دعوت دیتے ہو کہ
قَالَ یٰقَوْمِ اَرَءَیْتُمْ اِنْ کُنْتُ	ہمارے دل میں اُترتی نہیں" صالح نے کہا "اے میری قوم کے لوگو! کیا تم
عَلٰی بَیِّنَۃٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَاٰتٰنِیْ مِنْہُ	نے اس بات پر بھی غور کیا کہ اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے ایک دلیل
رَحْمَۃً فَمَنْ یَّنْصُرُنِیْ مِنَ اللّٰہِ اِنْ	روشن پر ہوں اور اُس نے اپنی رحمت مجھے عطا فرمائی ہو، تو پھر کون ہے
عَصَیْتُہٗ قف فَمَا تَزِیْدُوْنَنِیْ غَیْرَ	جو اللہ کے مقابلہ میں میری مدد کریگا اگر میں اُس کے حکم سے سرتابی کروں؟
تَخْسِیْرٍ ۝ وَیٰقَوْمِ ھٰذِہٖ نَاقَۃُ	تم (اپنی توقع کے مطابق دعوت کا رد کرکے) مجھے کوئی فائدہ نہیں پہنچاتے۔

اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ
فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا
بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ
قَرِيْبٌ ۝ فَعَقَرُوْهَا فَقَالَ
تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ
اَيَّامٍ ۭ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ
فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا صٰلِحًا
وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا
وَمِنْ خِزْيِ يَوْمِئِذٍ ۭ اِنَّ رَبَّكَ
هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ۝ وَاَخَذَ الَّذِيْنَ
ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ
دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ۝ كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا
فِيْهَا ۭ اَلَآ اِنَّ ثَمُوْدَا كَفَرُوْا
رَبَّهُمْ ۭ اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ ۝ (ہود)
(۳) وَلَقَدْ كَذَّبَ اَصْحٰبُ الْحِجْرِ
الْمُرْسَلِيْنَ ۝ وَاٰتَيْنٰهُمْ اٰيٰتِنَا فَكَانُوْا
عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ۝ وَكَانُوْا يَنْحِتُوْنَ
مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا اٰمِنِيْنَ ۝ فَاَخَذَتْهُمُ
الصَّيْحَةُ مُصْبِحِيْنَ ۝ فَمَآ

تباہی کی طرف لیجانا چاہتے ہو" اور اے میری قوم کے لوگو! دیکھو، یہ
اللہ کی اونٹنی (یعنی اُس کا نشان اونٹنی) تمہارے لیے ایک (فیصلہ کن)
نشانی ہے پس اُسے چھوڑ دو اللہ کی زمین میں چرتی رہے اُسے کسی
طرح کی اذیت نہ پہنچانا، ورنہ فوراً عذاب تمہیں آ پکڑیگا" لیکن لوگوں
نے (اور زیادہ ضد میں آکر) اُسے ہلاک کر ڈالا۔ تب صالح نے کہا "اب
تمہیں صرف تین دن کی مہلت ہے، اپنے گھروں میں کھا پی لو، یہ وعدہ
ہے جھوٹا نہ نکلیگا" پھر جب ہماری ٹھہرائی ہوئی بات کا وقت آپہنچا
تو ہم نے صالح کو اور اُن لوگوں کو جو اُس کے ساتھ ایمان لائے تھے،
اپنی رحمت سے بچا لیا اور اس دن کی رسوائی سے نجات دیدی (اے پیغمبر!)
بلاشبہ تیرا پروردگار ہی ہے جو قوت والا اور سب پر غالب ہے! اور جن
لوگوں نے ظلم کیا تھا اُن کا یہ حال ہوا کہ ایک روز کی کڑک نے آلیا
جب صبح ہوئی تو سب اپنے گھروں میں اوندھے پڑے تھے (وہ اس طرح
اچانک مرگئے) گویا اُن گھروں میں کبھی بسے ہی نہ تھے! تو سن رکھو کہ ثمود نے
اپنے پروردگار کی ناشکری کی، اور ہاں سن رکھو کہ ثمود کے لیے محرومی ہوئی!
اور دیکھو حجر کے لوگوں نے بھی رسولوں کی بات جھٹلائی۔ ہم نے اپنی
نشانیاں اُنہیں دکھائیں مگر وہ روگردانی ہی کرتے رہے۔ وہ پہاڑ
تراش کر گھر بناتے تھے کہ محفوظ رہیں لیکن (یہ حفاظتیں کچھ بھی
کام نہ آئیں) ایک دن صبح کو اُٹھے تو ایک ہولناک آواز نے آپکڑا
تھا۔ اور جو کچھ اُنہوں نے اپنی سعی و عمل سے کمایا تھا وہ کچھ بھی اُن کے کام نہ آیا۔

أَغْنَىٰ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ ۝ (حجر)

(۴) كَذَّبَتْ ثَمُودُ الْمُرْسَلِينَ ۝ إِذْ قَالَ	جھٹلایا ثمود نے پیغام لانے والوں کو جب کہا اُن کو اُن کے
لَهُمْ أَخُوهُمْ صَالِحٌ أَلَا تَتَّقُونَ ۝ إِنِّي	بھائی صالح نے کیا تم ڈرتے نہیں ۔ میں تمہارے پاس
لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ۝ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَ	پیغام لانے والا ہوں معتبر ۔ سو ڈرو اللہ سے اور میرا کہا
أَطِيعُونِ ۝ وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ	مانو ۔ اور نہیں مانگتا میں تم سے اس پر کچھ بدلا، میرا بدلہ ہے
إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝	اُسی جہان کے پالنے والے پر ۔ کیا چھوڑے رکھینگے تم کو
أَتُتْرَكُونَ فِي مَا هَاهُنَا آمِنِينَ ۝ فِي	یہاں کی چیزوں میں بے خوف ۔ باغوں میں اور چشموں
جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ ۝ وَزُرُوعٍ وَنَخْلٍ	میں، اور کھیتوں میں اور کھجوروں میں جن کا خوشہ نرم
طَلْعُهَا هَضِيمٌ ۝ وَتَنْحِتُونَ مِنَ	ہے ۔ اور تراشتے ہو پہاڑوں میں گھر تکلف کے ۔ سو
الْجِبَالِ بُيُوتًا فَرِهِينَ ۝ فَاتَّقُوا اللَّهَ	ڈرو اللہ سے اور میرا کہا مانو، اور نہ مانو حکم بیباک
وَأَطِيعُونِ ۝ وَلَا تُطِيعُوا أَمْرَ الْمُسْرِفِينَ ۝	لوگوں کا جو خرابی کرتے ہیں ملک میں اور اصلاح نہیں
الَّذِينَ يُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ وَلَا يُصْلِحُونَ ۝	کرتے ۔ بولے تجھ پر تو کسی نے جادو کیا ہے ۔ تو بھی ایک
قَالُوا إِنَّمَا أَنتَ مِنَ الْمُسَحَّرِينَ ۝ مَا أَنتَ	آدمی ہے جیسے ہم سو لے آ کچھ نشانی اگر تو سچا ہے ۔ کہا
إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا فَأْتِ بِآيَةٍ إِن كُنتَ	یہ اونٹنی ہے اُس کے لیے پانی پینے کی ایک باری اور تمہارے
مِنَ الصَّادِقِينَ ۝ قَالَ هَٰذِهِ نَاقَةٌ لَّهَا	لیے باری ایک دن کی مقرر ۔ اور مت چھیڑیو اُس
شِرْبٌ وَلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُومٍ ۝ وَلَا	کو بُری طرح سے پھر پکڑ لے تم کو آفت ایک بڑے دن
تَمَسُّوهَا بِسُوءٍ فَيَأْخُذَكُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَظِيمٍ ۝	کی، پھر کونچیں کاٹیں اُس اونٹنی کی پھر کل کو رہ گئے پچھتاتے
فَعَقَرُوهَا فَأَصْبَحُوا نَادِمِينَ ۝ فَأَخَذَهُمُ الْعَذَابُ	پھر آ پکڑا اُن کو عذاب نے البتہ اس بات میں نشانی
إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً ۖ وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُم	ہے ۔ اور اُن میں بہت لوگ نہیں ماننے والے

مُؤْمِنِيْنَ ۝ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝
(۵) وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا
اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ فَاِذَا هُمْ فَرِيْقٰنِ يَخْتَصِمُوْنَ
قَالَ يٰقَوْمِ لِمَ تَسْتَعْجِلُوْنَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ
الْحَسَنَةِ لَوْلَا تَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ
تُرْحَمُوْنَ ۝ قَالُوا اطَّيَّرْنَا بِكَ وَبِمَنْ مَّعَكَ
قَالَ طٰٓئِرُكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ
تُفْتَنُوْنَ ۝ وَكَانَ فِى الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ
رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ
قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَاَهْلَهٗ ثُمَّ
لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ
وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ۝ وَمَكَرُوْا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا
مَكْرًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝ فَانْظُرْ كَيْفَ
كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَقَوْمَهُمْ
اَجْمَعِيْنَ ۝ فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةًۢ بِمَا ظَلَمُوْا
اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ وَ
اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝
(النمل ۲)

اور تیرا رب وہی ہے زبردست رحم کرنے والا۔
اور ہم نے بھیجا تھا ثمود کی طرف اُن کے بھائی صالح
کو کہ بندگی کرو اللہ کی پھر وہ تو دو فرقے ہو کر لگے جھگڑنے
کہا اے میری قوم کیوں جلدی مانگتے ہو بُرائی کو پہلے بھلائی
سے، کیوں نہیں گناہ بخشواتے اللہ سے شاید تم پر
رحم ہو جائے۔ بولے ہم نے منحوس قدم دیکھا تجھ کو اور
تیرے ساتھ والوں کو۔ کہا تمہاری بُری قسمت اللہ کے
پاس ہے تمہارا کہنا صحیح نہیں بلکہ تم جانچے جاتے ہو۔ اور تھے اس شہر
میں نو شخص کہ خرابی کرتے ملک میں اور اصلاح نہ کرتے
بولے کہ آپس میں قسم کھاؤ اللہ کی کہ البتہ رات کو جا پڑیں
ہم اُس پر اور اُس کے گھر پر پھر کہہ دینگے اُس کے دعویٰ
کرنے والے کو ہم نے نہیں دیکھا جب تباہ ہوا اُس کا گھر اور
ہم بیشک سچ کہتے ہیں۔ اور اُنہوں نے بنائی ایک خفیہ تدبیر
ہم نے بنائی ایک خفیہ تدبیر اور اُن کو خبر نہ ہوئی پھر دیکھ لے کیسا
ہوا انجام اُنکے فریب کا کہ ہلاک کر ڈالا ہم نے اُنکو اور اُنکی
قوم کو سب کو۔ سو یہ پڑے ہیں اُنکے گھر ڈھئے ہوئے بسبب
اُن کے انکار کے۔ البتہ اس میں نشانی ہے ان لوگوں کے
لیے جو جانتے ہیں۔ اور بچا دیا ہم نے اُن کو جو یقین لائے
تھے اور بچتے رہے تھے۔

(٦) وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى فَاَخَذَتْهُمْ صٰعِقَةُ الْعَذَابِ الْهُوْنِ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ وَنَجَّيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝ (فصلت)

اور وہ جو ثمود تھے سو ہم نے اُن کو راہ بتلائی پھر اُن کو پسند آیا اندھا رہنا راہ سوجھنے سے۔ پھر پکڑا اُن کو کڑک نے ذلت کے عذاب کی، بدلا اُس کا جو کماتے تھے۔ اور بچا دیا ہم نے اُن لوگوں کو جو یقین لائے تھے اور بچ کر چلتے تھے (بُرائی سے)

(٧) وَفِيْ ثَمُوْدَ اِذْ قِيْلَ لَهُمْ تَمَتَّعُوْا حَتّٰى حِيْنٍ ۝ فَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ۝ فَمَا اسْتَطَاعُوْا مِنْ قِيَامٍ وَّمَا كَانُوْا مُنْتَصِرِيْنَ ۝ (الذاریات)

اور نشانی ہے ثمود میں جب کہا اُن کو فائدہ اُٹھالو ایک وقت تک۔ پھر شرارت کرنے لگے اپنے رب کے حکم سے، پھر پکڑا اُن کو کڑک نے اور وہ دیکھتے تھے پھر نہ ہو سکا اُن سے کہ اُٹھیں اور نہ ہوے کہ بدلا لیں۔

(٨) وَاَنَّهٗ اَهْلَكَ عَادَا الْاُوْلٰى ۝ وَثَمُوْدَ فَمَا اَبْقٰى ۝ (النجم)

اور یہ کہ اُس نے غارت کیا عاد اول کو، اور ثمود کو پھر کسی کو باقی نہ چھوڑا۔

(٩) كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِالنُّذُرِ ۝ فَقَالُوْا اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗ ۙ اِنَّا اِذًا لَّفِيْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ ۝ ءَاُلْقِيَ الذِّكْرُ عَلَيْهِ مِنْۢ بَيْنِنَا بَلْ هُوَ كَذَّابٌ اَشِرٌ ۝ سَيَعْلَمُوْنَ غَدًا مَّنِ الْكَذَّابُ الْاَشِرُ ۝ اِنَّا مُرْسِلُوا النَّاقَةِ فِتْنَةً لَّهُمْ فَارْتَقِبْهُمْ وَاصْطَبِرْ ۝ وَنَبِّئْهُمْ اَنَّ الْمَآءَ قِسْمَةٌۢ بَيْنَهُمْ ۚ كُلُّ

جھٹلایا ثمود نے ڈر سنانے والوں کو، پھر کہنے لگے کیا ایک آدمی ہم میں کا اکیلا ہم اُس کے کہے پر چلینگے تو تو ہم غلطی میں پڑے اور آگ میں۔ کیا اُتری اُسی پر نصیحت ہم سب میں سے کوئی نہیں یہ جھوٹا ہے بڑائی مارتا ہے۔ اب جان لینگے کل کو کون ہے جھوٹا بڑائی مارنے والا۔ ہم بھیجتے ہیں اونٹنی اُن کے جانچنے کے واسطے سو انتظار کر اُن کا اور سہتا رہ۔ اور سُنا دے اُن کو کہ پانی کی تقسیم ہے اُن میں ہر ایک فریق اپنی

شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ ۝ فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطٰى فَعَقَرَ ۝ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِىْ وَنُذُرِ ۝ اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَكَانُوْا كَهَشِيْمِ الْمُحْتَظِرِ ۝ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ (القمر)

باری پر پہنچ پھر پکارا اُنہوں نے اپنے رفیق کو پھر ہاتھ چلایا اور کاٹ ڈالا۔ پھر کیسا ہوا میرا عذاب اور میرا ڈرانا۔ ہم بھیجی بھیجی اُن پر ایک (خوفناک) چیخ ۔ پھر رہ گئے جیسے روندی ہوئی باڑ کانٹوں کی۔ اور ہم نے آسان کر دیا قرآن کو سمجھنے کے لیے کوئی سوچنے والا۔

(۱۰) كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ وَعَادٌ بِالْقَارِعَةِ ۝ فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَاُهْلِكُوْا بِالطَّاغِيَةِ ۝ (الحاقہ)

جھٹلایا ثمود اور عاد نے اُس کھڑکھڑانے والی (بات) کو سو وہ جو ثمود تھے سو غارت کر دیے گئے اُچھال کر (سخت بھونچال سے)

(۱۱) كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰهَآ ۝ اِذِ انْۢبَعَثَ اَشْقٰىهَا ۝ فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقْيٰهَا ۝ فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا ۝ فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰىهَا ۝ وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا ۝ (الشمس)

جھٹلایا ثمود نے اپنی شرارت سے ۔ جب اُٹھ کھڑا ہوا اُن میں کا بدبخت ۔ پھر کہا اُن کو اللہ کے رسول نے خبردار رہو اللہ کی اونٹنی سے اور اُس کی پانی پینے کی باری سے پھر اُنہوں نے اس کو جھٹلایا پھر پاؤں کاٹ ڈالے اُس کے پھر اُلٹ مارا اُن پر اُن کے رب نے بسبب اُن کے گناہوں کے پھر برابر کر دیا سب کو اور اللہ نہیں ڈرتا پیچھا کرنے سے ۔

چند عبرتیں | (۱) "ناقۃ اللہ" اگرچہ صالح علیہ السلام کی صداقتِ رسالت کا ایک نشان ہے تاہم قرآنِ عزیز کی تصریح ہے کہ وہ ثمود کے لیے آزمائش اور ابتلاء کا بھی نشان تھی۔

اِنَّا مُرْسِلُوا النَّاقَةِ فِتْنَةً لَّهُمْ فَارْتَقِبْهُمْ وَاصْطَبِرْ (القمر)

بیشک ہم بھیجنے والے ہیں ناقہ کو اُن کی آزمائش و امتحان کے لیے پس تو اُن کے انتظار میں رہ اور صبر اختیار کر۔

(۲) سُنت اللہ یہ رہی ہے کہ اگر وہ اپنے پیغمبر کو کسی قوم کی ہدایت کے لیے بھیجے اور قوم اُس کی ہدایت پر کان نہ دھرے تو ضروری نہیں کہ وہ قوم ہلاک ہی کر دی جائے لیکن جو قوم اپنے نبی سے اس وعدہ پر

نشان طلب کرے کہ اگر اُن کا مطلوبہ نشان ظاہر ہوگیا تو وہ ضرور ایمان لے آئینگے۔ اور پھر وہ ایمان نہ لائے تو اُس قوم کی ہلاکت یقینی ہو جاتی ہے اور خدائے تعالیٰ اُس کو معاف نہیں کرتا تا آنکہ وہ تائب ہو جائے اور خدا کے دین کو قبول کرلے، اور یا عذاب الٰہی سے صفحۂ ہستی سے مٹ کر دوسروں کے لیے عبرت کا سبب بن جائے۔

(۳) مگر اس سُنت اللہ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغامِ رسالت مستثنیٰ ہے۔ اِس لیے کہ آپ نے تصریح فرمائی ہے کہ میں نے خدائے تعالیٰ سے دعا مانگی کہ وہ میری اُمت (اُمتِ دعوت ہو یا اُمت اجابت) میں عذابِ عام مسلط نہ فرمائے اور اللہ تعالیٰ نے میری دعا قبول فرمالی۔ اور قرآنِ عزیز میں اللہ تعالیٰ نے آپ کی اس تصریح کی یہ کہہ کر تصدیق بھی فرما دی۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ فِيْهِمْ — اے رسول اس حال میں کہ تو اُن میں موجود ہے خدائے تعالیٰ ان (کافروں) پر عام عذاب مسلط نہ کریگا۔

(۴) یہ مہلک غلطی اور نفس کا دھوکا ہے کہ انسان خوش عیشی، رفاہیت، اور دنیوی جاہ وحشم کو دیکھ کر یہ سمجھ بیٹھے کہ جس قوم یا جس فرد کے پاس یہ سب کچھ موجود ہے وہ ضرور خدائے تعالیٰ کی مہربانیوں کے سایہ میں ہے اور یہ کہ اُن کی یہ خوش عیشی اس پر دال ہے کہ خدائے تعالیٰ کی خوشنودی اُن کے ساتھ ہے۔

یہ دھوکا اور غلطی اس لیے ہے کہ اس واقعہ میں جگہ جگہ یہ تصریح موجود ہے کہ بعض مرتبہ زیادہ سے زیادہ رفاہیت اور خوش عیشی زیادہ سے زیادہ عذاب وہلاکت کا پیش خیمہ ہوتی ہے اگرچہ قوموں کے لیے اُس کی مدت چند ماہ یا چند سال نہیں بلکہ گھبرا دینے والی مدت ہی کیوں نہ ہو۔ مگر ہمہ قسم کی دنیوی کامرانیوں اور خوش عیشیوں کے ساتھ ساتھ جب ظلم، سرکشی اور غرور کسی قوم کا مستقل شعار بن جائے تو سمجھو کہ اُس کی تباہی وہلاکت کا وقت قریب آپہنچا۔ "اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ" تیرے خدا کی پکڑ بہت سخت ہے"

البتہ ان تمام رفاہیتوں کے ساتھ اگر قوم اور قوم کے اکثر افراد خدا کے شکر گذار رہیں اُس کے بندوں کے ساتھ انصاف

کرنے والے اور باہم حُسنِ نیت اور خیر خواہی پر عامل ہوں تو بلاشبہ وہ مقبولِ بارِگاہ الٰہی ہیں اور اُن ہی کو دنیا و آخرت کی کامرانیوں کی بشارت ہے، اور اُن ہی کے لیے یہ دنیوی عیش خدا کی بے غایت نعمتوں کی علامت ہے۔

وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ وَ لَیُمَکِّنَنَّ لَھُمْ دِیْنَھُمُ الَّذِی ارْتَضٰی لَھُمْ وَلَیُبَدِّلَنَّھُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِھِمْ اَمْنًا یَعْبُدُوْنَنِیْ لَا یُشْرِکُوْنَ بِیْ شَیْئًا (نور)

اللہ نے اُن لوگوں سے وعدہ کر لیا جو تم میں سے ایمان لائے ہیں اور جنھوں نے نیک عمل کیے ہیں یہ کہ اُن کو زمین کی خلافت دیگا جیسا کہ اُن سے اگلوں کو خلیفہ بنایا تھا اور اُن کے لیے اُن کا دین مضبوط کر دیگا جو اُس نے اُن کے لیے پسند کیا ہے اور اُن کے خوف کو امن سے بدل دیگا (جن کی شان یہ ہوگی کہ) وہ میری بندگی کرینگے اور میرے ساتھ کسی کو (کسی حیثیت سے بھی) شریک نہ کرینگے۔

وَلَقَدْ کَتَبْنَا فِی الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّکْرِ اَنَّ الْاَرْضَ یَرِثُھَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ (انبیاء)

اور بلاشبہ ہم نے نصیحت کے بعد زبور میں لکھ دیا کہ زمین کی وراثت میرے نیک بندوں کو حاصل ہوگی۔

یہ آیات صراحت کر رہی ہیں کہ حکومت و دولت کا وعدہ "وراثت" کی حیثیت سے صرف اُنھی کا حصّہ ہے جو مؤمن بھی ہیں اور خدا کے احکام پر عامل بن کر صالحین (نکوکاروں) کی صف میں بھی شامل ہیں یعنی اُن کی اجتماعی زندگی کا قالب ایک ساتھ ان دونوں صفات سے متصف ہے۔ اُن کے لیے بلاشبہ یہ حکومت و دولت خدا کا انعام واکرام ہے اور اگر یہ نہیں ہے تو پھر "حکومت و دولت" کے لیے مومن و کافر کی کوئی تخصیص نہیں خدا کی حکمتوں اور مصلحتوں کے پیشِ نظر یہ دنیوی اسباب کی شکل میں چلتی پھرتی چھاؤں ہے اور ایسی "حکومت و دولت" کے لیے ہرگز یہ ضروری نہیں ہے کہ اُس کے ساتھ خدا کی خوشنودی اور اس کا فضل و کرم بھی شامل حال ہو۔

حضرت ابراہیم (علیہ السلام)

نسبِ ابراہیم، آزر کی تحقیق، مستشرقین کی ہرزہ سرائی کا جواب، قرآنِ عزیز میں حضرت ابراہیم کا تذکرہ۔ ابراہیم علیہ السلام کا بتوں کے ساتھ معاملہ، اسلام کے متعلق باپ سے مناظرہ، قوم سے مناظرہ اور محاکمہ، بادشاہِ وقت سے مناظرہ، سکونت و قیام، قوم کی ہدایت کے لیے اضطراب، مصر کی جانب سفر، ابراہیم و ہاجرہ، ولادتِ اسمٰعیل (علیہ السلام)، سارہ و ہاجرہ (رضی اللہ عنہما)، سُنّتِ ختنہ، ارضِ حجاز و ہاجرہ و اسمٰعیل، اسحٰق (علیہ السلام)، بناءِ کعبہ، چند اہم نتائج۔

نسب ابراہیم (خلیل اللہ) بن تارح بن ناحور بن سروج، بن رعو بن فالج بن عابر بن شالح بن ارفکشاذ بن سام بن نوح (علیہ السلام)

یہ تصریح تورات اور تاریخ کے مطابق ہے مگر قرآنِ عزیز نے اُن کے والد کا نام آزر بتایا ہے۔

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ لِأَبِيهِ آزَرَ أَتَتَّخِذُ أَصْنَامًا آلِهَةً (انعام) اور (وہ وقت یاد کرو) جب ابراہیم نے اپنے باپ آزر سے کہا "کیا تو بتوں کو خدا بناتا ہے؟"

آزر کی تحقیق چونکہ تاریخ اور تورات ابراہیم (علیہ السلام) کے والد کا نام تارخ بتاتے ہیں اور قرآنِ عزیز آزر اس لیے علماء اور مفسرین نے اس مسئلہ کی تحقیق میں دو راہیں اختیار کی ہیں۔

(۱) ایسی صورت کی جائے کہ دونوں ناموں کے درمیان مطابقت ہو جائے اور یہ اختلاف جاتا رہے۔

ؔ ابن اثیر جلد ۱ ص ۶۷۔

(۲) تحقیق کے بعد فیصلہ کن بات کہی جائے کہ ان دونوں میں کون صحیح ہے اور کون غلط یا دونوں صحیح ہیں مگر دو جدا جدا ہستیوں کے نام ہیں۔

پہلے خیال کے علماء کی رائے یہ ہے کہ یہ دونوں نام ایک ہی شخصیت سے وابستہ ہیں اور تارح علم اسمی (اسمی نام) ہے اور آزر علم وصفی (وصفی نام)

ان میں سے بعض کہتے ہیں کہ آزر عبری زبان میں محبِ صنم کو کہتے ہیں اور چونکہ تارح میں بت تراشی و بت پرستاری دونوں وصف موجود تھے اس لیے آزر کے لقب سے مشہور ہوا اور بعض کا گمان ہے کہ آزر کے معنی اعوج (کج فہم) یا بے وقوف اور پیر فرتوت کے ہیں۔ اور چونکہ تارح میں یہ باتیں موجود تھیں اس لیے اس وصف سے موصوف کیا گیا، قرآنِ عزیز نے اسی مشہور وصفی علم کو بیان کیا ہے۔

سہیلی نے روض الانف میں اسی کو اختیار کیا ہے[۵]۔

اور دوسرے خیال کے علماء کی تحقیق یہ ہے کہ آزر اس بت کا نام ہے، تارح جس کا پجاری اور مہنت تھا۔ چنانچہ مجاہد (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ قرآنِ عزیز کی مسطورۂ بالا آیت کا مطلب یہ ہے۔

اتتخذ ازرا الھا ای اتتخذ اصناما الھۃ کیا تو آزر کو خدا مانتا ہے یعنی بتوں کو خدا مانتا ہے؟

اور صغانی کی رائے بھی اس کے قریب قریب ہے صرف نحوی اعتبار سے تقدیرِ کلام میں وہ ایک دوسری راہ اختیار کرتے ہیں[۶]۔ غرض ان دونوں کے نزدیک "آزر" "ابیہ" کا بدل نہیں ہے بلکہ بت کا نام ہے اور اس طرح قرآنِ عزیز

ایک مشہور قول یہ بھی ہے کہ حضرت ابراہیم کے والد کا نام تارح تھا اور چچا کا نام آزر اور چونکہ آزر ہی نے ان کی تربیت کی تھی اور بمنزلہ اولاد کے پالا تھا اس لیے قرآنِ عزیز میں آزر کو باپ کہہ کر پکارا گیا جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی ارشاد ہے: "العم صنو ابیہ" چچا باپ ہی کی طرح ہے۔

علامہ عبدالوہاب نجار کی رائے یہ ہے کہ ان اقوال میں سے مجاہد کا قول قرینِ قیاس اور قابلِ

---

[۱] تاج العروس جلد ۳ ص ۱۲ [۲] جلد ص [۳] تاج العروس جلد ۳ ص ۱۲ [۴] قصص الانبیاء ص ۹۶

قبول ہے اس لیے کہ مصریوں کے قدیم دیوتاؤں میں ایک نام ازوریس بھی آتا ہے جس کے معنی "خدائے قوی ومعین" ہیں، اور اصنام پرست اقوام کا شروع سے یہ دستور رہا ہے کہ قدیم دیوتاؤں کے نام ہی پر جدید دیوتاؤں کے نام رکھ لیا کرتے تھے۔ اس لیے اس بت کا نام بھی قدیم مصری دیوتا کے نام پر آزر رکھا گیا، اور حضرت ابراہیم کے والد کا نام تارح تھا۔

ہمارے نزدیک یہ تمام تکلفاتِ باردہ ہیں۔ اس لیے کہ قرآنِ عزیز نے جب صراحت کے ساتھ آزر کو ابِ ابراہیم (ابراہیم کا باپ) کہا ہے تو پھر محض علماءِ انساب اور بائیبل کے تخمینی قیاسات سے متاثر ہو کر قرآنِ عزیز کی یقینی تعبیر کو مجاز کہنے یا اس سے بھی آگے بڑھ کر خواہ مخواہ قرآنِ عزیز میں نحوی مقدرات ماننے پر کون سی شرعی اور حقیقی ضرورت مجبور کرتی ہے۔

برسبیل تسلیم اگر آزر عاشقِ صنم کو کہتے ہیں یا بت کا نام ہے تب بھی بغیر تقدیر کلام اور بغیر کسی تاویل کے یہ کیوں نہیں ہو سکتا کہ ان ہر دو وجہ سے آزر کا نام آزر رکھا گیا جیسا کہ اصنام پرست اقوام کا قدیم سے یہ دستور رہا ہے کہ وہ کبھی اپنی اولاد کا نام بتوں کا غلام ظاہر کر کے رکھتے تھے اور کبھی خود بت ہی کے نام پر نام رکھ دیا کرتے تھے۔

اصل بات یہ ہے کہ "آوار" کالدی زبان میں بڑے پجاری کو کہتے ہیں اور عربی میں یہی "آزر" کہلایا، تارخ چونکہ بت تراش اور سب سے بڑا پجاری تھا اس لیے "آزر" ہی کے نام سے مشہور ہو گیا حالانکہ یہ نام نہ تھا بلکہ لقب تھا۔ اور جبکہ لقب نے نام کی جگہ لے لی تو قرآنِ عزیز نے بھی اُسی نام سے پکارا

جس مقدس انسان (ابراہیمؑ) کی اخلاقی بلندی کا یہ عالم ہو کہ جب بت پرستی کی مذمت کے سلسلہ میں آزر سے اُس کا مناظرہ ہو گیا اور آزر نے زچ ہو کر یہ کہا۔

اراغب انت عن اٰلھتی یا ابرٰھیم	اے ابراہیم کیا تو میرے خداؤں سے بیزار ہے، تو اگر
لئن لم تنتہ لارجمنك واھجرنی	اس حرکت سے باز نہ آیا تو میں ضرور تجھ کو سنگسار کر دوں گا

مَلِیًّا (طہ) اور جا میرے سامنے سے دور ہوجا۔

تو اس سخت گیر اور دل آزار گفتگو کے موقعہ پر بھی اُس بیٹے نے پدری رشتہ کی بزرگی کا احترام کیا اور جواب میں صرف یہ فرمایا:

سَلَامٌ عَلَيْكَ سَأَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ تجھ پر سلامتی ہو، میں عنقریب تیرے لیے اپنے پروردگار

اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا (مریم) سے بخشش چاہونگا بلاشبہ وہ میرے ساتھ بہت مہربان ہے

اُس ہستی سے یہ کیسے توقع ہوسکتی ہے کہ وہ اپنے باپ آزر کو بے وقوف، پیرِ فرتوت اور اسی قسم کے تحقیر آمیز الفاظ کے ساتھ خطاب کرے۔

پس بلاشبہ تاریخ کا تارح آزر ہی ہے اور وہ عَلَمِ اسمی ہے نہ کہ عَلَمِ وصفی اور تارح یا غلط نام ہے اور یا آزر کا ترجمہ ہے جو تورات کے دوسرے اعلام کی طرح ترجمہ نہ رہا بلکہ اصل بن گیا۔

مراتشی سترہویں صدی کا ایک عیسائی عالم ہے اُس نے قرآن عزیز کا ترجمہ کیا ہے اور قرآنِ عزیز پر نہایت رکیک اور متعصبانہ حملے کیے ہیں۔ اُس نے اس موقعہ پر بھی عادت کے مطابق ایک مہمل اور لچر اعتراض کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ یوزبیوس کی تاریخ کنیسہ کی ایک عبارت میں یہ لفظ آیا ہے جس کو غلط صیغہ کے ساتھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن عزیز میں درج کردیا۔

لیکن طرفہ تماشا یہ ہے کہ مراتشی اپنے اس دعوے کے ثبوت میں نہ تاریخ کنیسہ کی وہ عبارت پیش کرتا ہے جس سے یہ لفظ ماخوذ بتایا گیا ہے اور نہ اُس اصل لفظ ہی کا پتہ دیتا ہے کہ جس سے یہ غلط لفظ بنالیا گیا اور نہ یہ بتایا کہ آخر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اس نقل کی کیا ضرورت پیش آئی؟ اس لیے یہ قطعاً بے دلیل اور بے سروپا بات ہے جو محض تعصب اور جہالت کی وجہ سے کہی گئی اور حق وہی ہے جو ہم نے ابھی واضح کیا۔

شجرۂ نسب ابراہیم تا نوح علیہما السلام

تورات اور تاریخ حضرت ابراہیم سے حضرت نوح (علیہما السلام) تک نسب کی جو کڑیاں شمار کرائی ہیں وہ درج ذیل ہیں، اس شجرۂ نسب کی صحت و عدم صحت کا معاملہ قیاسی اور تخمینی

رائے سے زیادہ نہیں ہے اِس لیے کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلۂ نسب کے متعلق اس یقین کے باوجود کہ وہ حضرت ابراہیم کی نسل سے ہیں۔ عدنان سے اوپر کی کڑیوں کے متعلق خود ذات اقدس کا یہ فیصلہ ہے کہ "کذّب النسّابون" علمائِ نسب نے ناموں کی تعیین میں غلط بیانی سے کام لیا ہے تو حضرت ابراہیم سے حضرت نوح تک کا سلسلہ کس طرح اس کذب بیانی اور وضع سے پاک رہ سکتا ہے؟

نام	باپ کا نام	بیٹے کی پیدائش کے وقت باپ کی عمر
سَام	نوح	۵۰۰
اَرفَکشَاذ	سام	۱۰۰
شَالِخ	ارفکشاذ	۳۵
عَابِر	شالخ	۳۰
فَالِجُ	عابر	۳۴
رَعو	فالِجُ	۳۰
سَرُوج	رعو	۳۲
ناحور	سرُوج	۳۰
آزر (تَارِحُ)	ناحور	۲۹
ابراہیم	آزر (تارح)	۷۰
		۸۹۰ مجموعی مدت

اِن اعداد و شمار کے مطابق حضرت ابراہیمؑ کی ولادت سے حضرت نوحؑ تک آٹھ سو نوّے سال ہوتے ہیں اور جبکہ حضرتِ نوح کی کُل عمر نو سو پچاس سال بتائی جاتی ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ حضرت ابراہیمؑ نے حضرتِ نوحؑ کی عمر کے ساٹھ سال پائے اور وہ دونوں اس مدت کے اندر معاصر رہے ہیں اور یہ بلاشبہ

بے سروپا بات اور قطعاً غلط اور مہمل ہے، اس لیے یہ ماننا پڑیگا کہ تورات کے یہ اعداد وشمار محض خود تراشیدہ کہانیوں اور حکایتوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ قدیم زمانہ میں یہود کے یہاں تاریخ کا باب اسی قسم کی حکایات وروایات پر قائم رہا ہے اور اس میں تاریخی حقائق اور زمانوں کے تضاد واختلاف کا مطلق لحاظ وپاس نہیں رکھا گیا۔

مستشرقینِ یورپ کی ہرزہ سرائی

مستشرقینِ یورپ کی ایک جماعت اسلام دشمنی میں یدِطولیٰ رکھتی ہے اور بغض وعناد کی مشتعل آگ میں حقائق وواقعات تک کے انکار پر آمادہ ہوجاتی ہے۔ چنانچہ اس قسم کے مواقع میں سے کہ جہاں قرآنِ عزیز کے خلاف بے دلیل اُن کی تنقید کی تلوار چلتی رہتی ہے" ایک موقعہ حضرت ابراہیم کی شخصیت کا بھی ہے۔

دائرۃ المعارف الاسلامیہ[1] نے ونسنک[2] کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ سب سے پہلے اسپرنگر[3] نے یہ دعویٰ کیا کہ قرآن میں ایک عرصہ تک حضرت ابراہیم کی شخصیت کعبہ کے بانی اور دینِ حنیف کے ہادی کی حیثیت سے روشنی میں نہیں آئی۔ البتہ عرصہ دراز کے بعد اُن کی شخصیت کو ان صفات کے ساتھ متصف ظاہر کیا گیا ہے۔ اور اُن کی ذات کی خاص اہمیت نظر آتی ہے۔ چونکہ یہ دعویٰ اپنی اجمالی تعبیر کے لحاظ سے ابھی تشنۂ تکمیل تھا اس لیے ایک طویل زمانہ کے بعد سپرنگر کے اس دعویٰ کو سنوک ہیگرونییہ نے بڑے شرح وبسط کے ساتھ پیش کیا اور اپنے مزعومہ دلائل کے ذریعہ اُس کو خاص آب ورنگ سے رنگین بنایا۔

اُس نے کہا: قرآنِ پاک میں جس قدر مکی آیات اور سورتیں ہیں اُن میں کسی ایک مقام پر بھی اسمٰعیل (علیہ السلام) کا ابراہیم (علیہ السلام) کے ساتھ رشتہ نظر نہیں آتا اور نہ اُن کو اولِ مسلمین بتایا گیا ہے بلکہ وہ صرف ایک نبی اور پیغمبر کی حیثیت میں نظر آتے ہیں۔ اُن کے تذکرہ کی ایک آیت بھی ایسی نہیں ملتی جو اُن کو موسسِ کعبہ، اسمٰعیل علیہ السلام کا باپ، عرب کا پیغمبر وہادی اور ملت حنیفی کا داعی ظاہر کرتی ہو۔ سورۂ الذاریات، الحجر

---

[1] جلد ۱ ص ۲۷-۲۸۔ [2] Wensinck [3] Sprenger

الصافات، الانعام، ہود، مریم، انبیاء اور عنکبوت جو سب مکّی سورتیں ہیں ہمارے اس دعوے کی شاہد ہیں۔ اس سے صاف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے پہلے سرزمینِ عرب میں کوئی نبی نہیں آیا اور یہی پہلے شخص ہیں جنہوں نے نبوت کا دعویٰ کیا۔

البتہ جب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مدنی زندگی شروع ہوتی ہے تو مدنی سورتوں میں حضرت ابراہیم کے ذکر کے وقت یہ تمام خصوصیات نمایاں کی جاتی اور اہمیت کے ساتھ روشنی میں لائی جاتی ہیں۔

ایسا کیوں ہوا؟ اور یہ اختلاف کیوں موجود ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ مکّی زندگی میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے تمام امور میں یہود پر اعتماد رکھتے تھے، اور اُنہی کے طریقوں کو پسند فرماتے تھے، لہٰذا اُس وقت تک ابراہیم (علیہ السلام) کی شخصیت کو بھی اُنھوں نے اُسی نظر سے دیکھا جس نظر سے یہود دیکھتے تھے لیکن جب مدینہ پہنچ کر اُنھوں نے یہود کو اپنے مشن "اسلام" کی دعوت دی تو اُنھوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا، اور وہ آپ کے دشمن ہو گئے۔ اب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فکر و تامل کیا اور خوب سوچا آخر اُن کی ذکاوت اور جودتِ طبع نے راہنمائی کی اور اُنھوں نے عرب کے لیے یہود کی یہودیت سے جُدا ایک ایسے دین کی بنیاد ڈالی جس کو یہودیتِ ابراہیمی کہنا چاہیے۔ لہٰذا اس سلسلہ کی تکمیل کے لیے قرآن کی مدنی سورتوں میں ابراہیم (علیہ السلام) کی شخصیت کو اس طرح پیش کیا گیا کہ وہ ملتِ حنیفی کے داعی، عرب کے پیغمبر، اسمٰعیل کے والد، کعبہ کے مؤسس نظر آتے ہیں[۱]"۔ انتہیٰ

یہ ہے وہ دعویٰ اور اُس کی دلیل جو اسپرنگر، سنوک اور ونسنک جیسے اسلام دشمن مستشرقین کی جانب محض اس لیے اختراع کیے گئے ہیں کہ اس قسم کی لچر بنیادوں پر مسیحیت کی برتری اور اسلام کی تحقیر کی عمارت تیار ہو سکے اور نیز یہ کہ ابراہیم علیہ السلام کے متعلق یہ ثابت کیا جائے کہ اُن کا عرب کے ساتھ نہ نسلی تعلق ہے اور نہ دینی۔ لیکن جب ایک مورخ اور ایک نقاد مستشرقین کے اس دعوے اور اس دعوے کے دلائل کو صرف تاریخی اور تنقیدی حیثیت سے دیکھتا ہے تب بھی اُس کو یہ صاف نظر آتا ہے کہ یہ جو کچھ کہا گیا ہے حقائق اور واقعات سے قصداً چشم پوشی

[۱] Het Mekhaansche Feest ص ۲۰

بے سروپا بات اور قطعاً غلط اور مہمل ہے، اس لیے یہ ماننا پڑیگا کہ تورات کے یہ اعداد و شمار محض خود تراشیدہ کہانیوں اور حکایتوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ قدیم زمانہ میں یہود کے یہاں تاریخ کا باب اسی قسم کی حکایات و روایات پر قائم رہا ہے اور اس میں تاریخی حقائق اور زمانوں کے تضاد و اختلاف کا مطلق لحاظ و پاس نہیں رکھا گیا۔

مستشرقینِ یورپ کی ہرزہ سرائی

مستشرقینِ یورپ کی ایک جماعت اسلام دشمنی میں یدطولیٰ رکھتی ہے اور بغض و عناد کی مشتعل آگ میں حقائق و واقعات تک کے انکار پر آمادہ ہوجاتی ہے۔ چنانچہ اس قسم کے مواقع میں سے کہ جہاں قرآنِ عزیز کے خلاف بے دلیل اُن کی تنقید کی تلوار چلتی رہتی ہے" ایک موقعہ حضرت ابراہیم کی شخصیت کا بھی ہے۔

دائرۃ المعارف الاسلامیہ[1] نے ونسنک[2] کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ سب سے پہلے اسپرنگر[3] نے یہ دعویٰ کیا کہ قرآن میں ایک عرصہ تک حضرت ابراہیم کی شخصیت کعبہ کے بانی اور دینِ حنیف کے ہادی کی حیثیت سے روشنی میں نہیں آئی۔ البتہ عرصۂ دراز کے بعد اُن کی شخصیت کو ان صفات کے ساتھ متصف ظاہر کیا گیا ہے۔ اور اُن کی ذات کی خاص اہمیت نظر آتی ہے۔ چونکہ یہ دعویٰ اپنی اجمالی تعبیر کے لحاظ سے ابھی تشنۂ تکمیل تھا اس لیے ایک طویل زمانہ کے بعد اسپرنگر کے اس دعویٰ کو سنوک ہیگرونییہ نے بڑے شرح و بسط کے ساتھ پیش کیا اور اپنے مزعومہ دلائل کے ذریعہ اُس کو خاص آب و رنگ سے رنگین بنایا۔

اُس نے کہا: قرآنِ پاک میں جس قدر مکی آیات اور سورتیں ہیں اُن میں کسی ایک مقام پر بھی اسمٰعیل (علیہ السلام) کا ابراہیم (علیہ السلام) کے ساتھ رشتہ نظر نہیں آتا اور نہ اُن کو اولِ مسلمین بتایا گیا ہے بلکہ وہ صرف ایک نبی اور پیغمبر کی حیثیت میں نظر آتے ہیں۔ اُن کے تذکرہ کی ایک آیت بھی ایسی نہیں ملتی جو اُن کو موسسِ کعبہ، اسمٰعیل علیہ السلام کا باپ، عرب کا پیغمبر و ہادی اور ملت حنیفی کا داعی ظاہر کرتی ہو۔ سورۂ الذاریات، الحجر

---

[1] جلد ۱ ص ۲۷-۲۸۔ [2] Wensinck [3] Sprenger

الصافات، الانعام، ہود، مریم، انبیاء اور عنکبوت جو سب مکّی سورتیں ہیں ہمارے اس دعوے کی شاہد ہیں۔ اِس سے صاف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے پہلے سرزمینِ عرب میں کوئی نبی نہیں آیا اور یہی پہلے شخص ہیں جنہوں نے نبوت کا دعویٰ کیا۔

البتہ جب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مدنی زندگی شروع ہوتی ہے تو مدنی سورتوں میں حضرت ابراہیم کے ذکر کے وقت یہ تمام خصوصیات نمایاں کی جاتی اور اہمیت کے ساتھ روشنی میں لائی جاتی ہیں۔

ایسا کیوں ہوا؟ اور یہ اختلاف کیوں موجود ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ مکی زندگی میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے تمام امور میں یہود پر اعتماد رکھتے تھے، اور اُنہی کے طریقوں کو پسند فرماتے تھے، لہٰذا اُس وقت تک ابراہیم (علیہ السلام) کی شخصیت کو بھی اُنہوں نے اُسی نظر سے دیکھا جس نظر سے یہود دیکھتے تھے لیکن جب مدینہ پہنچ کر اُنہوں نے یہود کو اپنے مشن "اسلام" کی دعوت دی تو اُنہوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا، اور وہ آپ کے دشمن ہو گئے۔ اب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فکر و تامل کیا اور خوب سوچا آخر اُن کی ذکاوت اور جودتِ طبع نے راہنمائی کی اور اُنہوں نے عرب کے لیے یہود کی یہودیت سے جُدا ایک ایسے دین کی بنیاد ڈالی جس کو یہودیتِ ابراہیمی کہنا چاہیے۔ لہٰذا اس سلسلہ کی تکمیل کے لیے قرآن کی مدنی سورتوں میں ابراہیم (علیہ السلام) کی شخصیت کو اس طرح پیش کیا گیا کہ وہ ملتِ حنیفی کے داعی، عرب کے پیغمبر، اسمٰعیل کے والد، کعبہ کے مؤسس نظر آتے ہیں[۱]"۔ انتہیٰ

یہ ہے وہ دعویٰ اور اُس کی دلیل جو اسپرنگر، سنوک اور ونسنک جیسے اسلام دشمن مستشرقین کی جانب محض اس لیے اختراع کیے گئے ہیں کہ اس قسم کی لچر بنیادوں پر مسیحیت کی برتری اور اسلام کی تحقیر کی عمارت تیار ہو سکے اور نیز یہ کہ ابراہیم علیہ السلام کے متعلق یہ ثابت کیا جائے کہ اُن کا عرب کے ساتھ نہ نسلی تعلق ہے اور نہ دینی۔ لیکن جب ایک مورخ اور ایک نقاد مستشرقین کے اس دعوے اور اس دعوے کے دلائل کو صرف تاریخی اور تنقیدی حیثیت سے دیکھتا ہے تب بھی اس کو یہ صاف نظر آتا ہے کہ یہ جو کچھ کہا گیا ہے حقائق اور واقعات سے قصداً چشم پوشی

[۱] Het Mekhaansche Feest ص ۲۰

کرکے محض عداوت اور بغض و عناد کی راہ سے بے دلیل کہا گیا ہے۔ اس لیے کہ اس سلسلہ میں سب سے بڑی دلیل یہ پیش کی گئی ہے کہ مکی سورتوں میں حضرت ابراہیم کے متعلق وہ اوصاف نظر نہیں آتے جو مدنی آیات میں پائے جاتے ہیں، مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ سرتاسر غلط بلکہ قصد و ارادہ کے ساتھ علمی بددیانتی ہے کہ مکی سورتوں میں سے صرف اُنہی کا حوالہ دیا گیا ہے جن میں حضرت ابراہیم کو فقط ایک پیغمبر کی صورت میں ظاہر کیا گیا ہے، لیکن وہ مکی سورت جو ابراہیم کی شخصیت کو ہمہ حیثیت سے نمایاں کرنے کے لیے اُن کے نام ہی سے معنون کرکے نازل کی گئی یعنی سورۂ ابراہیم اُس کو نظرانداز کر دیا گیا تاکہ قرآنِ عزیز سے براہِ راست فائدہ نہ اُٹھا سکنے والے حضرات کے سامنے جہالت کا پردہ پڑا رہے اور اُن کی کورانہ تقلید میں وہ ان کے غلط دعوے کو صحیح سمجھتے رہیں۔

سورۂ ابراہیم مکی ہے، اُس کی آیات کا نزول ہجرت سے قبل مکہ ہی میں ہوا ہے اور وہ حسب ذیل حقائق کا اعلان کرتی ہے۔

(۱) حضرت ابراہیم عرب (حجاز) کے اندر قیام پذیر ہیں اور خدا کے رسول کی حیثیت سے خود کو اور اپنی اولاد کو بت پرستی سے بچنے اور اس مقام کو امنِ عالم کا مرکز بنانے کی دعا کر رہے ہیں۔

رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّ	اے پروردگار اس شہر (مکہ) کو تو امن کا مرکز بنا اور مجھ کو
اجْنُبْنِي وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ (۳۵)	اور میری اولاد کو بتوں کی پرستش سے دور رکھ۔
رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ	اے پروردگار بلاشبہ ان (بتوں) نے بہت سے لوگوں کو گمراہ
فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ وَمَنْ عَصَانِيْ	کر دیا، پس جو شخص میری پیروی کرے وہ میری جماعت
فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۰ (۳۶)	میں سے ہے اور جو میری نافرمانی کرے پس بلاشبہ تو بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

(۲) حضرت ابراہیم اقرار کرتے ہیں کہ سرزمینِ حجاز (جو عرب کا قلب ہے) اُن ہی کی اولاد سے آباد ہوئی

اور اُنہوں نے ہی اُس کو بسایا ہے، اور وہی اس چٹیل میدان میں بیتِ محرّم (کعبہ) کے مؤسّس ہیں۔

ربنا اِنی اسکنتُ من ذریتی بوادٍ	اے ہمارے پروردگار بیشک میں نے اپنی بعض ذریت
غیر ذی زرعٍ عند بیتك المحرم	کو اس بن کھیتی کی سرزمین میں تیرے گھر (کعبہ) کے
ربنا لیقیموا الصلوٰةَ فاجعل	نزدیک آباد کیا ہے۔ اے ہمارے پروردگار یہ اس لیے تاکہ
اَفئدةً مِن الناسِ تهوی الیهم	وہ نماز قائم کریں پس تو لوگوں میں سے کچھ کے دل اس
وارزُقهم مِنَ الثمراتِ لعلّهم	طرف پھیر دے کہ وہ (اس کعبہ کی بدولت) ان کی جانب
یشکرون ۔ (۳۷)	مائل ہوں اور اُن کو پھلوں سے رزق عطا کر تاکہ یہ شکر گذار بنیں

(۳) حضرت ابراہیم حضرتِ اسمٰعیل وحضرت اسحٰق (علیہم السلام) کے والد ہیں اور یہی اسمٰعیل اہل عرب کے باپ ہیں اور حضرت ابراہیم اپنے اور اپنی اولاد کے لیے ملتِ حنیفی کے شعار "صلوٰۃ" کی اقامت کی دعاء کر رہے ہیں:

الحمد لِلّٰہ الذی وھب لی علی	سب تعریف اُس اللہ کے لیے ہے جس نے مجھ کو بڑھاپے
الکبرِ اسمٰعیل واسحٰق اِنّ ربّی	میں اسمٰعیل اور اسحٰق بخشے بلاشبہ میرا پروردگار ضرور دعاء
لسمیع الدعاء ۔ ربِّ اجعلنی	کا سننے والا ہے۔ اے پروردگار مجھ کو اور میری اولاد کو نماز
مقیمی الصلوٰۃ ومن ذریتی ربنا	قائم کرنے والا بنا دے، اے ہمارے پروردگار ہماری
وتقبّل دُعاء ۔ ربنا اغفر لی و	دعا سُن لے ہمارے پروردگار تو مجھ کو اور میری اولاد کو
لوالدیّ ولِلمومنین یوم یقوم الحساب	اور کل مؤمنوں کو قیام حساب (قیامت) کے روز بخشدے۔

۳۹-۴۰-۴۱

اِن آیات کا مطالعہ کرنے کے بعد کیا ایک لمحہ کے لیے بھی کسی شخص کو یہ جرأت ہوسکتی ہے کہ وہ ان لغو اور بے سروپا دعووں کی تصدیق کرے جن کو مستشرقینِ یورپ نے اپنی جہالت یا ارادی جھوٹ کے ساتھ علمی تنقید کا عنوان دیا ہے۔ کیا یہ آیات مکی نہیں ہیں، اور کیا اِن سے وہ سب کچھ ثابت نہیں ہوتا جو مدنی آیات میں مذکور ہے

(۴) اسی طرح سورۂ ابراہیم کے علاوہ سورہ انعام اور سورۃ النحل بھی مکی سورتیں ہیں اُن میں بصراحت موجود ہے کہ حضرت ابراہیم شرک کے مقابلہ میں ملتِ حنیفی کے داعی ہیں اور اُن کی شخصیت اس دعوت میں بہت نمایاں اور ممتاز ہے۔

انی وجهت وجهیَ للذی فطرَ	بلاشبہ میں اپنے چہرہ کو اُسی ذات کی طرف جھکاتا ہوں
السمٰوٰتِ والارضَ حنیفًا ومَا	جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے، اور میں شرک
انا من المشرکین ۔ (الانعام ۹)	کرنے والوں میں سے ہرگز نہیں ۔
قُل اِنَّنی هدانی رَبّی الی صراطٍ	(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کہہ دو بلاشبہ مجھ کو میرے رب نے
مستقیمٍ دِینًا قیمًا ملۃ ابرٰهیم	سیدھی راہ کی ہدایت کی ہے جو کج مج راہ سے الگ
حنیفًا وما کان من المشرکین	صاف اور سیدھا دین ہے ملت ہے ابراہیم کی جو تھی ایک
(انعام - ۱۶۱)	خدا کی طرف جھکنے والے اور نہ تھے وہ مشرکوں میں سے ۔
انَّ ابراهیم کان اُمَّۃً قانتًا للّٰه	بیشک ابراہیم تھا راہ ڈالنے والا حکم بردار صرف ایک خدا
حنیفًا ولم یكُ من المشرکین (النحل ۱۲)	کی طرف جھکنے والا اور نہ تھا وہ شرک کرنے والوں میں سے
ثم اوحینا الیكَ اَنِ اتبع مِلَّۃَ	پھر وحی کی ہم نے تیری جانب (اے محمد صلی اللہ علیہ و
ابرٰهیمَ حنیفًا ومَا کانَ مِنَ	سلم) اس بات کی کہ تو پیروی کر اُس ابراہیم کی ملت کی
المشرکین ۔ (۱۲۳)	جو صرف خدائے واحد کی جانب جھکنے والا ہے اور نہیں ہے مشرکوں میں سے

تو کیا ان صاف اور واضح آیات کے بعد بھی اُن دلائل کو دلائل کہنا کوئی حقیقت رکھتا ہے جو اس سلسلہ میں سنوک اور اُس کے ہمنواؤں نے بیان کیے ہیں؟ مکی سورتیں ہوں یا مدنی دونوں جگہ ابراہیم کی شخصیت ایک ہی طرح نمایاں نظر آتی ہے، وہ دونوں حالتوں میں ملتِ حنیفی کے داعی، حضرت اسمٰعیل اور عرب کے باپ، کعبہ کے

موسس و بانی عرب کے ہادی ہیں۔ اور اس لیے مستشرقینِ یورپ کا یہ کہنا کہ ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت قرآنِ عزیز کی مکی اور مدنی آیات میں دو جُدا جُدا صورتوں میں نظر آتی ہے کذب اور صریح بہتان ہے نیز یہ بھی خلاف واقعہ ہے کہ عرب میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دعویِ نبوت سے قبل کوئی بھی اور پیغمبر نہیں گذرا کیونکہ ابراہیم و اسمٰعیل اسی سرزمین کے ہادی و پیغمبر ہیں۔

ان مدعیانِ علم کو تعصب نے ایسا نادان بنا دیا کہ قرآن اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کرتے وقت یہ بھی خیال نہ رہا کہ اس قسم کے دعوے سے ہم صرف قرآن ہی کی نہیں بلکہ بائبل (تورات) کی بھی تکذیب کر رہے ہیں۔ اس لیے کہ تورات میں تصریح ہے کہ اسمٰعیل، ابراہیم کے بیٹے ہیں اور اسمٰعیل ہی عرب کے باپ ہیں اور ابراہیم کی اسی اولاد سے حجاز کی سرزمین آباد ہوئی اور یہ دونوں باپ بیٹے عرب کی نمایاں شخصیتیں ہیں۔

نیز یہ الزام بھی قطعاً بے بنیاد اور لغو ہے کہ مکّہ کی زندگی میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود اور اُن کے مذہبی امور کی تقلید کی اور جب مدینہ میں پہنچ کر یہود کے انکار اور اُن کے مخالفانہ جذبہ کو دیکھا تو یہود سے الگ ایک نئی یہودیت کی بنیاد ڈالی اور اس کو ملّتِ ابراہیمی کا لقب دیا" اس لیے کہ مکّہ کی زندگی میں تو یہود سے آپ کا سابقہ ہی نہیں پڑا تو مخالفت و موافقت یا اتباع کا سوال ہی کیا۔ البتہ مدینہ میں آکر آپ نے مشرکین کے مقابلہ میں یہود کی جانب زیادہ توجہ فرمائی اور یہ اس لیے کہ وہ اسلام کے عقیدے کے مطابق دینِ موسوی کے پیرو تھے۔ اگرچہ اس میں تحریف ہو چکی تھی مگر وہ مشرکین کے خلاف توحید کے قائل تھے اور اُن کی محرف کتابوں میں تحریف کے بعد بھی بہت سے جملے ایسے موجود تھے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور رسالت کے شاہد اور گواہ ہیں اور اُن سے آپ کے حق میں بشارات نکلتی ہیں اس لیے آپ کو خیال تھا کہ یہ مشرکین کے مقابلہ میں جلد ہی ملّتِ ابراہیمی یعنی اسلام کو قبول کر لینگے، لیکن جب آپ نے اُن کے انکار، بغض اور حسد کا تجربہ کر لیا تو پھر اُن کے ساتھ بھی آپ کا معاملہ وہی ہو گیا جو مشرکین کے ساتھ تھا اور بمصداق الکفر ملة

واحدۃً (کفر سب ایک ملت ہے) آپ نے اُن سب کو ایک ہی حیثیت میں رکھا۔

اسپرنگر، سنوک اور اُن کے ہمنوا اتنی صاف بات سمجھنے سے بھی قاصر ہیں یا عمداً سمجھنا نہیں چاہتے کہ جبکہ ابراہیم علیہ السلام، اسرائیل (یعقوب) علیہ السلام کے دادا تھے اور یہود اپنے دین کی نسبت حضرت اسرائیل علیہ السلام کی جانب کرتے اور بنی اسرائیل ہونے کی حیثیت سے اس پر فخر کرتے تھے تو اُن کا یہ کہنا کہ ابراہیم بھی یہودی تھے کس قدر مضحکہ خیز تھا۔ کیا پوتے کے دین کے متعلق کسی طرح یہ کہنا درست ہو سکتا ہے کہ عرصۂ دراز کے گذرے ہوئے دادا کا دین پوتے کے دین کے تابع تھا۔

پس اسی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے قرآنِ عزیز نے یہ اعلان کیا:

مَاکَانَ ابراھیمُ یھودیاً ولا نصرانیاً ولٰکن کانَ حنیفاً مُّسْلِمًا

ابراہیم نہ یہودی تھے نہ نصرانی، اور البتہ وہ تھے حنیف مسلم۔

مگر ان کور چشموں نے اس کے معنی یہ لیے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں تو یہود کے دین پر تھے لیکن مدینہ جا کر جب یہود نے اُن کو پیغمبر ماننے سے انکار کر دیا تو یہود کے دین کے مقابلہ میں ذکاوتِ طبع سے یہودیتِ ابراہیمی ایجاد کر لی۔ سبحٰنک ھٰذا بھتان عظیم۔

سنوک اور اُس کے ہمنواؤں نے اس دعوے کی دلیل میں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے عرب میں کوئی پیغمبر نہیں گذرا۔ قرآنِ عزیز کی اس آیت کو بھی پیش کیا ہے۔

لِتُنذِرَ قوماً مَّا اَتٰھم مِّن نَّذِیرٍ مِّن قبلك۔

تاکہ تو (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ڈرائے ایسی قوم کو کہ نہیں آیا اُن کے پاس تجھ سے پہلے کوئی ڈرانے والا۔

وہ کہتے ہیں کہ اگر ابراہیم و اسمٰعیل عرب کے پیغمبر ہوتے تو قرآنِ عزیز امتِ عربیہ کے متعلق اس طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب نہ کرتا۔

مگر یہ بھی ایک سخت مغالطہ ہے جو قرآنِ عزیز کے طرزِ خطابت، اسلوبِ بیان اور باطل پرستوں

کی باطل پرستی کے خلاف دلائل کی ترتیب سے ناواقفیت کی بنا پر پیدا ہوا ہے یا گذشتہ اعتراضات کی طرح محض بغض و عناد کی خاطر اختیار کیا گیا ہے۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ عرب کا بہت بڑا حصہ بُت پرستی میں مبتلا تھا، اور اس سلسلہ میں اُنھوں نے عقائد اور دین کے نام سے کچھ احکام مرتب کر رکھے تھے۔ مثلاً دیوتاؤں کی نذر اور قربانی کے لیے سائبہ بحیرہ اور وصیلہ کی ایجاد، مختلف بتوں کی پرستش کے مختلف قواعد و ضوابط وغیرہ۔ اس لیے جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو توحید اور اسلام کی دعوت دی اور شرک اور بت پرستی سے روکا تو وہ کہنے لگے کہ تمہارا یہ کہنا کہ ہم بد دین ہیں اور ہمارا کوئی الہامی دین نہیں ہے، غلط ہے ہم تو خود مستقل دین رکھتے ہیں اور وہ ہمارے باپ دادا کا قدیمی دین ہے۔

قالوا وَجَدْنَا علیہا آبَاءَ نا واللہُ اَمَرَنَا بِہا۔	مشرکین نے کہا۔ ہم نے اسی (بت پرستی) پر اپنے باپ دادا کو پایا ہے اور اللہ نے ہم کو اسی کا حکم دیا ہے۔

تب قرآنِ عزیز نے اُن کے باطل عقائد کی حقیقت کو اُن پر واضح کرنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا کہ اُن کو بتایا جائے کہ کسی دین کے خدائی دین ہونے کے لیے دو ہی قسم کے دلائل ہو سکتے ہیں، یا حسی اور عقلی راہ سے یہ واضح ہو جائے کہ یہ خدا کا دین اور اُس کا مرغوب مذہب ہے۔ اور یا نقلی روایات اس کا قطعی یقینی اور ناقابلِ انکار ثبوت پیش کرتی ہوں کہ یہ خدا کی بھیجی ہوئی شریعت ہے اور اگر یہ دونوں راہیں کسی دعوی کے لیے بند ہیں تو یہ دعویٰ باطل اور اُس کا مدعی کاذب ہے۔

پس قرآنِ عزیز نے مشرکین کے اس دعوے کی تردید کے لیے آیاتِ قرآنی کے تین حصے کر دیے ایک حصہ میں اُن کے اس دعوے کا انکار اور دعوے کی غیر معقولیت کا اظہار کیا اور بتایا کہ مشرکین کا یہ کہنا کہ "واللہ امرنا بہا" ہم کو خدا نے ایسا (شرک) کرنے کا ہی حکم دیا ہے بالکل غلط اور سرتاسر باطل ہے۔ اس لیے کہ

ان اللہ لا یامر بالفحشاء اتقولون	بلاشبہ اللہ تعالیٰ بیہودہ خرافات کا حکم نہیں دیا کرتا

علی اللہِ مَا لَا تعلمون — مشرکین) کیا تم اللہ کے ذمہ وہ باتیں لگاتے ہو جو تم نہیں جانتے؟

اور دوسرا حصہ اُن کے باطل دعویٰ پرستی اور عقلی سند کے مطالبہ سے متعلق کیا اور بتایا کہ وہ عقل سے یہ فتویٰ صادر کریں کہ جو کچھ خدا کے ساتھ اُنہوں نے غلط نسبتیں قائم کر رکھی ہیں اور جن پر اُن کے مزعومہ دین کی بنیاد قائم ہے، وہ کس طرح صحیح اور اہل عقل کے نزدیک قابلِ تسلیم ہیں؟ وہ کہتا ہے۔

فَاسْتَفْتِهِمْ أَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَ لَهُمُ الْبَنُونَ أَمْ خَلَقْنَا الْمَلٰئِكَةَ إِنَاثًا وَهُمْ شٰهِدُونَ أَلَا إِنَّهُمْ مِنْ إِفْكِهِمْ لَيَقُولُونَ وَلَدَ اللّٰهُ وَإِنَّهُمْ لَكٰذِبُونَ أَصْطَفَى الْبَنَاتِ عَلَى الْبَنِينَ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ . أَفَلَا تَذَكَّرُونَ (الصافات)

پس (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) تم ان سے دریافت کرو کیا تمہارے پروردگار کے لیے لڑکیاں ہیں اور اُن کے لیے لڑکے، کیا ہم نے فرشتوں کو لڑکیاں بنایا اور وہ اُس وقت موجود تھے۔ خبردار! بلاشبہ یہ سب ان کی بہتان طرازی ہے، البتہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ کے اولاد ہے اور بلاشبہ یہ قطعاً جھوٹے ہیں۔ (یہ کہتے ہیں کہ خدا نے) اپنے لیے بیٹوں کے مقابلہ میں بیٹیوں کو پسند کر لیا ہے (اے مشرکین) تم کو کیا ہوا یہ تم کیسا (جھوٹا) حکم کرتے ہو، پس کیا تم نصیحت نہ حاصل (کرو گے)

اور تیسرا حصہ اُن کے باطل عقیدوں کے متعلق نقلی سند کے مطالبہ سے وابستہ کیا، قرآنِ عزیز اُن سے سوال کرتا ہے کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو اور اس کو خدا کا دین بتا رہے ہو تو کیا تمہارے پاس اُس کے لیے خدا کی جانب سے کوئی "حجت" اور "دلیل" نازل ہوئی ہے یا اُس کے پاس سے ان عقائد کی صداقت کے لیے کوئی کتاب بھیجی گئی ہے اگر ایسا ہے تو پیش کرو۔

أَمْ لَكُمْ سُلْطٰنٌ مُبِينٌ . فَأْتُوا بِكِتٰبِكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِينَ . (الصافات)

کیا تمہارے پاس کوئی ظاہر حجت اور صاف دلیل ہے پس تم اپنی (خدا کی جانب سے نازل شدہ) وہ کتاب لاؤ اگر تم سچے ہو۔

پس اگر اُن کے اپنے دعوے کی صداقت کے لیے اُن کے پاس نہ کوئی حسّی و عقلی دلیل ہے اور نہ نقلی سند کے طور پر کوئی حجت و کتاب، تو پھر اُن کا یہ دعویٰ کہ اُن کے پاس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے سے خدا کا دین موجود ہے اور اُس کی منضبط شریعت بھی۔ بالکل غلط اور باطل دعویٰ ہے۔

اسی طرح مشرکین پر یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ تمہارے پاس اپنے دعوۓ باطل کے سلسلہ میں عقلی سند ہے اور نہ نقلی اور اُن کو لاجواب بنانے کے لیے سورۂ احقاف میں بھی یہی طریق استدلال اختیار کیا گیا ہے۔

أَرَأَيْتُم مَّا تَدْعُونَ مِن دُونِ	تم مجھے بتاؤ کہ اللہ کے ماسوا جن کو تم پوجتے ہو مجھے دکھلاؤ کہ
اللَّهِ أَرُونِي مَاذَا خَلَقُوا مِنَ	اُنھوں نے زمین سے کیا بنایا، یا کیا اُن کی آسمانوں میں
الْأَرْضِ أَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي	(اللہ کے ساتھ) کوئی شرکت ہے۔ اس سے پہلی کوئی کتاب
السَّمَاوَاتِ ائْتُونِي بِكِتَابٍ مِّن	اگر تمہارے پاس ہے (جو اس دعوے کی تصدیق کرتی
قَبْلِ هَٰذَا أَوْ أَثَارَةٍ مِّنْ عِلْمٍ	ہو) تو وہ لے آؤ۔ یا علم (اولین میں سے کوئی بقیہ علم
(احقاف)	تمہارے پاس ہو تو وہ پیش کرو۔

پس یہی وہ حقیقت ہے جس کو ایک دوسرے پیرایہ میں قرآنِ عزیز کی اُن آیات میں بیان کیا گیا ہے جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مشرکینِ عرب کے پاس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کوئی پیغمبر نہیں آیا۔ ان آیات کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ سرزمینِ عرب (حجاز) ہمیشہ سے خدا کے نبی اور پیغمبر کے وجود سے محروم ہے۔ اور اس ملک میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سب سے پہلی آواز ہے۔ قرآنِ عزیز ایسی خلافِ حقیقت بات کس طرح کہہ سکتا تھا جبکہ سورۂ ابراہیم، الانعام اور النحل کی آیات میں حضرت ابراہیم و اسمٰعیل کے عربی نبی ہونے کی صاف اور صریح شہادتیں موجود ہیں جو ابھی نقل کی جا چکی ہیں اور قرآنِ عزیز اس قسم کے تضاد اور اختلاف سے قطعاً بری ہے، کہ ایک جگہ وہ ایک بات کا انکار کرے اور دوسری جگہ اُسی

بات کا اقرار اس لیے کہ وہ خدائے عالم الغیب و الشہادہ کا کلام ہے نہ کہ بھول چوک کرنیوالے انسان کا کلام

افلا یتدبرون القرآن ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافا کثیرا۔

کیا انہوں نے قرآن پر غور نہیں کیا اور اگر وہ ہوتا اللہ کے سوا کسی اور کا کلام تو تم ضرور پاتے اس میں بہت سا اختلاف۔

لہٰذا قرآن عزیز کے خلاف سنوک، اسپرنگر اور وینسنک کے یہ تمام دعاوی اور ان کے دلائل تاریخی حقائق اور واقعات کی روشنی میں قطعاً باطل اور افترا ہیں۔ اور ان کے طرزِ عمل سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اور اس قسم کے دوسرے ناقدین قرآنِ عزیز پر علمی دیانت کے ساتھ تنقید نہیں کرتے اور نہ اُن کی فہم اور سمجھ کا قصور ہے بلکہ اس کے برعکس وہ علمی بددیانتی سے کام لے کر قرآن کے خلاف زہر اگلتی غلط الزام قائم کرتے، اور صریح اور واضح مسائل میں اپنے پیش نظر مقاصد کے مطابق گنجلک پیدا کرکے ناواقف دنیا کو گمراہ کرتے ہیں بلکہ اس قسم کے الزامات سے اُن کا صرف ایک ہی مقصد ہو سکتا ہے جس کو قرآنِ عزیز نے اس قسم کے معاندین کے لیے ایک مستقل قانون کی طرح واضح کر دیا ہے۔

ودّوا لو تکفرون کما کفروا فتکونون سواء

یہ (منکرینِ قرآن و اسلام) یہ خواہش رکھتے ہیں کہ کاش تم بھی اُن کی طرح منکرین بن جاؤ تاکہ وہ اور تم سب یکساں ہو جائیں۔

اس لیے ان منکرین اور کافروں کے مقابلہ میں مسلمانوں کا ہمیشہ ایک ہی جواب رہا ہے۔

ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ ھدیتنا

اے پروردگار ہمارے دلوں کو ہدایت یافتہ اور راہیاب کرنے کے بعد کجی کی جانب مت مائل کرنا۔

بہرحال قرآنِ حکیم کی مسطورہ بالا زیرِ بحث آیت کا مطلب صاف اور واضح ہے اور اس کے درمیان اور الانعام، النحل اور ابراہیم جیسی سورتوں میں ابراہیم علیہ السلام کے پیغمبرِ عرب ہونے کے درمیان قطعاً کوئی تضاد اور اختلاف نہیں ہے۔

اس پیش کردہ تفصیل وتشریح کے علاوہ عام مفسرین نے اس قسم کی آیات کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ یہ خطاب صرف اُن ہی لوگوں سے متعلق ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگیِ مبارک میں موجود تھے۔ اُن کے گذشتہ آبا و اجداد اور گذشتہ تاریخِ عرب سے اس خطاب کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

حضرت ابراہیم کا ذکر قرآن میں

قرآن عزیز کے رشد و ہدایت کا پیغام چونکہ ملتِ ابراہیمی کا پیغام ہے اس لیے اُس نے جگہ جگہ حضرت ابراہیم کا ذکر کیا ہے اور جیسا کہ گذشتہ سطور میں کہا جا چکا ہے حضرت ابراہیم کا ذکر مکی اور مدنی دونوں قسم کی سورتوں میں موجود ہے۔ مندرجہ ذیل جدول اُن تمام سورتوں اور آیتوں کو ظاہر کرتی ہے۔

سورۃ	شمار	آیات
البقرہ	۲	۱۲۴-۱۲۵-۱۲۶-۱۲۷-۱۳۰-۱۳۲-۱۳۳-۱۳۵-۱۳۶-۱۴۰-۲۵۸-۲۶۰۔
آلِ عمران	۳	۳۳-۳۵-۶۷-۶۸-۸۴-۹۵-۹۷۔
النساء	۴	۵۴-۱۲۵-۱۶۳۔
الانعام	۶	۷۴-۷۵-۸۳-۱۵۱
التوبہ	۹	۷۰-۱۱۴۔
ہود	۱۱	۶۹-۷۴/۷۵/۷۶۔
یوسف	۱۲	۶-۳۸
ابراہیم	۱۴	۳۶۔
الحجر	۱۵	۵۱
النحل	۱۶	۱۲۰-۱۲۳

سورة	شمار	آیات	سورة	شمار	آیات
مریم	۱۹	۴۱-۴۶-۵۸	الانبیاء	۲۱	۵۱-۶۰-۶۲-۶۹
الحج	۲۲	۲۶-۴۳-۷۸	الشعراء	۲۶	۶۹
العنکبوت	۲۹	۱۶-۳۱	الاحزاب	۳۳	۷۰
الصافات	۳۷	۸۳-۱۰۴-۱۰۹	ص	۳۸	۴۵
الشوریٰ	۴۲	۱۳	الزخرف	۴۳	۲۶
الذاریات	۵۱	۲۴	النجم	۵۳	۳۷
الحدید	۵۷	۲۶	الممتحنہ	۶۰	۴
الاعلیٰ	۸۷	۱۹	مجموعہ = ۲۵ سورت ، ۶۳ آیات		

حضرت ابراہیم کے قصہ کے ساتھ دوسرے چند انبیاء علیہم السلام کے قصص بھی وابستہ ہیں مثلاً حضرت لوطؑ کا قصہ اس لیے کہ یہ ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے بھی ہیں اور اُن کے پیرو بھی۔ اسی طرح اُن کے صاحبزادوں حضرت اسمٰعیل و حضرت اسحٰق علیہما السلام کے قصے۔ اس لیے کہ اسمٰعیل علیہ السلام کی ولادت کے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر ستاسی[1] سال تھی اور حضرت اسحٰقؑ کی ولادت کے وقت اُن کی عمر پورے سو سال تھی۔ اور حضرت ابراہیم کی کل عمر ایک سو پچھتر ۱۷۵[2] سال ہوئی۔

مگر ان تینوں پیغمبروں کے تفصیلی واقعات مستقل عنوان میں درج کیے جائینگے اور یہاں صرف حضرت ابراہیم کے واقعہ کے ضمن میں کہیں کہیں ذکر آئیگا۔

حضرت ابراہیم کا قصہ قرآنِ عزیز میں ابراہیم علیہ السلام کے واقعات کو کسی جگہ اختصار کے ساتھ، کسی جگہ مختلف شئون و اوصاف کے پیش نظر، اور کسی جگہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس لیے ہم اس جگہ مناسب

[1] تورات اصحاح ۱۶ و تکوین ۱۶ [2] تورات آیت ۵ اصحاح ۲۱ تکوین۔ [3] تورات، آیت ۷، اصحاح ۲۵ تکوین۔

ترتیب کے ساتھ اُن کا تذکرہ کرینگے۔

تورات یہ بتاتی ہے کہ ابراہیم (علیہ السلام) عراق کے قصبہ اُور کے باشندہ اور اہل فدان میں سے تھے اور اُن کی قوم بت پرست تھی اور انجیل برنا باس میں تصریح ہے کہ اُن کے والد نجاری کا پیشہ کرتے اور اپنی قوم کے مختلف قبائل کے لکڑی کے بُت بناتے اور فروخت کیا کرتے تھے۔

مگر اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو شروع ہی سے حق کی بصیرت اور رشد و ہدایت عطا فرمائی تھی اور وہ یہ یقین رکھتے تھے کہ بُت نہ سُن سکتے ہیں، نہ دیکھ سکتے ہیں اور نہ کسی کی پکار کا جواب دے سکتے ہیں، اور نہ نفع ونقصان کا اُن سے کوئی واسطہ، اور نہ لکڑی کے کھلونوں اور دوسری بنی ہوئی چیزوں کے اور ان کے درمیان کوئی فرق و امتیاز ہے۔ وہ صبح و شام آنکھ سے دیکھتے تھے کہ اِن بیجان مورتوں کو میرا باپ اپنے ہاتھوں سے بناتا اور گھڑتا رہتا ہے۔ اور جس طرح اُس کا جی چاہتا ہے ناک، کان، آنکھیں اور جسم تراش لیتا اور پھر خریدنے والوں کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے۔ کیا یہ خدا ہو سکتے ہیں یا خدا کے مثیل و ہمسر کہے جا سکتے ہیں؟ حاشا و کلا۔ پس بعثت سے سرفراز ہو کر سب سے پہلے اُنھوں نے اسی طرف توجہ فرمائی۔

بعثت قرآن عزیز حضرت ابراہیم کی اس حقیقت بیں اور بصیرت افروز رشد و ہدایت کا اس طرح ذکر کرتا ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ ﴿٥١﴾	اور بلا شبہ ہم نے ابراہیم کو اوّل ہی سے رشد و ہدایت عطا کی تھی، اور ہم اُس کے (معاملہ کے) جاننے والے تھے جب
اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ ﴿٥٢﴾	اُس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا "یہ مجسمے کیا ہیں جن کو تم لیے بیٹھے ہو" کہنے لگے "ہم نے اپنے باپ دادا
قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ ﴿٥٣﴾	کو ان ہی کی پوجا کرتے پایا ہے" ابراہیم نے کہا "بلا
قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ	شبہ تم اور تمھارے باپ دادا کھلی گمراہی میں ہیں۔

فی ضلٰلٍ مُبین ۵۴ قالوا اجئتنا بالحق ام انت من اللّٰعبین ۵۵ قال بل ربکم رب السمٰوٰت و الارض الذی فطرھن و انا علیٰ ذٰلکم من الشّٰھدین ۵۶ (انبیاء)

انھوں نے جواب دیا "کیا تو ہمارے لیے کوئی حق لایا ہے یا یوں ہی مذاق کرنے والوں کی طرح کہتا ہے، ابراہیم نے کہا "(یہ بت تمہارے رب نہیں ہیں) بلکہ تمہارا پروردگار زمینوں اور آسمانوں کا پروردگار ہے جس نے ان سب کو پیدا کیا ہے، اور میں اسی بات کا قائل ہوں۔

اور جبکہ اس جلیل القدر ہستی پر اللہ تعالیٰ کے جود و کرم اور عطا و نوال کا فیضان بے غایت و بے نہایت سُرعتِ رفتار کے ساتھ ہو رہا تھا تو اُس کا یہ نتیجہ نکلا کہ اُس نے انبیاء علیہم السلام کی صف میں نمایاں جگہ پائی اور اُس کی دعوت و تبلیغ کا محور و مرکز "دینِ حنیف" قرار پایا۔

اُس نے جب یہ دیکھا کہ قوم بت پرستی اور ستارہ پرستی میں اس قدر منہمک ہے کہ خدائے برتر کی قدرتِ مطلقہ اور اُس کی احدیت و صمدیت کا تصور بھی اُن کے قلوب میں باقی نہیں رہا، اور اُن کے لیے خدا کی وحدانیت کے عقیدہ سے زیادہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں رہی تب اُس نے کمرِ ہمت چست کی اور ذاتِ واحد کے بھروسہ پر اُن کے سامنے دینِ حق کا پیغام رکھا اور اعلان کیا۔

اے قوم! یہ کیا ہے جو میں دیکھ رہا ہوں کہ تم اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے بتوں کی پرستش میں مشغول ہو، کیا تم اس قدر خوابِ غفلت میں ہو کہ جس بے جان لکڑی کو اپنے آلات سے گھڑ کر مجسمے تیار کرتے ہو اور اگر وہ مرضی کے مطابق نہ بنے تو اُس کو توڑ کر دوسرا بنا لیتے ہو اور بنا لینے کے بعد اُس کو پوجنے اور نفع و ضرر کا مالک سمجھنے لگتے ہو۔ تم اس خرافات سے باز آؤ، خدا کی توحید کے نغمے گاؤ۔ اور اُسی ایک مالکِ حقیقی کے سامنے سرِ نیاز جھکاؤ۔ جو میرا، تمہارا اور کل کائنات کا خالق و مالک ہے۔

مگر قوم نے اُس کی آواز پر مطلق کان نہ دھرا اور چونکہ گوشِ حق نیوش اور نگاہِ حق بیں سے محروم تھی اس لیے اُس نے جلیل القدر پیغمبر کی دعوتِ حق کا مذاق اُڑایا اور زیادہ سے زیادہ تمرّد و سرکشی کا مظاہرہ کیا۔

باپ کو دعوتِ اسلام اور باپ بیٹے کا مناظرہ

اس سلسلہ میں سب سے پہلے ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والد کو مخاطب کیا اور دعوتِ حق کو خاندان ہی سے شروع کیا، اور بتایا کہ اُن کی یہ قدیم راہ گمراہی کی راہ ہے اور میں جس راہ کی دعوت دیتا ہوں وہ صراطِ مستقیم ہے، مگر والد پر مطلق کوئی اثر نہ ہوا اور اس کے برعکس آزر نے بیٹے کو دھمکایا کہ اگر تو بتوں کی بُرائی سے باز نہ آئیگا تو میں تجھ کو سنگسار کر دونگا، ابراہیم علیہ السلام نے دیکھا کہ اب معاملہ حد سے آگے بڑھ گیا، ایک جانب باپ کے احترام کا مسئلہ اور دوسری جانب ادائے فرض، حمایتِ حق، اور اطاعتِ امرِ الٰہی کا سوال، اُنھوں نے سوچا اور آخر وہی کیا جو ایسے برگزیدہ انسان اور اللہ کے جلیل المرتبت پیغمبر کے شایانِ شان تھا، اُنھوں نے باپ کی سختی کا جواب سختی سے نہیں دیا تحقیر و تذلیل کا رویہ نہیں برتا بلکہ نرمی، ملاطفت اور اخلاق کریمانہ کے ساتھ یہ جواب دیا۔ اے باپ! اگر میری بات کا یہی جواب ہے تو آج سے میرا تیرا اسلام ہے، میں خدا کے سچے دین اور اس کے پیغامِ حق کو نہیں چھوڑ سکتا، اور کسی حال بتوں کی پرستش نہیں کر سکتا میں آج سے تجھ سے جُدا ہوتا ہوں مگر غائبانہ تیرے لیے درگاہِ الٰہی میں بخشش طلب کرتا رہونگا تاکہ تجھ کو ہدایت نصیب ہو اور تو خدا کے عذاب سے نجات پالے۔

سورۂ مریم میں اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِبْرَاهِيمَ	اور (اے پیغمبر!) الکتاب میں ابراہیم کا ذکر کر یقیناً وہ مجسم سچائی
إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَّبِيًّا.	تھا اور اللہ کا نبی تھا۔
إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ يَا أَبَتِ لِمَ	اُس وقت کا ذکر، جب اُس نے اپنے باپ سے کہا "اے
تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ	میرے باپ! تو کیوں ایک ایسی چیز کی پوجا کرتا ہے جو نہ تو
وَلَا يُغْنِي عَنكَ شَيْئًا. يَا أَبَتِ	سُنتی ہے، نہ دیکھتی ہے، نہ تیرے کسی کام آسکتی ہے! اے
إِنِّي قَدْ جَاءَنِي مِنَ الْعِلْمِ	میرے باپ! میں سچ کہتا ہوں، علم کی ایک روشنی مجھ پر

مَا لَمْ يَأْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْ اَهْدِكَ — گئی ہے، جو تجھے نہیں ملی۔ پس میرے پیچھے چل، میں تجھے

صِرَاطًا سَوِيًّا ۔ يَآ اَبَتِ لَا — سیدھی راہ دکھاؤنگا۔ اے میرے باپ! شیطان کی بندگی

تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ اِنَّ الشَّيْطٰنَ — نہ کر۔ شیطان تو خدائے رحمان سے نافرمان ہو چکا۔ اے

كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا ۔ يَآ اَبَتِ — میرے باپ! میں ڈرتا ہوں، کہیں ایسا نہ ہو۔ خدائے

اِنِّيْ اَخَافُ اَنْ يَّمَسَّكَ — رحمٰن کی طرف سے کوئی عذاب تجھے گھیرے اور تو شیطان

عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ — کا ساتھی ہو جائے!" باپ نے (یہ باتیں سُن کر) کہا

فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا — "ابراہیم کیا تو میرے معبودوں سے پھر گیا ہے؟ یاد رکھ

قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ — اگر تو ایسی باتوں سے باز نہ آیا تو تجھے سنگسار کر کے

اٰلِهَتِيْ يٰٓاِبْرٰهِيْمُ لَئِنْ — چھوڑونگا۔ اپنی خیر چاہتا ہے تو جان سلامت لے کر

لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَ — مجھ سے الگ ہو جا" ابراہیم نے کہا "اچھا میرا سلام

اهْجُرْنِيْ مَلِيًّا ۔ قَالَ سَلٰمٌ — قبول ہو۔ (میں الگ ہو جاتا ہوں) اب میں اپنے

عَلَيْكَ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ — پروردگار سے تیری بخشش کی دعا کرونگا۔ وہ مجھ پر بڑا ہی

اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا ۔ وَاَعْتَزِلُكُمْ — مہربان ہے۔ میں نے تم سب کو چھوڑا، اور انہیں بھی

وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ — جنہیں تم اللہ کے سوا پکارا کرتے ہو۔ میں اپنے پروردگار کو

وَاَدْعُوْا رَبِّيْ عَسٰٓى اَلَّآ اَكُوْنَ — پکارتا ہوں۔ اُمید ہے، اپنے پروردگار کو پکار کے میں محروم

بِدُعَآءِ رَبِّيْ شَقِيًّا ۔ — (مریم) ثابت نہیں ہونگا!"

اور سورۂ انعام میں آزر کو حضرت ابراہیم کی نصیحت کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ — اور (وہ وقت یاد کرو) جب ابراہیم نے اپنے باپ آزر

اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً — سے کہا! "کیا ٹھہراتا ہے تو بتوں کو خدا، میں تجھ کو اور

اِنِّیْ اَرٰىكَ وَقَوْمَكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ (انعام) تیری قوم کو کھلی ہوئی گمراہی میں دیکھتا ہوں ۔

قوم کو دعوتِ اسلام اور اُس سے مناظرہ

باپ اور بیٹے کے درمیان جب اتفاق کی کوئی صورت نہ بنی اور آزر نے کسی طرح ابراہیم علیہ السلام کی رشد وہدایت کو قبول نہ کیا تو حضرت ابراہیم نے آزر سے جُدائی اختیار کرلی اور اپنی دعوتِ حق اور پیغامِ رسالت کو وسیع کردیا اور اب صرف آزر ہی مخاطب نہ رہا بلکہ پوری قوم کو مخاطب بنالیا۔ مگر قوم اپنے باپ دادا کے دین کو کب چھوڑنے والی تھی اُس نے ابراہیم (علیہ السلام) کی ایک نہ سُنی۔ اور دعوتِ حق کے سامنے اپنے باطل معبودوں کی طرح گونگے، اندھے اور بہرے بن گئے۔

اُن کے کان موجود تھے مگر حق کی آواز کے لیے بہرے تھے۔ پتلیاں آنکھوں کے حلقوں میں زندہ انسان کی آنکھوں کی طرح حرکت ضرور کرتی تھیں مگر حق کی بصارت سے محروم تھیں، زبان گویا ضرور تھی لیکن کلمۂ حق کے اعتبار سے گنگ تھی۔

لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ	اُن کے دل ہیں پر سمجھتے نہیں، اُن کے آنکھیں
اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ	ہیں پر دیکھتے نہیں اور اُن کے کان ہیں پر اُن سے
لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا اُولٰٓئِكَ	سُنتے نہیں، یہ چوپاؤں کی طرح ہیں بلکہ اُن سے
كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ اُولٰٓئِكَ	بھی زیادہ بے راہ ہیں۔ یہی ہیں جو غفلت میں
هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ۔ (الاعراف)	سرشار ہیں۔

اور جب ابراہیم (علیہ السلام) نے زیادہ زور دے کر پوچھا کہ یہ تو بتاؤ کہ جن کی تم پرستش کرتے ہو یہ تم کو کسی قسم کا بھی نفع یا نقصان پہنچاتے ہیں؟ تو کہنے لگے کہ ان باتوں کے جھگڑے میں ہم پڑنا نہیں چاہتے ہم تو یہ جانتے ہیں کہ ہمارے باپ دادا یہی کرتے چلے آئے ہیں لہذا ہم بھی وہی کر رہے ہیں۔ تب حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے ایک خاص انداز سے خدائے واحد کی ہستی کی جانب توجہ دلائی۔ فرمانے لگے۔ میں تو تمہارے اُن سب بتوں کو اپنا دشمن جانتا ہوں یعنی میں ان سے بے خوف وخطر ہو کر اُن سے اعلانِ جنگ

کرتاہوں کہ اگر یہ میرا کچھ بگاڑ سکتے ہیں تو اپنی حسرت نکال لیں۔

البتہ میں صرف اس ہستی کو اپنا مالک سمجھتا ہوں جو تمام جہانوں کی پروردگار ہے، جس نے مجھ کو پیدا کیا اور راہ ہدایت دکھائی، جو مجھ کو کھلاتا پلاتا یعنی رزق دیتا ہے، اور جب میں مریض ہو جاتا ہوں تو جو مجھ کو شفا بخشتا ہے، اور جو میری زیست و موت دونوں کا مالک ہے، اور اپنی خطا کاری کے وقت جس سے یہ طمع کرتا ہوں کہ وہ قیامت کے روز مجھ کو بخش دے، اور میں اُس کے حضور میں یہ دعا کرتا رہتا ہوں۔

اے میرے پروردگار تو مجھ کو صحیح فیصلہ کی قوت عطا کر اور مجھ کو نکوکاروں کی فہرست میں داخل کر اور مجھ کو زبان کی سچائی عطا کر اور جنتِ نعیم کے وارثوں میں شامل کر۔

نصیحت و موعظت کے اس موثر اندازِ خطابت کو جو حضرت ابراہیمؑ نے اپنے والد اور قوم کے سامنے پیش کیا سورہ شعراء میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ اِبْرٰهِيْمَ ۘ اِذْ قَالَ	اور سُنا دے اُن کو خبر ابراہیم کی، جب کہا اپنے
لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا تَعْبُدُوْنَ ۔ قَالُوْا	باپ کو اور اُس کی قوم کو تم کس کو پوجتے ہو۔ وہ بولے
نَعْبُدُ اَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا	ہم پوجتے ہیں مورتوں کو پھر سارے دن اُنہی کے
عٰكِفِيْنَ ۔ قَالَ هَلْ يَسْمَعُوْنَكُمْ	پاس لگے بیٹھے رہتے ہیں۔ کہا کچھ سُنتے ہیں تمہارا کہا
اِذْ تَدْعُوْنَ ۔ اَوْ يَنْفَعُوْنَكُمْ اَوْ	جب تم پکارتے ہو، یا کچھ بھلا کرتے ہیں تمہارا یا بُرا
يَضُرُّوْنَ ۔ قَالُوْا بَلْ وَجَدْنَا	بولے نہیں، پر ہم نے پایا اپنے باپ دادوں کو
اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ۔ قَالَ	یہی کام کرتے۔ کہا بھلا دیکھتے ہو جن کو پوجتے رہے
اَفَرَءَيْتُمْ مَّا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ۙ اَنْتُمْ	ہو، تم اور تمہارے باپ دادے اگلے۔ سو وہ
وَاٰبَآؤُكُمُ الْاَقْدَمُوْنَ ۙ فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ	میرے دشمن ہیں مگر جہان کا رب جس نے
لِّيْٓ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ الَّذِيْ خَلَقَنِيْ	مجھ کو بنایا سو وہی مجھ کو راہ دکھلاتا ہے۔

فَهُوَ يَهْدِيْنِ ۝ وَالَّذِيْ هُوَ يُطْعِمُنِيْ — اور وہ جو مجھ کو کھلاتا ہے اور پلاتا ہے۔ اور جب

وَيَسْقِيْنِ ۝ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ ۝ — میں بیمار ہوں تو وہی شفا دیتا ہے۔ اور وہ

وَالَّذِيْ يُمِيْتُنِيْ ثُمَّ يُحْيِيْنِ ۝ وَالَّذِيْٓ — جو مجھ کو ماریگا اور پھر جلائیگا۔ اور جس سے مجھ کو

اَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لِيْ خَطِيْٓئَتِيْ يَوْمَ الدِّيْنِ ۝ — توقع ہے کہ بخشے میری تقصیر انصاف کے دن

رَبِّ هَبْ لِيْ حُكْمًا وَّاَلْحِقْنِيْ — اے میرے رب دے مجھ کو حکم اور ملا مجھ کو

بِالصّٰلِحِيْنَ ۝ وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ — نیکوں میں۔ اور رکھ میرا بول سچا

صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ ۝ وَاجْعَلْنِيْ مِنْ — پچھلوں میں۔ اور کر مجھ کو وارثوں میں نعمت

وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيْمِ ۝ وَاغْفِرْ لِاَبِيْٓ اِنَّهٗ — کے باغ کے۔ اور معاف کر میرے باپ کو

كَانَ مِنَ الضَّآلِّيْنَ ۝ وَلَا تُخْزِنِيْ — وہ ہے راہ بھولے ہوؤں میں۔ اور رسوا نہ کر مجھ کو

يَوْمَ يُبْعَثُوْنَ ۔ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ — جس دن سب جی کر اٹھیں۔ جس دن نہ کام آئے

وَّلَا بَنُوْنَ ۝ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ — کوئی مال اور نہ بیٹے۔ مگر جو کوئی آیا اللہ کے پاس

سَلِيْمٍ ۝ (شعراء) — لے کر بے روگ دل۔

مگر آزر اور قوم آزر کے دل کسی طرح قبول حق کے لیے نرم نہ ہوئے اور اُن کا انکار اور جحود حد سے گذرتا ہی رہا۔

گذشتہ سطور میں یہ ذکر ہو چکا ہے کہ حضرت ابراہیم کی قوم بت پرستی کے ساتھ ساتھ کواکب پرستی بھی کرتی تھی، اور اُن کا یہ عقیدہ تھا کہ انسانوں کی موت وحیات، اُن کا رزق، اُن کا نفع وضرر، خشک سالی اور قحط سالی، فتح وظفر اور شکست وہزیمت غرض تمام کارخانۂ عالم کا نظم ونسق کواکب اور اُن کی حرکات کی تاثیر پر چل رہا ہے۔ اور یہ تاثیر اُن کے ذاتی اوصاف میں سے ہے اس لیے اُن کی خوشنودی ضروری ہے اور یہ اُن کی پرستش کے بغیر ممکن نہیں۔

اس لیے حضرت ابراہیمؑ نے جس طرح اُن کو اُن کے سفلی معبودانِ باطل کی حقیقت وانکشاف کر کے راہِ حق کی طرف دعوت دی اسی طرح ضروری سمجھا کہ ان کے علوی معبودانِ باطل کی بے ثباتی اور فنا کے منظر کو پیش کر کے اس حقیقت سے بھی آگاہ کر دیں کہ تمہارا یہ خیال قطعاً غلط ہے کہ ان چمکتے ہوئے ستاروں چاند اور سورج کو خدائی طاقت حاصل ہے۔ ہرگز نہیں۔ یہ خیالِ خام اور باطل عقیدہ ہے۔ مگر یہ باطل پرست اپنے خود ساختہ اصنام سے اس قدر خائف تھے کہ اُن کو بُرا کہنے والے کے لیے ہر آن یہ تصور کرتے تھے کہ وہ ان کے غضب میں آکر برباد و تباہ ہو جائیگا تو ایسے اوہام پرستوں کے دلوں میں بلند ستاروں کی پرستش کے خلاف جذبہ پیدا کرنا کچھ آسان کام نہ تھا۔ اس لیے "مجددِ انبیاء" ابراہیمؑ (علیہ السلام) نے اُن کے دماغوں کے مناسب ایک عجیب اور دلچسپ پیرایۂ بیان اختیار فرمایا۔

تاروں بھری رات تھی، ایک ستارہ خوب روشن تھا حضرت ابراہیمؑ (علیہ السلام) نے اُس کو دیکھ کر فرمایا "میرا رب یہ ہے؟" اس لیے کہ اگر ستارے ربوبیت کر سکتے ہیں تو یہ ان سب میں ممتاز اور روشن ہے لیکن جب وہ اپنے وقتِ مقررہ پر نظر سے اوجھل ہو گیا، اور اُس کو یہ مجال نہ ہوئی کہ اپنے پرستاروں کے لیے ایک گھڑی اور رونمائی کر سکتا اور نظامِ کائنات سے منحرف ہو کر اپنے پوجنے والوں کے لیے زیارتگاہ بنا رہتا۔ تب حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا "میں چھپ جانے والے کو پسند نہیں کرتا" یعنی جس شے پر مجھ سے بھی زیادہ تغیرات کا اثر پڑتا ہو، اور جو جلد جلد اُن اثرات کو قبول کر لیتا ہو وہ میرا معبود کیونکر ہو سکتا ہے۔

مگر اب دیکھا کہ چاند[1] آب و تاب کے ساتھ سامنے موجود ہے، اُس کو دیکھ کر فرمایا "یہ میرا رب ہے؟" اس لیے کہ یہ تو خوب روشن ہے اور اپنی خنک روشنی سے سارے عالم کو بقعۂ نور

---

[1] قرآنِ عزیز نے یہ تصریح نہیں کی کہ ابراہیم علیہ السلام کی یہ گفتگو متعدد راتوں کا نتیجہ ہے یا ایک ہی شب کا اگر ایک ہی شب کا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایسی رات کا واقعہ ہے جبکہ چاند کچھ رات گئے نکلتا ہے۔

بنائے ہوئے ہے، پس اگر کواکب کو رب بنانا ہی ہے تو اسی کو کیوں نہ بنایا جائے، کیونکہ یہی اس کا زیادہ مستحق نظر آتا ہے۔

اب سحر کا وقت ہونے لگا تو قمر کے بھی ماند پڑ جانے اور روپوش ہو جانے کا وقت آپہنچا اور جس قدر طلوع آفتاب کا وقت قریب ہوتا گیا چاند کا جسم دیکھنے والوں کی آنکھوں سے اوجھل ہونے لگا تو یہ دیکھ کر ابراہیم علیہ السلام نے ایک ایسا جملہ فرمایا جس سے چاند کے رب ہونے کی نفی کے ساتھ ساتھ خدائے واحد کی ہستی کی جانب قوم کی توجہ اس خاموشی کے ساتھ پھیر دی جائے کہ قوم اس کا احساس بھی نہ کر سکے اور اس گفتگو کا جو مقصدِ وحید ہے "یعنی صرف خدائے واحد پر ایمان" وہ اُن کے دلوں میں بغیر قصد و ارادہ کے پیوست ہو جائے۔ فرمایا "اگر میرا حقیقی پروردگار میری راہنمائی نہ کرتا تو میں بھی ضرور گمراہ قوم ہی میں سے ایک ہوتا"

پس اس قدر فرمایا اور خاموش ہو گئے اس لیے کہ ابھی اس سلسلہ کی ایک کڑی اور باقی ہے اور قوم کے پاس ابھی مقابلہ کے لیے ایک ہتھیار موجود ہے۔ اس لیے اس سے زیادہ کہنا مناسب نہیں تھا۔

تاروں بھری رات ختم ہوئی، چمکتے ستارے اور چاند سب نظر سے اوجھل ہو گئے، کیوں؟ اس لیے کہ اب آفتابِ عالمتاب کا رُخِ روشن سامنے آ رہا ہے، دن نکل آیا اور وہ پوری آب و تاب سے چمکنے دمکنے لگا۔

ابراہیم علیہ السلام نے اُس کو دیکھ کر فرمایا "یہ ہے میرا رب کیونکہ یہ کواکب میں سب سے بڑا ہے اور نظامِ فلکی میں اس سے بڑا ستارہ ہمارے سامنے دوسرا نہیں ہے" لیکن دن بھر چمکنے اور روشن رہنے اور تمام عالم کو روشن کرنے کے بعد وقتِ مقررہ پر اُس نے بھی عراق کی سرزمین سے پہلو بچانا شروع کر دیا اور شبِ دیجور آہستہ آہستہ سامنے آنے لگی اور آخر کار وہ نظروں سے غائب ہو گیا۔

تواب وقت آپہنچا کہ ابراہیم علیہ السلام اصل حقیقت کا اعلان کردیں اور قوم کو لاجواب بنا دیں کہ اُن کے عقیدہ کے مطابق اگران کواکب کو ربوبیت اور معبودیت حاصل ہے تو اس کی کیا وجہ کہ ہم سے بھی زیادہ ان میں تغیرات نمایاں ہیں اور یہ جلد جلد اُن کے اثرات سے متاثر ہوتے ہیں اور اگر یہ معبود ہیں تو ان میں "افول" کیوں ہے، جس طرح چمکتے نظر آتے تھے اُسی طرح کیوں چمکتے نہ رہے، چھوٹے ستاروں کی روشنی کو ماہتاب نے کیوں ماند کردیا، اور ماہتاب کے رُخ روشن کو آفتاب کے نور نے کس لیے بے نور بنا دیا۔

پس اے قوم میں ان مشرکانہ عقائد سے بری ہوں، اور شرک اور شرک کی زندگی سے بیزار، بلاشبہ میں نے اپنا رُخ صرف اسی ایک خدا کی جانب کرلیا ہے جو آسمانوں اور زمینوں کا خالق ہے میں "حنیف" ہوں اور "مشرک" نہیں ہوں۔

اب قوم سمجھی کہ یہ کیا ہوا، ابراہیم (علیہ السلام) نے ہمارے تمام ہتھیار بیکار اور ہمارے تمام دلائل پامال کردیے۔ اب ہم ابراہیم (علیہ السلام) کے اس مضبوط و محکم بُرہان کا کس طرح رد کریں اور اس کی روشن دلیل کا کیا جواب دیں؟ وہ اس کے لیے بالکل عاجز و درماندہ تھے اور جب کوئی بس نہ چلا تو قائل ہونے، اور صدائے حق کو قبول کرلینے کے بجائے ابراہیمؑ سے جھگڑنے اور اپنے معبودانِ باطل سے ڈرانے لگے کہ وہ تیری توہین کا تجھ سے ضرور انتقام لینگے اور تجھ کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑیگا۔

حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے فرمایا کیا تم مجھ سے جھگڑتے، اور اپنے بتوں سے مجھ کو ڈراتے ہو، حالانکہ خدائے تعالیٰ نے مجھ کو صحیح راہ دکھا دی ہے اور تمہارے پاس گمراہی کے سوا کچھ نہیں۔ مجھے تمہارے بتوں کی مطلق کوئی پرواہ نہیں، جو کچھ میرا رب چاہیگا وہی ہوگا تمہارے بُت کچھ بھی نہیں کرسکتے کیا تم کو ان باتوں سے کوئی نصیحت حاصل نہیں ہوتی؟ تم کو تو خدا کی نافرمانی کرنے اور اس کے ساتھ بتوں کو شریک ٹھہرانے میں بھی کوئی خوف نہیں آتا جس کے لیے تمہارے پاس ایک دلیل بھی نہیں ہے۔

اور مجھ سے یہ توقع رکھتے ہو کہ خدائے واحد کا ماننے والا، اور امنِ عالم کا ذمہ دار ہو کر میں تمہارے بتوں سے ڈر جاؤنگا، کاش کہ تم سمجھتے کہ کون مفسد ہے اور کون مصلح و امن پسند؟

صحیح امن کی زندگی اُسی شخص کو حاصل ہے جو خدائے واحد پر ایمان رکھتا اور شرک سے بیزار رہتا ہے اور وہی راہیاب ہے۔

بہرحال اللہ تعالیٰ کی یہ وہ عظیم الشان حجت تھی جو اُس نے ابراہیم (علیہ السلام) کی زبان سے بت پرستی کے خلاف ہدایت و تبلیغ کے بعد کواکب پرستی کے رد میں ظاہر فرمائی، اور اُن کی قوم کے مقابلہ میں اُن کو روشن دلائل و براہین کے ساتھ سربلندی عطا فرمائی۔

اس سلسلہ میں سورۂ انعام کی یہ آیات شاہد عادل ہیں۔

وَكَذَٰلِكَ نُرِيٓ إِبْرَٰهِيمَ مَلَكُوتَ السَّمَٰوَٰتِ وَالْأَرْضِ وَلِيَكُونَ مِنَ الْمُوقِنِينَ. فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَءَا كَوْكَبًا ۖ قَالَ هَٰذَا رَبِّي ۖ فَلَمَّآ أَفَلَ قَالَ لَآ أُحِبُّ الْأَٰفِلِينَ. فَلَمَّا رَءَا الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هَٰذَا رَبِّي ۖ فَلَمَّآ أَفَلَ قَالَ لَئِن لَّمْ يَهْدِنِي رَبِّي لَأَكُونَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّينَ. فَلَمَّا رَءَا الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هَٰذَا رَبِّي هَٰذَآ أَكْبَرُ ۖ فَلَمَّآ	اور اسی طرح ہم نے ابراہیم کو آسمانوں کی اور زمین کی بادشاہت کے جلوے دکھا دیے، تاکہ وہ یقین رکھنے والوں میں سے ہو جائے۔ پھر (دیکھو) جب ایسا ہوا کہ اُس پر رات کی تاریکی چھا گئی، تو اُس نے (آسمان پر) ایک کوکب (چمکتا ہوا) دیکھا۔ اُس نے کہا "یہ میرا پروردگار ہے" (کہ سب لوگ اس کی پرستش کرتے ہیں) لیکن جب وہ ڈوب گیا، تو کہا "نہیں، میں اُنہیں پسند نہیں کرتا جو ڈوب جانے والے ہیں" (یعنی طلوع و غروب ہوتے رہتے ہیں) پھر جب ایسا ہوا کہ چاند چمکتا ہوا نکل آیا، تو ابراہیم نے کہا، "یہ میرا پروردگار ہے" لیکن جب وہ بھی ڈوب گیا، تو کہا "اگر میرے پروردگار نے مجھے راہ نہ دکھائی ہوتی تو میں ضرور اُسی گروہ میں سے ہو جاتا جو راہ راست سے بھٹک گیا ہے!" پھر جب صبح ہوئی اور سورج

اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ
مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۔ اِنِّيْ وَجَّهْتُ
وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ
الْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ
الْمُشْرِكِيْنَ ۚ وَحَآجَّهٗ قَوْمُهٗ
قَالَ اَتُحَآجُّوْٓنِّيْ فِي اللّٰهِ وَقَدْ
هَدٰىنِ ۭ وَلَآ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ
بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّشَاۗءَ رَبِّيْ شَيْـًٔا ۭ
وَسِعَ رَبِّيْ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ۭ اَفَلَا
تَتَذَكَّرُوْنَ ۔ وَكَيْفَ اَخَافُ
مَآ اَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ
اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ
عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا ۭ فَاَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ
اَحَقُّ بِالْاَمْنِ ۚ اِنْ كُنْتُمْ
تَعْلَمُوْنَ ۔ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ
يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰۗىِٕكَ
لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۔
وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ
عَلٰي قَوْمِهٖ ۭ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ

چمکتا ہوا طلوع ہوا تو ابراہیم نے کہا "یہ میرا پروردگار ہے کہ یہ
سب سے بڑا ہے" لیکن جب وہ بھی غروب ہوگیا، تو اُس نے کہا
"اے میری قوم! تم جو کچھ خدا کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہو، میں اُس
سے بیزار ہوں۔ میں نے تو ہر طرف سے مُنہ موڑ کر، صرف اُسی
ہستی کی طرف اپنا رُخ کرلیا ہے جو (کسی کی بنائی ہوئی نہیں،
بلکہ) آسمان و زمین کی بنانے والی ہے (اور جس کے حکم و قانون
پر تمام آسمانی اور ارضی مخلوقات چل رہی ہیں)، اور میں اُن میں سے
نہیں جو اُس کے ساتھ شریک ٹھہرانے والے ہیں!" اور (پھر) ابراہیم
سے اُس کی قوم نے ردّ و کد کی۔ ابراہیم نے کہا "کیا تم مجھ سے اللہ
کے بارے میں ردّ و کد کرتے ہو، حالانکہ اُس نے مجھ راہِ حق دکھادی
ہے۔ جنہیں تم نے خدا کا شریک ٹھہرالیا ہے، میں اُن سے نہیں ڈرتا۔
میں جانتا ہوں کہ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ مگر یہ کہ میرا
پروردگار ہی مجھ نقصان پہنچانا چاہے۔ میرا پروردگار اپنے علم سے
تمام چیزوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ پھر کیا تم نصیحت نہیں پکڑتے؟"
"اور (دیکھو)، میں اُن ہستیوں سے کیونکر ڈر سکتا ہوں جنہیں تم نے خدا
کا شریک ٹھہرالیا ہے، جبکہ تم اس بات سے نہیں ڈرتے کہ خدا کے ساتھ
دوسروں کو شریک ٹھہراؤ جن کے لیے اُس نے کوئی سند و دلیل
تم پر نہیں اُتاری؟ تبلاؤ ہم دونوں فریقوں میں سے کس کی راہ امن
کی راہ ہوئی اگر علم و بصیرت رکھتے ہو؟" جن لوگوں نے خدا کو مانا، اور

نَّشَآءُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيۡمٌ عَلِيۡمٌ (انعام)

اور اپنے ماننے کو ظلم سے (یعنی شرک سے) آلودہ نہیں کیا، تو اُنہی کے لیے امن ہے، اور وہی ٹھیک راستے پر ہیں!" اور (دیکھو) یہ ہماری حجت ہے جو ہم نے ابراہیم کو اُس کی قوم پر دی تھی۔ ہم جسکو مرتبے بلند کرنا چاہتے ہیں (اُسی علم و دلیل کا عرفان دیکر) بلند کر دیتے ہیں اور یقیناً تمہارا پروردگار حکمت والا، علم رکھنے والا ہے۔

آیات کی تفسیر میں قولِ فیصل

اس بارہ میں کلی اتفاق کے باوجود کہ ابراہیم (علیہ السلام) نے کبھی کواکب پرستی نہیں کی اور اُن کی تمام زندگی شرک کی تلوثیات سے پاک ہے۔ سورۂ انعام کی مسطورۂ بالا آیات کی تفسیر میں علماء کے مختلف اقوال ہیں۔ ان آیات کی تمہید میں جو کچھ لکھا گیا وہ اُن اقوال میں سے ایک قول کے مطابق ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی یہ گفتگو قوم کی کواکب پرستی کے رد میں اُس کو لاجواب کرنے کے لیے تھی اِس لیے کہ جب دو فریق کسی مسئلہ میں اختلاف کر بیٹھتے ہیں تو احقاقِ حق کے لیے مناظرانہ دلائل میں سے دلیل کا ایک یہ بھی طریقہ ہے کہ اپنے دعوے کے ثبوت میں صرف نظریوں اور تھیوریز سے کام نہ لیا جائے بلکہ مشاہدہ اور معائنہ کی ایسی راہ اختیار کی جائے کہ مخالف اُس کے دعوے کے مقابلہ میں لاجواب ہو جائے اور اُس کی دلیل کے رد کرنے کی تمام راہیں اُس کے سامنے بند ہو جائیں۔ اب اگر اُس میں سلامت روی باقی ہے اور اُس کے قلب میں قبولِ حق کی گنجائش ہے تو وہ اُس کو قبول کر لیتا ہے ورنہ بے دلیل لڑنے اور جھگڑنے پر آمادہ ہو جاتا ہے، پس اس طرح حق و باطل میں امتیاز ہو جاتا ہے اور اصلی اور حقیقی بات نکھر کر صاف ہو جاتی ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام جلیل القدر پیغمبر ہیں اس لیے اُن کی تبلیغ کا مشن منطقی صغریٰ کبریٰ پر قائم نہ تھا بلکہ حقیقت کو فطری دلائل کی سادگی کے ساتھ واضح کرنا ہی اُن کا طغرائے امتیاز تھا۔ اس لیے اُنہوں نے یہی راستہ اختیار کیا اور قوم پر واضح کر دیا کہ کواکب خواہ شمس و قمر ہی کیوں نہ ہوں رب کہلانے

کے قابل نہیں ہیں بلکہ ربوبیت صرف اُسی کو زیبا ہے جو رب العٰلمین ہے اور ارضی وسماوی، سفلی و علوی کل کائنات کا خالق و مالک ہے، اور چونکہ قوم کے پاس اُس کی بہترین دلیل کا کوئی جواب نہ تھا اس لیے وہ زچ ہوئی اور امرِ حق کو قبول کرنے کی بجائے لڑنے جھگڑنے پر آمادہ ہوگئی، مگر اُس کے ضمیر کو ماننا پڑا کہ یہ جو کچھ کہا گیا حق ہے اور ہمارے پاس اس کا کوئی صحیح جواب نہیں ہے۔ یہی حضرت ابراہیمؑ کا مقصد تھا اور اُن کے ادائے فرض کی حد یہیں تک تھی کیونکہ دل چیر کر حق کو اُس میں اُتار دینا ان کی طاقت سے باہر تھا۔

اس تفسیر کے مطابق قرآنِ عزیز کی ان آیات میں نہ تاویل کی ضرورت باقی رہتی ہے اور نہ مقدرات ماننے کی، نیز مشاہدۂ کواکب سے متعلق آیات کا سیاق و سباق بھی بے تکلف اسی کی تائید کرتا ہے۔ مثلاً اس سلسلہ کی پہلی دو آیات یہ ہیں:۔

اذ قال ابراھیم لابیہ اٰزر	جب کہا ابراہیم نے اپنے باپ آزر سے کیا تو بناتا ہے
اتتخذ اصناما اٰلھۃ انی اراک	بتوں کو خدا، میں تجھ کو اور تیری قوم کو کھلی ہوئی گمراہی
وقومک فی ضلٰل مبین ۔	میں دیکھتا ہوں۔ اور اسی طرح ہم نے ابراہیم
وکذٰلک نری ابراھیم ملکوت	کو آسمانوں اور زمینوں کی سلطنت کا مشاہدہ کرا
السمٰوٰت والارض ولیکون من الموقنین	دیا اور تاکہ وہ یقین کرنے والوں میں سے ہو جائے۔

اِن ہر دو آیات سے حسب ذیل نتائج ظاہر ہوتے ہیں۔

(۱) رویتِ کواکب کا یہ معاملہ ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ایسے زمانہ میں پیش آیا ہے جبکہ وہ اپنے والد اور قوم کے ساتھ تبلیغ حق کے مناظرہ میں مصروف تھے۔ اس لیے کہ پہلی آیت کے بعد دوسری آیت کو "وکذٰلک" کہہ کر شروع کرنا یہی معنی رکھتا ہے پھر تیسری آیت کے شروع میں فلمّا کی "ف" یہ ظاہر کرتی ہے کہ یہ دوسری آیت سے وابستہ ہے، اور اس طرح ان تینوں آیات کا سلسلہ ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو جس طرح اصنام پرستی کے مقابلہ میں روشن دلائل عطا فرمائے تھے تاکہ وہ آزر اور قوم کو لاجواب کر سکیں اور راہِ ہدایت دکھائیں۔ اسی طرح کواکب پرستی کے مقابلہ میں بھی اُس نے حضرت ابراہیم کو آسمانوں اور زمینوں کی سلطنت کا مشاہدہ کرا دیا تاکہ وہ ان سب مخلوق کی حقیقت سے آگاہ ہو جائیں اور اُن کو حق الیقین کا درجہ حاصل ہو جائے، اور پھر وہ کواکب پرستی کے رد میں بھی بہترین دلائل دے سکیں اور اس سلسلہ میں بھی قوم کو حق کی راہ دکھلا کر اُن کی غلط روش کے متعلق لاجواب بنا سکیں۔ یہ تو آیاتِ رویت کا سیاق تھا اب سیاق قابل توجہ ہے۔

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آخر میں آفتاب پر نظر فرمائی اور پھر وہ بھی نظروں سے غائب ہونے لگا تو اسی آیت میں یہ جملہ موجود نظر آتا ہے۔

قَالَ یٰقَوْمِ اِنِّی بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِکُوْنَ — ابراہیم نے کہا "اے قوم میں شرک کرنے والوں سے بری ہوں"

اور ساتھ ہی یہ آیت مذکور ہے :-

اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ۔ — بلاشبہ میں نے اپنا رخ صرف اُس خدا کی جانب پھیر دیا ہے جو آسمانوں اور زمین کا مالک ہے۔ اس حالت میں کہ میں حنیف ہوں اور مشرک نہیں ہوں۔

اور پھر اسی کے متصل آیت میں ہے :-

وَحَآجَّہٗ قَوْمُہٗ قَالَ اَتُحَآجُّوْنِّیْ فِی اللّٰہِ — اور ابراہیم کی قوم نے اُس سے جھگڑنا شروع کیا ابراہیم نے کہا کیا تو مجھ سے اللہ کے بارہ میں جھگڑتی ہے۔

اور سب سے آخر آیت میں کہا گیا ہے۔

وَتِلْکَ حُجَّتُنَآ اٰتَیْنٰھَآ اِبْرٰھِیْمَ عَلٰی قَوْمِہٖ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ — اور یہ ہماری دلیل ہے جو ہم نے ابراہیم کو اُس قوم کے مقابلہ میں عطا کی، ہم جس کا درجہ بلند کرنا چاہتے ہیں کر دیا کرتے

اِنَّ ربّكَ حكيمٌ عليم ۔ یقیناً تیرا رب دانا ہی جاننے والا ہے۔

ان آیات سے یہ نتائج اخذ ہوتے ہیں ۔

(۱) رویتِ کواکب کا معاملہ قوم سے ضرور وابستہ تھا تب ہی تیسری مرتبہ میں ابراہیم علیہ السلام نے اپنی ذات سے خطاب کرنے کے بجائے فوراً قوم سے خطاب شروع کر دیا۔

(۲) اور قوم نے بھی یہ سب کچھ سُن کر دلیل کا جواب دلیل سے دینے کی بجائے ابراہیم (علیہ السلام) سے لڑنا جھگڑنا شروع کر دیا۔

(۳) اللہ تعالیٰ نے ابراہیم (علیہ السلام) کی اس گفتگو کو قوم کے مقابلہ میں اپنی جانب سے حجت قرار دیا اور بتایا کہ ابراہیم (علیہ السلام) کا رُتبۂ رسالت بہت بلند اور ارفع ہے اور اس لیے اُس کی قوم اُس کی رہنمائی کی سخت محتاج ہے۔ اور ان سب کے علاوہ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کے متعلق یہ بھی ارشاد فرمایا ہے

ولقد آتینا ابرٰھیم رُشدہٗ من قبلُ وکنّا بہٖ عالمین ۔ اور بلاشبہ ہم نے ابراہیم کو پہلے ہی سے ہدایت عطا کر دی تھی اور ہم ہی اُس کے واقف کار ہیں ۔

لہٰذا یہ معاملہ حضرت ابراہیم کے نہ لڑکپن کا ہو سکتا ہے اور نہ اُن کے اپنے عقیدہ اور ایمان کا ۔

اس تفصیل سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہماری بیان کردہ تفسیر ہی آیات کی صحیح تفسیر ہے اور بلاشبہ ابراہیم علیہ السلام کی جانب سے قوم پر یہ زبردست حجت تھی کہ افرادِ قوم کا کواکب کی پرستش کرنا، اُن کے لیے ہیکل بنانا اپنے سفلی معبودوں کے نام اُن کے نام پر رکھنا، غرض اُن کو معبود، رب، اور خدا سمجھنا قطعاً باطل اور گمراہی ہے۔ اس لیے کہ یہ سب ایک خاص نظام میں جکڑے ہوئے ہیں، دن اور رات کے تغیر کے ساتھ تغیرات کو قبول کرنے والے ہیں، اور اس پورے نظام کی مالک و خالق صرف وہی ہستی ہے جس کے یدِ قدرت میں ان سب کی تسخیر ہے۔ اور وہ "اللہ" ہے ۔

لَا الشَّمۡسُ یَنۡۢبَغِیۡ لَهَاۤ اَنۡ تُدۡرِكَ — نہ سورج کی یہ مجال ہے کہ وہ قمر کو پاسکے اور نہ رات میں

الۡقَمَرَ وَلَا الَّیۡلُ سَابِقُ النَّهَارِ — یہ قدرت کہ وہ دن کو پیچھے ہٹا کر اُس کی جگہ خود لے لے۔

ان تمام روشن دلائل و براہین کے بعد بھی جب قوم نے دعوتِ اسلام کو قبول نہ کیا اور اصنام پرستی وکواکب پرستی میں اُسی طرح مبتلا رہی تو حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے ایکدن جمہور کے سامنے اعلانِ جنگ کر دیا کہ میں تمہارے ان بتوں کے متعلق ایک ایسی چال چلونگا جو تم کو زچ کر کے ہی چھوڑیگی۔

وَتَاللّٰهِ لَاَكِیۡدَنَّ اَصۡنَامَكُمۡ بَعۡدَ — اور اللہ کی قسم میں تمہاری عدم موجودگی میں ضرور تمہارے

اَنۡ تُوَلُّوۡا مُدۡبِرِیۡنَ۔ (انبیاء) — بتوں کے ساتھ خفیہ چال چلونگا۔

اس معاملہ سے متعلق اصل صورتِ حال یہ ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام نے آزر اور قوم کے جمہور کو ہر طرح بت پرستی کے معائب ظاہر کرکے باز رکھنے کی سعی کرلی۔ اور ہر قسم کے پند و نصائح کے ذریعہ اُن کو یہ باور کرانے میں قوت صرف کر دی کہ یہ بُت نہ نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان اور تمہارے کاہنوں اور پیشواؤں نے ان کے متعلق تمہارے دلوں میں غلط خوف بٹھا دیا ہے کہ اگر تم ان سے منکر ہو جاؤگے تو یہ تم پر غضبناک ہو کر تم کو تباہ کر ڈالینگے۔ یہ تو اپنی آئی ہوئی مصیبت کو بھی نہیں ٹال سکتے۔ مگر اُن پر مطلق اثر نہ ہوا اور وہ اپنے دیوتاؤں کی خدائی قوت کے عقیدہ سے کسی طرح باز نہ آئے بلکہ اُن کے کاہنوں اور سرداروں نے اُن کو اور زیادہ پختہ کر دیا اور ابراہیم علیہ السلام کی نصیحت پر کان دھرنے سے سختی کے ساتھ روک دیا۔ تب حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے سوچا کہ اب مجھ کو رشد و ہدایت کا ایسا پہلو اختیار کرنا چاہیے جس سے جمہور کو یہ مشاہدہ ہو جائے کہ واقعی ہمارے دیوتا صرف لکڑیوں اور پتھروں کی مورتیاں ہیں جو گونگی بھی ہیں اور بہری بھی ہیں اور اندھی بھی اور اُن کو یہ یقین ہو جائے کہ اب تک ان کے متعلق ہمارے کاہنوں اور سرداروں نے جو کچھ کہا تھا وہ بالکل غلط اور بے سرو پا بات تھی اور ابراہیم ہی کی بات سچی ہے۔ اگر ایسی کوئی صورت بن آئی تو پھر میرے لیے تبلیغ حق کے لیے آسان راہ نکل آئیگی۔ یہ

سوچ کر انہوں نے ایک نظامِ عمل تیار کیا جس کو کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیا، اور اُس کی ابتدا اس طرح کی کہ باتوں باتوں میں اپنی قوم کے افراد سے یہ کہہ گذرے کہ "میں تمہارے بتوں کے ساتھ ایک خفیہ چال چلونگا"، گویا اس طرح اُن کو متنبہ کرنا تھا کہ اگر تمہارے دیوتاؤں میں کچھ قدرت ہے جیسا کہ تم دعویٰ کرتے ہو تو وہ میری چال کو باطل اور مجھ کو مجبور کردیں کہ میں ایسا نہ کرسکوں" مگر چونکہ بات صاف نہ تھی اس لیے قوم نے اس جانب کچھ توجہ نہ کی، حُسنِ اتفاق کہ قریب ہی زمانہ میں قوم کا ایک مذہبی میلہ پیش آگیا، جب سب اس کے لیے چلنے لگے تو کچھ لوگوں نے ابراہیم علیہ السلام سے بھی اصرار کیا کہ وہ بھی ساتھ چلیں حضرتِ ابراہیم نے اوّل انکار فرمایا اور جب اُس جانب سے اصرار بڑھنے لگا تو ستاروں کی جانب نگاہ اُٹھائی اور فرمانے لگے "انی سقیم" میں آج کچھ علیل سا ہوں" چونکہ ابراہیم علیہ السلام کی قوم کو کواکب پرستی کی وجہ سے نجوم میں کمال تھا اس لیے اپنے عقیدہ کے لحاظ سے وہ یہ سمجھے کہ ابراہیم علیہ السلام کسی نحس ستارہ کے اثرِ بد میں مبتلا ہیں اور یہ سمجھ کر بغیر کسی تشریحِ حال کے ابراہیم علیہ السلام کو چھوڑ کر میلہ میں چلے گئے۔

فنظر نظرۃ فی النجوم . فقال انی سقیم . فتولوا عنہ مدبرین . (الصافات)

پس (ابراہیم نے) ایک نگاہ اُٹھا کر ستاروں کی جانب دیکھا، اور کہنے لگا میں کچھ علیل ہوں۔ پس وہ اُس کو چھوڑ کر چلے گئے۔

اب جبکہ ساری قوم، بادشاہ، کاہن، اور مذہبی پیشوا میلہ میں مصروف اور شراب و کباب میں مشغول تھے تو حضرتِ ابراہیم علیہ السلام نے سوچا کہ وقت آگیا ہے کہ اپنے نظامِ عمل کی تکمیل کروں اور مشاہدہ کی صورت میں جمہور پر واضح کروں کہ اُن کے دیوتاؤں کی حقیقت کیا ہے۔ وہ اُٹھے اور سب سے بڑے دیوتا کے مندر (ہیکل) میں پہنچے۔ دیکھا تو وہاں دیوتاؤں کے سامنے قسم قسم کے حلووں، پھلوں، میووں اور مٹھائیوں کے چڑھاوے رکھے تھے۔ ابراہیم علیہ السلام نے طنزیہ لہجہ میں چپکے چپکے اُن مورتیوں سے

خطاب کرکے کہا کہ یہ سب کچھ موجود ہے ان کو کھاتے کیوں نہیں؟ اور پھر کہنے لگے میں بات کر رہا ہوں کیا بات ہے کہ تم جواب نہیں دیتے؟ اور پھر اُن سب کو توڑ پھوڑ ڈالا اور سب سے بڑے بت کے کاندھے پر تبر رکھ کر واپس چلے گئے۔

فراغ إلیٰ الهتهم فقال الا تاکلون. — پس چپکے چپکے کہنے لگا (ابراہیم) اُن کے دیوتاؤں

مالکم لا تنطقون . فراغ علیهم ضربا — سے کیوں نہیں کھاتے، تم کو کیا ہو گیا کیوں نہیں بولتے؟

بالیمین . (الصافات) — پھر اپنے داہنے ہاتھ سے اُن سب کو توڑ ڈالا۔

فجعلهم جذاذاً الا کبیراً لهم — پس کر دیا اُن کو ٹکڑے ٹکڑے مگر اُن میں سے بڑے دیوتا

لعلهم الیه یرجعون . — کو چھوڑ دیا تاکہ (اپنے عقیدہ کے مطابق) وہ اُس کی طرف

(انبیاء) — رجوع کریں (کہ یہ کیا ہو گیا)

جب لوگ میلہ سے واپس آئے تو ہیکل (مندر) میں بتوں کا یہ حال پایا سخت برہم ہوئے۔ اور ایک دوسرے سے دریافت کرنے لگے کہ یہ کیا ہوا اور کس نے کیا؟ اُن میں وہ بھی تھے جن کے سامنے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) تاللہ لاکیدن اصنامکم کہہ چکے تھے، اُنھوں نے فوراً کہا کہ اُس شخص کا کام ہے جس کا نام ابراہیم ہے۔ وہی ہمارے دیوتاؤں کا دشمن ہے۔

قالوا من فعل هذا بالهتنا انه — وہ کہنے لگے یہ معاملہ ہمارے خداؤں کے ساتھ کس نے

لمن الظلمین . قالوا سمعنا فتی — کیا ہے بلاشبہ وہ ضرور ظالم ہے۔ (ان میں سے بعض)

یذکرهم یقال له ابرهیم — کہنے لگے ہم نے ایک جوان کی زبان سے ان بتوں کا (ذکر)

(الانبیاء) — (برائی کے ساتھ) ذکر سنا ہے۔ اُس کو ابراہیم کہا جاتا ہے (یعنی یہ کام اس کا ہے)

کاہنوں اور سرداروں نے جب یہ سنا تو غم و غصہ سے سرخ ہو گئے اور کہنے لگے اُس کو مجمع کے سامنے پکڑ کر لاؤ تاکہ سب دیکھیں کہ مجرم کون شخص ہے؟

ابراہیم علیہ السلام سامنے لائے گئے تو بڑے رُعب و داب سے اُنہوں نے پوچھا کیوں ابراہیم تونے ہمارے دیوتاؤں کے ساتھ یہ سب کچھ کیا ہے؟

قالوا فأتوا به على اعين الناس — اُنہوں نے کہا ابراہیم کو لوگوں کے سامنے لاؤ تاکہ وہ دیکھیں

لعلّهم يشهدون . قالوا أانت — وہ کہنے لگے کیا اے ابراہیم تونے ہمارے دیوتاؤں

فعلت هٰذا بآلهتنا یا ابرٰهیم. — کیا ہے؟

ابراہیم علیہ السلام نے دیکھا کہ اب وہ بہترین موقعہ آگیا ہے جس کے لیے میں نے یہ تدبیر اختیار کی، مجمع موجود ہے، جمہور دیکھ رہے ہیں کہ اُن کے دیوتاؤں کا کیا حشر ہوگیا، اس لیے اب کاہنوں اور مذہبی پیشواؤں کو جمہور کی موجودگی میں اُن کے باطل عقیدہ پر نادم کردینے کا وقت آگیا ہے تاکہ عوام کو آنکھوں دیکھتے معلوم ہوجائے کہ آج تک ان دیوتاؤں کے متعلق جو کچھ ہم سے کاہنوں اور پجاریوں نے کہا تھا یہ سب ان کا مکروفریب تھا۔ مجھے اُن سے کہنا چاہیے کہ یہ سب اس بڑے بت کی کارروائی ہے۔ اِس سے دریافت کرو؟ لامحالہ وہ یہی جواب دینگے کہ کہیں بت بھی بولتے اور بات کرتے ہیں، تب میرا مطلب حاصل ہے اور پھر میں اُن کے عقیدے کا پول جمہور کے سامنے کھول کر صحیح عقیدہ کی تلقین کرسکونگا اور بتاؤنگا کہ کس طرح وہ باطل اور گمراہی میں مبتلا ہیں، اُس وقت ان کاہنوں اور پجاریوں کے پاس ندامت کے سوائے کیا ہوگا۔ اِس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا۔

قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا — ابراہیم نے کہا بلکہ ان میں سے اس بڑے بت نے یہ کیا ہے

فَاسْئَلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ (انبیاء) — پس اگر یہ (تمہارے دیوتا) بولتے ہوں تو ان سے دریافت کرلو؟

ابراہیم (علیہ السلام) کی اس یقینی حجت اور دلیل کا کاہنوں اور پجاریوں کے پاس کیا جواب ہوسکتا تھا، وہ ندامت میں غرق تھے، دلوں میں ذلیل و رسوا تھا، اور سوچتے تھے کہ کیا جواب دیں، جمہور بھی آج سب کچھ سمجھ گئے اور اُنہوں نے اپنی آنکھوں سے وہ منظر دیکھ لیا جس کے لیے وہ تیار نہ تھے۔ اور بالآخر

چھوٹے اور بڑے سب ہی کو دل میں اقرار کرنا پڑا کہ ابراہیم ظالم نہیں ہے بلکہ ظالم ہم خود ہیں کہ ایسے بے دلیل اور باطل عقیدہ پر یقین رکھتے ہیں، اور نہایت شرمساری کے ساتھ سرنگوں ہو کر کہنے لگے ابراہیم تو خوب جانتا ہے کہ ان دیوتاؤں میں بولنے کی سکت نہیں ہے، یہ تو بے جان مورتیاں ہیں۔

فرجعوا الیٰ انفسھم فقالوا انکم — پس اُنہوں نے اپنے جی میں سوچا پھر کہنے لگے
انتم الظٰلمون ثم نکسوا علیٰ — بیشک تم ہی ظالم ہو۔ بعد ازاں اپنے سروں
رءوسھم لقد علمت ما ھؤلاء — کو نیچے جھکا کر کہنے لگے (اے ابراہیم) تو خوب
ینطقون (انبیاء) — جانتا ہے کہ یہ بولنے والے نہیں ہیں۔

اس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حجت و دلیل کامیاب ہوئی اور دشمنوں نے اعتراف کر لیا کہ ظالم ہم ہی ہیں اور اُن کو جمہور کے سامنے زبان سے اقرار کرنا پڑا کہ ہمارے یہ دیوتا جواب دینے اور بولنے کی طاقت نہیں رکھتے، چہ جائیکہ نفع و نقصان کے مالک ہوں۔

تو اب ابراہیم علیہ السلام نے مختصر مگر جامع الفاظ میں اُن کو نصیحت بھی کی اور ملامت بھی، اور بتایا کہ جب یہ دیوتا نہ نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان تو پھر یہ خدا اور معبود کیسے ہو سکتے ہیں افسوس تم اتنا بھی نہیں سمجھتے یا عقل سے کام نہیں لیتے؟ فرمانے لگے:۔

افتعبدون من دون اللہ ما لا — کیا تم اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر اُن چیزوں کی پوجا کرتے ہو
ینفعکم شیئا و لا یضرکم اُف — جو تم کو نہ کچھ نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان دے سکتے
لکم و لما تعبدون من دون اللہ — ہیں۔ تم پر افسوس ہے اور تمہارے اُن معبودانِ باطل
افلا تعقلون۔ (انبیاء) — پر بھی جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔
فاقبلوا الیہ یزفون۔ قالوا اتعبدون — پس وہ سب ہلہ کر کے ابراہیم کے گرد جمع ہو گئے، ابراہیم
ما تنحتون۔ واللہ خلقکم وما — نے کہا کیا جن بتوں کو ہاتھ سے گھڑتے ہو اُنہی کو پھر پوجتے

تعملون ۔ (الصافات) ہو، اور اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی نے تم کو پیدا کیا ہے اور اُنکو بھی جن کاموں کو تم کرتے ہو

حضرت ابراہیم کی اس نصیحت و موعظت کا اثر یہ ہونا چاہیے تھا کہ تمام قوم اپنے باطل عقیدہ سے تائب ہو کر ملتِ حنیفی کو اختیار کر لیتی اور کجروی چھوڑ کر راہِ مستقیم پر گامزن ہو جاتی لیکن دلوں کی کجی نفوس کی سرکشی و تمرد اور باطنی خباثت و دنائت نے اس جانب نہ آنے دیا اور اس کے برعکس اُن سب نے ابراہیم (علیہ السلام) کی عداوت و دشمنی کا نعرہ بلند کر دیا اور ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ اگر دیوتاؤں کی خوشنودی چاہتے ہو تو اس کو اس گستاخی اور مجرمانہ حرکت پر سخت سزا دو اور دہکتی ہوئی آگ میں جلا ڈالو تاکہ اُس کی تبلیغ و دعوت کا قصہ ہی پاک ہو جائے۔

بادشاہ کو دعوتِ اسلام اور اُس سے مناظرہ

ابھی یہ مشورے ہو ہی رہے تھے کہ شدہ شدہ بادشاہ وقت تک یہ باتیں پہنچ گئیں۔ اُس زمانہ میں عراق کے بادشاہ کا لقب نمرود ہوتا تھا اور یہ رعایا کے صرف بادشاہ ہی نہیں ہوتے تھے بلکہ خود کو اُن کا رب اور مالک جانتے تھے اور رعایا بھی دوسرے دیوتاؤں کی طرح اُس کو اپنا خدا اور معبود جانتی اور اُس کی بھی اُسی طرح پرستش کرتی تھی جس طرح دوسرے دیوتاؤں کی بلکہ اُن سے بھی زیادہ پاس و ادب کے ساتھ اس لیے کہ وہ صاحبِ عقل و شعور بھی ہوتا تھا اور صاحبِ تخت و تاج بھی۔

نمرود کو جب یہ معلوم ہوا تو بہت برافروختہ ہوا اور سوچنے لگا کہ اس شخص کی پیغمبرانہ تبلیغ و دعوت کی سرگرمیاں اسی طرح جاری رہیں تو یہ میری ربوبیت، ملوکیت اور الوہیت سے بھی سب رعایا کو برگشتہ کر دیگا، اور اس طرح باپ، دادا کے مذہب کے ساتھ ساتھ میری یہ سلطنت بھی زوال میں آجائیگی، اس لیے اس قصہ کا ابتدا ہی میں خاتمہ کر دینا بہتر ہے۔ یہ سوچ کر اُس نے حکم دیا کہ ابراہیم کو ہمارے دربار میں حاضر کرو، ابراہیم (علیہ السلام) جب نمرود کے دربار میں پہنچے تو نمرود نے گفتگو شروع کی اور ابراہیم علیہ السلام سے یہ دریافت کیا کہ تو باپ دادا کے دین کی مخالفت کس لیے کرتا ہے، اور مجھ کو رب ماننے سے

تجھے کیوں انکار ہے؟ ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ میں خدائے واحد کا پرستار ہوں، اُس کے علاوہ کسی کو اس کا شریک نہیں مانتا، ساری کائنات اور تمام عالم اُسی کی مخلوق ہے اور وہی ان سب کا خالق و مالک ہے، تو بھی اُسی طرح ایک انسان ہے جس طرح ہم سب انسان ہیں پھر تو کس طرح رب یا خدا ہو سکتا ہے اور کس طرح یہ گونگے بہرے لکڑی کے بت خدا ہو سکتے ہیں؟ میں صحیح راہ پر ہوں اور تم سب غلط راہ پر ہو اس لیے میں تبلیغ حق کو کس طرح چھوڑ سکتا ہوں، اور تمہارے باپ دادا کے خود ساختہ دین کو کیسے اختیار کر سکتا ہوں؟

نمرود نے ابراہیم علیہ السلام سے دریافت کیا کہ اگر میرے علاوہ تیرا کوئی رب ہے تو اس کا ایسا وصف بیان کر کہ جس کی قدرت مجھ میں نہ ہو۔ تب ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا۔ میرا رب وہ ہے جس کے قبضہ میں موت و حیات ہے۔ وہی موت دیتا ہے اور وہی زندگی بخشتا ہے۔ کج فہم نمرود موت و حیات کی حقیقت سے ناآشنا نمرود کہنے لگا۔ اس طرح موت و حیات تو میرے قبضہ میں بھی ہے، اور یہ کہہ کر اُسی وقت ایک بے قصور شخص کے متعلق جلاد کو حکم دیا کہ اس کی گردن مار دو اور موت کے گھاٹ اُتار دو۔ جلاد نے فوراً حکم کی تعمیل کر دی، اور ایک قتل کے سزا یافتہ مجرم کو جیل سے بلا کر حکم دیا کہ جاؤ ہم نے تمہاری جان بخشی، اور پھر ابراہیم علیہ السلام کی جانب متوجہ ہو کر کہنے لگا کہ دیکھا میں بھی کس طرح زندگی بخشتا اور موت دیتا ہوں؟

ابراہیم علیہ السلام سمجھ گئے کہ نمرود یا تو موت و حیات کی اصل حقیقت سے ناآشنا ہے اور یا جمہور اور رعایا کو مغالطہ دینا چاہتا ہے تاکہ وہ اس فرق کو نہ سمجھ سکیں کہ زندگی بخشنا اس کا نام نہیں ہے بلکہ نیست سے ہست کرنے کا نام زندگی بخشنا ہے اور اسی طرح کسی کو قتل یا پھانسی سے بچا لینا موت کا مالک ہونا نہیں ہے، موت کا مالک وہی ہے جو روحِ انسانی کو اُس کے جسم سے نکال کر اپنے قبضہ میں کر لیتا ہے۔ اس لیے کہ بہت سے دار رسیدہ اور شمشیر چشیدہ انسان زندگی پا جاتے ہیں اور بہت سے قتل و دار سے

بچائے ہوئے انسان لقمۂ اجل بن جاتے ہیں اور کوئی طاقت اُن کو نہیں روک سکتی اور اگر ایسا ہو سکتا تو ابراہیم علیہ السلام سے گفتگو کرنے والا نمرود سربرآرائے سلطنت نہ ہوتا بلکہ اُس کے خاندان کا پہلا شخص ہی آج بھی اس تاج و تخت کا مالک ہوتا مگر نہ معلوم کہ عراق کی اس سلطنت کے کتنے مدعی زیرِ زمین دفن ہو چکے اور ابھی کتنوں کی باری ہے۔

بہرحال ابراہیم (علیہ السلام) نے سوچا کہ اگر میں نے اس موقعہ پر موت و حیات کے دقیق فلسفہ پر بحث شروع کر دی تو نمرود کا مقصد پورا ہو جائیگا اور وہ جمہور کو مغالطہ میں ڈال کر اصل معاملہ کو الجھا دیگا اور اور اس طرح میرا مقصد فوت ہو جاتا ہے اور تبلیغ حق کے سلسلہ میں سرِ محفل نمرود کو لاجواب کرنے کا موقعہ ہاتھ سے جاتا ہے۔ کیونکہ بحث و مباحثہ اور جدل و مناظرہ میرا اصل مقصد نہیں ہے بلکہ لوگوں کے دماغ و قلب میں خدائے واحد کا یقین پیدا کرنا میرا مقصدِ وحید ہے۔ اس لیے اُنہوں نے اس دلیل کو نظر انداز کر کے سمجھانے کا ایک دوسرا پیرایہ اختیار کیا اور ایسی دلیل پیش کی جس کا صبح و شام ہر شخص آنکھوں سے مشاہدہ کرتا اور بغیر کسی منطقی دلیل کے روز و شب کی زندگی میں اُس سے دوچار ہوتا رہتا ہے۔

ابراہیم (علیہ السلام) نے فرمایا میں اُس ہستی کو "اللہ" کہتا ہوں جو روزانہ سورج کو مشرق سے لاتا اور مغرب کی جانب لیجاتا ہے۔ پس اگر تو بھی اسی کی طرح خدائی کا دعویٰ کرتا ہے تو اُس کے خلاف سورج کو مغرب سے نکال اور مشرق میں چھپا۔ یہ سُن کر نمرود مبہوت اور لاجواب ہو کر رہ گیا اور اس طرح ابراہیم (علیہ السلام) کی زبان سے نمرود پر خدا کی حجت پوری ہوئی۔

نمرود اس دلیل سے مبہوت کیوں ہوا اور اُس کے پاس اس کے مقابلہ میں مغالطہ کی گنجائش کیوں نہ رہی؟ یہ اس لیے کہ ابراہیم (علیہ السلام) کی دلیل کا حاصل یہ تھا کہ میں ایک ایسی ہستی کو اللہ مانتا ہوں جس کے متعلق میرا یہ عقیدہ ہے کہ یہ ساری کائنات اور اس کا سارا نظام اُس ہی نے

بنایا ہے اور اُس نے اس پورے نظام کو اپنی حکمت کے قانون سے ایسا مسخر کر دیا ہے کہ اُس کی کوئی شَے نہ وقتِ مقررہ سے پہلے اپنی جگہ سے ہٹ سکتی ہے اور نہ ادھر اُدھر ہو سکتی ہے۔ تم اس پورے نظام میں سے آفتاب ہی کو دیکھو کہ عالمِ ارضی اس سے کس قدر فائدے حاصل کرتا ہے باینہمہ اللہ تعالیٰ نے اُس کے طلوع و غروب کا بھی ایک نظام مقرر کر دیا ہے۔ پس اگر آفتاب لاکھ بار بھی چاہے کہ وہ اس نظام سے باہر ہو جائے تو وہ اس پر قادر نہیں ہے۔ کیونکہ اس کی باگ ایک خدا کے قبضۂ و قدرت میں ہے۔ اُس کو بیشک یہ قدرت ہے کہ جو چاہے کر گذرے لیکن وہ کرتا وہی ہے جو اُسکی حکمت کا تقاضا ہے

لہٰذا اب نمرود کے لیے تین ہی صورتیں جواب دینے کی ہو سکتی تھیں یا وہ یہ کہے کہ مجھے آفتاب پر پوری قدرت حاصل ہے اور میں نے ہی یہ سارا نظام بنایا ہے۔ مگر اُس نے یہ جواب اس لیے نہیں دیا کہ وہ خود اس کا قائل نہیں تھا کہ یہ ساری کائنات اُس نے بنائی ہے اور آفتاب کی حرکت اُس کے قبضۂ قدرت میں ہے بلکہ وہ تو خود کو اپنی رعایا کا رب اور دیوتا کہلاتا تھا۔

دوسری صورت یہ تھی کہ وہ کہتا "میں اس عالم کو کسی کی مخلوق نہیں مانتا اور آفتاب تو خود مستقل دیوتا ہے اُس کے اختیارات میں خود بہت کچھ ہے"، مگر اُس نے یہ بھی اس لیے نہ کہا کہ اگر وہ ایسا کہتا تو ابراہیم علیہ السلام کا وہی اعتراض سامنے آجاتا، جو اُنہوں نے جمہور کے سامنے آفتاب کی ربوبیت کے خلاف اُٹھایا تھا کہ اگر یہ "رب" ہے تو عابدوں اور پجاریوں سے زیادہ اس معبود اور دیوتا میں تغیرات اور فنا کے اثرات کیوں موجود ہیں" رب" کو تغیر اور فنا سے کیا علاقہ، اور کیا اس کی قدرت میں یہ ہے کہ وہ اگر چاہے تو وقتِ مقررہ سے پہلے یا بعد طلوع یا غروب ہو جائے؟

تیسری صورت یہ تھی کہ ابراہیم علیہ السلام کی تحدّی (چیلنج) کو قبول کر لیتا اور مغرب سے نکال کر دکھا دیتا، مگر نمرود چونکہ ان تینوں صورتوں میں سے کسی صورت میں بھی جواب پر قادر نہ تھا اس لیے مبہوت اور لاجواب ہو جانے کے علاوہ اُس کے پاس دوسرا کوئی چارۂ کار باقی ہی نہ رہا[1]۔

[1] (ملاحظہ ہو صفحہ ۱۷۸)

قرآنِ عزیز نے (بقرہ) میں اس واقعہ کو مختصر مگر لطیف پیرایہ میں بیان کیا ہے۔

الم تر الی الذی حاج ابرٰھیم فی ربہ ان آتٰہ اللہ الملک اذ قال ابرٰھیم ربی الذی یحیی و یمیت قال انا احی و امیت قال ابرٰھیم فان اللہ یاتی بالشمس من المشرق فات بھا من المغرب فبھت الذی کفر و اللہ لا یھدی القوم الظٰلمین (بقرہ)

کیا تو نے نہیں دیکھا اُس شخص (کا واقعہ) جس کو اللہ نے بادشاہت بخشی تھی اُس نے کس طرح ابراہیم سے اُس کے پروردگار کے بارہ میں مناظرہ کیا؟ جب کہا ابراہیم نے میرا پروردگار تو زندگی بخشتا ہے اور موت دیتا ہے۔ بادشاہ نے کہا میں بھی زندگی بخشتا ہوں اور موت دیتا ہوں، ابراہیم نے کہا بلاشبہ اللہ تعالیٰ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے پس تو اُس کو مغرب سے نکال کر دکھلا بس وہ کافر (بادشاہ) مبہوت اور لاجواب ہو کر رہ گیا۔ اور اللہ ظلم کرنے والوں کو راہیاب نہیں کرتا۔

(نوٹ صفحہ ۱۷۷) لہ عیسائی پادریوں اور اُن کی اندھی تقلید میں آریہ سماجیوں نے ابراہیم علیہ السلام کے اس ذکر کردہ مناظرہ پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اگر نمرود یہ کہہ بیٹھتا کہ ابراہیم تو ہی اپنے خدا سے آفتاب کو مغرب سے طلوع کرادے تو ابراہیم کے پاس کیا جواب تھا؟ یہ اعتراض بہت ہی لچر اور سطحی ہے اس لیے کہ ہم نے ابراہیم علیہ السلام کے مناظرہ کی جو تشریح بیان کی ہے اور جو حقیقتِ واقعہ ہے اُس کے بعد یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا، نمرود جانتا تھا کہ وہ ایسا اس لیے نہیں کہہ سکتا کہ پہلے وہ خود اپنی عاجزی و درماندگی کا اقرار کرے اور پھر تسلیم کرے کہ آفتاب ہمارا دیوتا بھی نہیں ہے اور نہ اُس میں یہ قدرت کہ وہ ہماری اس استدعا کو ابراہیم کے مقابلہ میں منظور کرلے۔ بدیں وجہ اُس نے خاموشی کو ترجیح دی اور اگر وہ ایسا سوال کر ہی بیٹھتا تو ابراہیم علیہ السلام کو یہ یقین تھا کہ ایسے تحدی (چیلنج) کے وقت اللہ تعالیٰ اپنے سچے پیغمبر کو ذلیل نہیں کریگا اور ابراہیم کی دعا پر وہ بلاشبہ آفتاب کو مغرب سے طلوع کرکے ابراہیم کی صداقت کو واضح کردیگا۔ البتہ یہ مسئلہ مادیئین اور خدا کی قدرت پر کنٹرول کرنے والوں کے لیے ضرور تعجب خیز ہو سکتا ہے لیکن جن کا عقیدہ یہ ہے کہ کائنات کا یہ سارا نظام اگرچہ خاص قوانین کے شکنجہ میں جکڑا ہوا ہے لیکن اس کا یہ شکنجہ ان اشیاء کے ذاتی خواص کی بنا پر نہیں ہے بلکہ اس شکنجہ میں کسنے والی ہستی اور ہے اور تمام اشیاء کی تاثیر اور اس کے خواص اُسی کے مخلوق ہیں لہٰذا وہ چاہے تو اُن کے خواص و تاثیرات کو بدل بھی سکتا ہے اور فنا بھی کرسکتا ہے۔ اور اسی قادرِ مطلق اور بے قید مالک و متصرف کا نام "اللہ" ہے۔

الحاصل حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سب سے پہلے اپنے والد آزر کو اسلام کی تلقین کی، پیغامِ حق سُنایا اور راہِ مستقیم دکھائی، اس کے بعد عوام اور جمہور کے سامنے اس دعوت کو عام کیا اور سب کو امرِ حق تسلیم کرانے کے لیے فطرت کے بہترین اصول و دلائل کو پیش کیا اور نرمی، شیریں کلامی مگر مضبوط و محکم اور روشن حجت و دلیل کے ساتھ اُن پر حق کو واضح کیا اور سب سے آخر میں بادشاہِ نمرود سے مناظرہ کیا اور اُس پر روشن کیا کہ ربوبیت و الوہیت کا حق صرف خدائے واحد ہی کے لیے سزاوار ہے اور بڑے سے بڑے شاہنشاہ کو بھی یہ حق نہیں ہے کہ وہ اُس کی ہمسری کا دعویٰ کرے، کیونکہ وہ اور کُل دنیا اُسی کی مخلوق ہے۔ مگر اس کے باوجود کہ بادشاہ، آزر اور جمہور، ابراہیم (علیہ السلام) کے دلائل سے لاجواب تھے اور دلوں میں قائل بلکہ بتوں کے واقعہ میں تو زبان سے اقرار کرتے تھے کہ ابراہیم جو کچھ کہتا ہے وہی حق ہے اور صحیح و درست تاہم اُن میں سے کسی نے راہِ مستقیم کو اختیار نہ کیا اور نہ وہ قبولِ حق کے لیے آمادہ ہوئے، بلکہ اس کے برعکس اپنی ندامت و ذلت سے متاثر ہو کر زیادہ غیظ و غضب میں آ گئے اور بادشاہ سے رعایا تک سب نے متفقہ فیصلہ کر دیا کہ دیوتاؤں کی توہین اور باپ دادا کے دین کی مخالفت میں ابراہیم کو دہکتی آگ میں جلا دینا چاہیے کیونکہ ایسے سخت مجرم کی سزا یہی ہو سکتی ہے اور دیوتاؤں کی تحقیر کا انتقام اسی طرح لیا جا سکتا ہے۔

آگ کا سرد ہو جانا اس مرحلہ پر پہنچ کر ابراہیم علیہ السلام کی جد و جہد کا معاملہ ختم ہو گیا اور اب دلائل و براہین کی قوت کے مقابلہ میں مادی طاقت و سطوت نے مظاہرہ شروع کر دیا۔ باپ اس کا دشمن، جمہور اُس کے مخالف، اور بادشاہِ وقت اُس کے درپے آزار، ایک ہستی اور چہار جانب سے مخالفت کی آواز، دشمنی کے نعرے، اور نفرت و حقارت کے ساتھ سخت انتقام اور خوفناک سزا کے ارادے تھے۔ ایسے وقت میں اُس کی مدد کون کرے، اور اُس کی حمایت کا سامان کس طرح مہیا ہو؟

ابراہیم علیہ السلام کو نہ اس کی پرواہ تھی اور نہ خوف، وہ اُسی طرح بے خوف و خطر اور لومۃ لائم کی

پرواہ کیے بغیر اعلانِ حق میں سرشار، اور دعوتِ رشد و ہدایت میں مشغول تھے، البتہ ایسے نازک وقت میں جب تمام مادی سہارے ختم، دنیوی اسباب ناپید اور حمایت و نصرت کے ظاہری اسباب مفقود ہو چکے تھے ابراہیم علیہ السلام کو اُس وقت ایک ایسا بڑا زبردست سہارا حاصل تھا جو تمام سہاروں کا سہارا اور تمام نصرتوں کا ناصر کہا جاتا ہے اور وہ خدائے واحد کا سہارا تھا۔ اُس نے اپنے جلیل القدر پیغمبر قوم کے عظیم المرتبت ہادی اور راہنما کو بے یار و مددگار نہ رہنے دیا اور دشمنوں کے تمام منصوبوں کو خاک میں ملا دیا۔ ہوا یہ کہ نمرود اور قوم نے ابراہیم (علیہ السلام) کی سزا کے لیے ایک مخصوص جگہ بنوائی اور اُس میں کئی روز مسلسل آگ دہکائی حتیٰ کہ اُس کے شعلوں سے قرب و جوار کی اشیا تک جھلسنے لگیں، جب اس طرح بادشاہ اور قوم کو کامل اطمینان ہو گیا کہ اب ابراہیم کے اس سے بچ نکلنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہی تب ایک گوپھن میں ابراہیم کو بٹھا کر دہکتی آگ میں پھینک دیا۔

اب آگ میں جلانے کی تاثیر بخشنے والے خدا نے آگ کو حکم دیا کہ وہ ابراہیم پر اپنی سوزش کا اثر نہ کرے اور ناری عناصر کا مجموعہ ہوتے ہوئے اُس کے حق میں سلامتی کے ساتھ سرد پڑ جائے آگ اُسی وقت حضرت ابراہیم کے حق میں "برد و سلام" بن گئی اور دشمن اُن کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچا سکے۔ اور ابراہیم علیہ السلام دہکتی آگ سے سالم و محفوظ دشمنوں کے نرغہ سے نکل گئے ۔

دشمن اگر قویست نگہباں قوی ترست

اس مقام پر ایک مذہبی انسان کی طمانیتِ قلب اور سکونِ خاطر کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ آگ کے برد و سلام ہو جانے کو اس لیے صحیح اور مبنی بر حقیقت سمجھے کہ اُس نے اپنی عقل اور اپنے شعور سے اول اس امر کا امتحان کر لیا ہے کہ قرآنِ عزیز کی تعلیم وحی الٰہی کی تعلیم ہے اور اُس کی لانے والی ہستی کی زندگی کا ہر پہلو پیغمبرانہ معصومیت کے ساتھ وابستہ ہے اور یہ کہ وہ جن معجزانہ حقائق کی اطلاعات بہم پہنچاتا اور وحی الٰہی کے ذریعہ ہم کو سناتا ہے وہ عقل کے لیے اگرچہ حیران کن ہیں لیکن عقل کی نگاہ میں محال اور

ناممکن نہیں، اس لیے ایک مخبر صادق (کہ جس کی زندگی کی صداقت کا ہر پہلو سے امتحان کر کے اطمینان کر لیا گیا ہے) کی اس قسم کی خبریں بلا شبہ صحیح اور حق ہیں اور بقول قیصر روم ہرقل اعظم (ہرکلیوس) کہ جو شخص انسانوں کے ساتھ جھوٹ نہیں بولتا اور اُن سے دغا فریب نہیں کرتا وہ ایک لمحہ کے لیے بھی خدا کی جانب کسی غلط بات کو منسوب نہیں کر سکتا اور کبھی اُس پر جھوٹ بولنے کی جرأت نہیں کر سکتا، پس مذہبی زندگی میں صاف اور سیدھی راہ یہی ہے کہ جس مذہب کی مکمل تعلیم کو عقل کی کسوٹی پر پرکھ کر ہر طرح قابل اطمینان پایا ہو اُس کے بتائے ہوئے چند ایسے امور پر جو عقل کے لیے صرف حیران کن ہوں مگر اُس کے نزدیک محال ذاتی اور ناممکن کے مرادف نہ ہوں فلسفیانہ موشگافیوں کے بغیر ایمان لے آنا چاہیے اور صاحبِ وحی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اس یقینی اور غیر مشکوک اطلاع کو آفتاب کی روشنی سے زیادہ روشن سمجھنا چاہیے، اور یقین کرنا چاہیے کہ تمام اشیاء میں خواص و تاثیرات پیدا کرنے والے خدا میں یہ بھی قدرت ہے کہ جب چاہے اُن کو دی ہوئی تاثیر اور خاصہ کو سلب کر لے اور جب چاہے دوسری کیفیت کے ساتھ بدل ڈالے لیکن مادیین کے لیے اگر یہ راہ باعثِ اطمینان نہ ہو اور فلسفہ کے شیدائی مذہب کے اس شعبہ کو بھی اُس کی موشگافیوں سے پاک نہ رہنے دینا چاہتے ہوں تو اُن کے لیے بھی اس معجزہ سے انکار کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ ہمیں یہ تسلیم ہے کہ آگ کا طبعی خاصہ جلا دینا ہے اور جو شے اُس کے ساتھ ملیگی جل جائیگی لیکن اس کی کیا وجہ کہ بعض وہ کپڑے اور وہ اشیاء جن کو "فائر پروف" کہا جاتا ہے آگ کے شعلوں کے اندر کیوں محفوظ رہتی ہیں، اور اُن کو آگ جلا کر کیوں خاکستر نہیں کر دیتی تم کہو گے کہ آگ بدستور جلانے کا خواص رکھتی ہے مگر کپڑے یا چیز پر ایک ایسا مسالہ لگا دیا گیا ہے جس پر آگ اپنا اثر نہیں کر سکتی یہ نہیں ہے کہ آگ نے اپنا جلانے کا خاصہ ترک کر دیا ہے۔

تو ایک مذہبی انسان کے لیے اسی طرح آپ کے فلسفیانہ رنگ میں یہ جواب دینے کا کیوں حق نہیں ہے کہ نمرود اور اُس کی قوم کی دہکتی آگ کے جلانے کا خاصہ بدستور اُسی طرح باقی تھا جس

طرح آگ کے عناصر میں موجود ہے۔ مگر وہ ابراہیم کے جسم کے لیے بے اثر ثابت ہوا، فرق صرف اس قدر ہے کہ تمہارے "فائر پروف" میں انسانوں کی سوچی ہوئی تدابیر کا دخل ہے اور اس لیے وہ ہر سیکھنے والے کو ایک فن کی طرح سیکھ لینے کا موقع حاصل ہے اور ابراہیم کے جسم کا آگ سے محفوظ ہو جانا بلا واسطہ انسانوں کے خدا کی تدبیر کے زیرِ اثر تھا اور اس قسم کا عمل پیغمبر کی صداقت اور دشمنوں کے مقابلہ میں اُس کی برتری کے لئے کبھی کبھی بہ تقاضائے حکمت اُس کی جانب سے سامنے آجاتا اور شریعت کی اصطلاح میں "معجزہ" شمار ہوتا ہے۔ بیشک وہ "فن" ہوتا ہے اور نہ وہ وسائل و اسباب سے پیدا کردہ تدابیر کا محتاج۔ لیکن اگر خدا کی مخلوق "انسان" کو یہ قدرت حاصل ہے کہ کسی شے کے طبعی خاصہ کو بعض اشیاء پر موثر نہ ہونے دے تو اشیاء کے خواص کے خالق کو کیوں یہ قدرت حاصل نہیں کہ وہ کسی خاص موقع پر شی کی تاثیر کو عمل سے روک دے۔

اور اگر آج سائنس کی دریافت پر فضا میں ایسی گیسیں موجود ہیں جن کے بدن پر اثر کرنے سے آگ کی سوزش سے محفوظ رکھا جا سکتا ہے تو گیسوں کے پیدا کرنے والے خالق کے لیے کون مانع ہے کہ نمرود کی دہکتی آگ میں اُن کو ابراہیم تک نہ پہنچا دے، اور اس طرح اُس کو حقِ ابراہیم (علیہ السلام) بردو سلام نہ بنا دے۔

بہرحال قرآنِ عزیز میں ابراہیم علیہ السلام کے اس معجزانہ معجزہ کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

قالوا حرّقوه وانصروا آلهتكم إن كنتم فاعلين. قلنا يا نار كوني بردًا وسلامًا على ابراهيم. وارادوا به كيدًا فجعلناهم الاخسرين. (الانبياء)	وہ سب کہنے لگے اس (ابراہیم) کو جلا ڈالو اور اپنے دیوتاؤں کی مدد کرو اگر تم کرنا چاہتے ہو ہم نے حکم دیا اے آگ! تو ابراہیم کے حق میں سرد اور سلامتی بن جا، اور اُنہوں نے ابراہیم کے ساتھ مکر کا ارادہ کیا پس ہم نے اُن کو اُن کے ارادہ میں ناکام بنا دیا۔
قالوا ابنوا له بنيانًا فالقوه في الجحيم. فارادوا به كيدًا فجعلناهم الاسفلين.	اُنہوں نے کہا اس کے لیے ایک جگہ بناؤ اور اس کو دہکتی آگ میں ڈالو پس اُنہوں نے اس کے ساتھ ارادۂ بد کیا تو

وقال انی ذاهب الی ربی	کر دیا ہم نے اُن کو (اُس کے مقابلہ میں) پست و ذلیل
سیهدین ۔	اور کہا ابراہیم نے میں جانے والا ہوں اپنے پروردگار
(الصافات)	کے پاس قریب ہی وہ مجھے راہیاب کریگا۔

حدیثِ بخاری ابراہیم علیہ السلام کے واقعات میں قرآنِ عزیز نے اُس موقعہ پر جبکہ ابراہیم (علیہ السلام) اور قوم کے بعض افراد کے درمیان میلے کی شرکت کے لیے گفتگو ہو رہی تھی ابراہیم علیہ السلام کا یہ قول نقل کیا ہے۔

"قال انی سقیم" (ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا میں بیمار ہوں) اور جب بتوں کی شکست و ریخت کے سلسلہ میں اُن سے دریافت کیا گیا تو اُن کا جواب اس طرح منقول ہے۔

قال بل فعلہ کبیرھم ھذا	ابراہیم نے کہا بلکہ ان میں سے سب سے بڑے بت نے یہ
فاسئلوھم ان کانوا ینطقون	کیا ہے پس ان سے پوچھو اگر یہ بول سکتے ہیں؟

ان دونوں جملوں کے متعلق ایک خالی الذہن انسان ایک لمحہ کے لیے بھی یہ تصور نہیں کرسکتا کہ ان میں جھوٹ کا بھی کوئی شائبہ ہوسکتا ہے؟ "انی سقیم" میں علالتِ طبع کا ذکر ہے جس کو ابراہیم علیہ السلام ہی خوب جان سکتے ہیں کہ وہ کیا بیمار ہیں، اس میں دوسرے کو خواہ مخواہ شک اور تردد کا کون سا موقع ہے، حتیٰ کہ اگر ایک شخص ظاہر بیں نگاہوں میں تندرست نظر آتا ہو تب بھی ضروری نہیں ہے کہ وہ واقعی تندرست ہے، ہوسکتا ہے کہ اُس کا مزاج کسی وجہ سے حدِ اعتدال پر نہ ہو اور ایسی تکلیف میں مبتلا ہو جس کا اظہار کیے بغیر دوسرا اُس کو نہ سمجھ سکے۔ اسی طرح دوسری آیت کا معاملہ ہے اس لیے کہ دو مختلف الخیال انسانوں کے درمیان اگر مناظرہ اور تبادلۂ خیالات کی نوبت آجاتی ہے تو معمولی حرف شناس بھی اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ اپنے حریف کو اُس کی غلطی پر متنبہ کرنے اور لاجواب کر دینے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اُس کے مسلّمات میں سے کسی مسلّمہ عقیدہ کو صحیح فرض کرکے اس طرح اس کا استعمال کرے کہ اُس کا ثمرہ اور نتیجہ حریف کے خلاف اور اپنے موافق ظاہر ہو۔

ابراہیم علیہ السلام نے یہی کیا، اُن کی قوم کا یہ عقیدہ تھا کہ اُن کے دیوتا سب کچھ سنتے اور ہماری مُرادوں کو پورا کرتے ہیں، وہ اپنے پجاریوں اور معتقدوں سے خوش ہوتے اور اپنے دشمنوں اور مخالفوں سے سخت انتقام لیتے ہیں، ابراہیم علیہ السلام نے جب اِن دیوتاؤں کو توڑ پھوڑ ڈالا تو بڑے بُت کو چھوڑ دیا آخر جب پوچھ گچھ کی نوبت آئی تو اُنہوں نے مناظرہ کا وہی بہترین اسلوب اختیار کیا جس کا تفصیلی ذکر گذشتہ صفحات میں آچکا ہے اور نتیجہ یہ نکلا کہ کاہنوں، پجاریوں اور ساری قوم کو یہ اعتراف کرنا پڑا کہ ہم ہی غلطی پر ہیں اور تو خود حقیقت شناس ہے کہ ان میں گویائی کی طاقت نہیں ہے۔

لہٰذا ان دونوں جملوں میں ایک بات بھی ایسی نہیں ہے جس کو حقیقۃً یا صورۃً جھوٹ کہا جاسکے یہ دو باتیں تو قرآنِ عزیز میں مذکور ہیں لیکن ایک تیسری بات بخاری، مسلم اور دوسری کتبِ حدیث کی ایک روایت میں موجود ہے اور اُس میں مسطورۂ بالا ان دونوں باتوں کا بھی ذکر ہے۔ وہ حدیث ان الفاظ سے شروع ہوتی ہے

لم یکذب ابراھیم النبی علیہ السلام	نہیں جھوٹ بولا کبھی ہرگز ابراہیم نبی علیہ السلام نے
قط الا ثلث کذبات الخ[۱]	مگر تین جھوٹ۔

اور پھر تفصیل کے ساتھ اِن تینوں کو شمار کیا ہے۔ ان میں سے دو کا ذکر ابھی ہو چکا اور تیسری بات یہ مذکور ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کا جب مصر سے گذر ہوا تو اُنہوں نے مصر پہنچنے سے پہلے اپنی زوجۂ مطہرہ حضرت سارہ رضی اللہ عنہا سے یہ فرمایا کہ یہاں کا بادشاہ جابر و ظالم ہے اگر کسی حسین عورت کو دیکھتا ہے تو اُس کو زبردستی چھین لیتا ہے اور اُس کے ساتھی مرد کو اگر وہ اُس عورت کا شوہر ہے تو قتل کر ڈالتا ہے اور اگر کوئی دوسرا عزیز ہے تو اُس سے کوئی تعرض نہیں کرتا، تم چونکہ میری دینی بہن ہو اور اس سرزمین میں میرے اور تمہارے علاوہ دوسرا کوئی مسلمان نہیں ہے اس لیے تم اُس سے کہہ دینا کہ یہ میرا بھائی ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، اور جب شب میں اُس نے ارادۂ بد کیا تو اُس کا ہاتھ شل ہو کر رہ گیا اور وہ کسی طرح حضرت سارہ کو ہاتھ نہ لگا

[۱] بخاری جلد ۲ ص ۳۰۱

سکا۔ یہ دیکھ کر اُس نے سارہؓ سے کہا اپنے خدا سے دعا کر کہ میرا ہاتھ درست ہو جائے تو میں تجھ کو رہا کر دونگا سارہ نے دعا کی مگر اُس نے پھر ارادہ بد کیا، دوبارہ اُس کا ہاتھ شل ہو گیا، تیسری مرتبہ پھر یہی تمام قصہ پیش آیا تب اُس نے کہا کہ معلوم ہوتا ہے یہ "جن" ہے انسان نہیں ہے اس کو میرے پاس سے جلد لیجاؤ اور ساتھ ہی ہاجرہؓ کو حوالہ کر کے کہا کہ اُس کو بھی اپنے ساتھ لیجا میں نے تیرے حوالہ کیا۔ جب سارہ ہاجرہ کو ساتھ لے کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس پہنچیں تو اُنھوں نے حال دریافت کیا، سارہ نے مبارکباد دی اور کہا شکر ہے خدائے عزوجل کا کہ اُس نے ہم کو اس فاسق و فاجر سے نجات دی اور آپ کے لیے ایک خادمہ اور ساتھ کر دی۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے یہ حدیث نقل کر کے فرمایا "اے شریف النسب اہل عرب یہ ہیں وہ ہاجرہ جو تم سب کی ماں ہیں"

یہ حدیث مختلف طریقوں سے کتبِ احادیث میں منقول ہے، اس کے علاوہ بخاری میں ایک اور طویل حدیث ہے جو حدیثِ شفاعت کے نام سے موسوم ہے اور متعدد ابوابِ بخاری مثلاً سورۂ بقرہ کی تفسیر کے باب میں کتاب الاسترقاق میں، اور کتاب التوحید میں مذکور ہے۔ اس میں حضرت ابراہیم کا جو تذکرہ ہے اُس کا حاصل یہ ہے:۔

> میدانِ حشر میں جب سب مخلوق آدم، نوح علیہما السلام اور دوسرے انبیاء سے شفاعت کے لیے کہہ چکی تو حضرت ابراہیم کے پاس پہنچی اور اُن سے کہا کہ آپ خلیل الرحمٰن ہیں آپ ہماری سفارش بارگاہِ الٰہی میں کیجئے کہ جلد فیصلہ ہو۔ تو اُنھوں نے فرمایا کہ مجھ کو شرم آتی ہے اس لیے کہ میں نے دنیا میں تین جھوٹی باتیں کہی تھیں۔ انی سقیم، بل فعلہ کبیرھم اور اپنی بیوی سے کہا تھا کہ انی اخوك

بخاری کے علاوہ یہ روایت مسلم، مسند احمد، صحیح ابن خزیمہ، مستدرک حاکم، معجم طبرانی، مصنف ابن ابی شیبہ، ترمذی، اور مسند ابی عوانہ میں مختلف صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔

یہ روایت کتبِ حدیث میں اجمال و تفصیل کے لحاظ سے مختلف طریقوں سے روایت کی گئی ہے بعض میں صرف اجمالی طور پر اسی قدر تذکرہ ہے کہ ہر نبی اُس وقت اپنی لغزش کو بیان کرکے معذرت کرینگے کہ وہ شفاعت نہیں کرسکتے۔ اور بعض میں ابراہیم علیہم السلام کے جواب میں فقط "ثلٰث کذبات" ہی کا ذکر ہے اور بعض روایات میں اُن تینوں کی تفصیل ہے۔ اور ان ہی میں سے بعض روایات میں یہ تصریح بھی موجود ہے۔

ما منہا کذبۃ الا ما حل بہا عن دین اللہ — رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ابراہیم علیہ السلام کے ان تینوں جھوٹ میں سے ہر ایک صرف اللہ تعالیٰ کے دین کی مدافعت و حمایت ہی کے لیے تھا۔

بہر حال یہ دونوں روایات صحیحین (بخاری و مسلم) کی روایات ہیں جو ہر قسم کے سقم روایت سے پاک اور صاف ہیں، یہ روایات ابراہیم علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر اور مجدد انبیاء کی جانب "کذب" کی نسبت کررہی ہیں اگرچہ انہی روایات کے بعض طرقِ روایت نے یہ صاف کردیا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقعہ پر "کذب" سے مراد وہ عام معنی نہیں لیے جو اخلاقی بول چال میں نہایت شنیع اور گناہ کبیرہ میں شمار ہیں، بلکہ اس کے برعکس یہ واضح کیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے یہ تینوں باتیں نہ ذاتی غرض کے لیے کہی ہیں اور نہ دنیوی مصلحت کے پیشِ نظر بلکہ دشمنانِ خدا کے مقابلہ میں خالص اللہ تعالیٰ کے دین کی حمایت میں کہی ہیں مگر پھر بھی جو بات دل میں کھٹکتی اور قلب پر ایک بھاری بوجھ محسوس ہوتی ہے وہ حدیث کی یہ تعبیر ہے۔

یہ تسلیم، کہ روایت کی بعض تصریحات نے اُس کو "کذب" کے عام معنی سے جُدا کردیا تاہم اول تو یہ "زیادت" صحیحین میں مذکور نہیں اگرچہ صحیح روایت میں موجود ہے۔ دوسرے جبکہ "صدق لسانی" انبیاء علیہم السلام کی غیر منفک، اور عصمت نبی کے لیے ایک ضروری صفت ہے نیز جبکہ خصوصیت کے ساتھ قرآنِ عزیز نے ابراہیم علیہ السلام کے متعلق حسب ذیل امتیازات کا صراحت کے ساتھ ذکر فرمادیا ہے تو پھر اُن کے ساتھ صورۃً بھی کذب کی نسبت کیسی؟

(۱) واذکر فی الکتاب ابرٰھیم — اور یاد کر کتاب میں ابراہیم کا ذکر بیشک تھا وہ

انہ کان صدیقاً نبیا (مریم) — صدیق (صادق النفس) نبی۔

"صدیق" مبالغہ کا صیغہ ہے اور اسی ہستی پر اس کا اطلاق کیا جاتا ہے "صدق" جس کی ذاتی اور نفسیاتی صفت ہو۔

(۲) ان ابرٰھیم کان امۃ قانتا للہ — بیشک ابراہیم تھا راہ ڈالنے والا حکم بردار خالص اللہ

حنیفاً ولم یک من المشرکین — کی طرف جھکنے والا اور نہ تھا وہ مشرکوں میں سے خدا

شاکراً لانعمہ اجتبٰہ وھدٰہ — کی نعمتوں کا شکر گذار تھا خدا نے اُس کو چن لیا تھا

الی صراط مستقیم (النحل) — اور سیدھی راہ کی اُس کو ہدایت دی۔

مجتبیٰ اور مھدی ایسی صفات ہیں کہ جن کے ساتھ کذب نہ حقیقۃً جمع ہو سکتا ہے اور نہ صورۃً

(۳) ثم اوحینا الیک ان اتبع ملۃ — (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پھر ہم نے تیری طرف وحی بھیجی کہ تو

ابرٰھیم حنیفا (النحل) — ملتِ ابراہیم کی پیروی کر جو ابراہیم کہ خالص خدا کی جانب جھکنے والا ہے

یہ وہ ابراہیم ہیں جن کی ملت کی اقتدا اور پیروی کا حکم محمد رسول اللہ صلی اللہ اور اُن کی اُمتِ مرحومہ کو دیا جارہا ہے۔

(۴) ولقد اٰتینا ابرٰھیم رشدہ من — اور بلا شبہ ہم نے ابراہیم کو رشد و ہدایت شروع ہی سے

قبل وکنا بہ علمین (الانبیاء) — بخش دی تھی اور ہم ہی اُس کو جاننے والے ہیں۔

یہ اور اسی قسم کی بہت سی آیات حضرت ابراہیم کی اُن خصوصی صفات کا ذکر کرتی اور نصوصِ قطعیہ پیش کرتی ہیں کہ جن کے بعد ایک لمحہ کے لیے بھی اس جیسی مقدس اور جلیل القدر ہستی کے متعلق "کذب" کا تصور نہیں ہو سکتا، چہ جائیکہ وقوع اور عمل "خواہ وہ کذب حقیقی معنی میں ہو یا محض کذب کی صورت میں"

زیر بحث مسئلہ | اس مقام پر پہنچ کر یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ مسئلہ زیر بحث یہ نہیں ہے کہ "العیاذ باللہ"

ابراہیم علیہ السلام نے واقعی جھوٹ بولا۔ کیونکہ قرآنِ عزیز کی قطعی نصوص اور زیرِ بحث روایات کے علاوہ احادیثی نصوص ابراہیم علیہ السلام کو نبی، پیغمبر اور رسول بتاتی اور اُن کی امتیازی صفات صدیق، مجتبیٰ، مہدی، نبی حنیف، اور رسول، ثابت کرتی ہیں۔ نیز زیرِ بحث روایت میں بھی یہ واضح ہے کہ اُن کے یہ کلمات خدا کے دین کی حمایت و مدافعت کے لیے تھے نہ کہ کسی اور غرض سے۔ لہٰذا ایک لمحہ کے لیے بھی اس میں تردد کی گنجائش نہیں ہے کہ "کذب" اُن سے اسی طرح دور ہے جس طرح دن سے رات اور روشنی سے تاریکی۔ اور بلاشبہ وہ ایک نبیِ معصوم ہیں اور ہر قسم کی معصیت و گناہ سے پاک۔

البتہ زیرِ بحث مسئلہ یہ ہے کہ ان دو صحیح روایات میں ان تینوں باتوں کے متعلق رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے جلیل القدر پیغمبر کے بارہ میں "کذب" کی تعبیر کیوں فرمائی جبکہ آپ کی ذاتِ اقدس ضروریاتِ دین اور عقائدِ اسلامی کے بارہ میں ابہام اور گنجلک کو دور کرنے کا باعث ہے نہ کہ ابہام و التباس پیدا کرنے کا؟ خصوصاً جبکہ یہ تینوں باتیں خود اپنی جگہ کسی حال میں صورت میں کذب ہیں اور نہ حقیقی معنی ہیں۔

بلاشبہ حضرت سارہ حضرت ابراہیم کی دینی بہن تھیں اور بیوی کے رشتہ سے اسلامی اخوت کا رشتہ منقطع نہیں ہو جاتا، نیز ابن کثیر اور دوسرے مورخین کی تحقیق میں وہ اُن کے چچا حاران کی بیٹی تھیں اس لیے چچا زاد بہن بھی تھیں۔ اور بلاشبہ اُن کا مزاج ناساز تھا گو سخت بیماری نہ سہی اس لیے "اِنّی سقیم" ہر حیثیت سے صحیح ہے اور بلاشبہ اُنھوں نے مناظرانہ طرزِ خطابت میں دشمن کو لاجواب کرنے کے لیے فرمایا "بل فعلہ کبیرھم" اور یہ علمی دنیا میں کسی حیثیت سے بھی جھوٹ نہیں تھا۔ تو پھر ان ہر دو احادیث میں اس قدر سخت تعبیر کیوں اختیار کی گئی؟ اس اشکال کے جواب میں علماءِ اسلام نے دو راہیں اختیار فرمائی ہیں۔

(۱) یہ اخبارِ آحاد ہیں اس لیے جرأت کے ساتھ یہ کہہ دینا چاہیے کہ اگرچہ یہ روایتیں صحیحین کی ہیں اور اس لیے مشہور کی حد تک پہنچ گئی ہیں مگر راوی کو ان روایات میں سخت مغالطہ ہوا ہے۔ لہٰذا ہرگز قابلِ قبول نہیں ہیں اس لیے کہ ایک نبی کی جانب کذب کی نسبت کے مقابلہ میں راویوں کی غلطی کا اعتراف بدرجہا

بہتر اور صحیح طریق کار ہے۔

امام رازی (رحمہ اللہ) کا رجحان اسی جانب ہے اور اُنہوں نے اسی کو اختیار کیا ہے۔

(۲) یہ قطعی اور یقینی عقیدہ ہے کہ نبی اور رسول کی جانب "کذب" کی نسبت کسی حال میں درست نہیں ہے، ایسی صورت میں اگر مستند اور صحیح روایات میں جو کہ حدِ شہرت و تواتر کو پہنچ چکی ہوں اس قسم کی کوئی نسبت موجود ہو جو نبی کی نبوت کے شان کے منافی ہو تو اُن روایات کو صحیح مانتے ہوئے اُن خصوصی جملوں کی ایسی توجیہ کرنی چاہیے جس سے اصل مسئلہ پر بھی زد نہ پڑے اور صحیح روایات کا انکار بھی لازم نہ آئے۔ پس چونکہ صحیحین کی یہ روایات "تلقی بالقبول" کی وجہ سے صحت اور شہرت کے اُس درجہ اور مرتبہ کو پہنچ چکی ہیں جو اخبارِ آحاد میں شمار نہیں ہو سکتیں، اس لیے ان روایات کو مردود قرار نہیں دیا جا سکتا، بلکہ "ثلث کذبات" کے جملہ کی یہ توجیہ کرنی چاہیے کہ اس مقام پر کذب سے مُراد یہ ہے کہ "ایسا کلام جو صحیح اور پاک مقصد کے لیے بولا گیا ہو، لیکن مخاطب اُس کا وہ مطلب نہ سمجھے جو متکلم کی مراد ہے بلکہ ان الفاظ کو اپنی ذہنی مُراد کے مطابق سمجھے" اور یہ معنی صرف ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ کے لیے ہی نہیں تراشے گئے بلکہ علمِ بدیع کی اصطلاح میں اس کو "معاریض" کی اقسام میں شمار کیا گیا ہے اور فصحاء و بلغاء کے کلام میں اکثر رائج ہے۔

اس طرح روایات کا انکار بھی لازم نہیں آئیگا اور صداقتِ نبی کا مسئلہ بھی اپنی جگہ بغیر کسی غل و غش کے صحیح رہیگا، چنانچہ حدیثِ شفاعت کے وہ الفاظ "ما منها كذبة الا ماحل بها عن دين الله" ہماری اس توجیہ کی تائید کرتے ہیں جمہور علماءِ اسلام کی یہی رائے ہے اور وہ امام رازی اور اُن کے ہمنوا علماء کی پہلی رائے کو غلط قرار دیتے ہیں۔

مشہور مصری عالم عبد الوہاب نجار نے قصص الانبیاء میں امام رازی کی رائے کے ساتھ موافقت کی ہے اور مصری علماءِ عصر کی رائے کے خلاف جو دراصل جمہور کی تائید میں نجار کی رائے پر

تنقید کی شکل میں ظاہر کی گئی ہے"۔ کافی شرح وبسط کے ساتھ لکھا ہے جس میں حضرت ابراہیم و سارہ کے اس واقعہ سے انکار کیا ہے۔

مؤلف کی رائے | مگران ہر دو آراء سے الگ سادہ اور صاف راہ یہ ہے کہ صحیح حدیث کے انکار اور اُس کے الفاظ کی رکیک تاویل کیے بغیر ہی مسئلہ کو اس طرح حل کر دیا جائے کہ اصل مسئلہ "عصمتِ پیغمبر" پر بھی حرف نہ آنے پائے اور اس قسم کے مواقع سے ناجائز فائدہ اُٹھانے والوں، اور احادیثِ نبوی کے ساتھ تمسخر اور مذاق کرنے والوں کو بھی الحاد کی جرأت نہ ہو سکے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ "عصمتِ پیغمبر" کا مسئلہ بلاشبہ اصولِ دین اور مہماتِ عقائد میں سے ہے بلکہ دین و مذہب کی صداقت کی اساس و بنیاد صرف اسی ایک مسئلہ پر قائم ہے، کیونکہ یہ تسلیم کر لینے کے بعد کہ بعض حالات میں نبی اور پیغمبر بھی "کذب" کی کوئی نہ کوئی شکل و صورت اختیار کر سکتا ہے خواہ وہ حمایتِ حق ہی کے لیے کیوں نہ ہو۔ اُس کی لائی ہوئی تمام تعلیم سے یہ امتیاز اُٹھ جائیگا کہ اس میں سے کونسا جزء، اپنی حقیقی مراد کے ساتھ وابستہ ہے اور کون سا "کذب" کے رنگ میں رنگا ہوا، اور اگر یہ مان لیا جائے تو پھر دین، دین نہیں رہ سکتا اور نہ مذہب، مذہب۔

اس لیے قرآنِ عزیز کا یہ منصوص عقیدہ "عصمتِ پیغمبر" اپنی جگہ غیر متزلزل اور غیر متبدل عقیدہ ہے اور اس لیے بلاشبہ جو اس عقیدہ کی صداقت پر حرف گیری کا باعث بنے وہ خود اپنی جگہ یا قابلِ رد و انکار ہے اور یا اپنی صحتِ تعبیر کے لیے جوابدہ۔ پس اس محکم عقیدہ کو اپنی جگہ سے ہٹنے کی ضرورت پیش نہیں آئیگی بلکہ اُس سے معارض شے کو یا اُس کے مطابق ہونا پڑیگا ورنہ تو مٹ جانا ہوگا۔

اسی طرح یہ بھی امرِ مسلّم ہے کہ قرآنِ عزیز کی تفسیر و تشریح صرف لغتِ عرب سے ہی نہیں کیجا سکتی بلکہ جس طرح اُس کے مفہوم سمجھنے کے لیے "لغت کی معرفت" ضروری ہے اُسی طرح بلکہ اُس سے کہیں زیادہ پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، اعمال اور احوال کی معرفت کی ضرورت ہے جو کلام اللہ کی

صحیح توجیہ، تفسیر، اور تشریح کے حامل ہیں۔

بلاشبہ یہ حقیقت ہے کہ مثلاً قرآنی احکام "اقیموا الصلوٰۃ" "اٰتوا الزکوٰۃ" "اتموا الحج والعمرۃ" "فمن شهد منکم الشهر فلیصمه" میں نماز، زکوٰۃ، حج، اور روزہ کے مفہوم اور معنی کو ہم کسی طرح بھی "لغت عربی" کے ذریعہ متعین نہیں کرسکتے، اور تنہا یہ لغوی معنی و مفہوم قرآنی احکام کا مصداق نہیں بن سکتے بلکہ ان کی معرفت کے لیے ہم مجبور ہیں کہ پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے اُن اقوال و اعمال کی طرف رجوع کریں جو ان فرائض کی تفسیر و تشریح میں کہے گئے یا کیے گئے ہیں، اور یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ صرف تعامل کے ذریعہ ہم ان فرائض کی حقیقت سے آگاہ ہوسکیں۔ اس لیے کہ اگر دقتِ نظر سے کام لیا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ تعامل کا مبدأ بھی آخرِ کار قول و عملِ رسول پر ہی جا کر منتہی ہوتا ہے، لہذا پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول و عمل کو بھی جزو دین سمجھنا ضروری ہوجاتا ہے اور بغیر اس تسلیم و رضا کے آیت

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ	بلاشبہ خدا کے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں اس
حسنۃ لمن کان یرجوا اللہ والیوم	شخص کے لیے عمدہ نمونہ ہے جو اللہ اور آخرت کے
الاٰخر۔	دن پر اُمید لگاتا ہو۔

کے کوئی معنی نہیں بنتے، کیونکہ یہ "اسوۂ حسنہ" خود قرآن عزیز اور اُس کی آیات نہیں ہیں بلکہ اُس پیغمبر کا قول، عمل و حال ہی اسوۂ حسنہ ہے اور جبکہ پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ اقوال، اعمال اور احوال جزءِ دین ہیں تو ضروری تھا کہ اُن کی حفاظت کا ایسا سامان مہیا ہو جو "خاتم النبیین" کی اُمت کے لیے رہتی دنیا تک محفوظ طریقہ سے پہنچ سکے اور اس جوہرِ خالص میں جب کبھی کھوٹ کی ملاوٹ کی جائے تو اُس کے محافظین اور فن کے ماہرین فوراً دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر کے کھرے کھوٹے کو الگ کرسکیں، پس اسی طریقۂ حفاظت کا نام روایتِ حدیث اور نقدِ حدیث ہے اور اسی فن کو "فنِ حدیث" کہتے ہیں، اور یہی وہ شریف اور مقدس خدمت ہے جس نے اپنوں سے نہیں بلکہ غیروں سے بھی خراجِ تحسین حاصل کیا

ہے اور اس خدمت کو اسلام کا امتیازی نشان تسلیم کرایا ہے۔

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ان اقوال و اعمال کی روایت کی حفاظت کے سلسلہ میں کھرے اور کھوٹے کے امتیاز کے لیے زمانۂ نبوت سے اب تک جو خدمت ہوتی آ رہی ہے اُس کی اہمیت اس سے ظاہر ہو سکتی ہے کہ "روایتِ حدیث" کا فن تقریباً چودہ فنون اور شاخوں میں منقسم ہے۔

لہٰذا ازبس ضروری ہے کہ ہم کسی ایک ایسی روایت یا روایت کے جملہ کو "جو اپنی لفظی اور ظاہری تعبیر میں مسئلہ عقیدہ کے بارہ میں ابہام پیدا کرتا ہو" صحیح اور مقبول، مشہور اور متواتر روایاتِ حدیث کے انکار پر حجت و دلیل قائم نہ کرلیں اور اس کو انکارِ حدیث کا ذریعہ بنا کر قرآنِ عزیز کو ایک ایسی اجنبی کتاب نہ بنا دیں جس کی تعبیر کے لیے نہ کسی پیغمبر کے تفسیری اقوال ہیں اور نہ تشریحی اعمال بلکہ وہ کسی بڑے یا پہاڑ پر نازل ہوئی ہے اور صرف اپنی زبان کی لغت اور ڈکشنری سے حل کی جا سکتی ہے۔

ان دونوں باتوں کو پیشِ نظر رکھنے کے بعد اب مسئلۂ زیرِ بحث کو اس طرح حل کیا جا سکتا ہے کہ بخاری کی احادیث کو بلا شبہ "تلقی بالقبول" حاصل ہے اور یہ کتاب جرح و نقد پر کسے جانے اور پرکھے جانے کے بعد اُمت میں شہرت و قبولیت کا وہ درجہ رکھتی ہے کہ کتاب اللہ کے بعد اس کو اصح الکتب کہا جاتا ہے، تاہم یہ ممکن ہے کہ روایت بالمعنی ہونے کی وجہ سے اُس کی کسی روایت میں راوی سے لفظی تعبیر میں سقم ہو گیا ہو اور روایت اگرچہ اپنے سلسلۂ سند اور مجموعہ متن کے اعتبار سے اصولاً قابلِ تسلیم ہو مگر اُس کے اُس جملہ کی تعبیر کو سقیم سمجھا جائے اور اصل روایت کو رد کرنے کی بجائے صرف اُس کے سقم کو ظاہر کر دیا جائے۔ اس کی بہترین مثال بخاری کی حدیثِ معراج ہے۔

محدثین کا اس پر اتفاق ہے کہ مسلم کی حدیثِ اسریٰ عن انس رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں بخاری کی حدیث عن عبداللہ بن ابی نمرہ میں سقم ہے اور اُس کی ترتیب میں غلطیاں ہیں اور مسلم کی روایت ان اسقام و اغلاط سے پاک صاف ہے۔ حالانکہ یہ دونوں روایتیں نفسِ روایت کے

اعتبار سے صحیح اور قابلِ تسلیم ہیں

پس بغیر کسی شک اور تردد کے یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ حضرت ابراہیم سے متعلق دونوں طویل روایات "روایت بالمعنیٰ" کی قسم میں داخل ہیں، اور یہ دعویٰ ہرگز نہیں کیا جا سکتا کہ الفاظ اور جملوں کی یہ پوری نشست نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ حق ترجمان کے نکلے ہوئے الفاظ اور جملوں کی نشست ہے بلکہ آپ کے مفہوم اور معنی کو ادا کرتی ہیں۔ لہٰذا ہو سکتا ہے کہ ہر دو روایات میں بیان کردہ واقعات کی صحت کے باوجود زیرِ بحث الفاظ سلسلۂ سند کے کسی راوی کے اختلالِ لفظی کا نتیجہ ہوں اور اُس سے یہ تفسیری سقم پیدا ہو گیا ہو۔

اس کے لیے یہ قرینہ بھی ہے کہ حضرت ابراہیم و سارہ اور شاہ مصر کا یہ واقعہ توراۃ میں بھی مذکور ہے اور وہاں اس قسم کے غیر محتاط جملے بکثرت موجود ہیں لہٰذا یہ ممکن ہے کہ راوی کو اس اسرائیلی روایت اور صحیح روایت کے درمیان تعبیر میں خلط ہو گیا ہو اور اُس نے اس معاملہ کی تعبیر زیرِ بحث الفاظ سے کر دی۔

ہدایت قوم کے لیے حضرت ابراہیم کا اضطراب

گذشتہ سطور سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ابراہیم (علیہ السلام) اپنی قوم کی ہدایت کے لیے کس درجہ مضطرب اور بےچین تھے۔ اور دلائل و براہین کی وہ کونسی صورت ہو سکتی ہے جو اُنہوں نے حق کے آشکار کرنے میں صرف نہ کر دی ہو؟ سب سے پہلے اپنے باپ آزر کو سمجھایا پھر جمہور کے سامنے حق کی اُس روشنی کو پیش کیا، اور آخر میں نمرود سے مناظرہ کر کے اُس کے سامنے بھی احقاقِ حق کو بہتر سے بہتر اسلوب کے ساتھ ادا کیا، اور ہر لمحہ یہی سب کو تلقین کی کہ خدائے واحد کے علاوہ کسی کی پرستش جائز نہیں۔ اور اصنام پرستی اور کواکب پرستی کا نتیجہ خسران اور ذلت کے سوائے دوسرا نہیں ہے اس لیے شرک سے باز آنا چاہیے اور "ملتِ حنیفیہ" ہی کو صراطِ مستقیم سمجھنا چاہیے جس کی اساس و بنیاد صرف "توحیدِ الٰہی" پر قائم ہے۔

مگر بدبخت قوم نے کچھ نہ سُنا، اور کسی طرح رشد و ہدایت کو قبول نہ کیا اور ابراہیم (علیہ السلام) کی

بیوی حضرت سارہ (رضی اللہ عنہا) اور اُن کے برادر زادہ حضرت لوط (علیہ السلام) کے علاوہ کوئی ایک بھی ایمان نہیں لایا۔ اور تمام قوم نے عداوت و دشمنی کو اُس حد پر پہنچا دیا جس کے متعلق گذشتہ صفحات میں سُن چکے ہو۔ کہ اُنہوں نے حضرت ابراہیم کو جلا دینے کا فیصلہ کرلیا، اور دہکتی آگ میں ڈال دیا۔

پس جب خدائے تعالےٰ نے دشمنوں کے ارادوں کو ذلیل و رسوا کرکے حضرت ابراہیم کے حق میں "نار" کو "بردوسلام" بنا دیا تو اب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ارادہ کیا کہ کسی دوسری جگہ جا کر پیغامِ الٰہی سنائیں اور دعوتِ حق پہنچائیں اور یہ سوچ کر "فدان آرامؑ" سے ہجرت کا ارادہ کرلیا؟

وَقَالَ اِنِّی ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّی سَیَهْدِیْنِ ۔ — اور ابراہیم نے کہا "میں جانے والا ہوں اپنے پروردگار کی طرف قریب ہی وہ میری رہنمائی کریگا۔

یعنی اب مجھے کسی ایسی آبادی میں ہجرت کرکے چلا جانا چاہیے جہاں خدا کی آواز گوشِ حق نیوش سے سُنی جائے۔ خدا کی زمین تنگ نہیں ہے یہ نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی، میرا کام پہنچانا ہے، خدا اپنے دین کی اشاعت کا سامان خود پیدا کردیگا۔

اُور کلدانیین کی جانب ہجرت

بہرحال حضرت ابراہیم اپنے والد آزر اور قوم سے جُدا ہوکر فرات کے غربی کنارہ کے قریب ایک بستی میں چلے گئے جو اُور کلدانیین کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں کچھ عرصہ قیام کیا، اور حضرت لوط (علیہ السلام) اور حضرت سارہ (رضی اللہ عنہا) ہم سفر رہیں، اور کچھ دنوں کے بعد یہاں سے حرّان یا حاران کی جانب روانہ ہوگئے اور وہاں "دینِ حنیف" کی تبلیغ شروع کردی۔ مگر اس عرصہ میں برابر اپنے والد آزر کے لیے بارگاہِ الٰہی میں استغفار کرتے، اور اُس کی ہدایت کے لیے دعا مانگتے رہے۔ اور یہ سب کچھ اس لیے کیا کہ وہ نہایت رقیق القلب، رحیم اور بہت ہی نرم دل و بردبار تھے اس لیے آزر کی جانب سے ہر قسم کی عداوت کے مظاہروں کے باوجود اُنہوں نے آزر سے یہ وعدہ کیا تھا کہ اگرچہ میں

لہ بابل کی حکومتِ نماردہ میں ایک مشہور شہر تھا، یہ حضرت ابراہیم کا مولد ہے۔

تجھ سے جُدا ہو رہا ہوں اور افسوس کہ تو نے خدا کی رشد و ہدایت پر توجہ نہ کی تاہم میں برابر تیرے حق میں خدا سے مغفرت کی دعا کرتا رہونگا۔ آخر کار حضرت ابراہیم کو وحی الٰہی نے مطلع کیا کہ آزر ایمان لانے والا نہیں ہے اور یہ اُن ہی اشخاص میں سے ہے جنہوں نے اپنی نیک استعداد کو فنا کر کے خود کو اس کا مصداق بنالیا

ختم اللہ علیٰ قلوبھم وعلیٰ سمعھم — اللہ نے مہر لگادی اُن کے دلوں پر اور اُن کے کانوں

وعلیٰ ابصارھم غشاوہ (بقرہ) — پر اور اُن کی آنکھوں پر پردہ ہے۔

حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو جب یہ معلوم گیا تو آپ نے آزر سے اپنی براءت کا صاف صاف اعلان کر دیا کہ جو اُمید موہوم میں نے لگا رکھی تھی آج وہ بھی ختم ہوگئی، اس واقعہ کو سورۂ توبہ کی اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے۔

وما کان استغفار ابراھیم لابیہ — اور نہ تھا ابراہیم کا استغفار اپنے باپ کے لیے مگر اُس وعدہ

الا عن موعدۃ وعدھا ایاہ — کے مطابق جو اُس نے اپنے باپ سے کیا تھا، پھر جب

فلما تبین لہ انہ عدو للہ تبرأ — اُس پر یہ ظاہر ہوگیا کہ یہ خدا کا دشمن ہے (یعنی اس کا

منہ ان ابراھیم لاواہ حلیم۔ (توبہ) — آخری انجام یہی ہوگا) تو اُس سے بیزاری کا اظہار کر دیا،

(توبہ) — بیشک ابراہیم بیحد رقیق القلب بردبار۔

ہجرتِ فلسطین ابراہیم (علیہ السلام) اس طرح تبلیغ کرتے کرتے فلسطین پہنچے اس سفر میں بھی اُن کے ہمراہ حضرت سارہ، حضرت لوطؑ اور لوط علیہ السلام کی بیوی تھیں سورۂ عنکبوت میں ہے۔

فاٰمن لہ لوط وقال انی مھاجر — پس لوط، ابراہیم پر ایمان لے آیا اور کہنے لگا میں اپنے

الیٰ ربی انہ ھو العزیز الحکیم۔ — پروردگار کی طرف ہجرت کرنے والا ہوں، بیشک

(عنکبوت) — وہ غالب ہے حکمت والا ہے۔

روایات میں آتا ہے کہ جب حضرت عثمان ذی النورین (رضی اللہ عنہ) اپنی زوجۂ مطہرہ حضرت رقیہ بنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حبشہ کو ہجرت کر گئے تو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

ان عثمان اوّل مھاجر باھلہ بعد لوط (الحدیث) — بلا شبہ لوط علیہ السلام کے بعد عثمان پہلے مہاجر ہیں جنہوں نے اپنی بیوی سمیت ہجرت کی۔

حضرت ابراہیم نے فلسطین کے غربی اطراف میں سکونت اختیار کی۔ اُس زمانہ میں یہ علاقہ کنعانیوں کے زیرِ اقتدار تھا۔ پھر قریب ہی شکیم (نابلس) میں چلے گئے اور وہاں کچھ عرصہ قیام کیا، اس کے بعد یہاں بھی زیادہ مدت قیام نہیں فرمایا اور غرب ہی کی جانب بڑھتے چلے گئے۔ حتیٰ کے مصر تک جا پہنچے

ہجرت مصر اور حضرت ہاجرہ رضؓ

جب نابلس سے چل کر مصر پہنچے تو بخاری و مسلم کی روایت کے مطابق ملک جبّار کا وہ واقعہ پیش آیا جو گذشتہ سطور میں سپردِ قلم ہو چکا ہے۔ اور تورات میں اس قصہ کو اس طرح نقل کیا گیا ہے

سو جب ابرام مصر پہنچا مصریوں نے اُس عورت کو دیکھا کہ وہ نہایت خوبصورت ہے اور فرعون کے امیروں نے بھی اُسے دیکھا اور فرعون کے حضور میں اُس کی تعریف کی اور اُس عورت کو فرعون کے گھر میں لے گئے، اور اُس نے اُس کے سبب ابرام پر احسان کیا کہ اُس کو بھیڑ بکری اور گائے بیل اور گدھے اور غلام اور لونڈی اور گدھیاں اور اونٹ ملے۔ پھر خداوند نے فرعون اور اُس کے خاندان کو ابرام کی جورو سری کے سبب بڑی مار ماری۔ تب فرعون نے ابرام کو بلا کر اُس سے کہا کہ تو نے مجھ سے یہ کیا کیا؟ کیوں نہ جتایا کہ یہ میری جورو ہے، تو نے کیوں کہا کہ وہ میری بہن ہے؟ یہاں تک کہ میں نے اُسے اپنی جورو بنانے کو لیا۔ دیکھ یہ تیری جورو حاضر ہے اُس کو لے اور چلا جا، اور فرعون نے اُس کے حق میں لوگوں کو حکم کیا تب اُنہوں نے اُسے اور اُس کی جورو کو اور جو کچھ اُس کا تھا روانہ کیا۔[1]

صحیحین (بخاری و مسلم) کی روایت اور تورات کی اس روایت کے درمیان یہ اختلاف ہے کہ صحیحین کی روایت میں حضرت سارہ کے بد دعاء والے واقعہ کو ملکِ جبار "فرعون" نے شیطانی (جنی) اثر سے سمجھ کر سارہ

---

[1] پیدائش باب ۱۲ آیت ۱۴-۲۰۔ تورات

جان چھڑائی اور حضرت ہاجرہ کو اُن کے حوالہ کر کے ابراہیم (علیہ السلام) کو مع ان کے رفقاء اور ساز و سامان کے مصر سے چلے جانے کی اجازت دی فتح الباری میں ہے کہ مصری "جن" کی عظمت کے قائل تھے اس لیے شیطان سے مراد یہاں جن ہے

اور توراۃ کی روایت یہ کہتی ہے کہ فرعونِ مصر نے سارہ کے واقعہ کو کرامت یقین کیا، اور حضرت ابراہیم پر یہ عتاب کیا کہ اُنھوں نے شروع ہی سے یہ کیوں نہ بتا دیا کہ سارہ اُن کی بہن نہیں ہے بلکہ بیوی ہے اور پھر بڑے انعام و اکرام اور عزت کے ساتھ اُن کو مصر سے رخصت کیا۔ توراۃ کی روایت کے مطابق اس وقت سارہ کی عمر ستر سال کی تھی۔

بہرحال صحیحین کی روایت ہو یا توراۃ کی معنی اور مفہوم کے اعتبار سے دونوں روایات قریب قریب ہیں اور دونوں کے درمیان کوئی بنیادی اختلاف نہیں ہے۔

البتہ ان تمام روایات سے اس قدر یقینی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اپنی بیوی سارہؓ اور اپنے برادر زادہ حضرت لوطؑ کے ساتھ مصر تشریف لے گئے اور یہ وہ زمانہ ہے جبکہ مصر کی حکومت ایسے خاندان کے ہاتھ میں ہے جو سامی قوم سے تعلق رکھتے، اور اس طرح حضرتِ ابراہیم سے نسبی سلسلہ میں وابستہ تھے۔ یہاں پہنچ کر ابراہیم علیہ السلام اور فرعونِ مصر کے درمیان ضرور کوئی ایسا واقعہ پیش آیا جس سے اُس کو یقین ہو گیا کہ ابراہیم اور اُس کا خاندان خدا کا مقبول اور برگزیدہ خاندان ہے۔ یہ دیکھ کر اُس نے حضرتِ ابراہیم علیہ السلام اور اُن کی بیوی حضرت سارہ رضی اللہ عنہا کا بہت اعزاز کیا اور اُن کو ہر قسم کے مال و منال سے نوازا، اور صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنے قدیم خاندانی رشتہ کو مضبوط اور مستحکم کرنے کے لیے اپنی بیٹی ہاجرہ کو بھی اُن کی زوجیت میں دے دیا، جو اُس زمانہ کے رسم و رواج کے اعتبار سے پہلی اور بڑی بی بی کی خدمتگذار قرار پائیں، چنانچہ اس تاریخی قیاس کی سب سے بڑی شہادت خود یہود کے یہاں بھی موجود ہے۔

سِفرالیشار میں (جو یہودیوں کی ایک معتبر تاریخ ہے) مذکور ہے کہ حضرت ابراہیم کے زمانہ میں مصر کا بادشاہ حضرت کا ہموطن تھا[1]۔

[1] ارض القرآن جلد ۲ ص ۱۴۱

اور اسی طرح یہود کی معتبر روایات سے یہ مسئلہ بھی صاف اور روشن ہو جاتا ہے کہ حضرت ہاجرہؓ شاہِ مصر فرعون کی بیٹی تھیں، لونڈی اور باندی نہ تھیں۔ تورات کا ایک معتبر اور مشہور مفسر ربی شلوم پیدائش باب ۱۶ آیت ۱ کی تفسیر میں لکھتا ہے:۔

ہاجرہ فرعون کی بیٹی بھی تھی فرعون نے جب سارہ کی کرامات دیکھی تو کہا کہ اس کے گھر میں لونڈی بن کر رہنا، دوسرے کے گھر میں بی بی بن کر رہنے سے بہتر ہے[۲]۔

اس تفسیر اور تورات کی آیت کو جمع کرنے سے یہ حقیقت بخوبی آشکارا ہو جاتی ہے کہ تورات میں ہاجرہ کو صرف اسی لیے لونڈی کہا گیا کہ شاہِ مصر نے اُن کو سارہ اور ابراہیم کے سپرد کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ وہ سارہ کی خدمت گذار رہیگی، یہ مطلب نہ تھا کہ وہ لونڈی بمعنی "جاریہ" ہیں اس لیے کہ ربی شلوم تصریح کرتا ہے کہ ہاجرہ فرعونِ مصر کی بیٹی تھیں۔

بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ملکِ جبار کی جو روایت مذکور ہے اُس میں بھی یہ جملہ موجود ہے اور ربی شلوم کی تفسیر کی تائید کرتا ہے۔

واخدمها هاجرة[۳] اور ہاجرہ کو سارہ کے حوالہ کر دیا کہ اُن کی خدمت گذار رہے۔

اس لیے بنی اسرائیل کا یہ طعن کہ بنی اسمٰعیل ہم سے اس لیے کمتر ہیں کہ وہ لونڈی سے ہیں اور ہم حضرت ابراہیم کی بیوی سارہ سے صحیح نہیں ہے اور واقعہ اور تاریخ دونوں کے خلاف ہے اور جس طرح تورات میں دوسرے مضامین میں تحریف کی گئی ہے اسی طرح اس واقعہ میں بھی تحریف کی گئی ہے۔ اور واقعہ کی تمام تفصیلات کو حذف کر کے صرف "لونڈی" کا لفظ باقی رہنے دیا گیا ہے۔

ہاجرہ اصل میں عبرانی لفظ "ہاغار" ہے جس کے معنی بیگانہ اور اجنبی کے ہیں[۴]۔ ان کا وطن چونکہ مصر تھا

---

[۱] اور سری ابرام کی جورو کوئی لڑکا نہ جنی اور اُس کی ایک مصری لونڈی تھی جس کا نام ہاجرہ تھا [۲] ارض القرآن جلد ۲ ص ۴۱
[۳] بخاری باب الانبیاء جلد ۶ صفحہ ۳۰ [۴] ارض القرآن جلد ۲ ص ۴۰

اس لیے یہ نام پڑگیا لیکن اسی اصول کے پیشِ نظر زیادہ قرینِ قیاس یہ ہے کہ "ہاغار" کے معنی "جُدا ہونے والے کے ہیں اور عربی میں "ہاجر" کے معنی بھی یہی ہیں۔ یہ چونکہ اپنے وطن مصر سے جُدا ہو کر یا ہجرت کر کے حضرت ابراہیم کی شریکِ حیات اور حضرت سارہ کی خدمت گذار بنیں اس لیے ہاجرہ کہلائیں۔

حضرت اسمٰعیل (علیہ السلام)

اسمٰعیل (علیہ السلام) کی ولادت

حضرت ابراہیم ابھی تک اولاد سے محروم تھے اور اُن کے گھر کا مالک ایک خانہ زاد الیعزر دمشقی تھا۔ ایک روز حضرت ابراہیم نے خدائے تعالیٰ کی بارگاہ میں فرزند کے لیے دعا کی، اور اللہ تعالیٰ نے اُن کی دعا کو قبول فرمالیا اور اُن کو تسلّی دی۔

ابرام نے کہا کہ اے خداوند خدا تو مجھ کو کیا دیگا میں تو بے اولاد جاتا ہوں اور میرے گھر کا مختار الیعزر ہے۔ پھر ابرام نے کہا کہ تو نے مجھے فرزند نہ دیا۔ اور دیکھ میرا خانہ زاد میرا وارث ہوگا۔ تب خداوند کا کلام اُس پر اُترا اور اُس نے کہا کہ یہ تیرا وارث نہیں ہونے کا بلکہ جو تیری صُلب سے پیدا ہو وہی تیرا وارث ہوگا۔[1]

اور یہ دعا اس طرح قبول ہوئی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی چھوٹی بی بی حضرتِ ہاجرہ حاملہ ہوئیں۔

اور وہ ہاجرہ کے پاس گیا اور وہ حاملہ ہوئی۔[2]

جب حضرتِ سارہ کو یہ پتہ چلا تو انہیں بہ تقاضائے بشریت ہاجرہ سے رشک پیدا ہو گیا اور انہوں نے حضرت ہاجرہ کو تنگ کرنا شروع کر دیا، حضرت ہاجرہ مجبور ہو کر اُن کے پاس سے چلی گئیں۔

اور خداوند کے فرشتے نے اُسے میدان میں پانی کے ایک چشمہ کے پاس پایا یعنی اُس چشمہ کے پاس جو سور کی راہ پر ہے اور اُس نے کہا کہ اے سری کی لونڈی ہاجرہ تو کہاں سے آئی؟ اور کدھر جاتی ہے؟ وہ بولی کہ میں اپنی بی بی سری کے سامنے سے بھاگی ہوں۔ اور خداوند کے فرشتے نے اُسے کہا کہ تو اپنی بیوی کے پاس پھر جا اور اُس کے تابع رہ۔ پھر خداوند کے فرشتہ نے اُسے کہا کہ میں تیری اولاد کو بہت بڑھاؤنگا کہ

---

[1] توراۃ پیدائش باب ۱۵ آیت ۲-۴ [2] توراۃ پیدائش باب ۱۶ آیت ۴۔

وہ کثرت سے گنی نہ جائے اور خداوند کے فرشتہ نے اُسے کہا کہ تو حاملہ ہے، اور ایک بیٹا جنیگی، اس کا نام اسمٰعیل رکھنا کہ خداوند نے تیرا دُکھ سُن لیا۔ اور وہ وحشی (بدوی) آدمی ہوگا۔ اُس کا ہاتھ سب کے اور سب کے ہاتھ اُس کے برخلاف ہونگے اور وہ اپنے سب بھائیوں کے سامنے بود و باش کریگا۔[1]

حضرت ہاجرہ جس مقام پر فرشتہ سے ہمکلام ہوئیں اس جگہ ایک کنواں تھا۔ ہاجرہ نے یادگار کے طور پر اُس کا نام "زندہ نظر آنے والے کا کنواں" رکھا۔ تھوڑے عرصہ کے بعد ہاجرہ کے بیٹا پیدا ہوا اور فرشتہ کی بشارت کے مطابق اُس کا نام اسمٰعیل رکھا گیا۔

"اور ہاجرہ ابرام کے لیے بیٹا جنی اور ابرام نے اپنے اُس بیٹے کا نام جو ہاجرہ جنی اسمٰعیل رکھا اور جب ابرام کے لیے ہاجرہ سے اسمٰعیل پیدا ہوا تب ابرام چھیاسی برس کا تھا۔"[2]

اللہ تعالیٰ نے اسمٰعیلؑ کے بعد ابراہیم علیہ السلام کو اسحٰقؑ کی بشارت دی جیسا کہ ابھی مفصل ذکر آئیگا۔ مگر ابراہیم علیہ السلام نے اس بشارت پر چنداں مسرت کا اظہار نہیں کیا اور اس کی جگہ یہ دعا مانگی

"اور ابراہام نے خدا سے کہا کاش کہ اسمٰعیل تیرے حضور جیتا رہے۔"[3]

اور اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کی اس دعا کا یہ جواب دیا۔

"اسمٰعیل کے حق میں میں نے تیری سُنی، دیکھ میں اُسے برکت دونگا، اور اُسے برومند کرونگا، اور اُس کو بہت بڑھاؤنگا، اور اُس سے بارہ سردار پیدا ہونگے اور میں اُس کو بڑی قوم بناؤنگا۔"[4]

اسمٰعیل "اسمع" اور "ایل" دو لفظوں سے مرکب ہے، عبرانی میں "ایل" "اللہ" کے مرادف ہے اور عربی کے اسمع اور عبرانی کے شماع کے معنیٰ ہیں "سُن" چونکہ اسمٰعیل علیہ السلام کی ولادت کے بارہ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کی دعا سُن لی اور ہاجرہ کو فرشتہ سے بشارت ملی اس لئے اُن کا یہ نام رکھا گیا۔ عبرانی میں

---

[1] تورات پیدائش باب ۱۶ آیت ۷-۱۲ [2] پیدائش باب ۱۶ آیت ۱۵-۱۶ [3] پیدائش باب ۱۷ آیت ۱۸ [4] پیدائش باب ۱۷ آیت ۲۰

اس کا تلفظ "شماع ایل" ہے۔

وادی غیر ذی زرع اور ہاجرہ و اسمٰعیل

حضرت ہاجرہ کے بطن سے اسمٰعیلؑ کا پیدا ہو جانا حضرت سارہ پر بیحد شاق گذرا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پہلی اور بڑی بیوی، قدیم سے گھر کی مالکہ، ہاجرہ چھوٹی بیوی اور اُن کی خدمتگذار۔ یہ سب باتیں تھیں جنہوں نے بشری تقاضا کے پیش نظر اسمٰعیل کی ولادت کو سارہؑ کے لیے سوہان روح بنا دیا تھا۔ اس لیے سارہ نے حضرت ابراہیم سے اصرار کیا کہ ہاجرہ اور اس کا بچہ اسمٰعیل میری نگاہ کے سامنے نہ رہیں، ان کو علیحدہ کسی جگہ لیجاؤ۔

حضرت ابراہیم کو یہ اصرار بیحد ناگوار گذرا مگر اللہ تعالیٰ نے اُن کو مطلع کیا کہ ہاجرہ، اسمٰعیل اور تیرے لیے مصلحت اسی میں ہے کہ سارہ جو کچھ کہتی ہے اُس کو مان لے۔

"اور سرہ نے دیکھا کہ ہاجرہ مصری کا بیٹا جو وہ ابراہیم سے جنی تھی ٹھٹھے مارتا ہے تب اُس نے ابراہام سے کہا کہ اس لونڈی کا بیٹا میرے بیٹے اضحق کے ساتھ وارث نہ ہوگا، پھر اپنے بیٹے کی خاطر یہ بات ابراہیم کی نظر میں نہایت بُری معلوم ہوئی۔ خدا نے ابراہام سے کہا کہ وہ بات اس لڑکے اور تیری لونڈی کی بابت تیری نظر میں بُری نہ معلوم ہو۔ ہر ایک بات کے حق میں جو سرہ نے تجھے کہی اس کی آواز پر کان رکھ، کیونکہ تیری نسل اضحاق سے کہلائیگی، اور اس لونڈی کے بیٹے سے بھی میں ایک قوم پیدا کرونگا، اس لیے کہ وہ تیری نسل ہے[1]۔

توراۃ کی اس روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت حضرت اسحٰق پیدا ہو چکے تھے اس لحاظ سے حضرت اسمٰعیلؑ سن رُشد کو پہنچ چکے ہونگے کیونکہ توراۃ ہی کی روایت کے مطابق حضرت اسمٰعیل حضرت اسحٰق سے تیرہ سال بڑے ہیں۔

لیکن اسی واقعہ میں توراۃ کی دوسری آیات مسطورۂ بالا آیات کے خلاف یہ کہتی ہیں کہ حضرت اسمٰعیل

---

[1] توراۃ پیدائش ۲۱ آیت ۹-۱۳۔

ابھی شیر خوار بچہ تھے۔

"تب ابراہام نے صبح سویرے اُٹھ کر روٹی اور پانی کی ایک مشک لی اور ہاجرہ کو اُس کے کاندھے پر دھر کر دی اور اُس لڑکے کو بھی اور اُسے رخصت کیا۔ وہ روانہ ہوئی اور بیرسبع کے بیابان میں بھٹکتی پھرتی تھی، اور جب مشک کا پانی چک گیا تب اُس نے اُس لڑکے کو ایک جھاڑی کے نیچے ڈال دیا اور آپ اس کے سامنے ایک پتھر کے ٹپے پر دور جا بیٹھی کیونکہ اُس نے کہا میں لڑکے کا مرنا نہ دیکھوں[1]۔

اس لیے توراۃ کے ان مخالف و متضاد بیانات کے مقابلہ میں صحیح قول یہ ہے کہ ہاجرہ و اسمٰعیل کے خروج کے وقت اسمٰعیل شیر خوار بچہ تھے اور اسحٰقؑ ابھی تک پیدا نہیں ہوئے تھے۔

بخاری میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے جو روایت منقول ہے وہ بھی اسی قول کی تائید کرتی ہے۔ اس روایت کا مضمون یہ ہے:-

"ابراہیم (علیہ السلام) ہاجرہ اور اُس کے شیر خوار بچہ اسمٰعیل کو لے کر چلے اور جہاں آج کعبہ ہے اُس جگہ ایک بڑے درخت کے نیچے زمزم کے موجودہ مقام سے بالائی حصہ پر اُن کو چھوڑ گئے۔ وہ جگہ ویران اور غیر آباد تھی اور پانی کا بھی نام و نشان نہ تھا، اس لیے ابراہیم نے ایک مشکیزہ پانی اور ایک تھیلی کھجور بھی اُن کے پاس چھوڑ دیں اور پھر مُنہ پھیر کر روانہ ہو گئے۔ ہاجرہ اُن کے پیچھے پیچھے یہ کہتی ہوئی چلیں اے ابراہیم تم ہم کو ایسی وادی میں کہاں چھوڑ کر چل دیے جہاں نہ آدمی ہے نہ آدم زاد اور نہ کوئی مونس و غمخوار۔ ہاجرہ برابر یہ کہتی جاتی تھیں مگر ابراہیم علیہ السلام خاموش چلے جا رہے تھے۔ آخر ہاجرہ نے دریافت کیا۔ کیا خدا نے تجھ کو یہ حکم دیا ہے؟ تب حضرت ابراہیم نے فرمایا "ہاں، یہ خدا کے حکم سے ہے" ہاجرہ نے جب یہ سُنا تو کہنے لگیں اگر یہ خدا کا حکم ہے تو بلاشبہ وہ ہم کو ضائع اور برباد نہیں کریگا۔ اور پھر واپس لوٹ آئیں۔

ابراہیم چلتے چلتے جب ایک ٹیلہ پر ایسی جگہ پہنچے کہ اُن کے اہل و عیال نگاہ سے اوجھل ہو گئے

[1] پیدائش ۲۱۔ آیت ۱۴-۱۶۔

تو اُس جانب جہاں کعبہ ہے رُخ کیا اور ہاتھ اُٹھا کر یہ دعا مانگی :-

رَبَّنَآ اِنِّیٓ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ	اے ہم سب کے پروردگار! (تو دیکھ رہا ہے کہ) ایک ایسے میدان
بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِکَ	میں جہاں کھیتی کا نام و نشان نہیں ہیں نے اپنی بعض اولاد
الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ	تیرے محترم گھر کے پاس لا کر بسائی ہے، اور خدایا! اس لیے
فَاجْعَلْ اَفْئِدَۃً مِّنَ النَّاسِ	بسائی ہے کہ نماز قائم رکھیں (تاکہ یہ محترم گھر عبادت گزارانِ توحید
تَھْوِیٓ اِلَیْھِمْ وَارْزُقْھُمْ مِّنَ	سے خالی نہ رہے) پس تو اپنے (فضل و کرم سے) ایسا کر کہ لوگوں
الثَّمَرٰتِ لَعَلَّھُمْ یَشْکُرُوْنَ ۔	کے دل اُن کی طرف مائل ہو جائیں، اور اُن کے لیے زمین کی
(ابراہیم)	پیداوار کے سامانِ رزق مہیا کر دے تاکہ تیرے شکر گذار رہیں!

ہاجرہ چند روز تک مشکیزہ سے پانی اور خورجی سے کھجوریں کھاتی اور اسمٰعیل کو دودھ پلاتی رہیں لیکن وہ وقت بھی آگیا کہ نہ پانی رہا نہ کھجوریں تب وہ سخت پریشان ہوئیں چونکہ وہ بھوکی پیاسی تھیں اس لیے دودھ بھی نہ اُترتا تھا اور بچہ بھی بھوکا پیاسا رہا۔ جب حالت دگرگوں ہونے لگی اور بچہ بیتاب ہونے لگا تو ہاجرہ، اسمٰعیل کو چھوڑ کر دور جا بیٹھیں تاکہ اس حالتِ زار میں اس کو اپنی آنکھ سے نہ دیکھیں۔ کچھ سوچ کر قریب کی پہاڑی صفا پر چڑھیں کہ شاید کوئی اللہ کا بندہ نظر آجائے یا پانی نظر آجائے مگر کچھ نظر نہ آیا۔ پھر بچہ کی محبت میں دوڑ کر وادی میں آگئیں اُس کے بعد دوسری جانب کی پہاڑی مروہ پر چڑھ گئیں، اور وہاں بھی جب کچھ نہ نظر آیا تو پھر تیزی سے لوٹ کر وادی میں بچے کے پاس آگئیں، اور اس طرح سات مرتبہ کیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مقام پر پہنچ کر فرمایا کہ یہی وہ "سعی بین الصفا والمروۃ" ہے جو حج میں لوگ کرتے ہیں۔ آخر میں جب وہ مروہ پر تھیں تو کانوں میں ایک آواز آئی، چونکیں اور دل میں کہنے لگیں کہ کوئی پکارتا ہے۔ کان لگایا تو پھر آواز آئی۔ ہاجرہ کہنے لگیں اگر تم مدد کر سکتے ہو تو سامنے آؤ تمہاری آواز سُنی گئی۔ دیکھا تو خدا کا فرشتہ (جبرئیل) ہے۔ فرشتہ نے اپنی ایڑی (یا پیر) اُس جگہ مارا

جہاں زمزم ہے۔ اُس جگہ سے پانی اُبلنے لگا۔ ہاجرہ نے یہ دیکھا تو پانی کے چاروں طرف باڑ بنانے لگیں مگر پانی برابر اُبلتا رہا۔

اس جگہ پہنچ کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ اُم اسمٰعیل پر رحم کرے، اگر وہ زمزم کو اس طرح نہ روکتیں اور اُس کے چار جانب باڑھ نہ لگاتیں تو آج وہ زبردست چشمہ ہوتا۔

ہاجرہ نے پانی پیا اور پھر اسمٰعیل کو دودھ پلایا۔ فرشتہ نے ہاجرہ سے کہا خوف اور غم نہ کر اللہ تعالیٰ تجھ کو اور اس بچہ کو ضائع نہ کریگا۔ یہ مقام "بیت اللہ" ہے جس کی تعمیر اس بچہ (اسمٰعیل) اور اس کے باپ ابراہیم کی قسمت میں مقدر ہو چکی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ اس خاندان کو ہلاک نہیں کریگا۔ بیت اللہ کی یہ جگہ قریب کی زمین سے نمایاں تھی مگر پانی کا سیلاب داہنے بائیں اُس بلند حصہ کو برابر کرتا جا رہا تھا۔ اسی دوران میں بنی جرہم کا ایک قبیلہ اس وادی کے قریب آکر ٹھہرا، دیکھا تو تھوڑے سے فاصلہ پر پرند اُڑ رہے ہیں، جرہم نے کہا یہ پانی کی علامت ہے۔ وہاں ضرور پانی موجود ہے۔ وہ وہاں سے چل کر اس مقام پر پہنچے جہاں ہاجرہ اور اسمٰعیل مقیم تھے۔ دیکھا تو واقعی پانی موجود ہے۔ جرہم نے بھی قیام کی اجازت مانگی، ہاجرہ نے فرمایا قیام کر سکتے ہو لیکن پانی میں ملکیت کے حصہ دار نہیں ہو سکتے۔ جرہم نے یہ بات بخوشی منظور کرلی۔ اور وہیں مقیم ہو گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہاجرہ خود بھی باہمی انس و رفاقت کے لیے یہ چاہتی تھیں کہ کوئی یہاں آکر مقیم ہو۔ اس لیے اُنھوں نے مسرت کے ساتھ بنی جرہم کو قیام کی اجازت دیدی۔

جرہم نے آدمی بھیج کر اپنے باقی ماندہ اہل خاندان کو بھی بُلالیا اور یہاں مکانات بنا کر رہنے سہنے لگے اُن ہی میں اسمٰعیل بھی رہتے اور کھیلتے اور اُن سے اُن کی زبان سیکھتے۔ جب اسمٰعیل بڑے ہو گئے تو اُن کا طرز و انداز اور اُن کی خوبصورتی بنی جرہم کو بہت بھائی اور اُنھوں نے اپنے خاندان کی لڑکی سے اُن کی شادی کردی، اس کے کچھ عرصہ بعد ہاجرہ کا انتقال ہو گیا، ابراہیم برابر اپنے اہل و عیال کو دیکھنے

آتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ تشریف لائے تو اسمٰعیل گھر پر نہ تھے اُن کی اہلیہ سے دریافت کیا تو اُنھوں نے جواب دیا کہ روزی کی تلاش میں باہر گئے ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام نے دریافت کیا۔ گذران کی کیا حالت ہے؟ وہ کہنے لگی سخت مصیبت و پریشانی میں ہیں اور سخت دُکھ اور تکلیف میں ابراہیم علیہ السلام نے یہ سُن کر فرمایا۔ اسمٰعیل سے میرا سلام کہہ دینا اور کہنا کہ اپنے دروازہ کی چوکھٹ تبدیل کردو اسمٰعیل علیہ السلام واپس آئے تو ابراہیم علیہ السلام کے نورِ نبوت کے اثرات پائے پوچھا کوئی شخص یہاں آیا تھا۔ بی بی نے سارا قصہ سُنایا اور پیغام بھی۔ اسمٰعیل علیہ السلام نے فرمایا کہ وہ میری باپ ابراہیم تھے اور اُن کا یہ مشورہ ہے کہ میں تجھ کو طلاق دیدوں۔ لہذا میں تجھ کو جُدا کرتا ہوں۔

اسمٰعیل نے پھر دوسری شادی کرلی ایک مرتبہ ابراہیم علیہ السلام پھر اسمٰعیلؑ کی غیبت میں آئے اور اسی طرح اُن کی بی بی سے سوالات کیے۔ بی بی نے کہا خدا کا شکر و احسان ہے اچھی طرح گذر رہی ہے دریافت کیا کھانے کو کیا ملتا ہے؟ اسمٰعیل کی بی بی نے جواب دیا گوشت۔ ابراہیم علیہ السلام نے پوچھا اور پینے کو؟ اُس نے جواب دیا۔ پانی۔ تب حضرت ابراہیمؑ نے دعا مانگی۔

اللّٰھم بارک لھم فی اللحم والماء   اللہ تعالیٰ اِن کے گوشت اور پانی میں برکت عطا فرما۔

اور چلتے ہوئے پیغام دے گئے کہ اپنے دروازہ کی چوکھٹ کو محفوظ رکھنا۔ حضرت اسمٰعیل آئے تو اُن کی بی بی نے تمام واقعہ دُہرایا اور پیغام بھی سُنایا۔ اسمٰعیل علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ میرے باپ ابراہیم تھے اور اُن کا پیغام یہ ہے کہ تو میری زندگی بھر رفیقۂ حیات رہے[1]۔ راحم

یہ طویل روایت بخاری کتاب الرویا اور کتاب الانبیاء میں دو جگہ منقول ہے اور دونوں سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ اسمٰعیل (علیہ السلام) وادی غیرِ ذی زرع (بن کھیتی کی سرزمین) یعنی مکہ میں بحالت شیرخوارگی پہنچے تھے۔

مگر سید سلیمان ندوی ارض القرآن میں تورات کی روایت کی تردید یا تصحیح کرتے ہوئے یہ تحریر

[1] بخاری کتاب الرویاء

فرماتے ہیں کہ اسمٰعیل علیہ السلام اُس وقت سنِ رشد کو پہنچ چکے تھے۔ اور قرآن کی اِن آیات سے استدلال کرتے ہیں۔

رَبِّ ھب لی من الصالحین. فبشرنٰہ	اے پروردگار عطا کر مجھ کو نیک لڑکا۔ پس بشارت دی
بغلامٍ حلیم. فلما بلغ معہ السعی	ہم نے اُس کو بردبار لڑکے کی۔ پھر جب پہنچا وہ اس
قال یٰبُنی انی اری فی المنام انی	سن کو کہ باپ کے ساتھ دوڑے۔ تو باپ نے کہا میرے
اذبحك فانظر ماذا تری قال	بیٹے میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تم کو ذبح کر
یٰابت افعل ما تؤمر ستجدنی	رہا ہوں۔ دیکھو تم کیا سمجھتے ہو۔ بیٹے نے کہا میرے باپ
ان شاء اللہ من الصابرین . . .	جو حکم کیا گیا ہے کر گذرو مجھے صابر پاؤ گے۔ اور ہم نے ابراہیم
وبشرنٰہ باسحٰق نبیا من الصالحین	کو اسحٰق کی بشارت دی اور اُس پر اور اسحٰق پر برکت
وبارکنا علیہ وعلی اسحٰق (صافات)	نازل کی۔
ربنا انی اسکنت من ذریتی بواد	اے ہمارے پروردگار میں نے بسا دیا ہے اپنی اولاد میں
غیر ذی زرع عند بیتك المحرم .	سے بن کھیتی کی سرزمین میں تیرے محترم گھر کے پاس
. . . .	(اور آخر میں ہے)
الحمد للہ الذی وھب لی علی الکبر	سب تعریفیں اُس اللہ کے لیے ہیں جس نے بخشا
اسمٰعیل واسحٰق (ابراہیم)	مجھ کو بڑھاپے میں اسمٰعیل و اسحٰق کو۔

وجہ استدلال یہ ہے کہ صافات کی پہلی آیت میں "بلغ معہ السعی" سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسمٰعیل علیہ السلام سنِ رُشد تک حضرت ابراہیم کے ساتھ رہے اور آخر کی آیت بتاتی ہے کہ اسحٰق علیہ السلام اُس وقت پیدا ہو چکے تھے اور اسمٰعیل علیہ السلام اسحٰق علیہ السلام سے تیرہ سال بڑے تھے۔

اور سورۂ ابراہیم کی آیتوں سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسمٰعیل جب مکہ میں لائے گئے ہیں تو وہ سنِ رشد

کو پہنچ چکے تھے تب ہی تو ابراہیم علیہ السلام نے دعاؤں میں دونوں کا ذکر فرمایا۔[1]

اس استدلال کے بعد سید صاحب بخاری کی روایت کو ابن عباس (رضی اللہ عنہما) پر موقوف اور اسرائیلیات میں سے قرار دیتے ہیں۔ مگر سید صاحب کا یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے اور نہ اُن کی پیش کردہ آیات سے اس کی تائید نکلتی ہے۔

اوّل۔ اس لیے کہ صافات میں "بلغ معہ السعی" کا یہ مطلب لینا کہ اسمٰعیل علیہ السلام حضرت ابراہیم کے زیر سایہ فلسطین ہی میں پرورش پاتے رہے تب صحیح ہو سکتا تھا کہ اس جملہ کے بعد آیت میں کوئی دوسرا جملہ حضرت اسمٰعیل کے مکہ پہنچنے کے متعلق مذکور ہوتا تاکہ ذبح اسمٰعیل کے واقعہ کے ساتھ صحیح جوڑ لگ سکتا۔ کیونکہ اس پر تمام علماءِ اسلام کا اتفاق ہے اور سید صاحب بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ ذبح اسمٰعیل کا واقعہ مکہ کی زندگی سے وابستہ ہے۔ اور آیت یہ کہتی ہے کہ "جب اسمٰعیل سنِ رشد کو پہنچے تو اُن کے باپ نے اُن سے اپنا رؤیا بیان کیا" پس سید صاحب کی توجیہ کے مطابق اس آیت میں سخت ابہام ہے حالانکہ قرآنِ عزیز کے طرزِ خطابت اور اصولِ بیان کے یہ قطعاً خلاف ہے کہ ایک آیت کے اندر اس طرح کا ابہام پیدا کرے جس سے دو اہم زندگیوں کے درمیان کوئی ربط قائم نہ ہو سکے۔

دوم۔ اس لیے کہ صافات میں اسمٰعیل علیہ السلام سے متعلق جس واقعہ کا ذکر ہے وہ "ذبحِ عظیم" کا تذکرہ ہے نہ کہ مکہ پہنچنے کا اور وہ بلاشبہ اسمٰعیل علیہ السلام کے سنِ رشد کا زمانہ ہے اور اسحٰق علیہ السلام اُس وقت پیدا ہو چکے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اگرچہ ہاجرہ اور اسمٰعیلؑ کو مکہ کے بیابان و صحرا میں چھوڑ آئے تھے لیکن باپ تھے، نبی و پیغمبر تھے، اہلیہ اور بیٹے کو کیسے بھول سکتے، اور اُن کی نگہداشت سے کیسے بے پرواہ ہو سکتے تھے۔ وہ برابر اس بے آب و گیاہ صحرا میں آتے رہتے، اور اپنے اس خاندان کی نگرانی کرتے رہتے تھے اور آیت "بلغ معہ السعی" سے یہی مراد ہے لہٰذا اسحٰق علیہ السلام کی بشارت کا ذکر بالکل برمحل ہے۔ خود سید صاحب تورات کے ایک فقرہ کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

[1] ارض القرآن جلد ۲ ص ۴۳ و ۴۴۔

تورات میں یہ مذکور نہیں کہ حضرت ابراہیم بھی ساتھ آئے تھے لیکن کون شقی ہوگا جو اپنے عزیز بچہ کو جس کی پیدائش کی اُس نے خود دعا کی ہو جس کے لیے زندگی اُس نے خدا سے مانگی ہو اُس کو تنہا بے آب و گیاہ مقام میں ہمیشہ کے لیے جانے دے[1]"

اسی طرح سورۂ ابراہیم کی آیت میں "عند بیتك المحرم" کے بعد یہ جملہ ہے۔

ربنا لیقیموا الصلٰوۃ فاجعل	اے ہمارے پروردگار (میں نے کعبہ کے پاس ان کو اس لیے
افئدۃ من الناس تھوی	بسایا) تاکہ یہ نماز کو قائم کریں پس تو لوگوں کو ان کی
الیھم (ابراہیم)	طرف پھیر دے۔

اِس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا بیت اللہ کی تعمیر کے بعد سے متعلق ہے اور آیت کا سیاق و سباق صاف صاف اسی پر دلالت کرتا ہے۔ اس میں قیامِ صلوٰۃ کا ذکر ہے اس میں حج کی طرف اشارہ ہے اور اس میں یہاں کے بسنے والوں کے لیے رزق کی وسعت کی تمنا جھلکتی ہے اور یہ سب باتیں جب ہی موزوں بیٹھتی ہیں کہ بیت اللہ اپنی تعمیر کے ساتھ موجود ہو۔ البتہ ابن عباسؓ کی روایت میں بھی اس دعا کا ذکر آتا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اپنے خاندان کو یہاں چھوڑتے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو دعا مانگی تھی وہ اسی کے قریب قریب تھی، اس لیے ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت میں اس آیت کو بطور استشہاد نقل کر دیا گیا ہے یہ مطلب نہیں ہے کہ بعینہٖ یہی وہ دعا ہے جو اُس وقت اُنہوں نے مانگی تھی اور اُس میں اسحٰقؑ کا بھی ذکر تھا۔ جب ابن عباس رضی اللہ عنہ خود روایت کر رہے ہیں کہ یہ واقعہ اسمٰعیلؑ کی شیر خوارگی کا ہے تو وہ کس طرح یہ کہہ سکتے تھے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اُس وقت ایسی دعا مانگی کہ جس کے آخر میں اسمٰعیلؑ کے ساتھ اسحٰقؑ کی ولادت کا بھی ذکر تھا۔

سویہ۔ اس بن کھیتی کی سرزمین کہ کے چپہ چپہ اور گوشہ گوشہ میں شور پانی کے سوائے شیریں پانی

[1] ارض القرآن جلد ۲ ص ۲۷

کا نام ونشان نہیں ہے اور آج بھی آلاتِ جدیدہ کی اعانت کے باوجود اُس زمین سے شیریں پانی کا اخراج ناممکن بنا ہوا ہے تو "زمزم" کا وجود یہاں کیسے ہوا؟ یہ مذہبی اور تاریخی دونوں حیثیت سے اہم سوال ہے، سو اس کے متعلق اگرچہ آیاتِ قرآنی کوئی تصریح نہیں کرتیں۔ مگر بخاری کی یہی ابن عباس والی ہر دو روایات اس کے وجود کی تاریخ بیان کرتی ہیں جس میں حضرت اسمٰعیل کو شیرخوار ظاہر کیا گیا ہے۔ اور تورات میں بھی جس طرح اس کا ذکر ہے وہ اُن ہی آیات میں ہے جو اسمٰعیلؑ کو شیرخوار ظاہر کرتی ہیں۔

بہرحال اگرچہ قرآن عزیز کی کسی آیت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اسمٰعیل علیہ السلام اس سرزمین "مکہ" میں کس سن میں پہنچائے گئے۔ مگر بخاری کی روایات کہتی ہیں کہ یہ زمانہ اسمٰعیل کی شیرخوارگی کا تھا اور یہی صحیح ہے۔ پس ابن عباس کی یہ روایت اسرائیلیات میں سے نہیں ہے بلکہ زبانِ وحی ترجمان کے بیان کردہ تفصیلات کی صحیح ترجمانی ہے۔

قرآنِ عزیز نے حضرت اسمٰعیل کی ولادت کے متعلق اُن کا نام لے کر صاف صاف کوئی ذکر نہیں کیا، البتہ بغیر نام ذکر کیے ہوئے اُن کی ولادت کی بشارت کا ذکر موجود ہے۔

ابراہیم علیہ السلام ابھی تک لاولد ہیں اس لیے درگاہِ الٰہی میں ایک نیک اور صالح فرزند کے لیے دعا مانگتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اُن کی دعا کو شرفِ قبولیت بخشتا اور ولادتِ فرزند کی بشارت دیتا ہے۔

رب هب لی من الصالحین ۔ اے پروردگار مجھ کو ایک نیکوکار لڑکا عطا کر پس ہم نے اُس
فبشرنٰه بغلٰم حلیم (الصافات) کو ایک بردبار لڑکے کی بشارت دی۔

یہ "غلامِ حلیم" کون ہے؟ وہی اسمٰعیل جو ہاجرہ کے بطن سے پیدا ہوا، اس لیے کہ قرآنِ عزیز کی اس آیت سے دوسری آیت کے بعد حضرت اسحٰق کی بشارت کا ذکر ہے۔

وبشرنٰه باسحٰق نبیا من الصّٰلحین ۔ اور بشارت دی ہم نے ابراہیم کو اسحٰق کی جو نیکوکاروں

وبارکنا علیہ وعلیٰ اسحٰق (الصافات) میں سے ہوگا نبی ہوگا اور برکت دی ہم نے اُس پر اور اسحٰق پر

پس جبکہ حضرت ابراہیم کے ابھی دو بیٹے تھے اسمٰعیل اور اسحٰق اور تورات و تاریخ کی متفقہ نقول کے پیشِ نظر اسمٰعیل بڑے ہیں اور اسحٰق چھوٹے تو صاف ظاہر ہے کہ صافات کی پہلی آیت میں جس لڑکے کی بشارت مذکور ہے اُس سے حضرت اسمٰعیل کے علاوہ دوسرا کون مراد ہو سکتا ہے؟

اور جب ابراہیم علیہ السلام نے ہاجرہ و اسمٰعیل کو مکہ میں آباد کیا تھا تو اُن کے لیے دعا کرتے ہوئے اس طرح اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کیا۔

الحمد للہ الذی وھب لی علی الکبر اسمٰعیل و اسحٰق (ابراہیم) تمام تعریف اُس اللہ کے لیے ہے جس نے مجھ کو بڑھاپے میں اسمٰعیل اور اسحٰق عطا کیے۔

یہ آیت بھی اسی بات کی تصدیق کرتی ہے کہ الصافات کی آیت میں جس بشارت کا ذکر ہے اس سے اسمٰعیل ہی مراد ہیں۔

ختنہ | جب حضرت ابراہیم کی عمر ۹۹ سال کی ہوئی اور حضرت اسمٰعیل کی تیرہ سال تو اللہ تعالیٰ کا حکم آیا کہ ختنہ کرو۔ ابراہیم علیہ السلام نے تعمیلِ حکم میں پہلے اپنی ختنہ کیں، اور اس کے بعد اسمٰعیل علیہ السلام اور تمام خانہ زادوں اور غلاموں کی ختنہ کرائیں

تب ابراہام نے اپنے بیٹے اسمٰعیل اور سب خانہ زادوں اور اپنے سب زرخریدوں کو یعنی ابراہام کے گھر کے لوگوں میں جتنے مرد تھے سب کو لیا، اور اُسی روز اُن کا ختنہ کیا جس طرح خدا نے اُس کو فرمایا تھا جس وقت ابراہام کا ختنہ ہوا وہ ننانوے برس کا تھا اور جب اُس کے بیٹے اسمٰعیل کا ختنہ ہوا وہ تیرہ برس کا تھا[1]

یہی رسمِ ختنہ آج بھی "ملتِ ابراہیمی" کا شعار ہے اور سنتِ ابراہیمی کے نام سے مشہور ہے۔

ذبحِ عظیم | مقربین بارگاہِ الٰہی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ وہ نہیں ہوتا جو عام انسانوں کے ساتھ ہے،

[1] پیدائش باب ۱۷، آیت ۲۳-۲۵۔

اُن کو امتحان و آزمائش کی سخت سے سخت منزلوں سے گذرنا پڑتا، اور قدم قدم پر جاں سپاری اور تسلیم و رضا کا مظاہرہ کرنا ہوتا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ہم گروہ انبیاء اپنے اپنے مراتب کے اعتبار سے امتحان کی صعوبتوں میں ڈالے جاتے ہیں۔

ابراہیم علیہ السلام بھی چونکہ جلیل القدر نبی اور پیغمبر تھے اس لیے اُن کو بھی مختلف آزمائشوں سے دوچار ہونا پڑا، اور اپنی جلالتِ قدر کے لحاظ سے ہر دفعہ امتحان میں کامل و مکمل ثابت ہوئے۔

جب اُن کو آگ میں ڈالا گیا تو اُس وقت جس صبر اور رضا بہ قضاءِ الٰہی کا انہوں نے ثبوت دیا، اور جس عزم و استقامت کو پیش کیا وہ انہی کا حصّہ تھا۔ اس کے بعد جب اسمٰعیل اور ہاجرہ کو فاران کے بیابان میں چھوڑ آنے کا حکم ملا تو وہ بھی معمولی امتحان نہ تھا، آزمائش اور سخت آزمائش کا وقت تھا۔ بڑھاپے اور پیری کی تمناؤں کے مرکز، راتوں اور دنوں کی دعاؤں کے ثمر اور گھر کے چشم و چراغ اسمٰعیل کو صرف حکمِ الٰہی کی تعمیل و امتثال میں ایک بے آب و گیاہ جنگل میں چھوڑتے ہیں اور پیچھا پھر کر بھی اُس کی طرف نہیں دیکھتے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ شفقتِ پدری جوش میں آجائے اور امتثالِ امرِ الٰہی میں کوئی لغزش ہو جائے۔

ان دونوں کٹھن منزلوں کو عبور کرنے کے بعد اب ایک تیسرے امتحان کی تیاری ہے جو پہلے دونوں سے بھی زیادہ زہرہ گداز اور جاں گسل امتحان ہے حضرت ابراہیم تین شب مسلسل خواب دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اے ابراہیم تو ہماری راہ میں اپنے اکلوتے بیٹے کی قربانی دے۔

انبیاء علیہم السلام کا خواب "رویاءِ صادقہ" اور وحی الٰہی ہوتا ہے اس لیے ابراہیم علیہ السلام رضاء و تسلیم کا پیکر بن کر تیار ہو گئے کہ خدا کے حکم کی جلد سے جلد تعمیل کریں۔ مگر چونکہ یہ معاملہ تنہا اپنی ذات سے وابستہ نہ تھا بلکہ اس آزمائش کا دوسرا جزء وہ "بیٹا" تھا جس کی قربانی کا حکم دیا گیا تھا۔ اس لیے باپ نے بیٹے کو اپنا خواب اور خدا کا حکم سُنایا۔ بیٹا ابراہیم جیسے مجددِ انبیاء و رسل کا بیٹا تھا فوراً سرِ تسلیم خم کر دیا اور کہنے لگا کہ اگر خدا کی یہی مرضی ہے تو انشاء اللہ تو مجھ کو صابر پائیگا۔ اس گفتگو کے بعد باپ بیٹے اپنی قربانی

پیش کرنے کے لیے جنگل روانہ ہوگئے باپ نے بیٹے کی مرضی پاکر مذبوح جانور کی طرح ہاتھ پیر باندھے، چھری کو تیز کیا اور بیٹے کو پیشانی کے بل پچھاڑ کر ذبح کرنے لگے۔ فوراً خدا کی وحی ابراہیم پر نازل ہوئی۔ اے ابراہیم تو نے اپنا خواب سچ کر دکھلایا، بیشک یہ بہت سخت اور کٹھن آزمائش تھی۔ اب لڑکے کو چھوڑ اور تیرے پاس جو یہ مینڈھا کھڑا ہے اُس کو بیٹے کے بدلہ میں ذبح کر۔ ہم نکوکاروں کو اسی طرح نوازا کرتے ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام نے پیچھے مڑکر دیکھا تو جھاڑی کے قریب ایک مینڈھا کھڑا ہے۔ حضرت ابراہیم نے خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے اُس مینڈھے کو ذبح کیا۔

یہی وہ "قربانی" ہے جو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ایسی مقبول ہوئی کہ بطور یادگار کے ہمیشہ کے لیے ملتِ ابراہیمی کا شعار قرار پائی اور آج بھی ذی الحجہ کی دسویں تاریخ کو تمام دنیائے اسلام میں "یہ شعار" اسی طرح منایا جاتا ہے۔

مگر اس پورے واقعہ سے یہ ثابت نہیں ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے "ذبیح" کون ہے اسمٰعیل (علیہ السلام) یا اسحٰق (علیہ السلام)؟

قرآنِ عزیز نے اگرچہ "ذبیح" کا نام نہیں لیا مگر جس طرح اس واقعہ کا تذکرہ کیا ہے اُس سے بغیر کسی کد و کاوش کے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نصِ قرآنی اسمٰعیل کو ذبیح بتاتی ہے اور یہی واقعہ اور حقیقت ہے۔

والصافات میں اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

رب ھب لی من الصّٰلحین	اے پروردگار مجھ کو ایک نکوکار لڑکا عطا کر، پس بشارت
فبشرنٰہ بغلامٍ حلیم. فلما	دی ہم نے اُن کو بُردبار لڑکے کی، پھر جب وہ اس سن
بلغ معہ السعی قال یٰبُنیّ انّی	کو پہنچا کہ باپ کے ساتھ دوڑنے لگے ابراہیم نے کہا اے
اریٰ فی المنام انی اذبحک فانظر	میرے بیٹے میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تجھے ذبح
ماذا تریٰ، قال یٰاابت افعل	کر رہا ہوں پس تو دیکھ کیا سمجھتا ہے کہا۔ اے میرے باپ جس

مَا تُؤمَرُ ستجدُنی ان شآء الله	بات کا تو حکم کیا گیا ہے وہ کر، اگر اللہ نے چاہا تو مجھ کو صبر
من الصابرین . فلمّا اسلما و	کرنے والوں میں سے پائیگا۔ پس جب ان دونوں نے
تلّہ للجبین . ونادینٰہ ان یا	رضا و تسلیم کو اختیار کرلیا اور پیشانی کے بل اُس (بیٹے) کو پچھاڑ
ابراھیم . قد صدّقت الرؤیا	دیا، ہم نے اُس کو پکارا اے ابراہیم تو نے خواب سچ کر دکھایا
إنا کذالك نجزی المحسنین ، إنّ	بیشک ہم اسی طرح نکوکاروں کو بدلہ دیا کرتے ہیں بلاشبہ
ھٰذا لھو البلاء المبین . وفدینٰہ	یہ کھلی ہوئی آزمائش ہے، اور بدلہ دیا ہم نے اُس کو بڑے
بذبحٍ عظیم . وترکنا علیہ فی	ذبح (مینڈھے) کے ساتھ۔ اور ہم نے آنے والی نسلوں میں
الاٰخرین . سلامٌ علیٰ ابراھیم	اُس کے متعلق یہ باقی چھوڑا کہ ابراہیم پر سلام ہو۔ اس طرح
کذالك نجزی المحسنین . انّہ	ہم نکوکاروں کو بدلہ دیا کرتے ہیں، بیشک وہ ہمارے
من عبادنا المومنین . وبشّرنٰہ	مومن بندوں میں سے ہے، اور بشارت دی ہم نے
باسحٰق نبیًّا من الصلحین . وبارکنا	اس کو اسحٰق کی جو نبی ہوگا اور نکوکاروں میں سے ہوگا۔ اور
علیہ وعلیٰ اسحٰق . (الصافات)	برکت دی ہم نے اُس پر اور اسحٰق پر۔

ان آیات میں ابراہیم علیہ السلام کے دو صاحبزادوں کی بشارت کا ذکر ہے پہلے لڑکے کا نام نہیں لیا اور "غلامٌ حلیم" کہہ کر اُس کے ذبح عظیم کے واقعہ کا تذکرہ کیا، اور اس کے بعد دوسرے لڑکے کی بشارت کا ذکر نام لے کر کیا "بشرنٰہ باسحٰق" اور یہ طے شدہ امر ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے دونوں صاحبزادوں اسمٰعیل و اسحٰق میں سے اسمٰعیل بڑے ہیں اور اسحٰق چھوٹے پس جبکہ چھوٹے لڑکے کا ذکر بعد کی آیت میں نام لے کر کر دیا گیا تو پہلی آیات میں اسمٰعیل کے علاوہ اور کس کا ذکر ہو سکتا ہے؟ بلاشبہ وہ اسمٰعیل علیہ السلام ہی ہیں جنہوں نے "ستجدنی ان شاء اللہ من الصّابرین" کہہ کر اور "وتلّہ للجبین" کا نمونہ پیش کر کے "وفدینٰہ بذبحٍ عظیم" کا اعزاز حاصل کیا۔ علاوہ ازیں صرف قرآنِ عزیز ہی اسمٰعیل کو ذبیح نہیں کہتا بلکہ توراۃ کی عبارت کو

اگر غور سے مطالعہ کیجیے تو وہ بھی یہی بتاتی ہے کہ اسمٰعیل اور صرف اسمٰعیل ہی ذبیح ہیں۔

ان باتوں کے بعد یوں ہوا کہ خدا نے ابراہام کو آزمایا اور اُسے کہا کہ تو اپنے بیٹے ہاں اپنے اکلوتے بیٹے کو جس کو تو پیار کرتا ہے "اضحاق کو لے" اور زمین موریاہ میں جا اور اُسے وہاں پہاڑوں میں سے ایک جو میں تجھے بتاؤنگا، سوختنی قربانی کے لیے چڑھا[1]۔

تب خداوند کے فرشتے نے دوبارہ آسمان پر سے ابراہام کو پکارا اور کہا کہ۔ خداوند فرماتا ہے اس لیے کہ تو نے ایسا کام کیا اور اپنا بیٹا "اپنا اکلوتا ہی بیٹا" دریغ نہ رکھا میں نے اپنی قسم کھائی کہ میں برکت دیتے ہی تجھے برکت دونگا[2]۔

توارت کی ان ہر دو عبارات کے نشان زدہ فقروں "اپنے اکلوتے بیٹے" اور "اپنا اکلوتا ہی بیٹا" کو دیکھیے اور پھر توارت کی اُن گذشتہ آیات کو پڑھیے کہ جس میں اسمٰعیل علیہ السلام کو حضرت ابراہیم کا اکلوتا بیٹا بتایا گیا ہے کیونکہ اسمٰعیل علیہ السلام جب چودہ برس کے ہو چکے ہیں تب اسحٰق علیہ السلام کی ولادت ہوئی ہے۔ کیا ان سے یہ صاف طور سے واضح نہیں ہوتا کہ "ذبیح" جیسے عظیم الشان اعزاز کو بنی اسرائیل کے ساتھ وابستہ کرنے کی یہ غلط حرص تھی جس نے یہود کو اس تحریف پر آمادہ کیا کہ اُنھوں نے اس عبارت میں "اکلوتے بیٹے" کے فقرے کے ساتھ "اسحٰق" کا نام بے محل جوڑ دیا؟ پس یہ اضافہ توارت کی تصریحات کے بھی خلاف ہے اور نصِ قرآنی کے بھی خلاف اور واقعہ و حقیقت کے بھی قطعاً خلاف۔

بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ "ذبیح اللہ" کا عظیم الشان شرف اسمٰعیل علیہ السلام ہی کے لیے مقسوم تھا۔

وذٰلك فضل الله يؤتيه من يشاء — یہ اللہ کا فضل ہے جس کو وہ چاہے اُس کو دے اور اللہ

والله ذو الفضل العظيم — بڑے فضل والا ہے۔

---

[1] توارت پیدائش باب ۲۲ آیت ۱-۲ [2] پیدائش باب ۲۲ آیت ۱۵-۱۷

سخت تعجب ہے کہ چند علمار اسلام بھی اس غلطی میں مبتلا نظر آتے ہیں کہ " ذبیح " اسمٰعیل نہ تھے اسحٰق تھے اور جو دلائل اُنھوں نے اس سلسلہ میں بیان کیے ہیں افسوس کہ ہم اُن سے متفق نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ اُن کی بنیاد و اساس محض وہم و ظن پر قائم ہے نہ کہ یقین کی روشنی پر۔ مثلاً اُن کی ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ "الصافات" کی مسطورہ بالا آیات میں سے پہلی آیت " بشرناہ بغلام حلیم " میں کوئی نام مذکور نہیں ہے اور اس کے بعد کی آیات میں اُس کے ذبح سے متعلق ذکر کرتے ہوئے فرمایا " بشرناہ باسحٰق " لہٰذا وہ " غلام حلیم " یہی اسحٰق ہیں۔ خود اندازہ کیجیے کہ یہ کس قدر غلط استدلال ہے اول ان آیات کے سیاق و سباق کا مطالعہ کیجیے اور پھر غور کیجیے کہ " وبشرناہ بغلام حلیم " کے بعد " وبشرناہ باسحٰق " کو عطف کے ذریعہ جس طرح جدا کیا گیا ہے عربی اصول نحو کے مطابق کون سی گنجائش ہے کہ ان دونوں کو ایک ہی شخصیت قرار دیا جائے خصوصاً جبکہ دونوں کی بشارت کے ذکر کے ساتھ ساتھ جُدا جُدا اُن کے اوصاف بھی بیان کیے گئے ہیں۔

صاحب قصص الانبیاء عبدالوہاب نجار نے اس موقع پر آیت " وبارکنا علیہ وعلیٰ اسحٰق " میں " علیہ " کی ضمیر " ذبیح " کی جانب راجع کی ہے اور یہ ترجمہ کیا ہے " ہم نے برکت نازل کی اُس (ذبیح) پر اور اسحٰق پر اور یہ دعویٰ کیا ہے کہ پورا قصہ بیان کرنے کے بعد اسحٰق (علیہ السلام) کی بشارت کا ذکر اس بات کے لیے " نص " ہے کہ صاحبِ قصہ لڑکا اسحٰق کے علاوہ ہے اور وہ صرف اسمٰعیل ہی ہو سکتے ہیں۔

علاوہ ازیں یہ واقعہ مکہ کے قریب منیٰ میں پیش آیا ہے اور توراۃ کا جملہ " اکلوتا بیٹا " اس بات کی زندہ شہادت ہے کہ ابھی تک حضرت اسحٰق کی ولادت بھی نہیں ہوئی لہٰذا توراۃ کا اس واقعہ کو موریا کے قریب بتانا اسی قسم کی تحریف ہے جس سے توراۃ کا کوئی باب خالی نہیں اور جس کا انکار بداہت کا انکار ہے[1]۔

یہ مسئلہ اگرچہ بہت زیادہ تفصیل طلب ہے لیکن ہم نے صرف ضروری امور کے بیان کر دینے پر اکتفا کیا ہے[2]۔

---

[1] اس کے لیے مولانا رحمۃ اللہ کیرانوی قدس اللہ سرہٗ کی کتاب " اظہار الحق " قابل مطالعہ ہے۔ [2] اس مسئلہ پر مولانا عبدالحمید صاحب فراہی مرحوم کا رسالہ " الرأی الصحیح فی من ھو الذبیح " بہترین معلومات کا حامل ہے۔

بنارکعبہ | حضرت ابراہیم علیہ السلام اگرچہ فلسطین میں مقیم تھے مگر برابر مکہ میں ہاجرہ و اسمٰعیل کو دیکھنے آتے رہتے تھے اسی اثنا میں ابراہیمؑ کو اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا کہ "کعبۃ اللہ" کی تعمیر کرو، حضرت ابراہیم نے حضرت اسمٰعیل سے تذکرہ کیا اور دونوں باپ بیٹوں نے "بیت اللہ" کی تعمیر شروع کردی۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباریؒ میں ایک روایت نقل کی ہے۔ جو یہ ظاہر کرتی ہے کہ "بیت اللہ" کی سب سے پہلی اساس حضرت آدم (علیہ السلام) کے ہاتھوں رکھی گئی اور ملائکۃ اللہ نے اُن کو وہ مقام بتادیا تھا جہاں کعبہ کی تعمیر ہونی تھی۔ مگر ہزاروں سال کے حوادث نے عرصہ ہوا اُس کو بے نشاں کردیا تھا البتہ اب بھی وہ ایک ٹیلہ یا اُبھری ہوئی زمین کی شکل میں موجود تھا یہی وہ مقام تھا جس کو وحی الٰہی نے ابراہیم علیہ السلام کو بتایا اور اُنھوں نے اسمٰعیل علیہ السلام کی مدد سے اُس کو کھودنا شروع کیا تو سابق تعمیر کی بنیادیں نظر آنے لگیں، اُن ہی بنیادوں پر "بیت اللہ" کی تعمیر کی گئی۔

مگر قرآن عزیز نے "بیت اللہ" کی تعمیر کا معاملہ حضرت ابراہیم ہی سے شروع کیا ہے اور اس سے قبل کی حالت کا کوئی ذکر نہیں کیا۔

حاصل یہ کہ اس واقعہ سے قبل تمام کائنات اور دنیا کے گوشہ گوشہ میں بتوں اور ستاروں کی پرستش کے لیے ہیکل اور مندر موجود تھے اور اُن ہی کے ناموں پر بڑی بڑی تعمیرات کی جاتی تھیں۔

مصریوں کے یہاں سورج دیوتا، ازوریس، ایزیس، حوریس اور بیل دیوتا سب ہی کے مندر تھے اور ہیکل۔ اشوریوں نے بعل دیوتا کا ہیکل بنایا اور ابوالہول کا مجسمہ بنا کر اُس کی جسمانی عظمت کا مظاہرہ کرایا۔ کنعانیوں نے مشہور قلعہ بعلبک میں اسی بعل کا مشہور ہیکل بنایا تھا جو آج تک یادگار چلا چلا جاتا ہے۔ غزہ کے باشندے "داجون" مچھلی دیبی کے مندر پر چڑھاوے چڑھاتے تھے جس کی شکل انسان کی اور جسم مچھلی کا بنایا گیا تھا، عمونیوں نے سورج دیوتا کے ساتھ عشتارون (قمر) کو دیبی بنا کر پوجا اور ان کے لیے عظیم الشان ہیکل تیار کیے۔ فارس نے آگ کی تقدیس کا اعلان کرکے آتشکدے تیار

ﻠ جلد ۸ ص ۱۳۸۔

کیے۔ رومیوں نے مسیح اور کنواری مریم کے بت بنا کر کلیساؤں کو زینت دی۔ اور ہندیوں نے مہاتما بُدھ، سری کرشن، شری رامچندر اور مہادیو کو دیوتا اور اوتار مان کر اور کالی دیوی، سیتلا دیوی، سیتا دیوی اور پاربتی دیوی ناموں سے ہزاروں بتوں کی پرستش کے لیے کیسے کیسے عظیم الشان مندر تیار کیے ہردوار، پریاگ، کاشی اور پوری جیسے مذہبی مقامات اس کی زندہ شہادتیں ہیں۔

مگر ان سب کے برعکس صرف خدائے واحد کی پرستش اور اُس کی یکتائی کے اقرار میں سرِ نیاز جُھکانے کے لیے یا یوں کہیے کہ توحیدِ الٰہی کی سربلندی کے اظہار کے لیے دنیا کے بتکدوں میں پہلا گھر جو "خدا کا گھر" کہلایا وہ یہی "بیت اللہ" ہے۔

وہ دنیا میں گھر سب سے پہلا خدا کا — خلیل ایک معمار تھا جس بِنا کا

اِنَّ اَوَّلَ بَیتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّھُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ (آل عمران)

بیشک سب سے پہلا وہ گھر جو لوگوں کے لیے (خدا کی یاد کے لیے) بنایا گیا البتہ وہ ہے جو مکہ میں ہے وہ سراپا برکت ہے اور جہان والوں کے لیے ہدایت (کا سرچشمہ)

اسی تعمیر کو یہ شرف حاصل ہے کہ ابراہیم جیسا جلیل القدر پیغمبر اُس کا معمار ہے اور اسمٰعیل جیسا نبی و ذبیح اُس کا مزدور۔ باپ بیٹے برابر اُس کی تعمیر میں مصروف ہیں اور جب اُس کی دیواریں اوپر اوٹھتی ہیں اور بزرگ باپ کا ہاتھ اوپر تعمیر سے معذور ہو جاتا ہے تو قدرت کی ہدایت کے مطابق ایک پتھر کو پیٹر بنایا جاتا ہے جس کو اسمٰعیل علیہ السلام اپنے ہاتھ سے سہارا دیتے اور ابراہیم علیہ السلام اُس پر چڑھ کر تعمیر کرتے جاتے ہیں۔ یہی وہ یادگار ہے جو آج "مقامِ ابراہیم" کے نام سے موسوم ہے جب تعمیر اُس حد پر پہنچی جہاں آج حجرِ اسود نصب ہے تو جبرئیلِ امین نے ان کی راہنمائی کی اور "حجرِ اسود" کو اُن کے سامنے ایک پہاڑی سے محفوظ نکال کر دیا جس کو جنت کا لایا ہوا پتھر کہا جاتا ہے تاکہ وہ نصب کیا جائے بیت اللہ تعمیر ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے ابراہیم کو بتایا کہ یہ ملتِ ابراہیمی کے لیے "قبلہ" اور سہارے

سامنے جھکنے کا نشان ہے۔ اِس لیے یہ توحید کا مرکز قرار دیا جاتا ہے۔ تب ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام نے دعا مانگی کہ اللہ تعالیٰ اُن کو اور اُن کی ذریت کو اقامتِ صلوٰۃ و زکوٰۃ کی ہدایت دے اور استقامت بخشے، اور اُن کے لیے پھلوں، میووں، اور رزق میں برکت عطا فرمائے، اور تمام اقطاعِ عالم کے بسنے والوں میں سے ہدایت یافتہ گروہ کو اس طرف متوجہ کرے کہ وہ دور دور سے آئیں اور مناسکِ حج ادا کریں، اور ہدایت و رشد کے اس مرکز میں جمع ہو کر اپنی زندگی کی سعادتوں سے دامن بھریں۔

قرآنِ عزیز نے بیت اللہ کی تعمیر، تعمیر کے وقت ابراہیم و اسمٰعیل کی دعاؤں، اقامتِ صلوٰۃ اور مناسکِ حج کی ادا کے لیے شوق و تمنا کے اظہار اور بیت اللہ کے مرکزِ توحید ہونے کے اعلان کا جگہ جگہ ذکر کیا ہے اور نئے نئے اسلوب و طرزِ ادا سے اُس کی عظمت اور جلالت و جبروت کو ان آیات میں واضح کیا ہے۔

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ	بلاشبہ، پہلا گھر جو انسان کے لیے (خدا پرستی کا معبد و مرکز) بنایا گیا ہے، وہ
لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى	یہی (عبادتگاہ) ہے جو مکہ میں ہے۔ برکت والا، اور تمام انسانوں کے لیے سرچشمہ ہدایت
لِّلْعٰلَمِيْنَ . فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ	اس میں (دینِ حق کی) روشن نشانیاں ہیں۔ از انجملہ مقامِ ابراہیم ہے (یعنی ابراہیم
مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ ڬ وَمَنْ دَخَلَهٗ	کے کھڑے ہونے اور عبادت کرنے کی جگہ، جو اُس وقت سے لیکر آج تک بغیر کسی
كَانَ اٰمِنًا ؕ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ	شک و شبہ کے مشہور و معین رہی ہے) اور (از انجملہ یہ بات ہے کہ) جو کوئی اس کے حدود
حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ	میں داخل ہوا، وہ امن و حفاظت میں آگیا اور (از انجملہ یہ کہ) اللہ کی طرف سے
سَبِيْلًا ؕ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ	لوگوں کے لیے یہ بات ضروری ہو گئی کہ اگر اس تک پہنچنے کی استطاعت پائیں
غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ	تو اس گھر کا حج کریں۔ بایں ہمہ جو کوئی (اس حقیقت سے) انکار کرے، (اور اس
(آل عمران)	مقام کی پاکی و فضیلت کا اعتراف نہ کرے) تو یاد رکھو، اللہ کی ذات تمام دنیا سے
	بے نیاز ہے (وہ اپنے کاموں کے لیے کسی فرد اور قوم کا محتاج نہیں)۔

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ؕ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۔ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۔ وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۔ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ

اور (پھر دیکھو) جب ایسا ہوا تھا کہ ہم نے (مکہ کے) اس گھر کو (یعنی خانہ کعبہ کو) انسانوں کی گردآوری کا مرکز اور امن و حرمت کا مقام ٹھہرا دیا، اور حکم دیا کہ ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ (ہمیشہ کے لیے) نماز کی جگہ بنالی جائے۔ اور ہم نے ابراہیم اور اسماعیل کو حکم دیا تھا کہ ہمارے نام پر جو گھر بنایا گیا ہے، اُسے طواف کرنے والوں، عبادت کے لیے ٹھہرنے والوں، اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے (ہمیشہ) پاک رکھنا اور ظلم و معصیت کی گندگیوں سے آلودہ نہ کرنا!) اور (پھر) جب ایسا ہوا تھا کہ ابراہیم نے خدا کے حضور دعا مانگی تھی۔ "اے پروردگار! اس جگہ کو (جو دنیا کی آباد سرزمینوں سے دور اور سرسبزی و شادابی سے یک قلم محروم ہے) امن و امان کا ایک آباد شہر بنا دے، اور اپنے فضل و کرم سے ایسا کر، کہ یہاں کے بسنے والوں میں جو لوگ تجھ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھنے والے ہوں، اُن کے رزق کے لیے ہر طرح کی پیداوار مہیا ہو جائے!" اس پر ارشاد الٰہی ہوا تھا کہ (تمہاری دعا قبول کی گئی اور یہاں کے باشندوں میں سے) جو کوئی کفر کا شیوہ اختیار کریگا، سو اُسے بھی ہم (سروسامان رزق سے) فائدہ اٹھانے دینگے۔ البتہ یہ فائدہ اُٹھانا بہت تھوڑا ہوگا کیونکہ بالآخر اُسے (پاداش عمل میں) چار و ناچار دوزخ میں جانا ہے، اور (جو بدبخت نعمت کی راہ چھوڑ کر عذاب کی راہ اختیار کرلے، تو کیا ہی بُری اُس کی راہ ہے، اور) کیا ہی بُرا اُس کا ٹھکانا ہے! اور (پھر دیکھو، وہ کیسا عظیم الشان اور انقلاب انگیز وقت تھا جب ابراہیم خانہ کعبہ کی بنیاد چن رہا تھا اور اسمٰعیل بھی اُس کے ساتھ

أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۖ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۖ إِنَّكَ أَنتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ. رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۚ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ.

(البقرہ)

شریک تھا اُن کے ہاتھ تو پتھر چن رہے تھے اور دل و زبان پر یہ دعا طاری تھی:
"اے پروردگار! (ہم تیرے دو عاجز بندے، تیرے مقدس نام پر اس گھر کی بنیاد رکھ رہے ہیں، سو) ہمارا یہ عمل تیرے حضور قبول ہو! بلاشبہ تو ہی ہے جو دعاؤں کا سننے والا اور (مصالح عالم کا) جاننے والا ہے! اے پروردگار (اپنے فضل و کرم سے) ہمیں ایسی توفیق دے کہ ہم سچے مسلم (یعنی تیرے حکموں کے فرمانبردار) ہو جائیں، اور ہماری نسل میں سے بھی ایک ایسی اُمت پیدا کر دے جو تیرے حکموں کی فرمانبردار ہو! خدایا ہماری عبادت کے (سچے) طور طریقے بتا دے، اور ہمارے قصوروں سے درگزر کر۔ بلاشبہ تیری ہی ذات ہے جو رحمت سے درگزر کرنے والی ہے اور جس کی رحیمانہ درگزر کی کوئی انتہا نہیں! اور خدایا! (اپنے فضل و کرم سے) ایسا کیجیو کہ اس بستی کے بسنے والوں میں تیرا ایک رسول مبعوث ہو جو اُنہی میں سے ہو۔ وہ تیری آیتیں پڑھ کر لوگوں کو سنائے، کتاب اور حکمت کی اُنہیں تعلیم دے، اور (اپنی پیغمبرانہ تربیت سے) اُن کے دلوں کو مانجھ دے۔ اے پروردگار! بلاشبہ تیری ہی ذات ہے جو حکمت والی اور سب پر غالب ہے"

وَإِذْ بَوَّأْنَا لِإِبْرَاهِيمَ مَكَانَ الْبَيْتِ أَن لَّا تُشْرِكْ بِي شَيْئًا وَطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْقَائِمِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ. وَأَذِّن فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ

اور (وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے ابراہیم کے لیے خانۂ کعبہ کی جگہ مقرر کر دی (اور حکم دیا) کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کر، اور میرا یہ گھر اُن لوگوں کے لیے پاک رکھ جو طواف کرنے والے ہوں، عبادت میں سرگرم رہنے والے ہوں، رکوع و سجود میں جھکنے والے ہوں! اور حکم دیا تھا کہ "لوگوں میں حج کا اعلان پکار دے۔ لوگ تیرے پاس دنیا کی تمام دور دراز راہوں سے آیا کریں گے پا پیادہ، اور ہر طرح کی سواریوں پر، جو (مشقتِ سفر سے) تھکی

رِجَالًا وَّعَلٰی كُلِّ ضَامِرٍ
يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ ۙ
لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ
وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ
اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰی مَا
رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ۚ
فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ
الْفَقِيْرَ ۫ ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ
وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوْا
بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ۔ ذٰلِكَ ۚ وَ
مَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ
لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۭ وَاُحِلَّتْ لَكُمُ
الْاَنْعَامُ اِلَّا مَا يُتْلٰی عَلَيْكُمْ فَاجْتَنِبُوا
الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا
قَوْلَ الزُّوْرِ ۔ حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَيْرَ
مُشْرِكِيْنَ بِهٖ ۭ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ
فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ
الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ
سَحِيْقٍ ۔ ذٰلِكَ ۤ وَمَنْ يُّعَظِّمْ

ہوئی ہونگی ۔ وہ اس لیے آئینگے کہ اپنے فائدہ پانے کی جگہ میں حاضر
ہو جائیں، اور ہم نے جو پالتو چارپائے اُن کے لیے مہیا کر دیے ہیں، ان کی
قربانی کرتے ہوئے مقررہ دنوں میں اللہ کا نام لیں ۔ پس قربانی کا گوشت
خود بھی کھاؤ اور بھوکے فقیر کو بھی کھلاؤ ۔ پھر قربانی کے بعد وہ اپنے جسم و لباس
کا میل کچیل دور کر دیں (یعنی احرام اُتار دیں) نیز اپنی نذریں پوری کریں اور
اس خانۂ قدیم (یعنی خانۂ کعبہ) کے گرد پھیرے پھریں“ ۔ تو دیکھو (حج کی) بات
یوں ہوئی ۔ اور جو کوئی اللہ کی ٹھہرائی ہوئی حرمتوں کی عظمت مانے تو اس
کے لیے اس کے پروردگار کے حضور بڑی ہی بہتری ہے ۔ اور (یہ بات بھی
یاد رکھو کہ) ان جانوروں کو چھوڑ کر جن کا حکم قرآن میں سُنا دیا گیا ہے
تمام چارپائے تمہارے لیے حلال کیے گئے ہیں ۔ پس چاہیے کہ بتوں
کی ناپاکی سے بچتے رہو، نیز جھوٹ بولنے سے ۔ صرف اللہ ہی کے
ہو کر رہو ۔ اس کے ساتھ کسی ہستی کو شریک نہ کرو ۔ جس کسی نے اللہ کے
ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا، تو اس کا حال ایسا سمجھو، جیسے بلندی
سے اچانک نیچے گر پڑا ۔ جو چیز اس طرح گریگی، اُسے یا تو کوئی
اُچک لیگا، یا ہوا کا جھونکا کسی دور دراز گوشہ میں لیجا کر پھینک دیگا؛
حقیقت حال یہ ہے، پس (یاد رکھو) جس کسی نے اللہ کی نشانیوں کی
عظمت مانی، تو اس نے ایسی بات مانی جو فی الحقیقت دلوں کی
پرہیزگاری کی باتوں میں سے ہے ۔ ان (چارپایوں) میں ایک مقررہ
وقت تک تمہارے لیے (طرح طرح کے) فائدے ہیں، پھر اس خانۂ

شَعَآئِرِ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ. لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ مَحِلُّهَآ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ. (الحج)

قدیم تک پہنچا کر ان کی قربانی کرنی ہے۔

وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ. لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ. (الحج)

اور (دیکھو، قربانی کے) اونٹ (جنہیں دور دور سے حج کے موقع پر لایا جاتا ہے)، تو ہم نے اُسے ان چیزوں میں سے ٹھہرا دیا ہے جو تمہارے لیے اللہ کی (عبادت کی) نشانیوں میں سے ہیں۔ اس میں تمہارے لیے بہتری کی بات ہے۔ پس چاہیے کہ انہیں قطار در قطار ذبح کرتے ہوئے اللہ کا نام یاد کرو۔ پھر جب وہ کسی پہلو پر گر پڑیں (یعنی ذبح ہو جائیں) تو اُن کے گوشت میں سے خود بھی کھاؤ اور فقیروں اور زائروں کو بھی کھلاؤ۔ اس طرح ہم نے اُن جانوروں کو تمہارے لیے مسخر کر دیا تاکہ (احسانِ الٰہی کے) شکر گزار رہو! یاد رکھو اللہ تک ان قربانیوں کا نہ تو گوشت پہنچتا ہے نہ خون، اس کے حضور جو کچھ پہنچ سکتا ہے، وہ تو صرف تمہارا تقویٰ ہے (یعنی تمہارے دل کی نیکی ہے) ان جانوروں کو اس طرح تمہارے لیے مسخر کر دیا کہ اللہ کی رہنمائی پر اس کے شکر گزار ہو۔ اور اُس کے نام کی بڑائی کا آوازہ بلند کرو، اور نیک کرداروں کے لیے (قبولیتِ حق کی) خوشخبری ہے۔

اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد

اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد کا ذکر قرآنِ عزیز یا احادیثِ نبوی میں تفصیل کے ساتھ نہیں آیا البتہ تورات نے اُن کے ناموں کا علیحدہ علیحدہ تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ تورات کے قول کے مطابق اسمٰعیل علیہ السلام کے بارہ لڑکے تھے جو بارہ سردار کہلائے اور عرب کے مستقل قبائل کے جدِ قبیلہ بنے۔ اور ایک لڑکی تھی جس کا نام بشامہ یا محلاۃ تھا۔

اور ابراہام کے بیٹے اسمٰعیل کا جسے سری کی لونڈی مصری ہاجرہ ابراہام کے لیے جنی تھی یہ نسب نامہ ہے اور یہ اسمٰعیل کے بیٹوں کے نام ہیں مطابق اُن کے ناموں اور نسبوں کی فہرست کے اسمٰعیل کا پہلوٹھا نبایوت، قیدار، ادبیل، مبشام مشماع، دومہ، مسّا، حدار، تیما، یطور، نافیش، قیدما۔ یہ اسمٰعیل کے بیٹے ہیں اور اُن کے نام اُن کی بستیوں اور قلعوں میں یہ ہیں اور یہ اپنی اُمتوں کے بارہ رئیس تھے[۱]۔

ان میں سے دو بڑے بیٹے نابت یا نبایوت اور قیدار بہت مشہور رہیں، اور اُن کا ذکر تورات میں بھی کثرت سے پایا جاتا ہے اور عرب مورخین بھی ان کی تفصیلات پر روشنی ڈالتے ہیں یہی وہ نابت ہیں جن کی نسل اصحاب الحجر کہلائی اور قیدار کی نسل اصحاب الرّس کے نام سے مشہور ہوئی ان کے علاوہ دوسرے بھائیوں اور اُن کے خاندانوں کے حالات بہت کم ملتے ہیں۔

قرآن عزیز میں حضرت اسمٰعیل کا تذکرہ

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کا ذکر قرآن عزیز میں متعدد بار ہوا ہے۔ ان میں سے ایک جگہ صرف اوصاف مذکور ہیں نام مذکور نہیں ہے یہ "ذبح عظیم" والی آیت ہے[۲] اور دو مقام پر اس بشارت کے موقع پر ذکر آیا ہے جس میں ابراہیم علیہ السلام کو پسری اولاد کی بشارت دی گئی ہے۔ اور سورۂ مریم میں اُن کا نام لے کر اُن کے اوصافِ جمیلہ کا ذکر کیا گیا ہے

وَاذکر فی الکتٰب اسمٰعیل انہ صادق الوعد	اور یاد کر کتاب میں اسمٰعیل کا ذکر، تھا وہ وعدہ کا سچا اور
وکان رسولًا نبیًّا وکان یأمر اھلہ بالصلوٰۃ	تھا رسول نبی اور حکم کرتا تھا اپنے اہل کو نماز کا اور زکوٰۃ
والزکوٰۃ وکان عند ربہ مرضیا (مریم)	کا اور تھا وہ اپنے پروردگار کے نزدیک پسندیدہ۔

حضرت اسمٰعیل کی وفات

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی عمر جب ایک سو چھتیس[۳] سال کی ہوئی تو اُن کا انتقال ہو گیا، اس وقت ان کے سامنے اُنکی اولاد اور نسل کا سلسلہ بہت پھیل گیا تھا جو حجاز، شام، عراق، فلسطین اور مصر تک پھیلی۔

تورات ایک موقع پر اشارہ کرتی ہے کہ حضرت اسمٰعیل کی قبر فلسطین ہی میں ہے[۴] اور یہیں اُن کی وفات ہوئی اور عرب مورخین کہتے ہیں کہ وہ اور اُنکی والدہ ہاجرہ بیت اللہ کے قریب حرم کے اندر مدفون ہیں[۵]

[۱] ۲۵-آیت ۱۲-۱۶-پیدائش [۲] پیدائش باب ۲۵ [۳] تاریخ طبری جلد ۱

حضرتِ اسحٰق علیہ السلام

حضرت ابراہیم کی عمر سو سال کی ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے اُن کو بشارت سُنائی کہ سارہ کے بطن سے بھی تیرے ایک بیٹا ہوگا تو اُس کا نام اسحٰق رکھنا۔

اور خدا نے ابراہام سے کہا کہ تیری جورو سری جو ہے اُس کو سری مت کہا کر بلکہ اُس کا نام سرہ ہے، اور میں اُسے برکت دونگا، اور اُس سے بھی تجھے ایک بیٹا بخشونگا یقیناً میں اُسے برکت دونگا کہ وہ قوموں کی ماں ہوگی۔ اور ملکوں کے بادشاہ اُس سے پیدا ہونگے۔ تب ابراہام منہ کے بل گرا اور ہنس کے دل میں کہا کہ کیا سو برس کے مرد کو بیٹا پیدا ہوگا اور کیا سارہ جو نوّے برس کی ہے بیٹا جنیگی؟ اور ابراہام نے خدا سے کہا کہ کاش کہ اسمٰعیل تیرے حضور جیتا رہے۔ تب خدا نے کہا کہ بیشک تیری جورو سرہ تیرے لیے بیٹا جنیگی تو اُس کا نام اضحٰق رکھنا۔[۱]

اور قرآنِ عزیز میں ہے :-

وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ	اور بلاشبہ ہمارے ایلچی (فرشتے) ابراہیم کے پاس
بِالْبُشْرٰى قَالُوْا سَلٰمًا ۭ قَالَ سَلٰمٌ	بشارت لے کر آئے، اُنھوں نے ابراہیم کو سلام کیا
فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ ۝	اور ابراہیم نے سلام کہا، تھوڑی دیر کے بعد ابراہیم
فَلَمَّا رَآ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ	بچھڑے کا بھنا گوشت لایا اور جب اُس نے
اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَاَوْجَسَ مِنْهُمْ	دیکھا کہ اُن کے ہاتھ اُس کی طرف

[۱] باب ۱۷ آیت ۱۵ تا ۱۹

خِيفَةً ۚ قَالُوا لَا تَخَفْ إِنَّا أُرْسِلْنَا إِلَىٰ
قَوْمِ لُوطٍ ۗ وَامْرَأَتُهُ قَائِمَةٌ فَضَحِكَتْ
فَبَشَّرْنَاهَا بِإِسْحَاقَ وَمِنْ وَرَاءِ إِسْحَاقَ
يَعْقُوبَ . قَالَتْ يَا وَيْلَتَىٰ أَأَلِدُ وَأَنَا عَجُوزٌ
وَهَٰذَا بَعْلِي شَيْخًا ۖ إِنَّ هَٰذَا لَشَيْءٌ عَجِيبٌ
قَالُوا أَتَعْجَبِينَ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ ۖ رَحْمَتُ اللَّهِ وَ
بَرَكَاتُهُ عَلَيْكُمْ أَهْلَ الْبَيْتِ ۚ إِنَّهُ حَمِيدٌ
مَجِيدٌ .

(ہود)

بڑھتے تو اُن کو اجنبی محسوس کیا اور اُن سے خوف کھایا وہ
کہنے لگے خوف نہ کرو، ہم لوط کی قوم پر (عذاب کے لیے)
بھیجے گئے ہیں۔ اور ابراہیم کی بیوی (سارہ) کھڑی ہوئی
ہنس رہی تھی پس ہم نے اُس کو اسحٰق کی اور اس کے بعد
(اُس کے بیٹے) یعقوب کی بشارت دی۔ سارہ کہنے لگی۔
کیا میں نگوڑی بڑھیا جنوں گی اور جبکہ یہ ابراہیم میرا شوہر بھی
بوڑھا ہے۔ واقعی یہ تو بہت ہی عجیب بات ہے۔ فرشتوں نے
کہا۔ کیا تو خدا کے حکم پر تعجب کرتی ہے۔ اے اہل بیت تم پر خدا
کی رحمت و برکت ہو۔ بلا شبہ اللہ تعالیٰ ہر طرح قابلِ حمد ہے اور

فأوجس منهم خيفة قالوا لا تخف و
بشروه بغلام عليم. فأقبلت امرأته
في صرة فصكت وجهها وقالت عجوز
عقيم. قالوا كذلك قال ربك انه
هو الحكيم العليم. (الذاريات)

پس محسوس کیا (ابراہیم نے) اُن سے خوف، وہ (فرشتے)
کہنے لگے خوف نہ کھا اور بشارت دی اُس کو ایک سمجھدار
لڑکے کی۔ پس آئی بی بی (سارہ) ابراہیم کی سخت بےچینی کا
اظہار کرتی ہوئی پھر پیٹ لیا اُس نے اپنا مُنہ اور کہنے لگی
بانجھ بڑھیا (اور بچہ) فرشتوں نے کہا تیرے پروردگار نے
یہی کہا ہے، ایسا ہی ہوگا، وہ دانا ہے حکمت والا۔

قال انا منكم وجلون. قالوا لا
توجل انا نبشرك بغلم عليم. قال
ابشرتموني على ان مسني الكبر فبم
تبشرون. قالوا بشرناك بالحق

ابراہیم نے کہا بیشک مجھ کو تم سے خوف معلوم ہوتا ہے۔ فرشتوں
نے کہا ہم سے نہ ڈر بلا شبہ ہم تجھ کو ایک سمجھدار لڑکے کی بشارت
دینے آئے ہیں۔ ابراہیم نے کہا کیا تم مجھ کو اس بڑھاپا آجانے پر
بھی بشارت دیتے ہو، یہ کیسی بشارت دے رہے ہو؟ فرشتوں نے

فلا تکن من القانطین. قال ومن یقنط من رحمۃ ربہ الا الضالون۔ کہا ہم تجھ کو حق بات کی بشارت دے رہے ہیں پس تو نااُمید ہونے والوں میں سے نہ ہو، ابراہیم نے کہا اور نہیں نااُمید ہوتے اپنے پروردگار کی رحمت سے مگر گمراہ۔ (ابراہیم)

ختنہ | جب حضرت اسحٰق آٹھ دن کے ہوئے تو حضرت ابراہیم نے اُن کی ختنہ کرا دیں۔

اور ابراہام نے جیسا کہ خدا نے اُسے حکم دیا تھا اپنے بیٹے اضحاق کا جب وہ آٹھ دن کا ہوا ختنہ کیا[1]

اسحٰق اصل تلفظ کے اعتبار سے "یصحق" ہے۔ یہ عبرانی لفظ ہے جس کا عربی ترجمہ "یضحک" (ہنستا ہے) ہوتا ہے۔

خدا کے فرشتوں نے جب حضرت ابراہیم کو سَو برس اور حضرت سارہ کو نوّے سال کے سن میں بیٹا ہونے کی بشارت دی تھی تو حضرت ابراہیم نے اچنبھا سمجھا تھا اور حضرت سارہ کو بھی یہ سُن کر ہنسی آ گئی تھی اس لیے اُن کا یہ نام تجویز ہوا۔ یا اس لیے یہ نام رکھا گیا کہ ان کی پیدائش حضرت سارہ کی مسرت و شادمانی کا باعث ہوئی۔

عربی قاعدہ سے "یضحق" مضارع کا صیغہ ہے اہلِ عرب کا ہمیشہ سے ہی یہ دستور رہا ہے کہ وہ مضارع کے صیغوں کو بھی بطور نام کے استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ یعرب یملک جیسے نام عرب میں معروف و مشہور ہیں۔

اسحٰق علیہ السلام کی شادی | قرآن عزیز میں اس کے متعلق کوئی ذکر نہیں ہے، البتہ توراۃ میں اس سلسلہ میں ایک طویل قصہ مذکور ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام نے اپنے خانہ زاد الیعزر دمشقی سے فرمایا کہ میں یہ طے کر چکا ہوں کہ اسحٰق کی شادی فلسطین کے ان کنعانی خاندانوں میں ہرگز نہ کرونگا بلکہ میری خواہش یہ ہے کہ میں اپنے خاندان اور باپ دادا کی نسل میں اس کا رشتہ کروں

[1] توراۃ باب ۲۱۔ آیت ۴۔

اس لیے تو سازو سامان لے کر جا اور فدان آرام میں میرے بھتیجے بتوئیل بن ناحور کو یہ پیغام دے کہ وہ اپنی بیٹی کا نکاح اسحٰق سے کر دے۔ اگر وہ راضی ہو جائے تو اس سے یہ بھی کہہ دینا کہ میں اسحٰق کو اپنے پاس سے جدا کرنا نہیں چاہتا لہٰذا لڑکی کو تیرے ساتھ رخصت کر دے۔ الیعزر حضرت ابراہیم کے حکم کے مطابق فوراً آرام کو روانہ ہو گیا، جب آبادی کے قریب پہنچا تو اپنے اونٹ کو بٹھایا تاکہ حالات معلوم کرے۔ الیعزر نے جس جگہ اونٹ بٹھایا تھا اُسی کے قریب حضرت ابراہیم کے بھائی بتوئیل کا خاندان آباد تھا۔ ابھی یہ اس میں مشغول تھا کہ سامنے ایک حسین لڑکی نظر آئی جو پانی کا گھڑا بھر کر مکان کو لیے جا رہی تھی۔ الیعزر نے اُس سے پانی مانگا، لڑکی نے اُس کو بھی پانی پلایا اور اُس کے اونٹ کو بھی اور پھر حال دریافت کیا، الیعزر نے بتوئیل کا پتہ دریافت کیا، لڑکی نے کہا کہ وہ میرے باپ ہیں اور الیعزر کو مہمان بنا کرلے گئی، مکان پر پہنچ کر اپنے بھائی لابان کو اطلاع دی۔ لابان نے الیعزر کی بیحد مدارات کی اور آمد کی وجہ دریافت کی، الیعزر نے حضرت ابراہیم کا پیغام سُنایا۔ لابان کو اس پیغام سے بیحد مسرت ہوئی اور اُس نے بہت سا سازو سامان دے کر اپنی بہن "رفقہ" کو الیعزر کے ہمراہ رخصت کر دیا۔

حضرت اسحٰقؑ کی اولاد

رفقہ سے حضرتِ اسحٰقؑ کے توأم دو لڑکے علی الترتیب عیسو اور یعقوب پیدا ہوئے اس وقت حضرت اسحٰق کی عمر ساٹھ سال کی تھی۔ اسحٰق علیہ السلام عیسو کو زیادہ چاہتے تھے اور رفقہ یعقوب سے زیادہ پیار کرتی تھیں۔ عیسو شکاری تھا اور بوڑھے ماں باپ کو شکار کا گوشت لا کر دیتا تھا اور یعقوبؑ خیمہ ہی میں رہتا تھا۔

ایک روز عیسو تھکا ماندہ آیا اور یعقوب سے کہنے لگا میں ماندہ ہوں اور آج شکار بھی ہاتھ نہ آیا تو اپنے کھانے مسور اور لپسی میں سے مجھے بھی کچھ دے۔ یعقوب نے کہا کہ فلسطینیوں کا یہ دستور ہے کہ میراث بڑے لڑکے کو ملتی ہے اس لیے باپ کا وارث تو ہوگا اگر تو اس حق سے دست بردار ہو جائے

تو میں تجھ کو کھانا کھلاؤنگا، عیسو نے کہا مجھے اس میراث کی کوئی پرواہ نہیں تو ہی وارث ہو جا تب یعقوب نے عیسو کو کھانا کھلایا۔

ایک مرتبہ حضرت اسحٰق نے (جبکہ بہت بوڑھے اور ضعیف البصر ہو گئے تھے) یہ چاہا کہ عیسو کو برکت دیں، اور اُس سے کہا کہ جا شکار کر کے لا اور عمدہ کھانا پکا کر میرے سامنے پیش کر، رفقہ نے یہ سُنا تو دل سے چاہا کہ یہ برکت یعقوب کو ملے۔ فوراً یعقوبؑ کو بُلا کر کہا کہ جلدی عمدہ کھانا تیار کر کے باپ کے سامنے لیجا اور دعاءِ برکت کا طالب ہو۔ یعقوب نے نام بتائے بغیر ایسا ہی کیا اور اسحٰقؑ سے دعاءِ برکت حاصل کر لی، جب عیسو آیا اور اُس نے سب قصہ سُنا تو انتہائی ناگواری محسوس کی اور یعقوبؑ سے کینہ رکھنے لگا۔ تب رفقہ نے یعقوب کو رائے دی کہ وہ یہاں سے اپنے ماموں لابان کے پاس کچھ دنوں کے لیے چلا جائے۔ یعقوب ماموں کے یہاں پہنچا اور وہیں کچھ مدت گذاری اور یکے بعد دیگرے لابان کی دونوں لڑکیوں لیئہ اور راحیل سے شادی کر لی[1]۔

یہ روایت اگرچہ اپنے مضامین کے اعتبار سے بہت زیادہ ناقابلِ اعتماد ہے اور اس میں جو اخلاقی زندگی پیش کی گئی ہے وہ تورات کی دوسری محرف روایات کی طرح انبیاء علیہم السلام اور اُن کے خاندان کے شایانِ شان بھی نہیں ہے۔ مگر اس سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ یعقوب علیہ السلام کی شادی اُن کے ماموں کے یہاں ہوئی اور وہ ایک عرصہ تک اُن کے پاس رہے

اور عیسو بھاگ کر اپنے چچا اسمٰعیل علیہ السلام کے پاس چلے گئے اور وہاں اُنکی صاحبزادی بشامہ یا باسمہ یا محلاۃ (جو نام بھی صحیح ہو) سے شادی کر لی۔ اور ان کے علاوہ بھی شادیاں کیں اور اپنے خاندان کو لے کر سعیر (یا ساعیر) کو اپنا موطن بنا لیا۔ اور یہاں ادوم کے نام سے مشہور ہوئے اور اس لیے اُن کی نسل بنی ادوم کے نام سے مشہور ہوئی۔

---

[1] پیدائش باب ۲۴ آیات ۱-۶۵-

حضرت ابراہیم اور حق الیقین کی طلب

گذشتہ سطور میں چونکہ حضرت اسمٰعیل اور حضرت اسحٰق (علیہما السلام) کا ذکر آ گیا تھا اس لیے اُن سے متعلق واقعات کو تفصیل سے بیان کر دینا مناسب سمجھا گیا تاکہ واقعات کے تسلسل میں انتشار پیدا نہ ہو، نیز یہ واقعات بھی درحقیقت حضرت ابراہیم ہی کی زندگی سے متعلق ہیں اس لیے بھی ان کا تذکرہ بے محل نہیں ہے۔ اب حضرت ابراہیم کے باقی حالات قابل توجہ ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حقائقِ اشیار کی جستجو اور طلب کا طبعی ذوق تھا۔ اور وہ ہر شے کی حقیقت تک پہنچنے کی سعی کو اپنی زندگی کا خاص مقصد سمجھتے تھے تاکہ اُن کے ذریعہ ذاتِ واحد "اللہ جل جلالہ" کی ہستی، اُس کی وحدانیت، اور اُس کی قدرتِ کاملہ کے متعلق علم الیقین کے بعد حق الیقین حاصل کریں۔

آزر، جمہور اور نمرود کے ساتھ مناظروں میں اُن کے اس طبعی ذوق کا بخوبی پتہ چلتا ہے، اس لیے حضرت ابراہیم نے "حیات بعد الممات" یعنی مرجانے کے بعد جی اُٹھنے کے متعلق خدائے تعالیٰ سے یہ سوال کیا کہ وہ کس طرح ایسا کریگا؟ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام سے فرمایا، اے ابراہیم! کیا تم اس مسئلہ پر یقین و ایمان نہیں رکھتے؟ ابراہیم علیہ السلام نے فوراً جواب دیا، کیوں نہیں میں بلا توقف اس پر ایمان رکھتا ہوں لیکن میرا یہ سوال ایمان ویقین کے خلاف اس لیے نہیں ہے کہ میں علم الیقین کے ساتھ ساتھ عین الیقین اور حق الیقین کا خواستگار ہوں، میری تمنا یہ ہے کہ تو مجھ کو آنکھوں سے مشاہدہ کرا دے کہ "حیاتِ بعد الممات" کی شکل کیا ہوگی۔ تب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اچھا اگر تجھ کو اس کے مشاہدہ کی طلب ہے تو چند پرندے اور اُن کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے سامنے والے پہاڑ پر ڈال دے اور پھر فاصلہ پر کھڑے ہو کر اُن کو پکار، حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے ایسا ہی کیا۔ جب ابراہیم علیہ السلام نے اُن کو آواز دی تو اُن سب کے اجزار علٰحدہ علٰحدہ ہو کر فوراً اپنی اپنی شکل پر آ گئے اور زندہ ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس اُڑتے ہوئے چلے آئے۔

سورۂ بقرہ میں اس واقعہ کو اس معجزانہ بلاغت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے :-

اذ قال ابراھیم ربّ ارنی کیف	(یاد کر) جب ابراہیم نے کہا، اے میرے پروردگار مجھے
تحی الموتیٰ قال اولم تؤمن قال	دکھلا تو کس طرح مُردوں کو زندہ کر دیگا۔ کہا، کیا تو ایمان
بلیٰ ولکن لیطمئنّ قلبی۔ قال فخذ	نہیں رکھتا؟ کہا، کیوں نہیں لیکن دلی اطمینان چاہتا
اربعۃ من الطیر فصرھنّ الیک ثمّ	ہوں۔ کہا، پس چار پرندے پھر اُن کو اپنے ساتھ مانوس کر
اجعل علی کلّ جبلٍ منھنّ جزءًا	پھر رکھ دے ہر ہر پہاڑ پر ان کے جزء جزء ڈال کر پھر ان
ثمّ ادعھنّ یاتینک سعیاً واعلم	کو بلا وہ آئیں گے تیرے پاس دوڑتے ہوئے اور تو جان
ان اللہ عزیز حکیم۔ (البقرہ)	بیشک اللہ تعالیٰ غالب ہے حکمت والا ہے۔

سلف صالحین سے ان آیات کی تفسیر یہی ثابت ہے اور بعض روایاتِ حدیثی بھی اس کی تائید کرتی ہیں، اس لیے جن حضرات نے اس مسئلہ کی غرابت کے پیشِ نظر ان آیات میں طرح طرح کی تاویلات کر کے دور از کار باتیں بیان کی ہیں وہ ناقابلِ التفات ہیں۔ ہم اس سے قبل واضح کر چکے ہیں کہ جس طرح یہ راہ غلط ہے کہ ہر موقعہ پر اچنبھوں اور عجوبہ کاریوں کی داستاں سرائی ہو اور رطب و یابس روایات کے اعتماد پر بے اصل باتوں پر یقین کیا جائے اُسی طرح یہ راہ بھی گمرہی کی راہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام سے متعلق جن خوارقِ عادات (معجزات) کا ذکر نصوصِ قرآنی اور صحیح روایات سے معلوم ہو جائے اُن کا بھی اس لیے انکار کیا جائے یا باطل تاویلات گھڑی جائیں کہ مدعیانِ عقل و فلسفہ (مادین) ہمارے اس یقینی علم پر ٹھٹھا کرینگے اور اس کی مذاق اُڑائینگے۔

بنی قطورہ | حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت سارہ اور حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہما کے علاوہ ایک اور شادی کی تھی ان بی بی کا نام قطورہ تھا۔ ان کے بطن سے ابراہیم علیہ السلام کے چھ بیٹے پیدا ہوئے

اور ابراہیم نے ایک اور جورو کی جس کا نام قتورہ تھا، اور اس سے زمران، یقسان، مدان،

مدیان، یشباق اور شوحا پیدا ہوئے اور یقسان اور یقسان سے صبا اور وُدّان پیدا ہوئے، اور اُن کے فرزند اسوری اور لطوسی اور لومی تھے اور مدیان کے فرزند عیفہ، عفر، خیوک، ابیداع اور دعاتھے۔ یہ سب بنی قطورہ تھے[1]

"مدین یا مدیان" کی نسل نے اپنی آبادی اپنے باپ کے نام پر مدین کے نام سے بسائی اور یہ اصحابِ مدین کہلائے، اور حضرت ابراہیم کے پوتے وُدّان کی نسل اصحاب الایکہ کے نام سے مشہور ہوئی۔ اصحابِ مدین اور اصحاب الایکہ دو قومیں ہیں جن میں ہدایت وسعادت کی پیغامبری کے لیے حضرت شعیب علیہ السلام کا ظہور ہوا۔ یہ قتادہؒ کی روایت اور بعض مورخینِ حاضر کی تحقیق ہے اس کے خلاف حافظ ابنِ کثیر اصحاب مدین و ایکہ کو ایک ہی تسلیم کرتے ہیں اور یہی تحقیق راجح ہے تفصیل حضرت شعیبؑ کے واقعہ میں گذر چکی۔

---

[1] پیدائش ۲۵۔ آیت ۱۔۴۔

حضرت لوط (علیہ السلام)

لوطؑ و ابراہیمؑ

صفحاتِ گذشتہ میں یہ ذکر آچکا ہے کہ حضرتِ لوط علیہ السلام حضرت ابراہیم کے برادر زادہ ہیں ان کے والد کا نام ہاران تھا، حضرت لوط کا بچپن حضرت ابراہیم ہی کے زیر سایہ گذرا اسی لیے وہ اور حضرت سارہ "ملتِ ابراہیمی" کے پہلے مسلم اور "السابقون الاولون" میں داخل ہیں

فآمن لہٗ لوط وقال انی مھاجر الیٰ ربی . پس ایمان لایا لوط ابراہیم (کے دین) پر اور کہا میں ہجرت کرنے والا ہوں اپنے رب کی جانب ۔

یہ اور ان کی بی بی حضرت ابراہیم کی ہجرتوں میں ہمیشہ ساتھ رہے ہیں اور جب حضرت ابراہیم مصر میں تھے تو اُس وقت بھی یہ ہم سفر تھے ۔

توراۃ میں ہے کہ مصر کے قیام میں چونکہ دونوں کے پاس کافی ساز و سامان تھا اور مویشیوں کے بڑے بڑے ریوڑ تھے اس لیے اُن کے چرواہوں اور محافظوں کے درمیان بہت زیادہ کشمکش رہتی تھی ۔ حضرت ابراہیم کے چرواہے چاہتے تھے کہ اس چراگاہ اور سبزہ زار سے پہلے ہمارے ریوڑ فائدہ اُٹھائیں اور حضرتِ لوط کے چرواہوں کی خواہش ہوتی کہ اول ہمارا حق سمجھا جائے حضرت ابراہیم نے اس صورتِ حال کا اندازہ کرکے حضرتِ لوط سے مشورہ کیا اور دونوں کی صلاح سے یہ طے پایا کہ باہمی تعلقات کی خوشگواری اور دائمی محبت و الفت کی بقا کے لیے ضروری ہے کہ حضرت لوط مصر سے ہجرت کرکے شرقِ اردن کے علاقہ سدوم اور عامورہ چلے جائیں اور وہاں رہ کر دین حنیف کی تبلیغ کرتے، اور حضرت ابراہیم کی رسالت کا پیغامِ حق سناتے رہیں، اور حضرت ابراہیم پھر واپس

فلسطین چلے جائیں اور وہاں رہ کر اسلام کی تعلیم و تبلیغ کو سربلند کریں۔

سدوم | اردن کی وہ جانب جہاں آج بحرِ میّت یا بحرِ لوط واقع ہے یہی وہ جگہ ہے جس میں سدوم اور عامورہ کی بستیاں آباد تھیں، اس کے قریب بسنے والوں کا یہ اعتقاد ہے کہ پہلے یہ تمام حصہ جو اب سمندر نظر آتا ہے کسی زمانہ میں خشک زمین تھی اور اس پر شہر آباد تھے۔ سدوم و عامورہ کی آبادیاں اسی مقام پر تھیں۔ یہ مقام شروع سے "بحر" نہ تھا جب قومِ لوط پر عذاب آیا اور اس سرزمین کا تختہ اُلٹ دیا گیا اور سخت زلزلے اور بھونچال آئے تب یہ زمین تقریباً چار سو میٹر سمندر سے نیچے چلی گئی اور پانی اُبھر آیا، اسی لیے اُس کا نام بحرِ میّت اور بحرِ لوط ہے۔ [1]

یہ صحیح ہو یا غلط بہر حال یہ مسئلہ حقیقت رکھتا ہے کہ اسی بحرِ میّت کے ساحل پر وہ حادثہ رونما ہوا جو قومِ لوط کے عذاب سے موسوم ہے اور گذشتہ دو سال کی اثری تحقیق نے بحرِ میّت کے ساحل پر لوطؑ کی بستیوں کے بعض تباہ شدہ آثار ہویدا کر کے اُس علم و یقین کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا ہے جس کا اعلان ساڑھے تیرہ سو سال قبل قرآنِ عزیز نے کر دیا تھا۔

قومِ لوط | لوط علیہ السلام نے جب سدوم میں آ کر قیام کیا تو دیکھا کہ یہاں کے باشندے فواحشات اور معصیتوں میں اس قدر مبتلا ہیں کہ الاماں، الحفیظ، دنیا کی کوئی بُرائی ایسی نہیں جو ان میں موجود نہ ہو اور کوئی خوبی ایسی نہیں جو ان میں پائی جاتی ہو، دنیا کی سرکش، متمرد، اور بد اخلاق و بد اطوار اقوام کے دوسرے عیوب و فواحشات کے علاوہ یہ قوم ایک خبیث عمل کی موجد تھی یعنی اپنی نفسانی خواہشات کو پوری کرنے کے لیے وہ عورتوں کی بجائے امرد لڑکوں سے اختلاط رکھتے تھے، دنیا کی قوموں میں اس عمل کا اُس وقت تک قطعاً کوئی رواج نہ تھا یہی بدبخت قوم ہے جس نے اس ناپاک عمل کی ایجاد کی اس عمل کا نام "لواطت" مشہور ہے۔

اور اس سے بھی زیادہ شرارت، خباثت، اور بے حیائی یہ تھی کہ وہ اپنی اس بدکرداری کو عیب نہیں

---

[1] بستانی جلد ۹ صفحہ ۵۳۷۔

سمجھتے تھے۔ اور علی الاعلان فخر و مباہات کے ساتھ اُس کو کرتے رہتے تھے۔

وَلُوطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِہٖ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَۃَ — اور لوط کا واقعہ، جب اُس نے اپنی قوم سے کہا کیا تم ایسے فحش کام

مَا سَبَقَکُمْ بِہَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ اِنَّکُمْ — میں مشغول ہو جس کو دنیا میں تم سے پہلے کسی نے نہیں کیا،

لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَہْوَۃً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ — یہ کہ بلا شبہ تم عورتوں کی بجائے اپنی شہوت کو مردوں سے

بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ۔ (اعراف) — پوری کرتے ہو، یقیناً تم حد سے گذرنے والے ہو۔

عبدالوہاب نجار کہتے ہیں کہ میں نے عبرانی ادب کی ایک کتاب میں ان کی بعض بداعمالیوں کا حال پڑھا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اہل سدوم کی یہ بھی عادت تھی کہ وہ باہر سے آنے والے تاجروں اور سوداگروں کے مال کو ایک نئے اور اچھوتے انداز سے لوٹ لیا کرتے تھے۔ اُن کا طریقہ یہ تھا کہ جب کوئی سوداگر باہر سے آکر سدوم میں مقیم ہوتا تو اُس کے مال کو دیکھنے کے بہانے سے ہر شخص تھوڑی تھوڑی چیزیں اُٹھاتا اور لے کر چل دیتا، اور تاجر بیچارہ حیران و پریشان ہو کر رہ جاتا۔ اب اگر اُس نے اپنے ضیاعِ مال کا شکوہ کیا اور رونے دھونے لگا تو ان لٹیروں میں سے ایک آتا اور لُوٹی ہوئی دو ایک چیزیں دکھلا کر کہنے لگتا کہ بھائی میں تو یہ لے گیا تھا لو تمہاری یہ چیز موجود ہے، وہ رنجیدہ آواز میں کہتا کہ میں اس کو لے کر کیا کرونگا، جہاں میرا سارا مال لٹ گیا وہاں یہ بھی سہی جا تو ہی اپنے پاس رکھ، جب یہ معاملہ ختم ہو جاتا تو اب دوسرا آتا اور وہ بھی اسی طرح کوئی معمولی سی چیز دکھا کر وہی کہتا جو پہلے نے کہا تھا۔ اور سوداگر رنج و غم اور غصہ میں اُس سے بھی پہلی بات لوٹا کر کہہ دیتا اسی طرح سب اس مال کو ہضم کر جاتے اور سوداگر کو لوٹ کھسوٹ کر بھگا دیتے۔

اُسی کتاب میں یہ عجیب قصہ بھی نقل کیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اور سارہ (رضی اللہ عنہا) نے ایک مرتبہ حضرت لوط کی عافیت و خیر معلوم کرنے کے لیے اپنے خانہ زاد الیعزر دمشقی کو سدوم بھیجا، یہ جب بستی کے قریب پہنچا تو اجنبی سمجھ کر ایک سدومی نے اُس کے سر پر پتھر کھینچ مارا، الیعزر کے سر کا خون

جاری ہوگیا، تب آگے بڑھ کر سدومی کہنے لگا کہ میرے پتھر کی وجہ سے یہ تیرا سر سُرخ ہوا ہے لہٰذا مجھے اس کا معاوضہ ادا کر، اور اس مطالبہ کے لیے کھینچتا ہوا سدوم کی عدالت میں لے گیا، حاکمِ سدوم نے مدعی کا بیان سُن کر کہا کہ بیشک الیعزر کو سدومی کے پتھر مارنے کی اُجرت دینی چاہیے، الیعزر یہ سُن کر غصہ میں آگیا اور ایک پتھر اُٹھا کر حاکم کے سر پر دے مارا اور کہنے لگا کہ میرے اس پتھر مارنے کی جو اُجرت ہے وہ تو اس سدومی کو دے دینا، اور یہ کہہ کر وہاں سے بھاگ گیا۔

یہ واقعات صحیح ہوں یا غلط لیکن ان سے یہ روشنی ضرور پڑتی ہے کہ اہلِ سدوم اس قدر ظلم فحش، بے حیائی، بداخلاقی اور فسق و فجور میں مبتلا تھے کہ اُس زمانہ کی قوموں میں اُن کی جانب اس قسم کے واقعات منسوب کیے جاتے تھے۔

حضرت لوطؑ اور تبلیغ حق

اِن حالات میں حضرت لوطؑ نے ان کو ان کی بے حیائیوں اور خباثتوں پر ملامت کی، اور شرافت و طہارت کی زندگی کی رغبت دلائی، اور حُسنِ خطابت، لطافت، اور نرمی کے ساتھ جو ممکن طریقے سمجھانے کے ہو سکتے تھے اُن کو سمجھایا اور موعظت و نصیحت کی اور گذشتہ اقوام کی بداعمالیوں کے نتائج و ثمرات بتا کر عبرت دلائی، مگر اُن بدبختوں پر مطلق اثر نہ پڑا، بلکہ اُس کا یہ اُلٹا اثر ہوا کہ کہنے لگے۔

ماکان جواب قومہ الّا ان قالوا	لوط کی قوم کا جواب اس کے سوائے کچھ نہ تھا کہ کہنے لگے
اخرجوھم من قریتکم انھم اُناس	ان (لوط اور اس کے خاندان کو) اپنے شہر سے نکال دو
یتطھرون ۔ (اعراف)	یہ بیشک بہت ہی پاک لوگ ہیں۔

"بیشک یہ پاک لوگ ہیں" قومِ لوط کا یہ مذاقیہ فقرہ تھا، گویا حضرت لوطؑ اور اُن کے خاندان پر طنز کرتے اور اُن کا ٹھٹھا اُڑاتے تھے کہ بڑے پاکباز ہیں ان کا ہماری بستی میں کیا کام، یا ناصح مشفق کی مربیانہ نصیحت سے غیظ و غضب میں آکر کہتے تھے کہ اگر ہم ناپاک اور بے حیا ہیں اور یہ بڑے پاکباز ہیں تو ان کا ہماری بستی میں کیا کام ان کو یہاں سے نکالو۔

حضرتِ لوطؑ نے پھر ایک مرتبہ بھری محفل میں اُن کو نصیحت کی اور بتایا کہ تم کو اتنا بھی احساس نہیں رہا ہے کہ یہ سمجھ سکو کہ مردوں کے ساتھ بے حیائی کا تعلق، لوٹ مار، اور اسی قسم کی بداخلاقیاں بہت بُری اعمال ہیں، تم یہ سب کچھ کرتے ہو اور بھری محفلوں اور مجلسوں میں کرتے ہو اور شرمندہ ہونے کی بجائے بعد میں اُن کا ذکر اس طرح سُناتے ہو کہ گویا یہ کارِ نمایاں ہیں جو تم نے انجام دیے ہیں۔

ائنکم لتاتون الرّجال وتقطعون — کیا تم ہی وہ نہیں ہو کہ تم مردوں سے بدعملی کرتے، لوگوں کی راہ

السبیل وتاتون فی نادیکم المنکر — لوٹتے ہو، اور اپنی مجلسوں میں اور اہل وعیال کے روبرو فواحش (عنکبوت)

قوم نے اس نصیحت کو سنا تو غم وغصہ سے تلملا اُٹھی اور کہنے لگی کہ لوطؑ! بس یہ نصیحتیں اور عبرتیں ختم کر، اور اگر ہمارے ان اعمال سے تیرا خدا ناراض ہے تو وہ عذاب لاکر دکھا جس کا ذکر کرکے بار بار ہم کو ڈراتا ہے۔ اگر تو واقعی اپنے قول میں سچا ہے تو بس اب ہمارا تیرا فیصلہ ہوجانا ضروری ہے۔

فما کان جواب قومہ الا ان قالوا — پس اُس (لوط) کی قوم کا جواب اس کے سوائے کچھ نہ تھا کہ وہ

ائتنا بعذاب اللہ ان کنت من الصدقین (عنکبوت) — کہنے لگے تو ہمارے پاس اللہ کا عذاب لے آ اگر تو سچا ہے۔

حضرت ابراہیم اور ملائکۃ اللہ

اِدھر یہ ہو رہا تھا اور دوسری جانب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جنگل میں سیر کر رہے تھے، اُنہوں نے دیکھا کہ تین اشخاص سامنے کھڑے ہیں۔ حضرت ابراہیم نہایت متواضع اور مہمان نواز تھے اور ہمیشہ اُن کا دسترخوان مہمانوں کے لیے وسیع تھا۔ اس لیے اُن تینوں کو دیکھ کر وہ بیحد مسرور ہوئے اور اُن کو اپنے گھر لے گئے، اور بچھڑا ذبح کرکے کلچے بنائے اور اُن کو بھون کر مہمانوں کے سامنے پیش کیے، مگر اُنہوں نے کھانے سے انکار کیا یہ دیکھ کر حضرتِ ابراہیم نے سمجھا کہ یہ کوئی دشمن ہیں جو حسب دستور کھانے سے انکار کر رہے ہیں اور کچھ خائف ہوئے کہ آخر یہ کون ہیں؟

مہمانوں نے جب حضرتِ ابراہیم کا اضطراب دیکھا تو اُن سے ہنس کر کہا کہ آپ گھبرائیں نہیں

ہم خدا کے فرشتے ہیں اور قومِ لوط کی تباہی کے لیے بھیجے گئے ہیں، اس لیے سدوم جا رہے ہیں۔

جب حضرت ابراہیمؑ کو اطمینان ہوگیا کہ یہ دشمن نہیں ہیں بلکہ ملائکۃ اللہ ہیں تو اب اُنکی رقتِ قلب، جذبۂ ہمدردی، اور محبت وشفقت کی فراوانی غالب آئی اور اُنھوں نے قومِ لوط کی جانب سے جھگڑنا شروع کر دیا اور فرمانے لگے کہ تم اس قوم کو کیسے برباد کرنے جا رہے ہو جس میں لوط جیسا خدا کا برگزیدہ نبی موجود ہے، اور وہ میرا برادر زادہ بھی ہے، اور ملتِ حنیف کا پیرو بھی۔ فرشتوں نے کہا، ہم یہ سب کچھ جانتے ہیں، خدا کا یہ فیصلہ ہے کہ قومِ لوط اپنی سرکشی، بدعملی، بے حیائی اور فواحش پر اصرار کی وجہ سے ضرور ہلاک کیجائیگی، اور لوط اور اس کا خاندان اس عذاب سے محفوظ رہیگا البتہ لوط کی بیوی قوم کی حمایت اور اُن کی بداعمالیوں اور بدعقیدگی میں شرکت کی وجہ سے قومِ لوط ہی کے ساتھ عذاب پائیگی۔

فلما ذهب عن ابراهيم الروع وجاءته البشرى يجادلنا في قوم لوط. ان ابراهيم لحليم اوّاه منيب يا ابراهيم اعرض عن هذا انه قد جاء امر ربك وانهم اتيهم عذاب غير مردود (ہود)

پھر جب ابراہیم سے خوف جاتا رہا اور اُس کو ہماری بشارت (ولادت اسحٰق کی) پہنچ گئی تو وہ ہم سے قومِ لوط کے متعلق جھگڑنے لگا، بیشک ابراہیم بردبار، غمخوار، رحیم ہے، اے ابراہیم اس معاملہ میں نہ پڑ بلاشبہ تیرے رب کا حکم آچکا ہے اور بلاشبہ اُن پر عذاب آنے والا ہے۔ جو کسی طرح ٹل نہیں سکتا۔

قال فما خطبكم ايها المرسلون قالوا انا ارسلنا الى قوم مجرمين. لنرسل عليهم حجارة من طين. مسوّمة عند ربك للمسرفين. (الذاريات)

ابراہیم نے کہا اے خدا کے بھیجے ہوئے فرشتو تم کس لیے آئے ہو؟ اُنھوں نے کہا ہم مجرم قوم کی جانب بھیجے گئے ہیں تاکہ ہم اُن پر پتھروں کی بارش کریں یہ نشان کردیا گیا ہے تیرے رب کی جانب سے حد سے گذرنے والوں کے لیے۔

ولمّا جاءت رسلنا ابراھیم	اور جب ہمارے فرشتے ابراہیم کے پاس بشارت لے کر آئے کہنے
بالبشریٰ قالوا انا مھلکوا اھل	لگے بیشک ہم ہلاک کرنے والے ہیں اس (سدوم) قریہ کے
ھٰذہ القریۃ ان اھلھا کانوا	بسنے والوں کو بلاشبہ اُس کے باشندے ظالم ہیں، ابراہیم نے
ظٰلمین. قال ان فیھا لوطا	کہا اُس بستی میں تو لوط ہے۔ فرشتوں نے کہا ہمیں خوب
قالوا نحن اعلم بمن فیھا	معلوم ہے جو اُس بستی میں آباد ہیں۔ ہم البتہ لوط کو اور اس
لننجینہ واھلہ الا امرأتہ	کے خاندان کو نجات دینگے مگر اُس کی بی بی کو نہیں کہ وہ بھی
کانت من الغٰبرین. (عنکبوت)	بستی میں رہ جانے والوں کے ساتھ ہے۔

غرض حضرتِ لوط کے ابلاغِ حق، امر بالمعروف، اور نہی عن المنکر کا قوم پر مطلق کچھ اثر نہ ہوا اور وہ اپنی بداخلاقیوں پر اُسی طرح مُصر رہی، حضرتِ لوط نے یہاں تک غیرت دلائی کہ تم اس بات کو نہیں سوچتے کہ میں رات دن جو اسلام اور صراطِ مستقیم کی دعوت و پیغام کے لیے تمہارے ساتھ حیران و سرگرداں ہوں کیا کبھی میں نے تم سے اس سعی و کوشش کا کوئی ثمرہ طلب کیا، کیا کوئی اُجرت مانگی، کسی نذر و نیاز کا طالب ہوا؟ میرے پیشِ نظر تو تمہاری دینی و دنیوی سعادت و فلاح کے سوائے اور کچھ بھی نہیں ہے، مگر تم ہو کہ مطلق توجہ نہیں کرتے۔

کذبت قوم لوطِ المرسلین. اذ	جھٹلایا قوم لوط نے پیغمبروں کو جبکہ کہا اُن کے بھائی لوط نے
قال لھم اخوھم لوط الا تتقون.	کیا تم نہیں ڈرتے، بیشک میں تمہارے لیے پیغامبر ہوں
انی لکم رسول امین. فاتقوا اللّٰہ	امانت والا، پس اللہ سے ڈرو اور میری پیروی کرو، اور
واطیعون. وما اسئلکم علیہ من	میں تم سے (اس نصیحت پر) اُجرت نہیں مانگتا۔ میرا اجر
اجر ان اجری الا علیٰ رب العٰلمین (الشعراء)	اللہ رب العٰلمین کے سوائے کسی کے پاس نہیں ہے۔

مگر اُن پر اس کا بھی مطلق کوئی اثر نہیں ہوا۔ اور وہ حضرت لوط کو "اخراج" اور سنگساری کی دھمکیاں

دیتے رہے۔ جب نوبت یہاں تک پہنچی اور اُن کی سیاہ بختی نے کسی طرح اخلاقی زندگی پر آمادہ نہ ہونے دیا تب اُن کو بھی وہی پیش آیا جو خدا کے بنائے ہوئے قانونِ جزا کا یقینی اور حتمی فیصلہ ہے یعنی بدکرداریوں پر اصرار کی سزا بربادی و ہلاکت۔ غرض ملائکۃ اللہ حضرت ابراہیم کے پاس سے روانہ ہو کر سدوم پہنچے اور لوط علیہ السلام کے یہاں مہمان ہوئے۔ یہ اپنی شکل و صورت میں حسین و خوبصورت اور عمر میں نوجوان لڑکوں کی حیثیت میں تھے، حضرت لوط نے ان مہمانوں کو دیکھا تو گھبرا گئے اور ڈرے کہ بدبخت قوم نہ معلوم میرے ان مہمانوں کے ساتھ کیا معاملہ کریگی۔ کیونکہ ابھی تک اُن کو یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ یہ خدا کے پاک فرشتے ہیں۔

ابھی حضرتِ لوط اسی حیص بیص میں تھے کہ قوم کو خبر لگ گئی اور لوط علیہ السلام کے مکان پر چڑھ آئے اور مطالبہ کرنے لگے کہ تم اِن کو ہمارے حوالہ کرو، حضرتِ لوط نے بہت سمجھایا کہ کیا تم سے کوئی بھی "رجلِ رشید" نہیں ہے کہ وہ انسانیت کو برتے اور حق کو سمجھے، تم کیوں اس لعنت میں گرفتار ہو، اور خواہشاتِ نفس کے ایفاء کے لیے فطری طریقِ عمل کو چھوڑ کر اور حلال طریقے سے عورتوں کو رفیقۂ حیات بنانے کی جگہ اس ملعون بے حیائی کے درپے ہو، اے کاش میں "رکنِ شدید" زبردست حمایتی کو حاصل کر سکتا

حضرت لوط کی اس پریشانی کو دیکھ کر فرشتوں نے کہا، آپ ہماری ظاہر صورتوں کو دیکھ کر گھبرائیں نہیں ہم ملائکۂ عذاب ہیں اور خدا کے قانون "جزائے اعمال" کا فیصلہ ان کے حق میں اٹل ہے، وہ اب ان کے سر سے ٹلنے والا نہیں۔ آپ اور آپ کا خاندان عذاب سے محفوظ رہیگا، مگر آپ کی بیوی ان ہی بے حیاؤں کی رفاقت میں رہیگی اور تمہارا ساتھ نہ دیگی۔

آخر عذابِ الٰہی کا وقت آپہنچا ابتداءِ شب ہوئی تو ملائکہ کے اشارہ پر حضرت لوط اپنے خاندان سمیت دوسری جانب سے نکل کر سدوم سے رخصت ہو گئے اور اُن کی بی بی نے ان کی رفاقت سے انکار کر دیا اور راستہ ہی سے لوٹ کر سدوم واپس آگئی، آخر شب ہوئی تو اول ایک ہیبتناک چیخ نے اہل

سدوم کو تہ و بالا کر دیا اور پھر آبادی کا تختہ اوپر اُٹھا کر اُلٹ دیا گیا اور اوپر سے پتھروں کی بارش نے اُن کا نام و نشان تک مٹا دیا اور وہی ہوا جو گذشتہ قوموں کی نافرمانی اور سرکشی کا انجام ہو چکا ہے۔

فَلَمَّا جَآءَ اٰلَ لُوْطِ ۨالْمُرْسَلُوْنَ ۙ
قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ۔ قَالُوْا
بَلْ جِئْنٰكَ بِمَا كَانُوْا فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ
وَاَتَيْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ
فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ
وَاتَّبِعْ اَدْبَارَهُمْ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ
اَحَدٌ وَّامْضُوْا حَيْثُ تُؤْمَرُوْنَ ۔
وَقَضَيْنَآ اِلَيْهِ ذٰلِكَ الْاَمْرَ اَنَّ
دَابِرَ هٰٓؤُلَآءِ مَقْطُوْعٌ مُّصْبِحِيْنَ ۔
وَجَآءَ اَهْلُ الْمَدِيْنَةِ يَسْتَبْشِرُوْنَ
قَالَ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ ضَيْفِيْ فَلَا تَفْضَحُوْنِ
وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ ۔ قَالُوْٓا
اَوَلَمْ نَنْهَكَ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۔ قَالَ
هٰٓؤُلَآءِ بَنٰتِيْٓ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ۭ
لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِيْ سَكْرَتِهِمْ
يَعْمَهُوْنَ ۔ فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ
مُشْرِقِيْنَ ۙ فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا

پھر جب ایسا ہوا کہ پہنچے ہوئے (فرشتے) خاندانِ لوط کے پاس
پہنچے، تو اُنھوں نے کہا "تم لوگ اجنبی معلوم ہوتے ہو" اُنھوں نے
کہا "نہیں، یہ بات نہیں ہے، بلکہ ہم تمہارے پاس وہ بات لے
کر آئے ہیں، جس میں لوگ شک کیا کرتے تھے (یعنی ہلاکت کے
ظہور کی خبر جس کا لوگوں کو یقین نہ تھا) ہمارا آنا ایک امرِ حق کے لیے
ہے، اور ہم اپنے بیان میں سچے ہیں پس چاہیے کہ کچھ رات رہے
اپنے گھر کے لوگوں کو لے کر نکل جاؤ اور ان کے پیچھے قدم اُٹھاؤ،
اور اس بات کا خیال رکھو کہ کوئی پیچھے مُڑ کے نہ دیکھے۔ جہاں جانے
کا حکم دیا گیا ہے (اُسی طرف رُخ کیے) چلے جائیں،" غرضکہ ہم نے
لوط پر حقیقتِ حال واضح کر دی کہ ہلاکت کا ظہور ہونے والا ہے
اور باشندگانِ شہر کی بیخ و بنیاد صبح ہوتے ہوتے اکھڑ جانے والی ہے
اور اس اثنا میں ایسا ہوا کہ شہر کے لوگ خوشیاں مناتے ہوئے آ
پہنچے۔ لوط نے کہا دیکھو یہ (نئے آدمی) میرے مہمان ہیں تم میری
فضیحت نہ کرو۔ اللہ سے ڈرو، تم میری رسوائی کے کیوں درپے
ہو گئے ہو؟" اُنھوں نے کہا "کیا ہم نے تجھے اس بات سے نہیں روک دیا
تھا کہ کسی قوم کا آدمی ہو، لیکن اپنے یہاں نہ ٹھہراؤ" لوط نے کہا اگر ایسا
ہی ہے تو دیکھو یہ میری بیٹیاں (کھڑی) ہیں (یعنی باشندگانِ شہر کی بیویاں

سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِيْنَ ۔

(الحجر)

جن کی طرف وہ ملتفت نہیں ہوتے تھے) اُنکی طرف ملتفت ہو۔ (تب فرشتوں نے لوط سے کہا) تمہاری زندگی کی قسم، یہ لوگ تو اپنی بدمستیوں میں کھوئے گئے ہیں (تمہاری باتیں ماننے والے نہیں) غرضکہ سورج نکلتے نکلتے ایک ہولناک آواز نے انہیں آلیا۔ پس ہم نے وہ بستی زیر و زبر کر ڈالی اور پکی ہوئی مٹی کے پتھروں کی اُن پر بارش کی۔ بلا شبہ اس واقعہ میں اُن لوگوں کے لیے بڑی ہی نشانیاں ہیں جو (حقیقت کی) پہچان رکھنے والے ہیں!

وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِيْٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَّقَالَ هٰذَا يَوْمٌ عَصِيْبٌ ۔ وَجَآءَهٗ قَوْمُهٗ يُهْرَعُوْنَ اِلَيْهِ ؕ وَمِنْ قَبْلُ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ قَالَ يٰقَوْمِ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ فِيْ ضَيْفِيْ ؕ اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ ۔ قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِيْ بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ ۚ وَاِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِيْدُ ۔ قَالَ لَوْ

اور پھر جب ایسا ہوا کہ ہمارے فرستادے لوط کے پاس پہنچے، تو وہ اُن کے آنے سے خوش نہ ہوا اور اُنکی موجودگی نے اُسے پریشان کر دیا وہ بولا "آج کا دن تو بڑی مصیبت کا دن ہے!" اور اُس کی قوم کے لوگ (اجنبیوں کے آنے کی خبر سُن کر) دوڑتے ہوئے آئے۔ وہ پہلے سے بُرے کاموں کے عادی ہو رہے تھے۔ لوط نے اُن سے کہا "لوگو! یہ میری بیٹیاں ہیں۔ (یعنی بستی کی عورتیں جنہیں وہ اپنی بیٹیوں کی جگہ سمجھتا تھا، اور جنہیں لوگوں نے چھوڑ رکھا تھا) یہ تمہارے لیے جائز اور پاک ہیں۔ پس اُن کی طرف ملتفت ہو۔ دوسری بات کا قصد نہ کرو اور) اللہ سے ڈرو۔ میرے مہمانوں کے معاملے میں مجھے رسوا نہ کرو کیا تم میں کوئی بھی بھلا آدمی نہیں ہے؟" ان لوگوں نے کہا "تجھے معلوم ہو چکا ہے کہ تیری ان بیٹیوں سے ہمیں کوئی سروکار نہیں۔ اور تو اچھی طرح جانتا ہے، ہم کیا کرنا چاہتے ہیں" لوط نے کہا "کاش تمہارے مقابلہ

اَنَّ لِيْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِيْٓ	کی مجھے طاقت ہوتی - یا کوئی سہارا ہوتا جس کا آسرا پکڑ سکتا" (تب)
اِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ. قَالُوْا	مہمانوں نے کہا "اے لوط! ہم تیرے پروردگار کے بھیجے ہوئے آئے
يٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ	ہیں۔ (گھبرانے کی کوئی بات نہیں) یہ لوگ کبھی تجھ پر قابو نہ پاسکینگے۔
لَنْ يَّصِلُوْٓا اِلَيْكَ فَاَسْرِ	تو یوں کر کہ جب رات کا ایک حصّہ گزر جائے تو اپنے گھر کے آدمیوں
بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ	کو ساتھ لے کر نکل چل اور تم میں سے کوئی ادھر اُدھر نہ دیکھے (یعنی
وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ	اور کسی بات کی فکر نہ کرے) مگر ہاں تیری بیوی (ساتھ دینے
اِلَّا امْرَاَتَكَ اِنَّهٗ مُصِيْبُهَا	والی نہیں - وہ پیچھے رہ جائیگی، اور) جو کچھ ان لوگوں پر گذرنا ہے
مَآ اَصَابَهُمْ اِنَّ مَوْعِدَهُمُ	وہ اس پر بھی گذریگا - ان لوگوں کے لیے عذاب کا مقررہ وقت
الصُّبْحُ اَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيْبٍ	صبح کا ہے، اور صبح کے آنے میں کچھ دیر نہیں" پھر جب ہماری
فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا	(ٹھہرائی ہوئی) بات کا وقت آپہنچا، تو (اے پیغمبر!) ہم نے اس (بستی)
عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا	کی تمام بلندیاں پستی میں بدل دیں (یعنی بستی کو اُلٹ دیا اور زمین کے
عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ	برابر کردیا) اور اس پر آگ میں پکے ہوئے پتھر لگاتار برسائے کہ تیرے
مَّنْضُوْدٍ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ	پروردگار کے حضور (اس غرض سے) نشانی کیے ہوئے تھے۔ یہ
رَبِّكَ وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ	(بستی) ان ظالموں سے (یعنی اشرارِ مکہ سے) کچھ دور نہیں ہے (اپنی
بِبَعِيْدٍ ۔	سیر و سیاحت میں وہاں سے گذرتے رہتے ہیں، اور اگر چاہیں، تو اس سے
(ہود)	عبرت پکڑ سکتے ہیں)
فَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اَجْمَعِيْنَ اِلَّا	پھر بچا دیا ہم نے اُس کو اور اُس کے گھر والوں کو سب کو۔ مگر
عَجُوْزًا فِي الْغٰبِرِيْنَ ثُمَّ دَمَّرْنَا	ایک بڑھیا رہ گئی رہنے والوں میں - پھر اُٹھا مارا ہم نے اُن
الْاٰخَرِيْنَ وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا	دوسروں کو اور برسایا اُن پر ایک برساؤ - سو کیا بُرا برساؤ

فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ. اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۚ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ. وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ. (الشعراء)

برسا ہوا تھا اُن ڈرائے ہوؤں کا۔ البتہ اس بات میں نشانی ہے، اور اُن میں بہت لوگ نہیں تھے ماننے والے۔ اور تیرا رب وہی ہے زبردست رحم والا

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ ۭ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا وَّقِيْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِيْنَ. (التحريم)

اللہ نے بتلائی ایک مثال منکروں کے واسطے عورت نوح کی اور عورت لوط کی، گھر میں تھیں دونوں دو نیک بندوں کے، ہمارے نیک بندوں میں سے۔ پھر انہوں نے اُن سے خیانت کی پھر وہ کام نہ آئے اُن کے اللہ کے ہاتھ سے کچھ بھی اور حکم ہوا کہ چلی جاؤ دوزخ میں جانے والوں کے ساتھ۔

مسائل (۱) مسطورۂ بالا آیات میں حضرتِ لوطؑ کے یہ مقولے مذکور ہیں "هٰٓؤُلَآءِ بَنٰتِيْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ" "هٰٓؤُلَآءِ بَنٰتِيْٓ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ" یعنی حضرت لوطؑ نے قوم کی چڑھائی اور مہمانوں سے متعلق مطالبہ سے تنگ آکر یہ فرمایا کہ تم ان سے کچھ تعرض نہ کرو اگر ایسی ہی خواہش ہے تو "یہ میری بیٹیاں موجود ہیں یہ تمہارے لیے پاک ہیں" اس کا کیا مطلب ہے؟ ایک باعصمت و باعزت انسان اور پھر وہ بھی نبیِ معصوم کس طرح یہ گوارا کرسکتا ہے کہ وہ اپنی باعصمت لڑکیوں کو ایسے بے حیا اور خبیث انسانوں کے سامنے پیش کرے؟ اس سوال کے حل میں علماءِ محققین نے مختلف جواب دیے ہیں

(الف) حضرتِ لوطؑ نبی ہیں اور ہر ایک نبی اپنی قوم کا روحانی باپ ہوتا ہے۔ قوم مسلمان ہو کر اس کی اطاعت گذار ثابت ہو، یا انکار کرکے منکر و منحرف، دونوں صورتوں میں وہ اس کی "اُمت" میں داخل ہے اگرچہ پہلی اُمت "اُمتِ اجابت" ہے اور دوسری "اُمتِ دعوت"

اور اس لیے تمام اُمت اُس کی اولاد ہوتی ہے اور نبی و رسول اُس کا روحانی باپ۔

لہٰذا حضرتِ لوط کا مطلب یہ تھا کہ بدبختو تمہارے گھروں میں یہ سب میری بیٹیاں تمہاری رفیقۂ حیات ہیں اور تمہارے لیے حلال پھر تم ان کو چھوڑ کر اس ملعون اور خبیث کام پر اصرار کرتے ہو ایسا نہ کرو "العیاذ باللہ" یہ مقصد ہرگز نہ تھا کہ وہ اپنی صلبی لڑکیاں اُن کو پیش فرما رہے تھے۔

(ب) تورات اور دیگر روایات سے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ یہ فرشتے جو حضرت ابراہیم کو "اسحٰق" کی بشارت دے کر قومِ لوط کو ہلاک کرنے آئے تھے تین تھے۔ اس لیے یہ ناممکن تھا کہ تین افراد کے لیے پوری بستی خواہشمند ہو جن کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ بلکہ اصل بات یہ تھی کہ اس قوم میں دو سردار تھے اور اُنہوں نے ہی لوط علیہ السلام کے مہمانوں کا مطالبہ کیا تھا۔ باقی قوم اپنی اس عام بدکرداری کی وجہ سے اُن کی حمایت میں جمع ہو گئی تھی اور چونکہ حضرت لوط کے دو بیٹیاں کنواری موجود تھیں اس لیے اُنہوں نے اُن دونوں سرداروں کو سمجھایا کہ تم اپنے اس خبیث و شنیع مطالبہ سے باز آجاؤ، اور میں اس کے لیے تیار ہوں کہ اپنی دونوں لڑکیوں کا نکاح تم سے کر دوں مگر اُنہوں نے صاف انکار کر دیا اور کہنے لگے۔ لوط! تجھے معلوم ہے کہ ہم عورتوں کی جانب رغبت نہیں رکھتے

(ج) حضرتِ لوط نے بیشک اپنی بیٹیوں ہی کے متعلق یہ جملہ فرمایا تھا مگر اس کی حیثیت اُس بزرگ کے مقولہ کی طرح ہے جو کسی کو ناحق پٹتا ہوا دیکھ کر ظالم مارنے والے سے یہ کہے کہ اس کو نہ مار اس کے عوض مجھ کو مار لے۔ حالانکہ وہ خوب جانتا ہے کہ وہ کبھی ایسی جرأت نہیں کر سکیگا کیونکہ وہ اس کا چھوٹا ہے یا ماتحت۔

پس جس طرح اس شخص کا مقصد مارنے والے کو عار اور شرم دلانا ہوتا ہے۔ اسی طرح حضرتِ لوط نے اُن کو شرم اور عار دلانے اور اس قبیح فعل پر ذلیل و نادم کرنے کے لیے یہ جملہ فرمایا اور اُن کو یہ یقین تھا کہ نہ یہ بدبخت اس طرف راغب ہونگے اور نہ وہ عملاً ایسا کرینگے۔

امام رازی، اصفہانی، اور ابوالسعود اسی توجیہ کو پسند فرماتے ہیں اور عبدالوہاب نجار مصری کی بھی یہی رائے ہے۔ مگر میرے نزدیک پہلی توجیہ زیادہ صحیح اور قابلِ قبول ہے اور علامہ عبدالوہاب کا اُس کے متعلق یہ کہنا صحیح نہیں ہے "کہ یہ قول اس لیے کمزور ہے کہ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ حضرتِ لوط اِن کافر عورتوں کے باپ تسلیم کیے جائیں"۔ اس لیے کہ ہم شروع جواب ہی میں تصریح کر چکے ہیں کہ "نبی معصوم اپنی اُس تمام اُمت کا روحانی باپ ہوتا ہے جس کی جانب اُس کو مبعوث کیا گیا ہے یہ جُدا بات ہے کہ اُمتِ اجابت اس کی عطا کردہ سعادت وفلاح سے مستفید ہوتی ہے اور اُمتِ دعوت اُس سے محروم رہتی ہے نیز آج بھی یہ دستور ہے کہ کافر و مسلم کے امتیاز کے بغیر بڑی بوڑھی بستی کی لڑکیوں کو اپنی بیٹیاں کہا کرتے ہیں۔

(۲) حضرتِ لوط نے جب دیکھا کہ قوم اُن کے مہمانوں کے ساتھ بد اخلاقی پر تُلی ہوئی ہے اور کسی طرح اُن کو حیاء، مروت، اور انسانیت اپیل نہیں کرتی تب پریشانِ خاطر ہو کر فرمایا:-

لو ان لی بکم قوۃً او اوی الی رکن شدید .	کاش میرے لیے تم سے (مقابلہ کی) طاقت ہوتی یا پناہ ملتی کسی زبردست قوت پناہ کے ساتھ

اس "رکن شدید" سے کیا مراد ہے، کیا حضرت لوط "العیاذ باللہ" خدا کی قدرت پر بھروسہ نہیں رکھتے تھے جو کسی "رکن شدید" کی پناہ کے طالب تھے ؟

اس مشکل کا حل بخاری کی روایت نے بخوبی کر دیا ہے اُس روایت میں ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

یغفر اللہ للوط ان کان لیاوی الی رکن شدید، وھو ربہ و خالقہ[1] (الحدیث)	اللہ تعالیٰ لوط کی بخشش کرے (کہ وہ اس درجہ پریشان کئے گئے) کہ رکن شدید کی پناہ کے طالب ہوئے اور اُن کے لیے رکن شدید اُن کا پروردگار اور اُن کا خالق ہے۔

مطلب یہ ہے کہ حضرت لوط خدا کو بھول کر کسی اور قوت کی پناہ کے طالب نہ تھے بلکہ وہ اس درجہ قابل

[1] بخاری کتاب الانبیاء

رحم حالت میں تھے کہ اُس وقت اُن کی یہ تمنا ہوئی کاش کہ اللہ تعالیٰ مجھے ایسی قوت عطا کرتا کہ میں اُسی وقت ان سب بدبختوں کو ان کی خباثت کا مزہ چکھا سکتا۔ اور "رکن شدید" یعنی اُس کے پروردگار نے آخر اُن کی مدد کی اور اُن پر فرشتوں نے اپنا راز ظاہر کر دیا اور اُن کو تسلی و اطمینان بخشا۔

(۳) بعض مفسرین نے "بکم قوۃ" میں "کُمْ" کا مخاطب فرشتوں کو سمجھا ہے، اور مراد یہ لیتے ہیں کہ حضرت لوط نے فرمایا کاش تم اس کثرت سے ہوتے کہ اُن کے مقابلہ میں مجھ کو تم سے قوت پہنچتی یا خدا کوئی اور ایسی صورت پیدا کر دیتا کہ میں اُن کو سزا دے سکتا۔ اسی لیے حضرت لوط کے اس قول کو سُن کر فرشتوں نے کہا۔

قالوا یٰلوط انا رسل ربک لن یصلوا الیک (ہود) — فرشتوں نے کہا، اے لوط! ہم تیرے پروردگار کے بھیجے ہوئے ہیں (مجبور انسان نہیں ہیں) یہ تجھ کو ہرگز ہرگز نہیں پہنچ سکتے۔

توراۃ میں ہے کہ حضرت لوط مع اپنے خاندان کے سدوم سے ہجرت کر کے ضوعر یا ضُغر کی بستی میں چلے گئے جو سدوم سے قریب ہی آباد تھی[1] آفتاب نکلنے کے بعد جب اُنہوں نے سدوم کی جانب دیکھا تو وہاں ہلاکت اور بربادی کے نشانات کے سوائے اور کچھ نہ تھا۔ حضرت لوط نے پھر ضُغر کو بھی چھوڑ دیا اور اُس کے قریب ایک پہاڑی پر جا آباد ہوئے۔ اور امن و امان سے رہنے سہنے لگے، اور وہیں اُن کا انتقال ہوا۔

حضرتِ ابراہیم مجددِ انبیاء

ان مسلسل واقعات سے بہت سے بصائر و عبر حاصل ہونے کے علاوہ ایک سب سے اہم بات یہ ظاہر ہوتی ہے کہ حضرت ابراہیم کی شخصیت، نبوت و رسالت میں بھی خاص امتیازی شان رکھتی ہے۔ یوں تو خدا کا ہر ایک پیغمبر "توحید کا داعی اور شرک کا دشمن ہے" اور اس لیے تمام انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات میں یہ دو باتیں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں بلکہ روحانی دعوت و ارشاد کی اساس و بنیاد ہی صرف ان دو مسئلوں پر قائم ہے مگر یہ خصوصیت ابراہیم علیہ السلام

[1] پیدائش باب ۱۹۔ آیت ۲۲۔

ہی کے حصہ میں آئی تھی کہ اس دنیا میں وہ پہلی ہستی ہیں جنہیں اس راہِ عزیمت میں سخت سے سخت آزمائشوں
اور کڑی سے کڑی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا اور وہ ان تمام مصائب کے مقابلہ میں کامران و کامیاب
ثابت ہوئے۔

غور کیجیے کہ بڑھاپے اور یاس کی عمر میں ہزاروں دعاؤں اور لاکھوں آرزوؤں کے بعد ایک بچہ پیدا
ہوتا ہے اور ابھی شیر خوار بچہ ہی ہے کہ خدائے تعالیٰ کا حکم آتا ہے۔ "ابراہیم! اس کو اور اس کی والدہ
کو اپنے گھر سے جدا کرو، اور ایک لق و دق بیابان، اور بن کھیتی کی سرزمین میں" جہاں نہ پانی ہے نہ سبزہ
ان دونوں کو چھوڑ آؤ" پھر کیا ہوا؟ کیا ابراہیم علیہ السلام نے ایک لمحہ بھی تامل کیا؟ اور تعمیلِ ارشاد میں کسی
قسم کا کوئی عذر سامنے آیا؟ نہیں ہرگز نہیں۔ بلکہ بے چون و چرا اُن دونوں کو مکہ کی سرزمین میں چھوڑ آئے

اور اس کے بعد جب وہ سنِ رشد کو پہنچا اور ماں باپ کی آنکھوں کا نور اور دل کا سرور بنتا ہے
تو اب پھر ابراہیمؑ کو خدا کا حکم ملتا ہے کہ اس کو ہمارے نام پر قربان کرو اور اپنی فداکاری و اطاعت شعاری کا ثبوت دو

اس نازک وقت میں ایک مطیع سے مطیع اور فرمانبردار سے فرمانبردار ہستی کے ایمان و
یقین کی کشتی کس طرح بھنور میں آجاتی ہے اس کا اندازہ خود کرو، اور پھر ابراہیم (علیہ السلام) کی جانب
دیکھو کہ نہ خدا کی اس وحی کی جو "منام" میں دکھائی گئی تھی، انہوں نے کوئی تاویل کی، نہ اُس کے لیے
حیلہ و بہانہ سوچا، اور نہ اُس کو ٹالنے کے لیے کوئی فکر و تردد کیا صبح اُٹھے اور اپنے لختِ جگر کو لیا اور
تعمیلِ ارشادِ الٰہی میں وہ سب کچھ کیا جو اُن کے انسانی ہاتھ کر سکتے تھے اور اس طرح اپنی محیر العقول فاکیشی کا ثبوت دیا

اور تیسری سخت آزمائش کا وہ وقت تھا کہ جب باپ، قوم، اور بادشاہِ وقت سب نے
متفق ہو کر یہ فیصلہ کر لیا کہ ابراہیم یا اپنے پیغامِ حق سے باز آجائے ورنہ تو اُس کو دہکتی آگ میں ڈال کر خاکستر
کر دیا جائے، مگر کیا ظالموں کا یہ فیصلہ اور یہ اتحاد ابراہیم کے قدم کو ڈگمگا سکے؟ نہیں! وہ ایک عزم کا پہاڑ بن کر
اسی طرح اپنی جگہ کھڑا رہا اور پیغامِ حق اور خدا کی رشد و ہدایت کو اُسی عزم و ثبات کے ساتھ سناتا رہا جس طرح

شروع سے کرتا رہا تھا پھر دشمنوں نے جو کچھ کہا تھا آخر کر دکھایا اور اُس کو دہکتی آگ میں جھونک دیا مگر ابراہیم کے سکون و اطمینان میں مطلق کوئی فرق نہیں آیا البتہ دشمنوں کی دشمنی اور اُن کے تمام مکر و فریب کو ابراہیم کے خدا نے پادرہوا کر دیا اور خاک میں ملا دیا، اور آگ کے شعلے اُس کے لیے "برد و سلام" بن گئے، اور اس طرح ابراہیم اپنے قوی تر نگہبان کے زیر سایہ سعادت و ہدایت کے فیضان سے بندگانِ خدا کو برابر منور و روشن کرتا رہا۔ اور اُس کی جرأتِ حق اور دعوت الی اللہ تیز سے تیز تر ہوگئی۔

ان تمام سخت امتحانوں اور آزمایشوں اور پھر ان میں ثبات قدمی و استقامت کے علاوہ ابراہیم علیہ السلام کی دوسری امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ اُنھوں نے شرک اور توحید کی تضاد زندگی کے لیے ایک ایسا امتیاز قائم کر دیا جو انہی جیسے جلیل القدر پیغمبر کے شایانِ شان تھا۔ یعنی انہوں نے اصنام پرستی اور کواکب پرستی کی تردید و تذلیل، اور اُن کی شناعت کا اظہار کرتے ہوئے یہ تصریح فرمائی۔

انی وجہت وجہی للذی فطر	بلا شبہ میں نے اپنا رُخ اُسی ذات کی طرف جھکا دیا ہے جو
السمٰوٰت والارض حنیفا وّ	آسمانوں اور زمینوں کا پیدا کرنے والا ہے، خالص اُس
وما انا من المشرکین۔	کا ہو کر اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔

ابراہیم علیہ السلام کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے تصوّر کی دو راہیں ہیں ایک صحیح اور دوسری غلط، غلط راہ یہ ہے کہ یہ عقیدہ قائم کر لیا جائے کہ خدا کو راضی کرنے اُس کو خوش رکھنے اور اُس کی عبادت و پرستش کرنے کے لیے ضروری ہے کہ بتوں اور ستاروں کی پوجا کی جائے اور جب یہ ارواح ہم سے خوش ہو جائینگی تو یہ خدا کو ہم سے راضی کر دینگی اس عقیدہ کا نام "شرک" اور "صابئیت" ہے، کیونکہ اس عقیدہ کے مطابق عبودیت و پرستش کے تمام وہ خصوصی امتیازات جو صرف "ذاتِ واحد" کے لیے مخصوص رہنے چاہئیں تھے دوسروں کے لیے بھی مشترک ہو جاتے ہیں۔

اور یہی شرک کی حقیقت ہے۔

اس کے مقابلہ میں صحیح راہ یہ ہے کہ اس یقین اور علم کو عقیدہ بنایا جائے کہ خدائے تعالیٰ کی رضامندی اور خوشنودی کا طریقہ اس کے علاوہ دوسرا نہیں ہے کہ خود اُسی کی پرستش کی جائے، اُسی کو حاجت روا اور مشکل کشا سمجھا جائے، نفع وضرر، صحت ومرض، افلاس وتمول، قبض وبسطِ رزق، غرض تمام امور میں اُسی کو اور صرف اُسی کو مالک ومختارِ مطلق یقین کیا جائے، اور اُس کی رضا اور عدمِ رضا کی معرفت کے لیے اُس کے بھیجے ہوئے سچے پیغمبروں اور رسولوں کی ہدایت ورشد پر عمل کیا جائے، اس عقیدہ کا نام "اسلام" اور "حنیفیت" ہے۔ بہرحال یہ پہلا دن تھا جبکہ ابراہیم علیہ السلام نے اس اعلانِ حق کے ذریعہ خیر وشر، اطاعت وسرکشی، اور تسلیم ورضا اور بغاوت وسرکشی کے درمیان "حنیف" کی اصطلاح "مسلم" کے لیے اور "صابی" کی اصطلاح "مشرک" کے لیے قائم کرکے دونوں راہوں کے درمیان مستقل امتیاز قائم کردیا، اور یہ امتیاز ایسا مقبول ہوا کہ آنے والی تمام پیغمبرانہ تعلیمات کی بنیاد واساس اسی نام سے موسوم کی گئیں حتیٰ کہ خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وصحبہ وبارک وسلم کے آخری پیغام کا نام بھی "ملتِ حنیف" اور اُس کے پیرو کا نام "مسلم" قرار پایا۔

واتبع ملّۃ ابرٰھیم حنیفا (البقرۃ) اور پیروی کرو ملتِ ابراہیم کی جو حنیف تھا۔

ھو سمّٰکم المسلمین من قبل وفی ھٰذا (حج) اس ابراہیم نے تمہارا نام پہلے ہی سے مسلمان رکھا ہے اور اس قرآن میں بھی وہی نام پسند رہا۔

یہی وجہ ہے کہ سورۂ "ابراہیم" کی یہ خصوصیت ہے کہ اُس میں انبیاء علیہم السلام کے ظہور اور اُن کے حالات وتشخصات اور نتائج کو مجموعی طور پر پیش کیا گیا ہے، اور بتایا گیا ہے کہ پیغمبروں کی دعوت رشد وہدایت کے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں کے درمیان کیا فرق ہے؟

پس ان مجموعی خصوصیاتِ ابراہیمی کے پیشِ نظر یہ کہنا صحیح ہے کہ نبیوں اور رسولوں کی مقدس زندگی میں ابراہیم (علیہ السلام) کا مقام "مجددِ انبیاء و رسل" کا مقام ہے۔

واقعاتِ زیرِبحث سے متعلق چند عبرتیں

(۱) جب انسان کسی عقیدہ کو علم و یقین کی روشنی میں قائم کرلیتا ہے، اور وہ اُس کے قلب میں جاگزیں، اُس کی رُوح میں پیوست، اور اُس کے سینہ میں نقش کالحجر ہو جاتا ہے تو اُس کا فکر و خیال، اس کا سوچ بچار، اور اس کا استغراق اس بارہ میں اس درجہ زبردست اور ثابت و راسخ ہو جاتا ہے کہ کائنات کا کوئی حادثہ اور دنیا کی کوئی سخت سے سخت مصیبت بھی اُس کو اپنی جگہ سے نہیں ہٹا سکتی، وہ اس کے لیے آگ میں بے خطر کود پڑتا، سمندر میں بے جھجک چھلانگ مار دیتا اور سولی کے تختہ پر بے خوف جان دے دیتا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کے عزم و ثبات کی مثال اس کے لیے ایک زندہ اور روشن مثال ہے۔

(۲) حمایتِ حق کے لیے ایسے دلائل و براہین پیش کرنے چاہئیں جو دشمن اور باطل پرست کے تہِ قلب میں اُتر جائیں اور وہ زبان سے خواہ اقرارِ حق نہ کرے لیکن اُس کا ضمیر اور اُس کا قلب اُس کے اقرار پر مجبور ہو جائے بلکہ بعض مرتبہ زبان بھی اعلانِ حق سے بے اختیارانہ طور پر باز نہ رہ سکے۔

پیغمبروں اور رسولوں کی راہ یہی ہے وہ جدل و مخاصمت کی منطقیانہ راہوں پر نہیں چلتے اُن کے دلائل و براہین کی بنیاد محسوسات و مشاہدات پر ہوتی ہے یا سادہ وجدانیات و عقلیات پر حضرت ابراہیم کا اصنام پرستی و کواکب پرستی کے متعلق جمہور سے مناظرہ اور مناظرۂ نمرود، اس کی روشن اور واضح مثال ہے۔

(۳) کسی امرِ حق کو ثابت کرنے کے لیے دلیل میں مخالف کے باطل عقیدہ کو فرضی طور پر تسلیم کرلینا جھوٹ یا اس باطل عقیدہ کا اقرار نہیں ہے بلکہ اُس کو "فرض الباطل مع الخصم" یا "معاریض" کہا جاتا ہے اور یہ طریقۂ استدلال مخالف کو اپنی غلطی کے اعتراف پر مجبور کر دیتا ہے۔

حضرتِ ابراہیم نے جمہور کے ساتھ مناظرہ میں دلیل کا یہی پہلو اختیار کیا تھا جس نے صنم پرستوں کو مجبور کر دیا کہ وہ اقرار کر لیں کہ بیشک بُت کسی حال میں بھی نہ سنتے ہیں اور نہ جواب دے سکتے ہیں۔

(۴) اگر ایک مسلم کے والدین مشرک ہوں اور کسی طرح وہ شرک سے باز نہ آتے ہوں تو اُن کی مشرکانہ زندگی سے بیزار اور علیٰحدہ رہتے ہوئے اُن کے ساتھ دنیوی معاملات اور آخرت کی پند و نصائح میں عزت و حرمت کا معاملہ کرنا چاہیے اور سختی اور درشتی کو کام میں نہ لانا چاہیے۔ حضرت ابراہیم کا طرزِ عمل آزر کے ساتھ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقِ عمل ابو طالب کے ساتھ اس مسئلہ کے لیے قطعی اور یقینی شہادت ہیں۔

(۵) اگر قلبِ مومن صحیح عقائد پر اطمینانِ قلب اور زبان و قلب کی مطابقت کے ساتھ ایمان رکھتا ہے، مگر عینی اور حقیقی مشاہدہ و محسوس کے لیے یا اُس کو حق الیقین کے درجہ تک حاصل کرنے کے لیے کسی ایمانی یا اعتقادی مسئلہ میں بھی سوال و جستجو کی راہ اختیار کرتا اور طمانیتِ قلب کا طالب ہوتا ہے تو یہ جستجو ریب و کفر نہیں ہے بلکہ عین ایمان ہے۔ حضرت ابراہیم کے جواب "ولٰكن لِيَطْمَئِنَّ قَلْبِي" سے اسی حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے۔

(۶) دسترخوان کی وسعت اگر ریا و نمود سے پاک ہو اور فطری تقاضے کے پیشِ نظر مہمان نوازی میں وسعتِ قلب اور فراخ حوصلگی پائی جاتی ہو تو اخلاقِ کریمانہ میں بہت بڑی فضیلت شمار ہوتی ہے اور "سخاءِ نفس" اور "کرم" کے نام سے موسوم ہے۔

یہ وصفِ گرامی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حقیقتِ نفس بن چکا تھا اور فطری تھا مہمان نوازی، دسترخوان کی وسعت، آنے والوں کا احترام، ایسے اوصاف تھے جو ابراہیم علیہ السلام میں "مثلِ اعلیٰ" کی حد تک پہنچے ہوئے تھے۔

بعض کتابوں میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مہمان نوازی کے سلسلہ میں ایک عجیب واقعہ

منقول ہے، کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حسبِ دستور حضرت ابراہیم کسی مہمان کے انتظار میں جنگل میں کھڑے تھے، کیونکہ بغیر مہمان کے نہ اُن کا دسترخوان بچھتا تھا اور نہ وہ کھانا کھاتے تھے۔ سامنے سے ایک بہت بوڑھا آدمی نظر پڑا جس کی کمر بھی کج ہوگئی تھی اور لکڑی کے سہارے بمشکل چل رہا تھا، ابراہیم علیہ السلام آگے بڑھے اور مسرت کے ساتھ اُس کو سہارا دیتے ہوئے گھر لائے، دسترخوان بچھا، اور کھانا چنا گیا، جب سب فارغ ہوگئے تو حضرت ابراہیم نے فرمایا۔ اس خدائے یکتا کا شکر ادا کر جس نے ہم سب کو یہ نعمتیں عطا فرمائیں۔ بوڑھے نے خشمناک ہو کر کہا میں نہیں جانتا کہ تیرا خدائے واحد کون ہے میں تو اپنے اُس معبود (بُت) کا شکر ادا کرتا ہوں جو میرے گھر میں رکھا ہے۔ یہ جواب ابراہیم علیہ السلام کو بہت شاق گذرا، اور اُس کو فوراً گھر سے رخصت کر دیا، لیکن کچھ وقفہ نہ گذرا تھا کہ ابراہیم علیہ السلام کے دل پر اپنے اس طرزِ عمل سے تکدر ہوا، اُنھوں نے سوچا کہ جس خدائے واحد کا شکر میں اُس سے کرانا چاہتا تھا اُس کی شان تو یہ ہے کہ اس بوڑھے کی اس عمرِ طویل میں وہ برابر اپنی نعمتوں سے اُس کو نوازتا رہا اور اُس کی بت پرستی، کفر، اور شرک سے ناراض ہو کر ایک وقت بھی اُس پر رزق کا دروازہ بند نہیں کیا پھر مجھ کو کیا حق تھا کہ اگر اُس نے میری بات نہ مانی اور حق کے کلمہ کو قبول نہ کیا تو خفا ہو کر اُس کو گھر سے نکال دیا۔

یہ واقعہ اپنی تاریخی حیثیت میں قابلِ قبول ہو یا ناقابلِ قبول لیکن اس حقیقت کا ضرور اعلان کرتا ہے کہ حضرت ابراہیم کے اخلاقِ کریمانہ کی وہ بلندی "جو حقیقی مثلِ اعلیٰ" تک پہنچی ہوئی تھی ضرب المثل اور زبان زدِ خلائق تھی۔ اور ان کا یہ فکر، پیغامِ حق اور دعوتِ اسلام کے لیے بہترین اسوہ ہے۔

(۷) اللہ تعالیٰ جن ہستیوں کو اپنے ابلاغِ حق کے لیے چن لیتا ہے اُن کے قلب و دماغ کو اپنے نور سے اس درجہ روشن کر دیتا ہے کہ اُن کے سامنے عشقِ حق و صداقت کے سوائے دوسری کوئی چیز باقی ہی نہیں رہتی اور اس لیے اُن میں شروع ہی سے یہ استعداد ودیعت ہوتی ہے۔

کہ وہ عہدِ طفولیت ہی سے اپنے ہم عصروں میں ممتاز اور نمایاں نظر آنے لگتے اور راہِ حق میں ابتلاء و امتحان کو خوشی خوشی سہنے اور صبر و رضا کا اسوۂ حسنہ پیش کرتے رہتے ہیں۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کا واقعہ اس کی شہادت کے لیے شاہد عدل اور باعث صد ہزار عبرت و عظمت ہے۔

(۸) حضرت لوطؑ اگرچہ حضرت ابراہیمؑ کے برادرزادہ اور اُن کے پیرو تھے مگر چونکہ شرفِ نبوت سے بھی سرفراز ہو چکے تھے اور خدا کے ایلچی بنا دیے گئے تھے اس لیے سدوم اور عامورہ میں ہمہ قسم کے مصائب اور وطن سے دور دشمنوں کے نرغہ کی تکالیف کے باوجود اُنھوں نے صبر و استقامت سے کام لیا اور اپنے بزرگ چچا اور خاندان کی مدد کی طلب کی بجائے صرف خدائے عزوجل ہی پر بھروسہ رکھتے ہوئے اس کے احکام کے سامنے رضا و تسلیم کا ثبوت دیا، یہ مقام "مقربین وانبیاءؑ" کا مقام ہے۔

حضرت یعقوب (علیہ السلام)

نسب نامہ، قرآنِ عزیز میں ذکرِ یعقوبؑ، اولادِ یعقوبؑ، ولادت یوسفؑ

نسب نامہ حضرت یعقوبؑ، حضرتِ اسحٰق کے بیٹے اور حضرت ابراہیمؑ کے پوتے ہیں، اور حضرتِ ابراہیم (علیہ السلام) کے بھتیجے بتوئیل کے نواسہ، ان کی والدہ کا نام رفقہ یا ربقہ تھا یہ اپنی والدہ کے چہیتے اور پیارے تھے اور ان کا حقیقی بھائی عیسو والد کا محبوب اور پیارا، اور دونوں حقیقی بھائی تھے۔

تورات سے اِن دونوں بھائیوں کی باہم ناراضی کا واقعہ گذشتہ سطور میں نقل کیا جا چکا ہے

حضرت یعقوب اپنی والدہ کے اشارہ پر جب فدّان آرام چلے گئے تو اُن کے ماموں لابان نے اُن سے یہ عہد لیا کہ وہ دس سال اُن کے یہاں رہ کر اُن کی بکریاں چرائیں تو وہ اس مدت کو مہر قرار دے کر اپنی لڑکی سے شادی کر دینگے، جب یعقوب علیہ السلام نے اس مدت کو پورا کر دیا تو لابان نے اپنی بڑی لڑکی لیّہ سے اُن کا نکاح کرنا چاہا تو حضرت یعقوبؑ نے اپنا رجحان طبع چھوٹی لڑکی راحیل کی جانب ظاہر کیا، لابان نے یہ عذر کیا کہ یہاں کے دستور کے مطابق بڑی لڑکی کے نکاح سے قبل چھوٹی لڑکی کا نکاح نہیں ہو سکتا، اس لیے تم اس رشتہ کو منظور کرو، اور اپنے قیام کو دس سال اور طویل کرو اور میری خدمت میں رہو تو راحیل بھی تمہارے نکاح میں دی جا سکیگی (کیونکہ اس زمانہ میں دو بہنوں کا ایک نکاح میں جمع ہونا شرعاً ممنوع نہ تھا) چنانچہ یعقوب علیہ السلام نے اُس مدت کو بھی پورا کر دیا اور راحیل سے شادی کر لی، ان دونوں کے علاوہ لیّہ کی خانہ زاد زُلفا اور راحیل کی خانہ زاد بلہا بھی ان کی زوجیت کے رشتہ میں منسلک ہو گئیں۔ اور ان سب سے اولاد بھی ہوئی۔ اور بنیامین کے علاوہ

یعقوب علیہ السلام کی تمام اولاد اپنے ماموں کے ہی یہاں پیدا ہوئی اور جب یعقوب علیہ السلام فلسطین واپس آ گئے تو یہاں بنیامین پیدا ہوئے۔ لابان نے یعقوب علیہ السلام کو بیس سال اپنے پاس رکھنے کے بعد بہت سا مال ومتاع اور ریوڑ دے کر رخصت کیا اور یہ پھر اپنے دادا کے دار الہجرت فلسطین میں آ کر مقیم ہو گئے۔

یعقوبؑ جس زمانہ میں فدان آرام چلے گئے تھے اُسی زمانہ میں عیسو ناراض ہو کر اپنے چچا اسمٰعیل علیہ السلام کے پاس چلے گئے تھے اور اُن کی بیٹی سے شادی کر کے قریب ہی آباد ہو گئے تھے یہ تاریخ میں ادوم کے نام سے مشہور ہیں۔ اس عرصہ میں دونوں بھائیوں کے درمیان جو چپقلش تھی وہ بھی دور ہو گئی اور دونوں کے درمیان محبت کا رشتہ پھر استوار ہو گیا اور دونوں نے ایک دوسرے کو تحائف بھیجنے کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔

یہ تمام واقعات تورات کی کہانی اور داستان ہیں، قرآنِ عزیز ان تفصیلات کے حق میں قطعاً خاموش ہے اور صرف حضرت یعقوبؑ کے جلیل القدر نبی، صاحبِ صبر وعزیمت، اور یوسف علیہ السلام کے برگزیدہ باپ ہونے کا ذکر کرتا ہے اور اسی ضمن میں نام لیے بغیر یوسفؑ کے دوسرے بھائیوں کا بھی ذکر آ جاتا ہے۔

ذکرِ یعقوب قرآن میں

قرآن عزیز میں حضرتِ یعقوب کا نام دس جگہ آیا ہے اور اگرچہ سورۂ یوسف میں جگہ جگہ ضمائر اور اوصاف کے لحاظ سے اور بعض دوسری سورتوں مثلاً "مومن" میں اوصاف کے اعتبار سے اُن کا تذکرہ موجود ہے، مگر نام کے ساتھ صرف دو ہی جگہ اُن کا ذکر کیا گیا ہے یہ مسطورۂ ذیل جدول اس کی وضاحت کرتی ہے۔

سورۃ	آیت	شمار	سورۃ	آیت	شمار
بقرہ	۱۳۲-۱۳۶-۱۴۰	۳	نساء	۱۶۳	۱

سورہ	آیت	شمار	سورہ	آیت	شمار
انعام	۸۵	۱	یوسف	۶-۳۸	۲
مریم	۶	۱	صٓ	۴۵	۱
انبیاء	۷۲	۱			

اسرائیل | حضرت یعقوب کا نام عبرانی میں اسرائیل ہے یہ اِسرا (عبد) اور ایل (اللہ) دو لفظوں سے مرکب ہے، اور عربی میں اس کا ترجمہ "عبد اللہ" کیا جاتا ہے۔ حضرت ابراہیم کا وہ اسحاقی خاندان جو ان کی نسل سے ہے اسی لیے بنی اسرائیل کہلاتا ہے اور آج بھی یہود و نصاریٰ کے قدیم خاندان اسی نسبت کے ساتھ منسوب ہیں۔

اولادِ یعقوب | یعقوب علیہ السلام کے بارہ لڑکے تھے اور گذشتہ سطور میں واضح ہو چکا ہے کہ بنیامین کے علاوہ اُن کی تمام اولاد فدان آرام ہی میں پیدا ہو چکی تھی صرف بن یمین فلسطین "ارضِ کنعان" میں پیدا ہوئے۔ حضرت یعقوب کی یہ اولاد چونکہ چند بیبیوں سے ہے اس لیے اُن کی تفصیل یہ ہے۔

لیئہ یا لیا بنت لابان سے (۱) راؤبین (۲) شمعون (۳) لاوی (۴) یہوذا (۵) ویسا کر (۶) زلوبون پیدا ہوئے۔

راحیل بنت لابان سے (۷) یوسف (۸) بن یمین پیدا ہوئے۔

بِلہا جاریہ راحیل سے (۹) وان (۱۰) نفتالی اور زُلفا جاریہ لیئہ سے (۱۱) جاد اور (۱۲) آشیر پیدا ہوئے[1]

پیغمبری | حضرت یعقوب، خدا کے برگزیدہ پیغمبر تھے اور کنعانیوں کی ہدایت کے لیے مبعوث ہوئے انہوں نے برسوں اس خدمتِ حق کو انجام دیا۔ قرآن عزیز میں چونکہ ان کا ذکر بیشتر حضرت یوسف کے ساتھ کیا گیا ہے اِس لیے وہیں قابل مراجعت ہے۔

[1] تورات پیدائش باب ۳۵ آیات ۲۱-۲۶۔

حضرت یوسف علیہ السلام

یوسف علیہ السلام کا نسب نامہ۔ یوسفؑ کا ذکر قرآنِ حکیم میں۔ سورۂ یوسف کا نزول۔ برادرانِ یوسف۔ یوسف کا خواب، برادرانِ یوسف کی سازش۔ یوسف آزمائشوں میں۔ چاہِ کنعان۔ یوسف بحالت غلامی۔ عزیزِ مصر اور یوسف۔ عزیزِ مصر کی بی بی اور یوسف۔ یوسف اور آیت "ولقد ہمت بہ"۔ شاہی خاندان کی عورتیں اور یوسف۔ قیدخانہ۔ قیدخانہ میں دعوت و تبلیغ۔ تعبیر خواب۔ شاہِ مصر اور یوسف۔ یوسف تخت شاہی پر۔ برادرانِ یوسف کا قافلہ، حضرت یوسف کا حسنِ سلوک، عذرخواہی اور معافی۔ حضرت یعقوب کی مصر میں آمد اور لختِ جگر سے ملاقات۔ یوسف علیہ السلام کی وفات۔ آخری وصیت۔ حضرت موسیٰ کے زمانہ میں وصیت پر عمل۔

نسب نامہ | یوسف بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم (علیہم السلام) حضرت ابراہیم کے پڑپوتے ہیں اور ان کی والدہ کا نام راحیل بنت لابان ہے۔ حضرت یعقوب کو ان کے ساتھ بیحد محبت تھی بلکہ عشق تھا، اور اس لیے کسی وقت بھی اُن کی جُدائی گوارا نہ کرتے تھے۔

یہ بھی اپنے والد، دادا، اور پردادا کی طرح سنِ رشد کو پہنچ کر خدائے برتر کے جلیل القدر پیغمبر بنے اور "ملتِ ابراہیمی" کی دعوت و تبلیغ کی خدمت سرانجام دی۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائے زندگی ہی سے اُن کی دماغی اور فطری استعداد دوسرے بھائیوں کے مقابلہ میں بالکل جُدا اور نمایاں تھی۔ یعقوب علیہ السلام کے عشق و محبت کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہ یوسف کی پیشانی کا چمکتا ہوا نورِ نبوت پہچانتے، اور وحیِ الٰہی کے ذریعہ اس کی اطلاع پا چکے تھے۔

قرآنِ عزیز میں حضرتِ یوسف کا ذکر | حضرت یوسف کا نام قرآنِ عزیز نے چھبیس[۲۶] مرتبہ ذکر کیا ہے۔ جن میں سے چوبیس جگہ صرف سورۂ یوسف میں اور ایک جگہ سورۂ انعام میں اور ایک جگہ سورۂ غافر میں ذکر آیا ہے

اوران کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ پردادا ابراہیم علیہ السلام کی طرح ان کے نام پر بھی قرآن عزیز کی ایک سورت "سورۂ یوسف" نازل ہوئی ہے جو ان کے واقعات سے متعلق عبرت وموعظت کا بے نظیر ذخیرہ ہے

سورۃ	آیت	شمار
انعام	۸۴	
یوسف	۴-۷-۱۰-۱۱-۱۷-۲۱-۲۹-۴۶-۵۱-۵۶-۶۱-۶۶-۷۲-۷۳-۷۴-۸۵-۸۷-۸۹-۹۴-۹۹	۲۴
غافر	۳۴	۱
		۲۶

سورۂ یوسف قرآنِ عزیز نے یوسف علیہ السلام کے واقعہ کو "احسنِ قصص" کہا ہے اس لیے کہ اس ایک واقعہ میں جس قدر عِبَر ونصائح اور مواعظ وحِکم ودیعت ہیں دوسرے کسی واقعہ میں یکجا میسر نہیں ہیں۔ درحقیقت یہ واقعہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے عجیب دلکش اور زمانہ کے عروج وزوال کی زندہ یادگار ہے۔ یہ ایک فرد کے ذریعہ قوموں کے بننے اور بگڑنے، گرنے اور اُبھرنے کی ایسی بولتی .. ہوئی تصویر ہے جو کسی تشریح وتوضیح کی محتاج نہیں رہتی، یہ بدوی اور خانہ بدوش قبیلہ کے ایک ایسے فردِ یگانہ اور انمول موتی کی حیرت زا تاریخ ہے جس کو خدائے تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کے اعجاز نے اُس زمانہ کی بڑی سے بڑی متمدن قوم کی راہنمائی اور اُن پر حاکمانہ اقتدار کے لیے چن لیا تھا۔

قرآنِ عزیز توراۃ کی طرح داستان گوئی یا محض اشخاص واقوام کی تاریخی حالات کا مرقع نہیں ہے بلکہ وہ جن واقعاتِ تاریخی کو بیان کرتا ہے اُس کے سامنے اُن کے لیے صرف ایک ہی مقصد ہوتا ہے اور وہ عبرت وموعظت اور تذکیر وپند کا مقصدِ وحید ہے۔

پس جبکہ یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں بے نظیر عبرتیں اور بصیرتیں پنہاں تھیں۔ مثلاً رشد وہدایت

کی اہمیت، ابتلاء اور آزمائشوں پر صبر و استقامت، رضا و تسلیم کے مظاہرے، افراد و اقوام کے عروج و اقبال کے وقائع، خدائے تعالیٰ کے عدل و رحم کی کرشمہ سازیاں، انسانی اور بشری لغزشیں اور ان کے انجام و مآل، عصمت اور ضبطِ نفس کی عجوبہ کاریاں، تو بلا شبہ وہ "احسن قصص" ہے، اور کتابِ ماضی کا وہ حسین ورق جو اپنی شانِ زیبائی میں یکتا اور فرد کہلانے کا مستحق ہے۔

سورۂ یوسف کے شانِ نزول کے بارہ میں حدیثی روایات اور مفسرین کے اقوال کا حاصل یہ ہے کہ کفارِ مکہ نے ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق "یہود" سے گفتگو کی اور اپنی درماندگی اور پریشانی کا اظہار کیا اس پر یہود نے اُن سے کہا کہ اس مدعی نبوت کو زچ کرنے اور جھوٹا بنانے کے لیے تم ان سے یہ سوال کرو کہ یعقوب کی اولاد شام سے مصر کیوں منتقل ہوئی اور یوسف سے متعلق جو واقعات ہیں اُن کی تفصیل کیا ہے۔

کفارِ مکہ نے یہود کی ہدایت کے مطابق ذاتِ اقدس سے یہ دونوں سوال کیے اور آپ نے وحی الٰہی کے ذریعہ وہ سب کچھ اُن کو سُنا دیا جو سورۂ یوسف میں موجود ہے۔

یوسفؑ کا خواب اور برادرانِ یوسف

ان واقعات کا حاصل یہ ہے کہ جبکہ حضرتِ یعقوب اپنی تمام اولاد میں حضرت یوسف سے بیحد محبت رکھتے تھے تو حضرت یعقوب کا حضرتِ یوسف کے ساتھ والہانہ عشق و محبت برادرانِ یوسف (علیہ السلام) کے لیے بیحد شاق اور ناقابلِ برداشت تھا، اور وہ ہر وقت اس فکر میں لگے رہتے تھے کہ یا حضرتِ یعقوب کے قلب سے اس محبت کو نکال ڈالیں اور یا پھر یوسف ہی کو اپنے راستہ سے ہٹا دیں تاکہ قصہ پاک ہو جائے۔

ان بھائیوں کے حاسدانہ تخیل پر مزید تازیانہ یہ ہوا کہ یوسف علیہ السلام نے ایک خواب دیکھا کہ گیارہ ستارے اور شمس و قمر اُن کے سامنے سجدہ ریز ہیں حضرتِ یعقوب نے چہیتے بیٹے کا یہ خواب سُنا تو سختی کے ساتھ اُن کو منع کر دیا کہ اپنا یہ خواب کسی کے سامنے نہ دُہرانا، ایسا نہ ہو کہ اس کو سُن کر تیرے

بھائی بُرے پیش آئیں، کیونکہ شیطان، انسان کے پیچھے لگا ہے، اور تیرا خواب اپنی تعبیر میں بہت صاف اور واضح ہے۔

یٰبُنَیَّ لَا تَقْصُصْ رُؤْيَاكَ عَلٰٓى اِخْوَتِكَ	اے میرے بیٹے تو اپنے اس خواب کو اپنے بھائیوں کو نہ سُنانا
فَیَکِیْدُوْا لَكَ كَیْدًا، اِنَّ الشَّیْطٰنَ	کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تیرے ساتھ کوئی چال چل جائیں، بلاشبہ
لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ. وَكَذٰلِكَ	شیطان انسان کے لیے کھُلا دشمن ہے، اور اس طرح تیرا پروردگار
یَجْتَبِیْكَ رَبُّكَ وَیُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِیْلِ	تجھ کو برگزیدہ کریگا، اور سکھائیگا تاویلِ احادیث، اور اپنی نعمت
الْاَحَادِیْثِ وَیُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَیْكَ وَ	کو تجھ پر اور اولادِ یعقوب پر تمام کریگا جس طرح کہ اس نعمت
عَلٰٓى اٰلِ یَعْقُوْبَ كَمَآ اَتَمَّهَا عَلٰٓى	(نبوت) کو پورا کیا تیرے اجداد پر پہلے سے (یعنی) ابراہیم
اَبَوَیْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِیْمَ وَاِسْحٰقَ	و اسحٰق پر، بیشک تیرا پروردگار جاننے والا، حکمت والا
اِنَّ رَبَّكَ عَلِیْمٌ حَكِیْمٌ (یوسف)	ہے۔

اس مقام پر توراۃ اور قرآنِ عزیز کے بیانات میں تفاوت و اختلاف پایا جاتا ہے۔

(۱) قرآنِ عزیز بیان کرتا ہے کہ یوسف علیہ السلام نے جب اپنا خواب حضرت یعقوب علیہ السلام کو سُنایا تو دوسرے بھائی وہاں موجود نہ تھے اور توراۃ کہتی ہے کہ یہ معاملہ بھائیوں کی موجودگی میں پیش آیا۔

(۲) قرآنِ عزیز سُناتا ہے کہ حضرت یعقوب اس خواب سے بحقِ یوسف علیہ السلام بیحد مسرور ہوئے اور اُن کو نبوت و علومِ الٰہیہ کی بشارت سُنائی مگر توراۃ کہتی ہے کہ یعقوب علیہ السلام خواب سن کر بہت خفا ہوئے اور فرمانے لگے کہ شاید اس سے تیرا منشا یہ ہے کہ میں تیری والدہ اور تیرے سب بھائی تیرے سامنے سجدہ ریز ہونگے؟[1]

واقعات کی اس ترتیب کے اعتبار سے جو آگے چل کر قرآنِ عزیز اور توراۃ میں مشترک ہے

[1] پیدائش باب ۳۷ آیت ۹-۱۰۔

یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآنِ عزیز ہی کا بیان صحیح اور درست ہے، نیز تقاضاءِ فطرت اسی کا داعی ہے کہ یوسف علیہ السلام اپنے اس خواب کو بھائیوں سے الگ ہو کر بیان کریں، اور یعقوب علیہ السلام بیٹے کے اس خواب کو سن کر مسرور ہوں کہ ہر ایک باپ اپنی اولاد کے ترقی درجات اور بلندی مناصب کا خواہشمند ہوتا ہے۔ خصوصاً جبکہ یعقوب علیہ السلام نبی ہونے کی وجہ سے اس خواب کی تعبیر میں یوسف علیہ السلام کے لیے جو بلندی دیکھ رہے تھے وہ موجب صد ہزار مسرت تھی نہ کہ باعثِ رنج والم۔

غرض حسد کی بھڑکتی ہوئی آگ نے ایک روز برادرانِ یوسف کو یوسف علیہ السلام کے خلاف سازش کرنے پر مجبور کر دیا۔

اذ قالو الیوسف واخوہ احبُّ اِلٰی ابینا منا ونحن عصبۃٌ ان ابانا لفی ضلال مبین. اقتلوا یوسف او اطرحوہ ارضاً یخلُ لکم وجہ ابیکم وتکونوا من بعدہٖ قوماً صٰلحین. قال قائلٌ منھم لا تقتلوا یوسف والقوہ فی غیٰبت الجُبّ یلتقطہ بعضُ السیارۃ ان کنتم فاعلین. (یوسف)

جبکہ وہ کہنے لگے البتہ یوسف اور اُس کا بھائی (بن یمین) ہمارے باپ کو زیادہ پیارا ہے اور ہم اُن سے زیادہ قوت والے ہیں، بلاشبہ ہمارا باپ صریح خطا پر ہے، یوسف کو مار ڈالو یا کسی ملک میں پھینک دو تاکہ تمہارے باپ کی توجہ تمہاری طرف سمٹ آئے، اور ہو رہنا بعد میں نیک قوم، اُن میں سے ایک نے کہا یوسف کو قتل کرو اور اُس کو گمنام کنویں میں ڈال دو کہ اُٹھا لیجائے اُس کو کوئی مسافر، اگر تم کو کرنا ہی ہے۔

اس مشورہ کے بعد سب جمع ہو کر حضرت یعقوب علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ آپ یوسف کو ہمارے ساتھ سیر کرنے کس لیے نہیں بھیجتے، کیا آپ کو ہم پر اعتماد نہیں ہے ہم سے زیادہ اُس کا محافظ دوسرا کون ہو سکتا ہے؟

مالک لا تامنا علیٰ یوسف وانا	(اے باپ) کیا بات ہے کہ تجھ کو یوسف کے بارہ میں ہم
لہٗ لنٰصحون . ارسلہ معنا غدًا	پر اعتماد نہیں ہے حالانکہ ہم اُس کے خیرخواہ ہیں، کل
یرتع ویلعب وانا لہٗ لحٰفظون.	اس کو ہمارے ساتھ بھیج کہ وہ کھائے پیے اور کھیلے کودے اور
(یوسف)	بلا شبہ ہم اُس کے نگہباں ہیں۔

حضرت یعقوب سمجھ گئے کہ ان کے دلوں میں کھوٹ ہے اور یہ یوسف کو نقصان پہنچانے کے درپے ہیں، مگر صاف صاف اس لیے ظاہر نہ کیا کہ کہیں بگڑ کر علی الاعلان دشمنی نہ کرنے لگیں اور یہ کہ ممکن ہے کہ اس پوشیدہ صورتِ حال میں وہ ظالمانہ کارروائی سے باز رہیں، تاہم اشارات میں اُن پر حقیقتِ حال واضح کر دی کہ واقعی مجھ کو یوسف کے بارہ میں تم سے اندیشہ ہے۔

قال انی لیحزننی ان تذھبوا بہ	یعقوب نے کہا مجھے اس سے رنج اور دکھ پہنچتا ہے کہ
واخاف ان یأکلہ الذئب	تم اُس کو (اپنے ساتھ) لیجاؤ، اور مجھے یہ خوف ہے کہ اس کو
وانتم عنہ غافلون .	بھیڑیا کھا جائے اور تم غافل رہو۔

برادرانِ یوسف نے یہ سُن کر بیک زبان کہا:-

لئن اکلہ الذئب ونحن عصبۃٌ	اگر کھا گیا اُس کو بھیڑیا حالانکہ ہم سب طاقتور ہیں تو بلاشبہ
انا اذا لخٰسرون .	ایسی صورت میں تو ہم نے سب کچھ گنوا دیا۔

اس جگہ توراۃ کا بیان یہ ہے کہ حضرت یعقوب نے خود اپنے حکم سے یوسف کو اُس کے بھائیوں کے ساتھ جنگل میں کھیلنے کودنے کے لیے بھیجا تھا[1]، مگر آگے کے واقعات خود توراۃ کے بیان کی تغلیط کرتے ہیں۔

چاہِ کنعان غرض برادرانِ یوسف یوسف کو جنگل کی سیر کرانے کے بہانہ لے گئے اور مشورہ کے مطابق ایک ایسے کوئیں میں اُس کو ڈال دیا جس میں پانی نہ تھا اور عرصہ سے خشک پڑا تھا، اور واپسی میں اُس کے

[1] پیدائش باب ۳۷ آیت ۱۳-۱۴۔

قمیص کو کسی جانور کے خون میں تر کر کے روتے ہوئے حضرتِ یعقوب کے پاس آئے اور کہنے لگے، اے باپ! اگرچہ ہم تجھ کو اپنی صداقت کا کتنا ہی یقین دلائیں مگر تجھ کو ہرگز یقین نہ آئیگا کہ ہم دوڑ میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے میں مشغول تھے اور یوسف کو اس دوران میں بھیڑیا اُٹھا کر لے گیا۔

حضرتِ یعقوب نے پیراہنِ یوسف کو دیکھا تو خون آلود تھا مگر کسی ایک جگہ سے بھی پھٹا ہوا نہ تھا اور نہ چاک داماں تھا، فوراً حقیقتِ حال سمجھ گئے، مگر جھڑکنے طعن و تشنیع کرنے اور نفرت و حقارت کا طرزِ عمل اختیار کرنے کی بجائے پیغمبرانہ علم و فراست اور حلم و سماحت کے ساتھ یہ بتا دیا کہ باوجود حقیقتِ حال کو چھپانے کی سعی کے تم اُسے چھپا نہ سکے۔

قال بل سوّلت لکم انفسکم امرا	(حضرت یعقوب نے) کہا یہ ہرگز نہیں بلکہ بنا دی ہے تمہارے
فصبرٌ جمیلٌ واللہ المستعان علیٰ	نفسوں نے تمہارے لیے ایک بات، اب صبر ہی بہتر ہے۔
ما تصفون ۔	اور جو بات تم ظاہر کرتے ہو اُس پر اللہ ہی سے مدد مانگتا ہوں۔

یوسف اور غلامی یہاں یہ گفتگو ہو رہی تھی اور یوسف کے ساتھ یہ قصہ پیش آیا کہ حجازی اسمٰعیلیوں (مدیانیوں) کا ایک قافلہ شام سے مصر کو بخورات، بلسان اور مسالہ لاد کر لیے جا رہا تھا۔ کنواں دیکھ اُنھوں نے پانی کے لیے ڈول ڈالا، یوسف سمجھے کہ شائد بھائیوں کو رحم آگیا ڈول پکڑ کر لٹک گئے، تاجر نے ڈول نکالا تو یوسف کو دیکھ کر جوش سے شور مچایا۔

یٰبشریٰ ھٰذا غلام   بشارت ہو، ایک غلام ہاتھ آیا۔

توراۃ میں ہے کہ برادرانِ یوسف نے جب اسمٰعیلی قافلہ کو دیکھا تو آپس میں کہنے لگے کہ یوسف کو کنویں سے نکال کر اس قافلہ کے ہاتھ فروخت کر دو مگر اس سے پہلے ہی مدیانیوں (اسمٰعیلیوں) نے اُن کو نکال کر غلام بنا لیا، اور سب سے بڑا بھائی راؤبین جب کنویں پر پہنچا اور دیکھا کہ یوسف وہاں نہیں ہے تو روتا ہوا واپس آگیا، راؤبین کو یہ رائے یہوذا نے دی تھی، اور راؤبین شروع ہی سے اس فکر میں تھا کہ

یوسف کو کنویں سے نکال کر خاموشی سے باپ کے سپرد کر آئے اسی لیے اُس نے قتلِ یوسف کی سخت مخالفت کی تھی۔

اس مقام پر بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ یوسف کو خود برادرانِ یوسف نے ہی کنویں سے نکال کر اسمٰعیلیوں کے قافلہ میں فروخت کر دیا تھا، مگر مفسرین کے اس قول کی نہ تورات موافقت کرتی ہے اور نہ قرآن عزیز بلکہ دونوں سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ قافلہ والوں نے ہی یوسف کو کنویں سے نکالا اور اپنا غلام بنالیا۔

اسی طرح صاحبِ قصص الانبیا کو تورات کے بیان سے قافلہ کے متعلق غلط فہمی ہوگئی ہے اور وہ یہ کہ اُنھوں نے اسمٰعیلی اور مدیانی کو دو جُدا جُدا قافلے سمجھا ہے حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے۔ بلکہ حقیقتِ حال یہ ہے کہ شام سے مصر جانے والا یہ قافلہ ایک ہی قافلہ تھا جو نسلی اعتبار سے "اسمٰعیلی" اور ملکی اعتبار سے مدیانی[1] (حجازی) تھا۔

غرض اس طرح حضرت یوسف کو اسمٰعیلی تاجروں کے قافلہ نے اپنا غلام بنالیا اور مالِ تجارت کے ساتھ اُن کو بھی مصر لے چلے۔

حضرت یوسف کی زندگی کا یہ پہلو اپنے اندر کیسی عظمتیں پنہاں رکھتا ہے اس کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جو چشمِ بصیرت رکھتا ہو۔ چھوٹی سی عمر، والدہ کا انتقال ہو چکا ہے، باپ کی آغوشِ محبت تھی وہ بھی چھوٹی، وطن چھوٹا، بھائیوں نے بے وفائی کی، آزادی کی جگہ غلامی نصیب ہوئی، مگر ان تمام باتوں کے باوجود نہ شور و شیون ہے نہ واویلا، نہ جزع و فزع ہے اور نہ الحاح و زاری، قسمت پر شاکر، مصائب پر صابر اور خدا کے فیصلہ پر راضی بہ رضا سرِ نیاز خم کیے مصر کے بازار میں فروخت ہونے جا رہے ہیں پیچ ہو۔

[1] جدید نسلی و جغرافی تحقیق نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ جس مقام کو توراۃ میں مدین یا مدیان کہا ہے اُس سے وہ علاقہ مراد ہے جو ساعیر (سراۃ) سے بحر احمر کے کنارے شام سے یمن تک چلا گیا ہے۔ اس کو حضرت موسیٰ کے زمانہ سے بنی اسرائیل مدین اور شروع سے اسمٰعیلی حجاز کہتے تھے۔ اس لیے ایک ہی مقام کے یہ دو نام ہیں (ارض القرآن جلد ۲ ص ۴۷-۴۹)

نزدیکاں رابیش بود حیرانی

یوسف ؑ مصر میں | تقریباً دو ہزار سال قبل مسیح "مصر" تمدن و تہذیب کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا، یہاں کے حکمران عمالقہ (ہیکسس) تھے جبکہ حضرت یوسف کنعان سے ایک بدوی غلام کی حیثیت میں مصر میں داخل ہوئے۔ مصر کا دارالسلطنت اس زمانہ میں رعمیس تھا جہاں آج صان کی بستی آباد ہے یہی غالباً وہ مقام ہے۔ جغرافی حیثیت سے اس کا جائے وقوع مشرق کی جانب دریائے نیل کے قریب بتایا جاتا ہے۔ مصری افواج کا افسر شاہی خاندان کا ایک رئیس فوطیفار تھا، یہ سیر کے لیے مصر کے بازار سے گذر رہا تھا کہ یوسف پر نظر پڑی اور اُس نے معمولی قیمت دے کر اُن کو خرید لیا۔

ابھی ذکر ہو چکا ہے کہ اُس زمانہ میں مصری خود کو دنیا کی بہترین مہذب اور متمدن قوم سمجھتے تھے اور بدوی اور صحرائی قبائل کو نہایت ذلت و حقارت سے دیکھتے اور اپنے شہروں میں ان کے ساتھ اچھوت کی طرح کا معاملہ کرتے تھے۔ ان ہی قبائل میں سے ایک قبیلہ نسلِ ابراہیمی کی یادگار کنعان میں آباد تھا، یہاں مدنیت و حضارت کا نام و نشان تک نہ تھا، شکار پر اُن کے رزق کا مدار تھا اور خس پوش جھونپڑیاں اور بکریوں کے گلے اُن کا دھن دولت تھے۔

ان حالات میں یوسف ؑ کے متعلق خدائے تعالیٰ کی کارسازی اور معجزانہ چارہ سازی دیکھیے کہ ایک بدوی اور وہ بھی غلام، ایک متمدن اور صاحبِ شوکت و حشمت رئیس کے یہاں جب پہنچتا ہے تو اپنی عصمت مآب زندگی، حلم و وقار اور امانت و سلیقہ مندی کے پاک اوصاف کی بدولت اُس کی آنکھوں کا تارا اور دل کا مالک بن جاتا ہے، اور وہ اپنی بیوی سے کہتا ہے۔

اکرمی مثواہ عسیٰ ان ینفعنا او نتخذہ ولدا ۔ (دیکھو) اس کو عزت سے رکھ کچھ عجب نہیں کہ یہ ہم کو فائدہ بخشے یا ہم اس کو اپنا بیٹا بنالیں۔

اور یہ کس لیے ہوا، اور یوسف میں یہ پسندیدہ اطوار و اخلاق کہاں سے پیدا ہو گئے، ایک بدوی نے کس

یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی، اور ایک غلام نے کس مربّی سے اس پاک طینت کو پایا؟ اس کے متعلق قرآنِ عزیز جواب دیتا ہے۔

ولما بلغ اشدہ اٰتینٰہ حکماً	اور جب وہ سن رشد کو پہنچ گیا تو ہم نے اُس کو فیصلہ کی
وعلماً وکذٰلک نجزی المحسنین۔	قوت اور علم عطا کیے، اور ہم اسی طرح نکوکاروں کو جزا دیا کرتے ہیں۔

بہرحال فوطیفار نے حضرت یوسفؑ کے ساتھ غلاموں کا سا معاملہ نہیں کیا، بلکہ اپنی اولاد کی طرح عزت واحترام کے ساتھ رکھا، اور اپنی ریاست، دولت وثروت اور گھریلو زندگی کی تمام ذمہ داریاں ان کے سپرد کردیں اور اُن سب کا امین بنادیا، گویا کنعان کے گلہ بان کو عنقریب جو جہانداری و جہانبانی سپرد ہونے والی تھی یہ اُس کی تمہید تھی اسی لیے ارشاد ہوا۔

وکذٰلک مکنّا لیوسف فی	اور اسی طرح جگہ دی ہم نے یوسف کو اس ملک میں اور اس
الارض ولنعلمہ من تاویل الاحادیث	واسطے کہ اُس کو سکھائیں باتوں کا نتیجہ اور مطلب نکالنا
واللہ غالب علیٰ امرہ ولکنّ اکثر	اور اللہ طاقت ور رہتا ہے اپنے کام میں، لیکن اکثر آدمی
الناس لایعلمون۔	ایسے ہیں جو نہیں جانتے۔

عزیز مصر کی بیوی اور یوسف علیہ السلام

ایک مشہور صوفی ابن عطاء اللہ السکندری کا قول ہے۔ رُبَّمَا کَمَنَتِ المِنَنُ فِی المِحَنِ (اکثر خدا کے احسانات وکرم مصائب کے اندر مستور ہوتے ہیں) حضرت یوسفؑ کی ساری زندگی اسی مقولہ کا ہوبہو مصداق ہے۔

بچپن کی پہلی مصیبت یا آزمائش نے کنعان کی بدوی زندگی سے نکال کر تہذیب وتمدن کے گہوارہ "مصر" کے ایک بہت بڑے گھرانے کا مالک بنادیا، غلامی میں آقائی اسی کو کہتے ہیں۔

اب وقت کی دوسری اور کٹھن آزمائش شروع ہوئی، وہ یہ کہ حضرتِ یوسفؑ کا جوانی کا عالم تھا، حُسن وخوبروئی کا کوئی پہلو ایسا نہ تھا جو اُن کے اندر موجود نہ ہو، جمال ورعنائی کا پیکرِ مجسم،

رُخِ روشن شمس و قمر کی طرح منور، عصمت و حیا کی فراوانی سونے پر سہاگہ اور پھر ہر وقت کا ساتھ، عزیزِ مصر کی بیوی دل پر قابو نہ پا سکی اور یوسف پر پروانہ وار نثار ہونے لگی، مگر ابراہیم علیہ السلام کا پوتا اسحاق و یعقوبؑ کا نورِ دیدہ، خانوادۂ نبوت کا چشم و چراغ اور منصبِ نبوت کے لیے منتخب: بھلا اُس سے یہ کس طرح ممکن تھا کہ ناپاکی اور فحش میں مبتلا ہو اور عزیز کی بیوی کے ناپاک عزائم کو پورا کرے۔

لیکن مصر کی اس آزاد عورت نے جب اس طرح جادو چلتے نہ دیکھا تو ایک روز بے قابو ہو کر مکان کا دروازہ بند کر دیا اور اصرار کرنے لگی کہ مجھے شاد کام کر، حضرت یوسف کے لیے یہ وقت سخت آزمائش کا وقت تھا، شاہی خاندان کی نوجوان عورت، شعلۂ حُسن سے لالہ رُو، محبوب نہیں بلکہ عاشق، آرائشِ حُسن و زینت کی بے پناہ نمائش، عشوہ طرازیوں کی بارش، ادھر یوسف خود نوجوان حسین اور حُسن کی خوبی سے آشنا، دروازے بند، رقیب کا خوف نہ ڈر، مالکہ خود ذمہ دار، مگر ان تمام سازگار حالات نے کیا یوسف کے دل میں ایک لمحہ کے لیے بھی عزیزِ مصر کی بیوی کی حوصلہ افزائی کی، کیا اس کے دل نے قرار چھوڑ کر بے قراری اختیار کی، کیا نفس نے جہانِ قلب کو ایک سکنڈ کے لیے بھی متزلزل کیا؟ نہیں، ہرگز نہیں، بلکہ اس کے برعکس اُس پیکرِ عصمت، امینِ نبوت، مہبطِ وحیِ الٰہی نے دو لیسے دلکش اور محکم دلائل سے "مصری عورت" کو سمجھایا جو ایک ایسی ہستی سے ہی ممکن تھے جس کی تربیت براہِ راست آغوشِ الٰہی میں ہوئی ہو۔ فرمایا "یہ ناممکن ہے" پناہ بخدا! میں اور اس کی نافرمانی کروں جس کا اسمِ جلالت "اللہ" ہے۔ اور وہ تمام کائنات کا مالک، اور کیا میں اپنے اُس مربی "عزیزِ مصر کی امانت میں خیانت کروں جس نے مجھ کو غلام رہنے کی بجائے یہ حرمت و عزت عطا کی، اگر میں ایسا کروں تو ظالم ٹھہرونگا اور ظالموں کے لیے انجام و مآل کے اعتبار سے کبھی فلاح نہیں ہے"۔

مگر عزیزِ مصر کی بیوی پر اس نصیحت کا مطلق اثر نہ ہوا اور اُس نے اپنے ارادہ کو عملی شکل دینے پر اصرار

کیا تب یوسف نے اپنے اُس بُرہانِ رب کے پیش نظر جس کا ذکر وہ کر چکا تھا صاف انکار کر دیا۔

وراودتہ التی ھو فی بیتہا عن نفسہ	اور پھسلایا یوسف کو اُس عورت نے جس کے گھر میں
وَغَلَّقَتِ الابواب وَقَالَتْ ھیت	وہ رہتے تھے اُس کے نفس کے معاملہ میں اور دروازے
لک قال معاذ اللہ ، اِنَّہٗ ربی	بند کر دیے اور کہنے لگی آ میرے پاس آ۔ یوسف نے کہا
اَحْسَنَ مثوای اِنَّہٗ لا یُفلح الظّٰلمون	پناہ بخدا! بلاشبہ وہ (عزیز مصر) میرا مربی ہے جس نے مجھ کو
وَلَقد ھمت بہ وھم بہا لولا ان	عزت سے رکھا، بلاشبہ ظالم فلاح نہیں پاتے، اور البتہ اُس
رای برھان ربہ کذالک لنصرف	عورت نے یوسف سے ارادۂ بد کیا اور وہ بھی ارادہ کرتے
عنہ السوء والفحشاء انہ من عبادنا	اگر اپنے پروردگار کے برہان کو نہ دیکھ لیتے، اسی طرح ہوا، تاکہ
المخلصین	ہٹائیں ہم اُس سے بُرائی اور بیحیائی کو، بیشک وہ ہمارے مخلص

بندوں میں سے ہے۔

ولقد ھمت بہ وھم بہا کی تفسیر

مفسرین نے آیت ولقد ھمت بہ وھم بہا کی مختلف تفسیریں کی ہیں لیکن ہم نے جو معنی بیان کیے ہیں وہی زیادہ موزوں اور مناسبِ مقام ہیں۔ قرآنِ عزیز نے اوّل سے آخر تک اس واقعہ میں عزیزِ مصر کی بیوی کی شناعتِ کار اور حضرتِ یوسف کی عصمت وجلالتِ قدر کا تذکرہ فرمایا ہے، اس لیے یوسف کے "معاذ اللہ" "انہ احسن مثوای" "انہ لا یفلح الظّٰلمون" فرمانے کے بعد یہی معنی برمحل ہو سکتے ہیں کہ یوسف کی زبان سے بُرہانِ رب کو سُن لینے کے بعد بھی جب "عورت" اپنی ہٹ سے باز نہ آئی اور اپنے ارادہ پر مُصر رہی تو یوسف نے اُس کے ارادہ کو قطعاً رد کر دیا اور "برہانِ رب" کے سامنے اُس کے "ھم" کی مطلق پرواہ نہ کی۔ اور نتیجہ یہ نکلا کہ یوسف اس سے بچنے کے لیے دروازہ کی طرف بھاگے اور عزیزِ مصر کی بیوی نے اُن کا پیچھا کیا

بعض اہل علم نے اس تفسیر پر یہ اعتراض کیا ہے کہ نحوی اعتبار سے "لولا" تصدیر یعنی "شروع کلام میں ہونا" چاہتا ہے سو اس کا جواب یہ ہے کہ "وھم بہا" لولا کا جواب نہیں ہے، دال

علی الجواب ہے۔ اور ایسی صورت میں جواب مقدر و محذوف ہوتا ہے۔ کلام مجید میں اس کی نظیر موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے تذکرہ سے متعلق یہ آیت ہے۔

اِنْ كَادَتْ لَتُبْدِیْ بِهٖ لَوْلَا — قریب تھا کہ وہ (والدہ موسیٰ) اس کو ظاہر کر دے

اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰى قَلْبِهَا۔ — اگر ہم اُس کے دل کو مضبوط نہ بنا دیتے۔

یعنی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے دل کو مضبوط کر دیا تو وہ موسیٰ علیہ السلام کے راز کو ظاہر نہ کر سکیں اور اگر ہم ایسا نہ کرتے تو وہ ظاہر کر دیتیں۔

دیکھیے یہاں بھی "لولا" سے دال علی الجواب مقدم ہے اور "لولا" کا جواب مقدر محذوف ہے۔ اسی طرح اس مقام پر یہ معنی ہیں کہ اگر یوسف کو برہانِ رب حاصل نہ ہوتا تو وہ بھی ارادۂ بد کر لیتے لیکن اُنہوں نے ارادۂ بد نہیں کیا کیونکہ وہ برہانِ رب دیکھ چکے تھے۔

اس جگہ یہ بھی ایک سوال ہے کہ وہ "برہانِ رب" کیا تھا جس کا قرآن عزیز یہاں ذکر کر رہا ہے سو اس کا جواب یہ ہے کہ قرآنِ عزیز نے اپنی بلیغانہ اور معجزانہ خطابت میں خود ہی اس کو اس طرح ادا کر دیا ہے کہ سوال کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔ دروازہ بند ہو جانے پر عزیز کی بیوی اور حضرت یوسفؑ کی گفتگو پر غور کرو اور سوچو کہ یوسفؑ نے عملِ بد کی ترغیب کے جواب میں جو کچھ کہا اور عزیز کی بیوی کو جو جواب دیا ایسے مقام کے لحاظ سے اس سے بہتر جواب کیا ہو سکتا تھا سو یہی وہ "برہان رب" تھا جو یوسف (علیہ السلام) کو عطا ہوا اور جس نے عصمتِ یوسف کو بے داغ رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ عزیز نے بڑے شد و مد سے اس کے بعد یہ بیان کیا "کذالك (یونہی ہوا) لنصرف عنه السوء والفحشاء تاکہ ہٹائیں ہم اُس سے بُرائی اور بے حیائی۔ انه من عبادنا المخلصین (بیشک وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے ہے)" یعنی حضرت یوسف کا دامن اس قسم کے "ھمّ" سے اس لیے پاک رہا کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی عصمت و پاکی کا فیصلہ شروع ہی سے کر دیا تھا۔ پھر کیسے ممکن تھا کہ اُس کی

عصمت وحفاظت کے بعد اس کے خلاف کوئی شائبہ بھی اُن میں پایا جاتا؟

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ حضرت یعقوب کی صورت نظر آنا اور اُن کا اشارہ سے منع کرنا یا فرشتہ کا ظاہر ہوکر اُن کو اس سے روکنا، یا عزیزِ مصر کے گھر میں رکھے ہوئے صنم پر اُس کی بیوی کا پردہ ڈالنا اور حضرتِ یوسف کا اُس سے عبرت حاصل کرنا، یہ اور اس قسم کے تمام اقوال کے مقابلہ میں "برہانِ رب" کی تفسیر وہی بہتر تفسیر ہے جو خود قرآنِ عزیز کی نظم و ترتیب سے ثابت ہے یعنی (۱) ایمان باللہ کا حقیقی تصور (۲) اور مربّی مجازی کے احسان کی احسان شناسی اور وصفِ امانت۔ عزیزِ مصر نے یوسفؑ کے متعلق کہا تھا "اکرمی مثواہ" یوسف علیہ السلام نے اسی کو پیشِ نظر رکھ کر فرمایا "احسن مثوای"

بہرحال حضرت یوسف جب دروازہ کی جانب بھاگے تو عزیز کی بیوی نے پیچھا کیا، دروازہ کسی طرح کھل گیا تو سامنے عزیزِ مصر اور عورت کا چچازاد بھائی کھڑے نظر آئے۔ عورت کا عشق ابھی خام تھا اس لیے وہ صحیح حال کہنے پر قادر نہ ہوئی اور اصل حقیقت کو چھپانے کے لیے غیظ وغضب میں آکر کہنے لگی کہ ایسے شخص کی سزا قید خانہ یا دردناک عذاب کے علاوہ اور کیا ہوسکتی ہے جو تیرے اہل کے ساتھ ارادۂ بد رکھتا ہو؛ حضرتِ یوسف نے اُس کے مکر وفریب کو سُنا تو فرمایا کہ یہ اس کا بہتان ہے، اصل حقیقت یہ ہے کہ خود اُس نے میرے ساتھ ارادۂ بد کیا تھا مگر میں نے کسی طرح نہ مانا اور بھاگ کر باہر نکل جانا چاہتا تھا کہ اُس نے پیچھا کیا اور سامنے آپ نظر آگئے تو اُس نے یہ جھوٹ گھڑ لیا۔

عزیز کی بیوی کا چچازاد بھائی ذکی، فطین اور بہت ہوشیار تھا اُس نے کہا کہ یوسف کا پیراہن دیکھنا چاہیے اگر وہ سامنے سے چاک ہے تو عورت راستباز ہے۔ اور اگر پیچھے سے چاک ہے تو یوسف صادق القول ہے اور عورت جھوٹی ہے۔ دیکھا تو پیراہنِ یوسف پیچھے سے چاک تھا، عزیزِ مصر نے اصل حالت کو بھانپ لیا، مگر اپنی عزت وناموس کی خاطر معاملہ کو ختم کرتے ہوئے کہا۔ یوسف! سچے تم ہی ہو، اب اس عورت کے معاملہ سے درگزر و اور اس کو یہیں ختم کردو، اور پھر بیوی سے

کہا یہ سب تیرا مکر وفریب ہے اور تم عورتوں کا مکر وفریب بہت ہی بڑا ہوتا ہے، بلاشبہ تو ہی خطا کار ہے۔ لہٰذا اپنی اس حرکتِ بد کے لیے استغفار کر اور معافی مانگ۔

قَالَتْ مَا جَزَاءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ	کہنے لگی اُس شخص کی کیا سزا ہے جو تیرے اہل کے ساتھ
سُوْءًا اِلَّآ اَنْ يُّسْجَنَ اَوْ عَذَابٌ	بُرائی کا ارادہ رکھتا ہو مگر یہ کہ قید کر دیا جائے یا دردناک
اَلِيْمٌ قَالَ هِيَ رَاوَدَتْنِيْ عَنْ نَّفْسِيْ	عذاب میں مبتلا کیا جائے۔ یوسف نے کہا اسی نے مجھ کو
وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا اِنْ	میرے نفس کے بارہ میں پھسلایا تھا۔ اور فیصلہ کیا عورت
كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ	ہی کے گھرانے کے ایک شخص نے کہ اگر پیراہن یوسف
فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ	سامنے سے چاک ہے تو عورت سچی ہے اور یوسف جھوٹا۔ اور
وَاِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ	اگر پیچھے سے چاک ہے تو عورت کاذب ہے اور یوسف
قَالَ اِنَّهٗ مِنْ كَيْدِكُنَّ اِنَّ كَيْدَكُنَّ	صادق۔ پس جب اُس کے قمیص کو دیکھا تو پیچھے سے چاک تھا
عَظِيْمٌ . يُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ	کہا بیشک اے عورت یہ تیرے مکر وفریب سے ہے بلاشبہ تمہارا مکر
هٰذَا وَاسْتَغْفِرِيْ لِذَنْۢبِكِ اِنَّكِ	بہت بڑا ہے۔ یوسف تو اس معاملہ سے درگذر، اور اے عورت تو
كُنْتِ مِنَ الْخٰطِئِيْنَ . (یوسف)	اپنے گناہ کی معافی مانگ تو بلاشبہ خطا کار ہے۔

عزیز مصر نے اگرچہ فضیحت و رسوائی سے بچنے کے لیے اس معاملہ کو یہیں پر ختم کر دیا مگر بات پوشیدہ نہ رہ سکی اور رفتہ رفتہ شاہی خاندان کی عورتوں میں یہ چرچا ہونے لگا کہ عزیز مصر کی بیوی کس قدر بے حیا ہے کہ اپنے غلام پر ریجھ گئی، اتنے بڑے مرتبہ کی عورت اور غلام سے اختلاط کا ارادہ؟ آہستہ آہستہ یہ خبر عزیز کی بیوی تک بھی پہنچ گئی، اس کو یہ طعن بیحد شاق گذرا اور اُس نے چاہا کہ اس کا انتقام لے، اور ایسا انتقام لے کہ جس بات پر وہ مجھ پر طعن کرتی ہیں اُسی میں اُن کو بھی مبتلا کیا جائے، یہ سوچ کر ایک روز اُس نے شاہی خاندان اور عمائدینِ شہر کی عورتوں کو دعوت دی، جب سب

دسترخوان پر بیٹھ گئیں اور سب نے کھانا کھانے کے لیے چھریاں ہاتھ میں لے لیں تاکہ اُس سے گوشت یا ترنج جیسی چیزوں کو کاٹیں۔ تب عزیز کی بیوی نے حضرت یوسف کو حکم دیا کہ وہ باہر آئیں، حضرتِ یوسف مالکہ کے حکم سے باہر نکلے تو تمام عورتیں جمالِ یوسف کو دیکھ کر حیران رہ گئیں، اور رُخِ انور کی تجلی و تابانی سے اس قدر متاثر ہوئیں کہ چیزیں کاٹنے کی بجائے چھریوں سے ہاتھ کاٹ لیے، اور بے ساختہ کہنے لگیں کہ کون کہتا ہے یہ انسان ہے، بخدا یہ تو نور کا پتلا اور بزرگ فرشتہ ہے، یہ دیکھ کر عزیز کی بیوی بیحد محظوظ ہوئی اور اپنی کامیابی اور اُن کی شکست پر فخر کرتے ہوئے کہنے لگی، یہی تو وہ غلام ہے جس کے عشق و محبت کے بارہ میں تم نے مجھ کو مطعون کر رکھا ہے اور تیرِ ملامت کا نشانہ بنایا ہوا ہے، اب اس کو دیکھ کر یہ تمہارا کیا حال ہے؟ بتاؤ میرا یہ عشق بیجا ہے یا بجا، اور تمہاری ملامت بے محل ہے یا برمحل؟

وقال نسوۃ فی المدینۃ امرأۃ العزیز تراود فتٰها عن نفسه قد شغفها حبا انا لنرٰها فی ضلٰل مبین۔ فلما سمعت بمکرهن ارسلت الیهن واعتدت لهنّ متکأ واٰتت کل واحدۃ منهنّ سکینا وقالت اخرج علیهنّ فلما راینه اکبرنه وقطعنّ ایدیهن وقلن حاش لله ما

اور (پھر جب اس معاملہ کا چرچا پھیلا) تو شہر کی بعض عورتیں کہنے لگیں "دیکھو عزیز کی بیوی اپنے غلام پر ڈورے ڈالنے لگی کہ اُسے رجھالے وہ اس کی چاہت میں دل ہار گئی، ہمارے خیال میں تو وہ صریح بدچلنی میں پڑ گئی۔ پس جب عزیز کی بیوی نے اُن عورتوں کے مکر کو سُنا تو اُن کو بُلا بھیجا اور اُن کے لیے مسندیں آراستہ کیں اور (دستور کے موافق) ہر ایک کو ایک ایک چھری پیش کر دی، پھر یوسف سے کہا ان سب کے سامنے نکل آؤ، جب یوسف کو اُن عورتوں نے دیکھا تو اُس کی بڑائی کی قائل ہوگئیں، اُنھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے اور (بے اختیار) پکار اُٹھیں" یہ تو انسان

ھذا بشرًا ان ھذا الا — نہیں یہ ضرور ایک فرشتہ ہے بڑے مرتبہ والا فرشتہ۔ تب

ملکٌ کریم۔ قالت فذلکن — (عزیز کی بیوی) بولی تم نے دیکھا یہ ہے وہ آدمی جس کے

الذی لمتننی فیہ۔ — بارہ میں تم نے مجھے طعنے دیے۔

عزیز کی بیوی نے یہ بھی کہا کہ بیشک میں نے اُس کا دل اپنے قابو میں لینا چاہا تھا مگر وہ بے قابو نہ ہوا، مگر میں یہ کہے دیتی ہوں کہ اگر اُس نے میرا کہنا نہ مانا تو یہ ہو کر رہیگا کہ وہ قید کیا جائے اور بے عزتی میں پڑے۔

حضرت یوسف نے جب یہ سُنا اور پھر عزیز کی بیوی کے علاوہ اور سب عورتوں کے چلتر اپنے بارہ میں دیکھے تو اللہ تعالیٰ کے حضور میں دست بدعا ہوئے اور کہنے لگے۔ خدایا! جس بات کی جانب یہ عورتیں بُلا رہی ہیں اُس کے مقابلہ میں مجھے قید میں رہنا کہیں زیادہ پسند ہے۔ اگر تو نے میری مدد نہ کی اور مجھ کو ان کی مکاریوں سے نہ بچایا تو عجب نہیں کہ میں اُن کی جانب مائل ہو جاؤں اور نادانوں میں سے بن جاؤں۔ یوسفؑ کی دعا درگاہِ الٰہی میں قبول ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے اُن عورتوں کے سب مکر و فریب دفع کر دیے اور کامیابی کا سہرا یوسف (علیہ السلام) ہی کے سر رہا۔

قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ — یوسف نے کہا اے میرے پروردگار جس بات کی طرف یہ مجھ

مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْٓ اِلَیْہِ وَاِلَّا تَصْرِفْ — کو بلاتی ہیں مجھ کو اُس کے مقابلہ میں قید خانہ زیادہ پسند ہے۔ اور

عَنِّیْ کَیْدَھُنَّ اَصْبُ اِلَیْھِنَّ — اگر تو نے ان کے مکر کو مجھ سے نہ ہٹا دیا اور میری مدد نہ کی تو

وَاَکُنْ مِّنَ الْجٰھِلِیْنَ ۔ فَاسْتَجَابَ — کہیں میں اُن کی جانب جھک نہ جاؤں اور نادانوں میں سے

لَہٗ رَبُّہٗ فَصَرَفَ عَنْہُ کَیْدَھُنَّ — نہ ہو جاؤں، پس اُس کے رب نے اس کی دعا قبول کی

اِنَّہٗ ھُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ۔ — اور اس سے ان کا مکر ہٹا دیا بیشک وہ سُننے والا جاننے والا ہے۔

اس واقعہ میں مذکور ہے "فقطعن ایدیھن" "اُن عورتوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے" عام

طور پر مفسرین اس کی تفسیر یہ کرتے ہیں کہ جمالِ یوسف سے مدہوش ہو کر واقعی یہ حالت ہو گئی تھی کہ اُن کو اپنے تن بدن کا ہوش نہ رہا اور کاٹنے والی چیزوں کی بجائے ہاتھوں کو کاٹ لیا۔

مگر بعض مفسرینِ عصر[1] نے اس تفسیر کو صحیح نہیں سمجھا، اُن کے نزدیک مصری عورتوں کا یہ بھی تریا چلتر تھا، اور وہ یوسف کو اپنی جانب مائل کرنے کے لیے یہ بتانا چاہتی تھیں "کہ ہم تیرے حُسن کے اس قدر متوالے ہیں کہ تیری صورت دیکھ کر ہوش و حواس بھی جاتے رہے اور ہاتھوں کو زخمی کر لیا"، اور اپنی اس تفسیر کی تائید میں اس آیت سے استدلال کیا ہے "اِلّا تصرف عنی کیدھن" یعنی یوسف علیہ السلام نے اُن کی اس حالت کو "کید" (مکر) سے تعبیر کیا ہے۔ اگر یہ اضطراری حالت ہوتی تو پھر وہ بے قصور تھیں۔ ایسی حالت میں اُن کے اس طرزِ عمل کو "کید" کہنے کے کیا معنی؟ نیز جب یوسف علیہ السلام کو شاہِ مصر نے زندان سے نکالنے کا حکم دیا ہے تو اُس وقت بھی حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ فرمایا تھا کہ:

فَسْئَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِی قَطَّعْنَ اَیْدِیَهُنَّ اِنَّ رَبِّیْ بِکَیْدِهِنَّ عَلِیْمٌ۔

پس تو بادشاہ سے جا کر دریافت کر کہ اُن عورتوں کا معاملہ کیا تھا جنھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے، بلاشبہ میرا رب اُن کے مکر سے خوب واقف ہے۔

بہرحال عزیز پر چونکہ حضرت یوسف کی صداقت ظاہر ہو چکی تھی اس لیے اُس نے یہ چاہا کہ یوسفؑ کو کسی قسم کی گزند پہنچائے لیکن اُس کی بیوی پر عشق کا بھوت بُری طرح سوار تھا، سو جب اُس نے خوشامد، چاپلوسی، مکر و حیلہ کسی طرح سے مطلب برآری نہ دیکھی تو دھمکیوں سے کام لینا شروع کیا اور جب کوہِ استقامت کو اس کے باوجود بھی مطلق حرکت نہ ہوئی تو اب عزیز نے یوسفؑ کی صداقتوں کی تمام نشانیاں دیکھنے اور سمجھ لینے کے باوجود اپنی بیوی کی فضیحت و رسوائی ہوتی دیکھ کر یہ طے کر ہی لیا کہ یوسفؑ کو ایک مدت کے لیے زندان میں بند کر دیا جائے تاکہ یہ معاملہ لوگوں کے دلوں سے محو ہو جائے

[1] مولانا آزاد (ترجمان القرآن، سورۂ یوسف)

اور یہ چرچے بند ہو جائیں اس طرح حضرت یوسف کو زندان جانا پڑا۔

اس موقعہ پر حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلوی (رحمہ اللہ) نے تحریر فرمایا ہے[1] کہ یوسف علیہ السلام نے اپنی دعاء کے ساتھ چونکہ یہ بھی کہہ دیا کہ مجھے ان کی بے حیائی کی دعوت کے مقابلہ میں زندان زیادہ پسند ہے تو اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے مکر سے تو اُن کو بچا لیا مگر قید اُن کی قسمت میں مقدر کردی اُن کو چاہیے تھا کہ وہ یہ جملہ نہ کہتے اور بلاء و امتحان کو دعوت نہ دیتے، اور حضرت شاہ صاحب نور اللہ مرقدہ کے اس لطیفہ کو قوی بنانے کے لیے ایک دوسرے محقق مفسر نے ایک حدیث کا حوالہ بھی دے دیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ایک شخص خدا سے دعا مانگا کرتا تھا "اللھم انی اسئلك الصبر" (اے اللہ میں تجھ سے صبر مانگتا ہوں) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو فرمایا تو بلاء و مصیبت کیوں مانگتا ہے، اُس سے "عافیت" کا طالب کیوں نہیں ہوتا۔

ہمیں ان دونوں بزرگوں کی جلالتِ قدر کے پیشِ نظر اگرچہ جرأتِ گویائی نہیں ہے لیکن یوسف علیہ السلام جیسے عظیم المرتبت پیغمبر کی زندگی کے اس عدیم النظیر کارنامہ کو ایک لطیفہ کی نذر ہوتے دیکھ کر رہا نہیں جاتا، اور بے اختیار یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ حضرت یوسف کا یہ جملہ "السجن احب الیّ مما یدعوننی الیہ" اُن کے علوِ شان، تقرب الی اللہ، استقامت فی الدین، عزیمت فی الحق اور رضا و تسلیم کا وہ بےنظیر مظاہرہ ہے جو ان جیسے اولوالعزم پیغمبروں کا ہی حصہ ہے۔

غور کیجیے، عزیز کی بیوی اور گھر کی مالکہ نے خوشامد و چاپلوسی کی کونسی راہ اختیار نہیں کی جس سے یوسف کو رام کیا جا سکے، پھر اُس میں ناکامی کے بعد دوسری عورتوں کی مدد حاصل کی اور انہوں نے اپنے ممکن داؤں گھات یوسف پر استعمال کیے مگر پھر بھی ناکامی رہی، اب آخری درجہ یہ تھا کہ اُس نے دھمکی دی کہ یا یوسف اُس کو شادکام کرے ورنہ قید خانہ میں ڈالا جائیگا، ایسی حالت میں ایک باخدا انسان صاحبِ عزیمت و استقامت ہستی، اور خوفِ خدا کو تمام کائنات کے غیظ و

[1] موضح القرآن۔

غضب پر غالب رکھنے والا انسان، اس سے بہتر اور کیا جواب دے سکتا تھا کہ خدایا میں اس عملِ بد کے مقابلہ میں زندان کو ترجیح دیتا ہوں۔ مجھے قید و بند سب کچھ منظور ہے مگر تیری نافرمانی منظور نہیں

کون کہہ سکتا ہے کہ یہ قید کی طلب ہے، زندان کے شوق کا اظہار ہے، بلا و مصیبت کو دعوت ہے۔ ہرگز نہیں بلکہ یہاں تو لطیف پیرایہ میں وہ کہا جا رہا ہے جو اعلانِ حق اور خدارسی کا صحیح درجہ ہے، یوسف نے یہ بھی گوارا نہیں کیا کہ عزیز کی بیوی کو مخاطب کرے یا جہان عورتوں کو اپنی گفتگو میں تخاطب کا موقعہ دے بلکہ اُس نے اپنے خدا کو پکارا، مگر اُن گمراہ اور بدقماش عورتوں پر یہ ظاہر کر دینا ضروری سمجھا کہ جس طرح ان کے تمام مکر و فریب، خوشامد اور چاپلوسی ناکام رہیں، اسی طرح ان کی دھمکی اور ان کا عذاب بھی میرے ارادۂ حق، اور خدارسی کو باطل نہیں کر سکتا۔ یہ کہتی ہے کہ یوسف یا مجھ کو شادکام کرے ورنہ جیل خانہ جائے، تو میں جیل خانہ کو اس کے ارادۂ بد کے مقابلہ میں لاکھ بار ترجیح دونگا۔ رب السجن احبُّ الیّ مما یدعوننی الیہ۔

اب فرمائیے کہ اِس اعلانِ حق، اور اظہارِ استقامت کا اُس دعا سے کیا تعلق جو ایک شخص خواہ مخواہ اپنے لیے "صبر" مانگ کر خود کو آزمائش میں پڑنے کی دعوت دے رہا تھا، وہاں نہ آزمائش تھی نہ امتحان، بلکہ مفت میں بلا و مصیبت کا داعی بن رہا تھا، اور یہاں امتحان سر پر ہے، آزمائش موجود ہے، مصیبت کی دھمکی دی جا رہی ہے، بلا نازل کرنے کا خوف دلایا جا رہا ہے کیا ایسے نازک موقعہ پر صرف یہ جواب کافی ہوتا کہ یوسف علیہ السلام گڑگڑا کر جنابِ باری میں امراۃِ عزیز سے چھٹکارا پا لینے کی دعا کرتے اور بس، اگر ایسا ہوتا، تو امتحان، آزمائش، اور بلا و مصیبت کے وقت استقامت، اعلانِ حق، بے خوفی، اور تمام دنیوی رعنائیوں کے مقابلہ میں اعلاءِ کلمۃ اللہ کا سبق کون سکھاتا، عزیمت کی زندگی کون بتاتا، باطل سے بے خوفی کی تعلیم کس سے ملتی اور حق و باطل میں امتیاز کی شان کون پیدا کرتا؟

یوسف زندان میں بہرحال یوسف علیہ السلام کو قید خانہ بھیجدیا گیا، اور ایک بے خطا کو خطا کار اور معصوم کو مجرم بنا دیا گیا تاکہ عزیز کی بیوی فضیحت سے بچ جائے اور مجرم کو کوئی مجرم نہ کہہ سکے۔

توراۃ میں ہے کہ یوسف کے علمی و عملی جوہر قید خانہ میں بھی نہ چھپ سکے اور قید خانہ کا داروغہ اُس کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گیا اور جیل کا تمام انتظام و انصرام اُس کے سپرد کر دیا، وہ قید خانہ کا بالکل مختار ہو گیا اور خداوند نے وہاں بھی اُسے اس کے تمام کاموں میں اقبال مند کیا۔[1]

قرآنِ عزیز سے بھی اس کی تائید نکلتی ہے اس لیے کہ اُس زمانہ کے قید خانوں کے حالات کے پیشِ نظر یوسف علیہ السلام کے پاس قیدیوں کا اس طرح آنا جانا اور پھر اُن کی عظمت و نیک نفسی کا اعتراف، اس کو واضح کرتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام کے پاک اوصاف کی قید خانہ میں کافی شہرت تھی۔

دعوت و تبلیغ حُسنِ اتفاق کہ یوسف علیہ السلام کے ساتھ دو نوجوان اور قید خانہ میں داخل ہوئے، اُن میں سے ایک شاہی ساقی تھا اور دوسرا شاہی باورچی خانہ کا داروغہ۔[2] ایک روز دونوں خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور اُن میں سے ساقی کہنے لگا میں نے یہ خواب دیکھا ہے کہ میں شراب بنانے کے لیے انگور نچوڑ رہا ہوں، اور دوسرے نے کہا میں نے یہ دیکھا ہے کہ میرے سر پر روٹیوں کا خوان ہے اور پرند اُس سے کھا رہے ہیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام نبی زادہ تھے، اسلام کی تبلیغ کا ذوق اُن کے ریشہ ریشہ میں پیوست تھا، پھر خدا نے اُن کو بھی نبوت کے لیے چن لیا تھا اس لیے دینِ حق کی اشاعت اُن کی زندگی کا نصب العین تھا، گو قید میں تھے مگر مقصدِ حیات کو کیسے بھول جاتے اور اگرچہ مصیبت و محن میں تھے لیکن اعلاءِ کلمۃ اللہ کو فراموش کر دیں یہ کیسے ممکن تھا، موقعہ کو غنیمت جانا اور اُن سے نرمی اور محبت سے فرمایا کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے جو باتیں مجھے تعلیم فرمائی ہیں منجملہ اُن کے یہ علم بھی اُس نے

[1] پیدائش باب ۳۹، آیت ۲۲۔ [2] پیدائش باب ۴۰، آیت ۱

عطا فرمایا ہے، میں اس سے پہلے کہ تمہارا مقررہ کھانا تم تک پہنچے تمہارے خوابوں کی تعبیر بتادونگا۔ مگر میں تم سے ایک بات کہتا ہوں ذرا اس پر بھی غور کرو اور سمجھو بوجھو۔

"میں نے اُن لوگوں کی ملت ترک کر دی ہے جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور آخرت کے بھی منکر ہیں میں نے اپنے باپ دادوں یعنی ابراہیم، اسحٰق اور یعقوب کی ملت کی پیروی کی ہے۔ ہم ایسا نہیں کر سکتے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی چیز کو بھی شریک ٹھہرائیں، یہ اللہ کا ایک فضل ہے جو اُس نے ہم پر اور لوگوں پر کیا ہے لیکن اکثر لوگ اس نعمت کا شکر ادا نہیں کرتے"۔

"اے دوستو تم نے اس پر بھی غور کیا جُدا جُدا معبودوں کا ہونا بہتر ہے یا اللہ کا جو یکتا اور سب پر غالب ہے؟ تم اُس کے علاوہ جن کی عبادت بھی کرتے ہو اُن کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ چند نام ہیں جن کو تمہارے باپ دادا نے گھڑ لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کے لیے ہرگز کوئی سند نہیں اُتاری حکومت تو صرف اللہ کے ہی لیے ہے۔ اُس نے یہ حکم دیا ہے کہ اُس کے سوائے کسی کی عبادت نہ کرو، یہی سیدھا دین ہے۔ مگر اکثر آدمی نہیں جانتے"۔

یٰصاحبی السجن ء ارباب متفرقون	"اے یارانِ مجلس! (تم نے اس پر بھی غور کیا کہ) جُدا جُدا معبودوں
خیر ام اللہ الواحد القہار	کا ہونا بہتر ہے یا اللہ کا جو یگانہ اور سب پر غالب ہے؟ تم اس
ما تعبدون من دونہ الا اسماءً	کے سوا جن ہستیوں کی بندگی کرتے ہو اُن کی حقیقت اس سے
سمیتموھا انتم و اٰباءکم ما انزل	زیادہ کیا ہے کہ محض چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادوں
اللہ بھا من سلطٰن ط ان الحکم	نے رکھ لیے ہیں۔ اللہ نے اُن کے لیے کوئی سند نہیں اُتاری
الا للہ ط امر الا تعبدوا الا ایاہ	حکومت تو اللہ ہی کے لیے ہے۔ اُس کا فرمان یہ ہے کہ صرف
ذٰلک الدین القیم و لکن اکثر	اسی کی بندگی کرو، اور کسی کی نہ کرو، یہی سیدھا دین ہے، مگر اکثر
الناس لا یعلمون ۔ (یوسف)	آدمی ایسے ہیں جو نہیں جانتے"۔

رشد و ہدایت کے اس پیغام کے بعد اب حضرت یوسفؑ اُن کے خوابوں کی تعبیر کی جانب متوجہ ہوئے اور فرمانے لگے۔

دوستو! جس نے یہ دیکھا ہے کہ وہ انگور نچوڑ رہا ہے وہ پھر آزاد ہو کر بادشاہ کے ساقی کی خدمت انجام دیگا۔ اور جس نے روٹیوں والا خواب دیکھا ہے اُس کو سولی دیجائیگی اور پرند اُس کے سر کو نوچ نوچ کھائینگے۔ جن باتوں کے بارہ میں تم نے سوال کیا تھا وہ فیصل ہو چکی، اور فیصلہ یہی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ساقی اور داروغہ باورچیخانہ پر یہ الزام تھا کہ اُنہوں نے بادشاہ کے کھانے پینے کی چیزوں میں زہر ملایا ہے، جب تحقیقات ختم ہوگئی تو داروغہ پر جرم ثابت ہوگیا اور ساقی کو بری کر دیا گیا۔

حضرت یوسف علیہ السلام جب تعبیر خواب سے فارغ ہوگئے تو ساقی سے یہ سمجھ کر کہ وہ نجات پا جائیگا، فرمانے لگے "اذکرنی عند ربک" اپنے بادشاہ سے میرا ذکر کرنا، ساقی جب رہا ہوگیا تو اُس کو اپنی مشغولیتوں میں کچھ بھی یاد نہ رہا کہ زندان میں کیا وعدہ کر آیا تھا۔ اور شیطان نے اُس کے دماغ سے یہ سب بھلا دیا اور اس طرح چند سال تک یوسف علیہ السلام کو قید خانہ ہی میں رہنا پڑا۔

اس مقام پر اکثر مفسرین کی تفسیر کا ماحصل یہ ہے کہ "اذکرنی عند ربک" سے یوسف علیہ السلام کی مراد یہ تھی کہ بادشاہ سے کہنا کہ ایک بے قصور اور بے گناہ انسان اس طرح مجرم بنا کر زندان میں ڈال دیا گیا ہے، اور اس تفسیر کے بعد وہ یہ نکتہ پیدا کرتے ہیں کہ اگرچہ مصائب اور ضرورت کے موقع پر انسان کا انسانوں سے مدد لینا اور استعانت طلب کرنا حق کوشی اور خدا پرستی کے خلاف نہیں ہے تاہم بمصداق "حسنات الابرار سیئات المقربین" (نیکوں کی بعض بھلائیاں مقربین بارگاہِ الٰہی کے شایانِ شان نہیں ہوتیں) حضرت یوسفؑ جیسی ہستی کے لیے یہ موزوں نہ تھا کہ وہ خدا پر بھروسہ کے ساتھ ساتھ دنیوی اسباب پر بھروسہ کریں اور بادشاہ سے اپنی مظلومیت کے دفاع کے طالب ہوں، اس لیے

خدا کا فیصلہ یہ ٹھہرا کہ اُن کو ابھی چند سال اور قید خانہ میں رکھے اور ساقی کو شیطان نے ایسا بھلایا کہ وہ یوسف کا کچھ بھی ذکر نہ کر سکا، اور ابن جریر اور بغوی نے بعض سلف سے نقل کیا ہے کہ وہ "فانساہ" کی ضمیر کو یوسف کی جانب پھیرتے، اور یہ معنی کرتے ہیں کہ شیطان نے یوسف کو بھلا دیا کہ اُن کا پادشاہ کی مدد کے لیے ساقی سے کہنا ناموزوں ہے مگر ابن کثیر نے اس کو سختی کے ساتھ رد کر دیا اور اس معنیٰ کی تغلیط کی ہے۔

اس تفسیر کے برعکس بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اس جملہ کا مطلب یہ ہے "کہ حضرت یوسف نے فرمایا کہ پادشاہ کے سامنے میرا ذکر کرنا کہ ایسا ایک شخص ہم کو اس طرح دینِ حق کی تلقین کرتا ہے، اور وہ اپنی ملت کو ہماری ملت سے جُدا بتاتا، اور اُس پر بہترین دلائل دیتا ہے

اور اس تفسیر کی صحت کے لیے قرینہ یہ بیان کرتے ہیں کہ اس موقعہ پر قرآنِ عزیز میں یوسف علیہ السلام اور اُن دو شخصوں کے درمیان صرف دو ہی باتوں کا تذکرہ پایا جاتا ہے ایک دعوت و تبلیغ اسلام کا اور دوسرے خواب اور اُس کی تعبیر کا تیسری کسی بات کا اشارہ تک نہیں یعنی کسی اشارہ اور کنایہ سے بھی یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ حضرت یوسف نے ان ہر دو اشخاص کے سامنے اپنا قصہ بیان کیا ہو اور اُن کی توجہ اس طرف مبذول کرائی ہو، پھر بغیر ذکرِ سابق کے اس طرح "اذکرنی عند ربك" میں اجمال کے کیا معنی؟ علاوہ ازیں اگر حضرت یوسف کی زندان سے باہر آنے کی طلب و جستجو کا یہ حال تھا تو جب ساقی کے یاد آنے، اور بادشاہ کی خواب کی تعبیر دینے کے بعد بادشاہ نے اُن کی رہائی کا حکم دیدیا تو کیوں فوراً باہر نہ نکل آئے اور تفتیشِ حال کا مطالبہ کیوں کیا۔ یہ تو رہائی کے بعد بھی ہو سکتی تھی، اور عصمت، اور بے گناہی کا فیصلہ باہر آکر بھی ہو سکتا تھا۔

توراۃ میں اس واقعہ کو ان الفاظ کیساتھ بیان کیا گیا ہے۔

> تب یوسف بولا اس کی تعبیر یہ ہے کہ یہ تین ڈالیاں تین دن ہیں اور فرعون اب سے تین دن میں تیری روبکاری کریگا۔ اور تجھے تیرا منصب پھر دیگا اور تو آگے کی طرح جب تو فرعون

کا ساقی تھا اُس کے ہاتھ میں پھر جام دیگا لیکن جب تو خوش حال ہو تو مجھے یاد کیجیو اور مجھے اس گھر سے خلاصی دلوائیو کہ وہ عبرانیوں کی ولایت سے مجھے چرا لائے۔ اور یہاں بھی میں نے ایسا کام نہیں کیا کہ وہ مجھے اس قید میں رکھیں[1]۔

فرعون کا خواب

حضرت یوسف کا یہ واقعہ "فراعنۂ مصر" کے زمانہ سے تعلق رکھتا ہے، یہ خاندانِ شاہی، نسلی اعتبار سے "عمالقہ" میں سے تھا، مصر کی تاریخ میں ان کو ہیکسوس کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے اور ان کی اصلیت کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ چرواہوں کی ایک قوم تھی، جدید تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ قوم عرب سے آئی تھی اور دراصل یہ "عرب عاربہ" ہی کی ایک شاخ تھی، نیز قدیم قبطی اور عربی زبانوں کی باہمی مشابہت اُن کے عرب ہونے کی مزید دلیل ہے[2]۔

اور مصر کے مذہبی تخیل کی بنا پر ان کا لقب فارع[3] (فرعون) تھا، اس لیے کہ مصری دیوتاؤں میں سب سے بڑا اور مقدس دیوتا آمن راع (سورج دیوتا) تھا اور بادشاہِ وقت اُس کا اوتار اور "فارع" کہلاتا تھا۔ یہی فارع عبرانی میں فارعن اور عربی میں فرعون کہلایا۔ اور اس زمانہ کے فرعون کا نام عرب مورخوں نے ریان بتایا ہے اور مصری اثریات میں آپوفی کے نام سے موسوم ہے۔

بہرحال حضرت یوسف ابھی زندان ہی میں تھے کہ وقت کے فرعون نے ایک خواب دیکھا کہ سات موٹی گائیں ہیں اور سات دُبلی اور دُبلی گائیں موٹی کو نگل گئیں اور سات سرسبز و شاداب بالیں ہیں اور سات خشک اور خشک بالوں نے سبز کو کھا لیا۔ بادشاہ صبح اُٹھا تو پریشان خاطر تھا اور اس عجیب و غریب خواب سے حیران، فوراً دربار کے مشیروں سے اپنا خواب کہا اور خواب

---

[1] پیدائش باب ۴۰ آیت ۱۲-۱۵۔ [2] ترجمان القرآن جلد ۲ ص ۳۶۶۔ [3] مصری مختلف دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے .... اور ان سب سے بلند تر "آمن رع" تھا یعنی سورج دیوتا۔ نیز مصریوں میں الوہیت آمیز شاہی کا تصور بھی پوری طرح نشو و نما پا چکا تھا، اور تاجدارانِ مصر نے نیم خدا کی حیثیت اختیار کر لی تھی اُن کا لقب فارع اسی لیے ہوا کہ وہ راع یعنی سورج دیوتا کے اوتار سمجھے جاتے تھے۔ (ترجمان القرآن ج ۲ ص ۳۶۲) پھر یہی فارع عربی بن کر فرعون بن گیا۔

کی تعبیر چاہی، درباری بھی اس کو سُن کر فکر و تردد میں پڑ گئے اور جب حل نہ کر سکے تو اپنی درماندگی اور بیچارگی کو چھپانے کے لیے کہنے لگے "بادشاہ! یہ خواب نہیں ہے بلکہ پریشان خیالات ہیں جن کا کوئی خاص مطلب نہیں ہے، ہم سچے خواب کی تعبیر تو دے سکتے ہیں لیکن پریشان خیالات کا حل نہیں کر سکتے

بادشاہ کو درباریوں کے اس جواب سے اطمینان نہ ہوا کہ اس اثنا میں ساقی کو اپنا خواب اور یوسف کی تعبیر کا واقعہ یاد آگیا، اُس نے بادشاہ کی خدمت میں عرض کی اگر کچھ مہلت دیجیے تو میں اس کی تعبیر لا سکتا ہوں مجھے یہاں سے جانے کی اجازت دیجیے بادشاہ کی اجازت سے وہ اسی وقت قید خانہ پہنچا اور حضرت یوسف کو بادشاہ کا خواب سُنایا اور کہا کہ آپ اس کو حل کیجیے کیونکہ آپ سچائی اور تقدس کے پیکر ہیں۔ آپ ہی اس کو حل کر سکتے ہیں، اور کیا عجب ہے کہ جن لوگوں نے مجھے بھیجا ہے جب میں صحیح تعبیر لے کر اُن کے پاس واپس جاؤں تو وہ آپ کی حقیقی قدر و منزلت معلوم کر لیں۔

حضرت یوسف کا کمالِ صبر و استقلال، اور جلالتِ قدر کا اندازہ کیجیے کہ ساقی کو نہ ملامت کی اور نہ برسوں تک بھولے رہنے پر جھڑکا، اور نہ عطاءِ علم میں بخل سے کام لیا اور نہ یہ سوچا کہ جن ظالموں نے مجھ کو بے قصور زندان میں ڈالا ہے وہ اگر تباہ ہو جائیں اور اس خواب کا حل نہ پا کر برباد ہو جائیں تو اچھا ہے۔ ان کی یہی سزا ہے۔ نہیں ایسا کچھ بھی نہیں کیا بلکہ اُسی وقت خواب کی تعبیر دی اور اپنی جانب سے اُس سلسلہ میں صحیح تدبیر بھی بتلا دی اور ساقی کو پوری طرح مطمئن کر دیا۔ فرمایا۔

اس خواب کی تعبیر، اور اس کی بنا پر تمہیں جو کچھ کرنا چاہیے وہ یہ ہے کہ تم سات برس لگاتار کھیتی کرتے رہو گے اور یہ تمہاری خوشحالی کے سال ہونگے، جب کھیتی کے کٹنے کا وقت آئے تو جس قدر مقدار تمہارے سال بھر کھانے کے لیے ضروری ہو اُس کو الگ کر لو اور باقی غلہ کو اُن کی بالوں ہی

میں رہنے دو تاکہ محفوظ رہے اور گلے سڑے نہیں۔ اُس کے بعد سات برس بہت سخت مصیبت کے آئینگے وہ تمہارا جمع کیا ہوا تمام ذخیرہ ختم کر دینگے، اُس کے بعد پھر ایک برس ایسا آئیگا کہ خوب پانی برسیگا، کھیتیاں ہری بھری ہونگی اور لوگ پھلوں اور دانوں سے عرق اور تیل بہتات کے ساتھ نکالینگے۔ یعنی موٹی گائیں اور بالیں خوشحالی کے سال ہیں اور دُبلی گائیں اور بالیں خشک سالی کے برس جو خوشحالی کی پیداوار کو کھا جائینگے۔

قال تزرعون سبع سنين دأبا فما حصدتم فذروه في سنبله الا قليلا مما تأكلون. ثم يأتي من بعد ذلك سبع شداد يأكلن ما قدمتم لهن الا قليلا مما تحصنون. ثم يأتي من بعد ذلك عام فيه يغاث الناس وفيه يعصرون.

کہا تم کھیتی کروگے سات برس جم کر سو جو کاٹو اُس کو چھوڑ دو اُس کی بال میں مگر تھوڑا سا جو تم کھاؤ، پھر آئینگے اُس کے بعد سات برس سختی کے کھا جائینگے جو رکھا تم نے اُن کے واسطے مگر تھوڑا سا جو روک رکھو گے بیج کے واسطے، پھر آئیگا اُس کے پیچھے ایک برس اس میں مینہ برسیگا لوگوں پر اور اُس میں رس نچوڑینگے۔

یہ قرآنِ عزیز کی بلاغتِ کلام کا اعجاز ہے کہ اُس نے حضرت یوسف کی تعبیرِ خواب اور اُس سے متعلق تدبیر کو ایک ہی جملہ میں ساتھ ساتھ بیان کر دیا ہے تاکہ کلام میں تکرار اور دُہرانے کی ضرورت باقی نہ رہے۔

ساقی نے یہ سب معاملہ بادشاہ کے سامنے جا سُنایا، بادشاہ نے ساقی کی زبان سے پہلے کچھ جملے یوسف علیہ السلام کی تعریف میں سُنے تھے، تعبیرِ خواب کا معاملہ دیکھ کر تو اُن کے علم و دانش، اور جلالتِ قدر کا قائل ہو گیا اور نادیدہ مشتاق بن کر کہنے لگا کہ ایسے شخص کو میرے پاس لاؤ۔

جب بادشاہ کا پیامبر یوسف علیہ السلام کے پاس پہنچا اور بادشاہ کے طلب و اشتیاق کا حال

سُنایا تو حضرتِ یوسف نے قید خانہ سے باہر آنے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ اس طرح تو میں جانے کو تیار نہیں ہوں، تم اپنے آقا کے پاس جاؤ اور اُس سے کہو کہ وہ یہ تحقیق کرے کہ ان عورتوں کا معاملہ کیا تھا جنھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے۔ پہلے یہ بات صاف ہو جائے کہ اُنھوں نے کیسی کچھ مکاریاں کی تھیں اور میرا پروردگار تو اُن کی مکاریوں سے خوب واقف ہے۔

حضرتِ یوسف (علیہ السلام) بے قصور اور بے خطا برسوں سے قید خانہ میں بند تھے اور بلاوجہ اُن کو زندانی بنایا ہوا تھا، اب جبکہ بادشاہ نے مہربان ہو کر رہائی کا مژدہ سُنایا تو چاہیے تھا کہ وہ مسرت و خوشی کے ساتھ زندان سے باہر نکل آتے، مگر اُنھوں نے ایسا نہیں کیا، اور گذشتہ معاملہ کی تحقیق کا مطالبہ شروع کر دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرتِ یوسف خانوادۂ نبوت سے ہیں اور خود بھی برگزیدہ نبی و پیغمبر ہیں۔ اس لیے غیرت و حمیت اور عزتِ نفس کے بدرجۂ اتم مالک ہیں، اُنھوں نے سوچا کہ اگر بادشاہ کی اس مہربانی پر میں رہا ہو گیا تو یہ بادشاہ کا رحم و کرم سمجھا جائیگا اور میرا بے قصور اور صاحبِ عصمت ہونا پردۂ خفا میں رہ جائیگا، اس طرح صرف عزتِ نفس ہی کو ٹھیس نہیں لگیگی بلکہ دعوت و تبلیغ کے اُس اہم مقصد کو بھی نقصان پہنچیگا جو میری زندگی کا نصب العین ہے پس اب بہترین وقت ہے کہ معاملہ کی اصل صورت سامنے آجائے اور حق ظاہر و واضح ہو جائے۔

صحیحین (بخاری و مسلم) کی روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس واقعہ کا ذکر فرماتے ہوئے حضرتِ یوسف کے ضبط و صبر کو بہت سراہا اور تواضع و کسر نفسی کی حد تک اس کو بڑھا کر یہ ارشاد فرمایا:-

لو لبثت فی السجن ما لبث یوسف لاجبت الداعی[1] (الحدیث)

اگر میں اس قدر دراز مدت تک قید میں رہتا جس قدر کہ یوسف رہے تو بلانے والے کی دعوت فوراً قبول کر لیتا۔

---

[1] بخاری کتاب الانبیاء

اس جگہ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اگرچہ یوسف علیہ السلام کا معاملہ براہِ راست عزیز کی بیوی کے ساتھ پیش آیا تھا مگر حضرت یوسف نے اُس کا ذکر نہیں کیا بلکہ اُن مصری عورتوں کا حوالہ دیا جنھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے حضرت یوسف نے ایسا کیوں کیا سو اس کی دو وجہ تھیں ایک یہ کہ حضرت یوسف کو اگرچہ عزیز کی بیوی سے زیادہ تکلیف پہنچی تھی مگر قید کے اس معاملہ میں ان عورتوں کی بھی سازش تھی اس لیے کہ ان میں سے ہر ایک یوسف کی عاشق اور اُن کو اپنی جانب مائل کرنے کی آرزومند تھی، اور ناکامی کی صورت میں سب نے مل کر عزیز کی بیوی کو اُس کے قید والے فیصلہ میں تندی اور عملی جامہ پہنا کر چھوڑا، یہی وجہ ہے کہ زندان کا معاملہ ان عورتوں کے قضیہ کے بعد پیش آیا۔ دوسری یہ کہ حضرت یوسف سمجھتے تھے کہ عزیز نے میرے ساتھ ممکن حسنِ سلوک برتا ہے، میری عزت اور میرا احترام کیا ہے اس لیے موزوں نہیں ہے کہ میں اُس کی بیوی کا نام لے کر اُس کی رسوائی کا باعث بنوں۔

غرض بادشاہ نے جب یہ سُنا تو اُن عورتوں کو بلوایا اور اُن سے کہا کہ صاف صاف اور صحیح صحیح بتاؤ کہ اُس معاملہ کی اصل حقیقت کیا ہے جب کہ تم نے یوسف پر ڈورے ڈالے تھے تاکہ تم اُس کو اپنی طرف مائل کر لو؟ وہ ایک زبان ہو کر بولیں:-

قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِن سُوءٍ   بولیں، حاشا للہ ہم نے اُس میں بُرائی کی کوئی بات نہیں پائی

مجمع میں عزیز کی بیوی بھی موجود تھی اور اب وہ عشق و محبت کی بھٹی میں خام نہ تھی کندن تھی، اور ذلت و رسوائی کے خوف سے آگے نکل چکی تھی، اُس نے جب یہ دیکھا کہ یوسف کی خواہش ہے کہ حقیقتِ حال سامنے آجائے تو بے اختیار بول اُٹھی۔

الْـٰٔنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ، اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ۔   جو حقیقت تھی وہ اب ظاہر ہو گئی، ہاں وہ میں ہی تھی جس نے یوسف پر ڈورے ڈالے کہ اپنا دل ہار بیٹھے، بلاشبہ وہ اپنے بیان میں (سچا ہے)

اور یہ بھی کہا :-

ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّىْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ	یہ میں نے اس لیے کہا کہ اُس (یوسف) کو معلوم ہو جائے کہ
وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِىْ كَيْدَ	میں نے اُس کے پیٹھ پیچھے اُس کے معاملہ میں خیانت نہیں
الْخَائِنِيْنَ . وَمَا اُبَرِّئُ نَفْسِىْ	کی نیز اس لیے کہ (واضح ہو جائے) اللہ خیانت کرنے والوں
اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ	کی تدبیروں پر کبھی (کامیابی) کی راہ نہیں کھولتا، میں اپنے نفس
اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّىْ اِنَّ رَبِّىْ	کی پاکی کا دعویٰ نہیں کرتی، آدمی کا نفس تو بُرائی کے لیے بڑا
غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ .	ہی اُبھارنے والا ہے مگر اں اسی حال میں کہ میرا پروردگار رحم کرے

بلاشبہ میرا پروردگار بڑا ہی بخشنے والا، بڑا ہی رحم کرنے والا ہے۔

ہم نے اس آیت کا ترجمہ مشہور مفسر ابو حیان اندلسی کی تفسیر کے مطابق کیا ہے۔ دوسرے مفسرین اس کے علاوہ تفسیر کرتے ہیں۔

حافظ ابن تیمیہ (رحمہ اللہ) اور ان کے شاگرد رشید حافظ عماد الدین ابن کثیر اپنی تفسیر میں اس آیت کا ترجمہ اس طرح کرتے ہیں۔

"یہ میں نے اس لیے کہا کہ اُس (عزیز) کو معلوم ہو جائے کہ میں نے اُس کے پیٹھ پیچھے اُس کی (اس سے زیادہ اور کوئی) خیانت نہیں کی (جس کا حال اُسے معلوم ہے) اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کے مکر کو کامیاب نہیں کرتا (سو اگر میں نے اس سے زیادہ خیانت کی ہوتی تو اس کا بھی پردہ فاش ہو کر رہتا) اور میں اپنے نفس کو بری نہیں کرتی، بیشک نفس البتہ برائی کے لیے بڑا ہی اُبھارنے والا ہے مگر جس پر میرا پروردگار رحم کرے، بیشک میرا پروردگار بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

یعنی اُنھوں نے اس مقولہ کو عزیز کی بیوی کا مقولہ قرار دے کر "لم اخنہ" کی ضمیر کا مرجع "عزیز"

کو قرار دیا ہے۔

اور عام مفسرین اس پورے مقولے کو حضرت یوسف کا مقولہ قرار دیتے ہیں اور "لم اخنہ" کی ضمیر کو اسی طرح عزیز کی بیوی کی جانب پھیرتے ہیں جس طرح حافظ ابن تیمیہ کی رائے ہے۔ اور آیت کا اس طرح ترجمہ کرتے ہیں۔

"یوسف نے کہا یہ اس واسطے کہ عزیز کو معلوم ہو جائے کہ میں نے اس کے پیٹھ پیچھے اس کی خیانت نہیں کی اور اللہ تعالیٰ دغابازوں کا فریب کامیاب نہیں کرتا، اور میں اپنے نفس کو پاک نہیں کہتا، بیشک نفس تو سکھلاتا ہے برائی مگر یہ کہ رحم کرے میرا پروردگار، بیشک میرا رب بخشنے والا مہربان ہے"

اور "ما ابرّئ نفسی" کے متعلق یہ فرماتے ہیں کہ حضرت یوسف نے چونکہ اپنی عصمتِ نفس کا اس موقعہ پر زبردست مظاہرہ کیا تھا تو ایک جلیل القدر نبی اور مقربِ بارگاہِ الٰہی ہونے کی وجہ سے یہ ظاہر کر دینا بھی ضروری تھا کہ میری پاکبازی اور عصمت کا یہ معاملہ میرے اپنے نفس کی بدولت نہیں ہے کیونکہ نفس انسانی تو اکثر برائی پر ابھارتا رہتا ہے۔ بلکہ یہ محض خدا کی رحمت و عنایت کا صدقہ ہے اور یہی رحمت عصمتِ انبیاء کی کفیل ہے۔

بہر حال وقت آپہنچا کہ حضرت یوسف کی عصمت و پاکبازی اور صداقت و طہارت کا معاملہ تہمت لگانے والوں کی زبان ہی سے واضح ہو جائے۔ چنانچہ واضح اور ظاہر ہو گیا، اور شاہی دربار میں مجرموں نے اعترافِ جرم کر کے یہ بتا دیا کہ یوسف کا دامن ہر قسم کی آلودگیوں سے پاک اور منزہ ہے۔

لطیفہ | امام رازی (رحمہ اللہ) فرماتے ہیں کہ یوسف خدا کے سچے پیغمبر اور نبی معصوم تھے اس لیے ان کا دامن ہر قسم کی آلائش سے پاک صاف تھا، اور ان کی مقدس زندگی کا ایک لمحہ بھی کسی آلودگی سے

ملوث نہیں ہوا تھا، اس لیے خدائے تعالیٰ کی کرشمہ سازی دیکھیے کہ یوسف کے واقعہ سے متعلق جس قدر بھی شخصیتیں تھیں اُن سب کی زبانی اُن کی طہارتِ نفس اور عصمت کا اعتراف کرایا۔

الفضل ما شھدت بہ الاعداء

اچھا یوسف کے علاوہ اس واقعہ کی شخصیتیں کون ہیں؟ عزیزِ مصر، عزیز کی بیوی شہری عورتیں اور عزیز کی بیوی کا رشتہ دار۔ یہی افراد ہیں جو کسی نہ کسی طرح تحقیق طلب معاملہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں سب سے پہلے عزیز کی بیوی کا رشتہ دار سامنے آتا ہے، اور پیراہن کے چاک ہونے کا عاقلانہ فیصلہ دے کر یوسف کی پاکی کا اظہار کرتا، اور عورت کو مجرم ٹھہراتا ہے، اس کے بعد حقیقتِ حال واضح ہو جانے پر عزیز بھی اقرار کرتا ہے کہ یوسف بے گناہ، بے خطا اور معصوم ہے اور "یوسف اعرض عن ھذا" کہہ کر یوسف علیہ السلام سے معذرت کرتا اور اپنی ناموس کی حفاظت کی خاطر معاملہ کو ختم کرنے کی درخواست کرتا ہے۔ تیسرا نمبر شہری عورتوں کا ہے جب بادشاہ نے بھرے دربار میں یوسف کے معاملہ کے متعلق دریافت کیا تو اُنھوں نے بے تامل کہہ دیا: "حاش للہ ما علمنا علیہ من سوٓء" اور اس طرح یوسف علیہ السلام کی پاکدامنی پر مہر لگادی، یہ سب شہادتیں اگرچہ یوسف کے عزیزوں، رشتہ داروں اور حامیوں کی جانب سے نہ تھیں بلکہ ایک اجنبی ملک عزیز کی بیوی کے ہم قوم اور اہل خاندان کی شہادتیں تھیں، تاہم وہم و گمان ہو سکتا تھا کہ کچھ عجب نہیں کہ اس معاملہ میں کسی حد تک "اگرچہ بہت تھوڑا ہی سہی" یوسف کا بھی ضرور قصور ہوگا، لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا عظیم الشان فضل و کرم تھا کہ اُس نے اپنے پاک اور مقدس بندہ کی عصمت کے اعلان، اور اُس کے بارہ میں شائبۂ سوءِ ظن کے انہدام کے لیے علیٰ رؤسِ الاشہاد خود مجرم سے اقرارِ جرم کرایا، اور اُس ہی کی زبان سے یوسف کی عصمت و صداقت کی شہادت دلا کر حقیقتِ حال آشکارا کردی

اور شاہی دربار میں عزیز کی بیوی کو یہ کہنا پڑا کہ الآن حصحص الحق انا راودتہ عن نفسہ وانہ لمن الصادقین" "اب حق ظاہر ہو گیا، میں نے ہی اُس کو اپنے نفس کے لیے پھسلایا تھا اور بلاشبہ وہ سچا ہے"

ذٰلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء و   یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جس کو چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور

اللہ ذوالفضل العظیم۔   اللہ بڑے فضل والا ہے۔

فرعون پر جب حقیقتِ حال منکشف ہو گئی تو اُس کے قلب میں حضرت یوسف کی عظمت و جلالت قدر کا سکہ بیٹھ گیا۔ ساقی کا حُسنِ عقیدت کے ساتھ یوسف کی عقل و دانش کا ذکر، اپنی خواب کی بہترین اور دل لگتی تعبیر، اور عصمتِ نفس کا یہ انکشاف، یہ سب امور تھے جنہوں نے مل کر بادشاہ کو اُس بزرگ اور پُر عظمت ہستی کی دید اور اُس سے استفادہ کا عاشق بنا دیا، وہ کہنے لگا۔

ائتونی بہ استخلصہ لنفسی   اُس کو (جلد) میرے پاس لاؤ کہ میں اُس کو خاص اپنے کاموں کے لیے مقرر کروں

یوسف (علیہ السلام) اب بایں رعنائی و دلبری، بایں عصمت و پاکبازی، اور بایں عقل و دانش زندان سے نکل کر بادشاہ کے دربار میں تشریف لائے، بات چیت ہوئی تو بادشاہ حیران رہ گیا کہ اب تک جس کی راستبازی، امانت داری اور وفاءِ عہد کا یہ کچھ تجربہ کیا تھا وہ عقل و دانش اور حکمت و فطانت میں بھی آپ اپنی نظیر ہے، اور مسرت کے ساتھ کہنے لگا۔

انک الیوم لدینا مکین امین   بلاشبہ آج کے دن تو ہماری نگاہوں میں بڑا صاحبِ اقتدار اور امانتدار ہے

پھر اُن سے دریافت کیا کہ میرے خواب میں جس قحط سالی کا ذکر ہے اُس کے متعلق مجھ کو کیا کیا تدابیر اختیار کرنی چاہئیں؟ حضرت یوسف نے جواب دیا

قال اجعلنی علی خزائن الارض   یوسف نے کہا! اپنی مملکت کے خزانوں پر آپ مجھے مختار کیجیے میں حفاظت

انی حفیظ علیم۔   کر سکتا ہوں، اور میں اس کام کا جاننے والا ہوں۔

چنانچہ بادشاہ نے ایسا ہی کیا اور حضرت کو اپنی تمام مملکت کا امین و کفیل بنا دیا اور شاہی خزانوں

کی کنجیاں اُن کے حوالہ کرکے مختارِ کل بنا دیا۔ توراتؔ میں اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

یہ تعبیر فرعونؔ کی نگاہ میں اور اس کے سب نوکروں کی نظر میں اچھی معلوم ہوئی، فرعونؔ نے اپنے نوکروں کو کہا کیا ہم ایسا جیسا یہ مرد کہ جس میں خدا کی روح ہے پا سکتے ہیں؟ اور فرعونؔ نے یوسفؔ سے کہا از بس کہ خدا نے تجھے اس سب میں بینائی دی ہے سو کوئی تجھ سا عاقل اور دانشور نہیں ہے، تو میرے گھر کا مختار ہو اور اپنا حکم میری سب رعیت پر جاری کر فقط تخت نشینی میں میں تجھ سے بزرگتر ہونگا، پھر فرعونؔ نے یوسفؔ سے کہا دیکھ میں نے تجھے ساری زمینِ مصرؔ پر حکومت بخشی اور فرعونؔ نے اپنی انگشتری اپنے ہاتھ سے نکال کر یوسفؔ کے ہاتھ میں پہنا دی اور اُس کو کتاں کا لباس پہنایا اور سونے کا طوق اُس کے گلے میں ڈالا اور اُس نے اُسے مصرؔ کی ساری مملکت پر حاکم کیا۔ اور فرعونؔ نے یوسفؔ کو کہا میں فرعونؔ ہوں اور بغیر تیرے مصرؔ کی ساری زمین میں کوئی انسان اپنا ہاتھ یا پاؤں نہ اُٹھائیگا۔[1]

اللہ اللہ! خدائے تعالیٰ کی قدرت اور اُس کے عطاء و کرم کی یہ کیسی بوالعجبی ہے کہ کل جس ہستی کو مصرؔ کی متمدن قوم، بدوی اور صحرائی سمجھتی تھی، جو بدوی تھا اور غلام بھی، اُس کو پہلے ایک سردار کے گھر کا مختار، اُس کی نگاہوں میں محترم و معزز اور امین و فطین بنایا۔ اور پھر قیدخانہ کی زندگی سے نکالا تو مملکتِ مصرؔ، اور قومِ مصرؔ کا مالک و مختار بنا دیا، اور اس مرتبہ پر پہنچا دیا کہ اسبابِ دنیوی کے ماتحت جس کا تصور بھی ممکن نہ تھا۔ یہ قادرِ مطلق کی کارفرمائی کا معجزانہ مظاہرہ نہیں تو اور کیا ہے کہ کل جو کنعانؔ میں گلہ بانی کر رہا تھا وہ آج وقت کی سب سے بڑی متمدن قوم کا مختار و مالک بن کر جہاں بانی کر رہا ہے، سچ ہے جس کو وہاں قبولیت کا شرف حاصل ہو گیا اس کے لیے راہ کی تمام دشواریاں ہیچ ہیں، اور حالات کی نامساعدت پرِکاہ کی وقعت بھی نہیں رکھتی۔

---

[1] پیدائش باب ۴۱ آیات ۳۷-۴۴

اسی لئے حق تعالیٰ نے "عزیز" کے کاروبار کا مختار بنا کر یوسف کے لیے یہ فرمایا تھا کہ ہم نے اُس کو "تمکین فی الارض" عطا کر دی اور اب جبکہ اُس آغاز کی یہ انتہا نمود میں آگئی تو پھر ارشاد فرمایا

وکذالک مکنا لیوسف فی	اور اس طرح ہم نے سرزمین مصر میں یوسف کے قدم جما دیے
الارض یتبوأ منہا حیث یشاء	کہ جس جگہ سے چاہے حسب مرضی رہنے سہنے کا کام لے،
نصیب برحمتنا من نشاء ولا	ہم جسے چاہتے ہیں (اسی طرح) اپنی رحمت سے فیض یاب
نضیع اجر المحسنین ۔	کر دیتے ہیں اور نیک عملوں کا اجر کبھی ضائع نہیں کرتے ۔
ولاجر الاخرۃ خیر للذین اٰمنوا	اور جو لوگ اللہ پر ایمان لائے اور بدعملیوں سے بچتے رہے
وکانوا یتقون ۔	اُن کے لیے تو آخرت کا اجر اس سے کہیں بہتر ہے ۔

سورۂ یوسف میں حضرت یوسفؑ کے لیے دو جگہ "تمکین فی الارض" (زمین کا مالک بنا دینا) کی بشارت سُنائی گئی ہے اور دونوں مقام پر تعبیر کا نیا اسلوب اختیار کیا گیا ہے ۔ اس کے متعلق مولانا آزاد نے اپنی تفسیر میں کیا خوب کہا ہے ۔

"حضرت یوسف کی مصری زندگی کے دو انقلاب انگیز نقطے تھے ۔ ایک وہ، جب غلام ہو کر بکے اور پھر عزیز کی نظروں میں ایسے معزز ہوئے کہ اُس کے علاقہ کے مختار ہو گئے ۔ دوسرا یہ کہ قید خانہ سے نکلے، اور نکلتے ہی وہاں پہنچ گئے کہ حکمرانی کی مسندِ اجلال پر جلوہ آرا نظر آئے پس جب پہلے انقلاب تک سرگذشت پہنچی تھی تو آیت (۲۱) میں حکمت الٰہی کی کرشمہ سنجیوں پر توجہ دلائی تھی کہ کذالک مکنا لیوسف فی الارض اور اب کہ دوسرا انقلاب پیش آیا تو اسی طرح آیت (۵۶) میں فرمایا کذالک مکنا لیوسف فی الارض وہاں چونکہ معاملۂ مصر کی ابتدا ہوئی تھی، اور ابھی حضرت یوسف کو حکمرانی کی دانش سیکھنی باقی تھی اس لیے فرمایا تھا ولنعلمہ من تاویل الاحادیث واللہ غالب علی امرہ

یہاں چونکہ تکمیلِ کار کے بعد اُس کا نتیجہ ظاہر ہوگیا تھا اس لیے فرمایا و نضیع اجر المحسنین یہ اس لیے ہوا کہ ہمارا قانون ہے۔ نیک عمل کا بیج کبھی ضائع نہیں ہوتا ضروری ہے کہ پھل لائے[1]۔

شروع واقعہ میں یہ کہا گیا ہے کہ سورۂ یوسف کا نزول یہودیوں کے اُس سوال پر ہوا جو اُنھوں نے مشرکینِ مکّہ کے ذریعہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تھا وہ یہ کہ "ابراہیمؑ کی نسل مصر میں کیسے آئی؟"

اس لیے آیت زیرِ بحث کی تفسیر میں شاہ عبدالقادر (نوراللہ مرقدہ) ارشاد فرماتے ہیں:-

یہ جواب ہوا اُن کے سوال کا کہ "اولادِ ابراہیم اس طرح شام سے آئی مصر میں" اور بیان ہوا کہ "بھائیوں نے حضرتِ یوسف کو گھر سے دور پھینکا تا ذلیل ہو، اور اللہ نے زیادہ عزت دی اور ملک پر اختیار دیا" ویسا ہی ہوا ہمارے حضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو[2]۔

غرض حضرت یوسف نے سلطنتِ مصر کے مختارِ کل ہونے کے بعد خواب سے متعلق وہ تمام تدابیر شروع کر دیں جو چودہ سال کے اندر مفیدِ کار ہو سکیں اور رعایا قحط سالی کے ایام میں بھی بھوک اور پریشان حالی سے محفوظ رہ سکے۔ چونکہ یہ تفصیل، خواب اور اُس کی تعبیر کے ضمن میں خود بخود ذہن میں آجاتی ہے، اس لیے قرآنِ عزیز نے ان غیر ضروری حصصِ واقعات کو بیان نہیں کیا، البتہ توارت نے ان تفصیلات کو بھی دہرایا ہے۔

اور یوسف جس وقت مصر کے بادشاہ فرعون کے حضور کھڑا ہوا تیس برس کا تھا، اور یوسف فرعون کے حضور سے نکل کر مصر کی ساری زمین میں پھرا، اور بڑھتی کے سات برس میں زمین مالامال ہوئی۔ تب اُس نے ان سات برسوں کی ساری چیزیں کھانے کی جو زمینِ مصر

---

[1] ترجمان القرآن جلد ۲ ص ۲۳۵ (نوٹ) [2] موضح القرآن، سورۂ یوسف۔

میں تھیں جمع کیں، اور اُس نے اُن کھانے کی چیزوں کو بستیوں میں ذخیرہ کیا اور اُن کھیتوں کی جو ہر بستی کے آس پاس تھے کھانے کی چیزیں اُسی بستی میں رکھیں، اور یوسف نے غلہ بہت کثرت سے جیسے دریا کی ریت ایسا کہ وہ حساب کرنے سے باز رہا جمع کیا، کیونکہ وہ بے حساب تھا۔ . . . . اور سات برس ستی کے جو زمینِ مصر میں تھے آخر ہوئے اور گرانی کے سات برس جیسا کہ یوسف نے کہا تھا آنے شروع ہوئے اور سب زمین میں گرانی ہوئی، پر ہنوز مصر کی ساری زمین میں روٹی تھی۔ پر جب ساری زمینِ مصر بھوک سے ہلاک ہونے لگی تو خلق روٹی کے لیے فرعون کے آگے چلائی، فرعون نے سب مصریوں کو کہا کہ یوسف کنے جاؤ وہ جو تمہیں کہے سو کرو، اور تمام روئے زمین پر کال تھا، اور یوسف نے ذخیرے کے کھتے کھول کے مصریوں کے ہاتھ بیچے اور مصر کی زمین میں کال بہت بڑھا، اور سارے ملکِ مصر میں مول لینے آئے، کیونکہ سب ملکوں میں سخت کال تھا۔

جب یعقوب نے دیکھا کہ مصر میں غلہ ہے تب یعقوب نے اپنے بیٹوں سے کہا کہ تم کیوں ایک دوسرے کو تاکتے ہو، دیکھو میں نے سنا ہے کہ مصر میں غلہ ہے تم وہاں جاؤ اور وہاں سے ہمارے لیے مول لو، تاکہ ہم جییں اور مریں نہیں[1]۔

غرض جب قحط سالی کا زمانہ شروع ہوا تو مصر اور اُس کے قرب و جوار کے علاقہ میں بھی سخت کال پڑا اور کنعان میں خاندانِ یعقوبؑ بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکا جب حالت انتہائی نزاکت اختیار کر گئی تو حضرتِ یعقوب نے صاحبزادوں سے کہا کہ مصر میں عزیزِ مصر نے اعلان کیا ہے کہ اُس کے پاس غلہ محفوظ ہے تم سب جاؤ اور غلہ خرید کر لاؤ چنانچہ باپ کے حکم کے مطابق یہ کنعانی قافلہ عزیز

[1] پیدائش باب ۴۱ آیات ۴۶-۴۹-۵۳-۵۷ و باب ۴۲ آیات ۱-۲۔

مصر سے غلہ لینے کے لیے مصر روانہ ہوا خدا کی قدرت دیکھیے کہ برادرانِ یوسف کا یہ قافلہ اُسی بھائی سے غلہ لینے چلا ہے جس کو اپنے خیال میں وہ کسی مصری گھرانے کا معمولی اور گمنام غلام بنا چکے تھے، مگر اس یوسف فروش قافلہ کو کیا معلوم کہ وہ کل کا غلام آج مصر کے تاج و تخت کا مالک، و مختارِ کل ہے اور اُس کو اُسی کے سامنے عرضِ حال کرنا ہے، بہرحال کنعان سے چلے اور مصر جا پہنچے اور جب دربارِ یوسفی میں پیش ہوئے تو یوسف (علیہ السلام) نے اُن کو پہچان لیا، اور کیوں نہ پہچانتے رنگ ڈھنگ، بول چال، لب ولہجہ، نقشہ وصورت اور ساری ادائیں یوسف کی جانی پہچانی تھیں، البتہ وہ یوسف کو نہ پہچان سکے، اور کس طرح پہچانتے؟ کل جو چھوٹا سا بچہ تھا آج وہ تقریباً چالیس سالہ تجربہ کار انسان ہے، نقشہ و رنگ اور بول چال سے کچھ شبہ بھی کرتے تو کس طرح؟ اُن کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ یوسف اور تختِ شاہی! مگر یہ واقعہ تھا حقیقت تھی، اور اپنے برگزیدہ بندہ کے ساتھ رب العٰلمین کا وہ معاملہ تھا جو صفحۂ دنیا پر ثبت ہو کر رہا۔

وجاء اخوة یوسف فدخلوا علیه فعرفهم وهم له منکرون .	اور (پھر ایسا ہوا کہ قحط سالی کے زمانہ میں) یوسف (علیہ السلام) کے بھائی (غلہ خریدنے مصر سے آئے، وہ جب یوسف کے پاس پہنچے تو اُس نے فوراً اُن کو پہچان لیا اور وہ یوسف کو نہ پہچان سکے۔

تورات کا بیان ہے کہ برادرانِ یوسف پر جاسوسی کا الزام لگایا گیا اور اس طرح اُن کو یوسف (علیہ السلام) کے سامنے حاضر ہو کر بالمشافہ گفتگو کرنے کا موقعہ ملا۔

غرض حضرت یوسف نے والد، حقیقی بھائی، اور گھر کے حالات کو خوب کُرید کُرید کر پوچھا اور آہستہ آہستہ سب کچھ معلوم کر لیا، اور پھر اُن کو حسب مرضی غلہ بھر کر دیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ قحط اس قدر سخت ہے کہ تم کو دوبارہ یہاں آنا پڑیگا اس لیے یاد رکھو کہ اب کی مرتبہ اگر تم اپنے چھوٹے بھائی بن یمین کو ساتھ نہ لائے جس کے متعلق تم نے مجھ سے کہا ہے کہ اُس کا بھائی یوسف گم ہو گیا ہے،

اور اس لیے تمہارا باپ اُس کو کسی طرح جُدا نہیں کرتا" تو تم کو ہرگز غلہ نہیں ملیگا۔

ولما جہزھم بجہازھم
قال ائتونی باخ لکم من ابیکم
الا ترون انی اوف الکیل
وانا خیر المنزلین ۔ فان لم
تاتونی بہ فلا کیل لکم عندی
ولا تقربون ۔

اور جب یوسف نے اُن کا سامان مہیا کر دیا تو کہا اب کے
آنا تو اپنے سوتیلے بھائی بن یمین کو بھی ساتھ لانا، تم نے اچھی
طرح دیکھ لیا ہے کہ میں تمہیں (غلہ) پوری تول دیتا ہوں اور باہر
سے آنے والوں کے لیے بہتر مہمان نواز ہوں، لیکن اگر تم اُسے
میرے پاس نہ لائے تو پھر یاد رکھو نہ تو تمہارے لیے میرے
پاس خرید و فروخت ہوگی نہ تم میرے نزدیک جگہ پاؤ گے۔

برادرانِ یوسف نے کہا کہ ہم اپنے والد سے کہینگے اور ہر طرح ترغیب دینگے کہ وہ بن یمین کو ہمارے ساتھ یہاں بھیجنے پر راضی ہو جائے پھر جب وہ چلنے لگے اور یوسف علیہ السلام سے رخصت ہونے آئے تو اُنہوں نے اپنے نوکروں کو حکم دیا کہ خاموشی کے ساتھ ان کے کجاووں میں ان کی وہ پونجی بھی رکھ دو جو اُنہوں نے غلہ کی قیمت کے نام سے دی ہے تاکہ جب گھر جا کر اس کو دیکھیں تو عجب نہیں کہ پھر دوبارہ واپس آئیں، جب یہ قافلہ کنعان واپس پہنچا تو اُنہوں نے اپنی تمام سرگذشت اپنے باپ یعقوب (علیہ السلام) کو سنائی اور اُن سے کہا کہ مصر کے والی نے صاف صاف ہم سے کہہ دیا ہے کہ اُس وقت تک یہاں نہ آنا اور نہ غلہ کی خرید کا دھیان کرنا، جب تک اپنے سوتیلے بھائی بن یمین کو ساتھ نہ لاؤ، لہٰذا تم کو چاہیے کہ اُس کو ہمارے ساتھ کر دو، ہم اُس کے ہر طرح نگہبان اور محافظ ہیں۔

حضرتِ یعقوب نے فرمایا کیا تم پر اسی طرح اعتماد کروں جس طرح اس کے بھائی یوسف کے معاملہ میں کر چکا ہوں، اور تمہاری حفاظت ہی کیا؟ خدا ہی سب سے بہتر حفاظت کرنے والا ہے۔ اور اُس سے بڑھ کر کوئی رحم کرنے والا نہیں ہے۔

قال ھل امنکم علیہ الا کما (یعقوب نے) کہا کیا میں تم پر اُس (بن یمین) کے بارہ میں ایسا ہی

امنتکم علیٰ اخیہ من قبل ط   اعتماد کروں جیسا اس سے پہلے اس کے بھائی (یوسف) کے

فاللہ خیر حافظا وھو   بارہ میں کرچکا ہوں، سو اللہ ہی بہترین حفاظت کرنے والا ہے

ارحم الرحمین ۔   اور وہی سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔

اِس گفتگو سے فارغ ہونے کے بعد اب اُنھوں نے اپنا سامان کھولنا شروع کیا، دیکھا تو اُن کی پونجی اُن ہی کو واپس کردی گئی ہے، یہ دیکھ کر وہ کہنے لگے اے باپ! اس سے زیادہ ہم کو اور کیا چاہیے؟ دیکھیے غلّہ بھی ملا اور ہماری پونجی بھی جوں کی توں لوٹا دی گئی اُس نے تو ہم سے قیمت بھی نہ لی۔ اب ہمیں اجازت دے کہ ہم دوبارہ اُس کے پاس جائیں اور گھر والوں کے لیے رسد لائیں، اور بن یمین کو بھی ہمارے ساتھ بھیج دے ہم اُس کی پوری حفاظت کرینگے اور ایک اونٹ کا بوجھ اور زیادہ لائینگے کیونکہ یہ غلہ جو پہلے ہم لائے تھے تھوڑا ہے۔

اور توراۃ[1] میں ہے کہ برادرانِ یوسف اور حضرت یعقوب پونجی کو دیکھ کر ڈر گئے تھے کہ نہ معلوم اب کیا نئی آفت آئے۔ مگر واقعات کی ترتیب اور حضرتِ یوسف کے طرزِ عمل کے پیش نظر جن کا ذکر قرآن اور توراۃ دونوں میں یکساں طور پر کیا گیا ہے یہی صحیح ہے جو قرآنِ عزیز نے بیان کیا ہے، برادرانِ یوسف خود اپنے ہاتھ سے غلّہ کی قیمت ادا کر چکے تھے، لین دین کے بعد ہی قافلہ کو روانگی کی اجازت ملی تھی، پھر ہر ایک بھائی کے کجاوہ میں سے علیٰحدہ علیٰحدہ اُسی طرح قیمت کی واپسی ہر عقلمند کے لیے یہی راہنمائی کرتی ہے کہ جس طرح والیِ مصر نے دورانِ قیام میں ہمارا اعزاز کیا اُسی طرح یہ پونجی بھی اُس نے واپس کردی اور منت و احسان سے بچانے کے لیے اس کا اظہار بھی مناسب نہ سمجھا۔

بہرحال حضرت یعقوبؑ نے فرمایا میں بن یمین کو ہرگز تمہارے ساتھ نہیں بھیجونگا جب تک

---

[1] پیدائش باب ۴۲ آیت ۳۵۔

تم اللہ کے نام پر مجھ سے عہد نہ کرو اور وہ یہ کہ جب تک ہم خود نہ گھیر لیے جائیں اور ہر طرح مجبور نہ کر دیے جائیں ہم ضرور ضرور اُس کو تیرے پاس صحیح و سلامت لوٹا لائینگے، جب اُن سب نے متفق ہو کر باپ کے سامنے اس کا پختہ عہد کیا اور ہر طرح اطمینان دلایا تب حضرت یعقوبؑ نے فرمایا کہ یہ جو کچھ ہوا محض اسبابِ ظاہری کی بنا پر ہے ورنہ کیا تم اور کیا تمہاری حفاظت، اور کیا ہم اور کیا ہمارا عہد، ہم سب کو اپنے اس معاملہ کو خدا کی نگہبانی میں دینا چاہیے۔

قال، اللّٰه علیٰ ما نقول وکیل یعقوبؑ نے کہا ہم نے جو قول و قرار کیا ہے اُس پر اللہ نگہبان ہے

عہد و پیمان کے بعد برادرانِ یوسف کا قافلہ دوبارہ کنعان سے مصر کو روانہ ہو رہا ہے اور اس مرتبہ بن یمین بھی ہمراہ ہے حضرت یعقوبؑ نے رخصت کرتے وقت نصیحت فرمائی کہ دیکھو سب ایک ہی دروازہ سے مصر میں داخل نہ ہونا بلکہ متفرق دروازوں سے شہر میں داخل ہونا اور یہ بھی فرمایا کہ اس نصیحت کا مقصد یہ نہیں ہے کہ تم اپنی تدابیر پر مغرور ہو بیٹھو۔ کیونکہ میں تمہیں کسی ایسی بات سے ہرگز نہیں بچا سکتا جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہونے والی ہو، فرمانروائی تو صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے، میں نے اُسی پر بھروسہ کیا اور تمام بھروسہ کرنے والوں کو اُسی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ اس لیے میں نے جو کچھ کہا ہے وہ صرف احتیاطی تدبیر کے طور پر ہے اور خدا پر بھروسہ اور یقین کے ساتھ اسبابِ ظاہری کو احتیاطی تدبیر کے لیے استعمال کرنا خدا پرستی کے خلاف نہیں ہے۔

علمائِ تفسیر عام طور پر حضرت یعقوب کی اس نصیحت کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ عزیزِ مصر حضرت یوسفؑ نے چونکہ پہلی مرتبہ اُن کا کافی اعزاز کیا تھا اور اب یہ قافلہ خاص شان کے ساتھ یوسف (علیہ السلام) کی دعوت پر مصر میں داخل ہو رہا ہے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ مصری اُن سے حسد کرنے لگیں اور یہ اُن کی تکلیف کا باعث بن جائے۔

لیکن بعض مفسرین اور مورخین اس کی وجہ دوسری بتاتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ تورات

سے اس قدر ثابت ہو چکا ہے کہ پہلی مرتبہ برادرانِ یوسف پر جاسوسی کا گمان کیا جا چکا تھا اور اگرچہ یوسف علیہ السلام نے یہ الزام نہ لگایا ہو لیکن مصریوں نے ضرور اُن پر شبہ کیا تھا، اور حضرت یعقوبؑ بیٹوں کی زبانی پوری تفصیل سُن چکے تھے لہذا اُنھوں نے سوچا کہ اگر گیارہ نوجوان اس کرّوفر سے ایک ساتھ شہر میں داخل ہونگے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ عزیزِ مصر کے پاس پہنچنے سے پہلے ہی جاسوسی کے الزام میں گرفتار کر لیے جائیں، اس لیے نصیحت فرما دی کہ ایک جتھہ بنا کر شہر میں داخل نہ ہونا، جُدا جُدا دروازوں سے ایک مسافر کی طرح داخل ہونا

اِس موقعہ پر اللہ تعالیٰ نے اس حقیقت کی جانب بھی توجہ دلائی ہے کہ یعقوب چونکہ صاحبِ علم و بصیرت تھے اور یہ دولتِ علم ہم نے ہی اُس کو بخشی تھی اس لیے اُس نے بیٹوں سے یہ نصیحت کی بات کہہ دی جو اُس کے خیال میں آگئی تھی ورنہ تو باپ کے حکم کی تعمیل کرنے کے باوجود بھی خدائے تعالیٰ کی مشیّت نے جو کچھ مقرر کر دیا تھا اُس کے مقابلہ میں اُن کی یہ احتیاط کچھ بھی کام نہ آسکی

ولمّا دخلوا من حیث امرھم	پھر جب یہ مصر میں اُسی طرح داخل ہوئے جس طرح اُن کے
ابوھم ما کان یغنی عنھم من	باپ نے اُن کو حکم کیا تھا تو یہ (احتیاط) اُن کو اللہ تعالیٰ
اللّٰہ من شیءٍ الّا حاجۃً فی نفس	(کی مشیّت) کے مقابلہ میں کچھ کام نہ آئی مگر یہ ایک خیال تھا
یعقوب قضٰھا ؕ وانّہٗ لذو علم	یعقوب کے جی میں جو اُس نے پورا کر لیا اور بلا شبہ وہ
لما علّمنٰہ ولٰکنّ اکثر النّاس	صاحبِ علم تھا اور ہم نے ہی اُس کو یہ علم سکھایا تھا لیکن
لا یعلمون ۔	اکثر لوگ نہیں سمجھتے ۔

مطلب یہ ہے کہ یعقوب نے جو کچھ کیا اُس کو بمقتضائے علم ہی کرنا چاہیے تھا، کیونکہ علم کی یہ دولت ہم نے ہی اُس کو بخشی تھی مگر یہ ضروری نہیں کہ احتیاطی تدابیر ہر جگہ راست ہی آجائیں اگر خدائے تعالیٰ کی مشیت اُس کے برعکس مصلحت دیکھتی ہے تو پھر وہی ہو کر رہتا ہے اور سب تدبیریں بیکار ہو جاتی

ہیں جیسا کہ آنے والے واقعہ میں بن یمین کے ساتھ پیش آیا کہ وہ روک لیے گئے اور ایسی مصلحت کے زیر اثر روک لیے گیے کہ اُس کا انجام تمام خاندانِ یعقوب (علیہ السلام) کے حق میں بہتر ثابت ہوا۔

صورت یہ پیش آئی کہ جب برادرانِ یوسف کنعان سے روانہ ہوئے تو راستہ میں بن یمین کو تنگ کرنا شروع کر دیا کبھی اُس کو باپ کی محبت و عشق کا طعنہ دیتے اور کبھی اس بات پر حسد کرتے کہ عزیزِ مصر نے خصوصیت کے ساتھ اُس کو کیوں بلایا ہے، بن یمین یہ سب کچھ سنتا اور خاموش رہتا، جب یہ سب منزلِ مقصود پر پہنچے تو حضرتِ یوسف نے بن یمین کو اپنا تمام حال سُنایا اور بتایا کہ میں تیرا حقیقی بھائی یوسف ہوں، اور پھر تسلی و تشفی کی کہ اب گھبرانے کی کوئی بات نہیں ان کی بدسلوکیوں کا دور ختم ہو گیا، اب یہ تجھ کو کسی قسم کی ایذا نہیں پہنچا سکینگے۔

ولما دخلوا علیٰ یوسف	اور جب یہ سب یوسف (علیہ السلام) کے پاس پہنچے تو اُس
اٰوی الیہ اخاہ قال انی	نے اپنے بھائی (بن یمین) کو اپنے پاس بٹھا لیا، اور اُس سے
انا اخوک فلا تبتئس بما	(آہستہ سے) کہا میں تیرا بھائی (یوسف) ہوں، بس (جو بدسلوکی یہ
کانوا یعملون ۔	تیرے ساتھ کرتے آئے ہیں) تو اُس پر غمگین نہ ہو۔

توراة میں ہے کہ یوسفؑ نے بھائیوں کی بڑی مدارات کی اور نوکروں کو حکم دیا کہ اُن کو شاہی مہمان خانہ میں اُتاریں، اور اُن کے لیے پُرتکلف دعوت کا سامان کیا[1] چند روز کے قیام کے بعد جب یہ رخصت ہونے لگے تو یوسف (علیہ السلام) نے حکم دیا کہ اُن کے اونٹوں کو غلہ سے اس قدر لاد دو جتنا یہ لیجا سکیں۔ حضرتِ یوسف کی یہ خواہش تھی کہ کسی طرح اپنے عزیز بھائی بن یمین کو اپنے پاس روک لیں مگر انتہائی اضطراب اور بے قراری کے باوجود اُن کے لیے ایسا کرنا ممکن نہ تھا اس لیے کہ حکومتِ مصر کے قانون میں کسی غیر مصری کو بغیر کسی معقول وجہ کے روک لینا

[1] پیدائش باب ۴۳ آیت ۲۳-۳۵۔

سخت ممنوع تھا، اور حضرت یوسف یہ کسی طرح نہیں چاہتے تھے کہ اس وقت لوگوں پر یا اُن کے بھائیوں پر اصل حقیقت منکشف ہو، بدیں وجہ خاموش رہے اور جب قافلہ روانہ ہونے لگا توکسی کو اطلاع کیے بغیر نشانی کے طور پر اپنا چاندی کا پیالہ بن یمین کے کجاوہ میں رکھ دیا۔

کنعان کے اس قافلہ نے ابھی تھوڑی ہی مسافت طے کی ہوگی کہ یوسف (علیہ السلام) کے کارندوں نے شاہی برتنوں کی دیکھ بھال کی تو اُس میں پیالہ ندارد پایا، سمجھے کہ شاہی محل میں کنعانیوں کے سوا دوسرا کوئی نہیں آیا، اس لیے اُنہوں نے ہی یہ چوری کی ہے، فوراً دوڑے اور چلائے۔ قافلہ والو ٹھہرو تم چور ہو، برادرانِ یوسف کارندوں کی طرف متوجہ ہوکر کہنے لگے ہم کو خواہ مخواہ کیوں الزام لگاتے ہو آخر معلوم تو ہو کہ تمہاری کیا چیز گم ہوگئی ہے، کارندے کہنے لگے کہ بادشاہ کا پیمانہ (پیالہ) گم ہوگیا ہے اور اُن میں سے ایک نے آگے بڑھ کر کہا کہ جو شخص اس چوری کا پتہ لگا دیگا اُس کو ایک اونٹ غلہ انعام میں ملیگا اور میں اس بات کا ضامن ہوں۔ برادرانِ یوسف نے کہا "خدا علیم ہے کہ ہم مصر میں فساد اور شرارت کی غرض سے نہیں آئے اور تم جانتے ہو کہ ہم اس سے پہلے بھی غلّہ لینے آچکے ہیں۔ ہم میں چوری کی قطعاً عادت نہیں ہے" کارندوں نے کہا "اچھا جس کے پاس سے یہ چوری نکلے اُس کی سزا کیا ہونی چاہیے" اُنہوں نے جواب دیا کہ وہ خود آپ اپنی سزا ہے یعنی وہ تمہارے حوالہ کردیا جائیگا تاکہ وہ اپنے جرم کی پاداش میں پکڑا جائے اور ہم اپنے یہاں ایسی زیادتی کرنے والوں کو یہی سزا دیا کرتے ہیں۔

کارندوں نے یہ جواب سُنا تو پہلے دوسرے بھائیوں کے بوروں کی تلاشی لی اور جب اُن میں پیالہ نہ نکلا تو آخر میں بن یمین کی خورجی کی تلاشی لی، اُس میں پیالہ موجود تھا، اُنہوں نے وہ پیالہ نکال لیا اور قافلہ کو واپس لوٹا کر عزیزِ مصر "یوسف" کی خدمت میں معاملہ کو پیش کیا حضرت یوسف نے معاملہ کی نوعیت کو سُنا تو دل میں بیحد مسرور ہوئے اور خدائے تعالےٰ

کی کارسازی پر شکر ادا کیا کہ جس بات کے لیے میں بیقرار تھا کہ کسی طرح بن یمین میرے پاس رُک جائے اور وہ میرے ہاتھوں کسی طرح نہ بن پڑی اُس کو قادرِ مطلق نے اس حکمت کے ساتھ پورا کر دیا اور یہ سوچ کر قطعاً خاموش رہے اور یہ ظاہر نہیں فرمایا کہ یہ پیالہ میں نے خود بن یمین کی خورجی میں اپنی نشانی کے طور پر رکھ دیا تھا ادھر بن یمین بھی جو کہ قبل ہی اپنے برادرِ بزرگ یوسف علیہ السلام سے واقف ہو چکا تھا اس واقعہ کو مرضی کے مطابق پا کر خاموش رہا۔

برادرانِ یوسف نے جب یہ دیکھا تو اُن کی حاسدانہ رگ پھڑک اُٹھی اور اُنھوں نے یہ جھوٹ بولنے کی جرأت کی کہ اگر بن یمین نے یہ چوری کی ہے تو تعجب کا مقام نہیں ہے اس سے پہلے اس کا بڑا بھائی یوسف بھی چوری کر چکا ہے۔

حضرت یوسف نے یہ دیکھ کر بھی کہ میرے مُنہ پر ہی جھوٹ بول رہے ہیں ضبط سے کام لیا اور راز فاش نہ کیا اور دل میں کہنے لگے "تمہارے لیے سب سے بُری جگہ ہے کہ تم ایسا جھوٹا الزام لگا رہے ہو اور جو کچھ تم بیان کرتے ہو اللہ تعالیٰ اُس کی حقیقت کا خوب جاننے والا ہے"۔

یا خود اُن ہی سے مخاطب ہو کر فرمایا جیسا کہ بعض مفسرین کی تفسیر سے ظاہر ہوتا ہے یعنی اُن کو شرمندہ کرتے ہوئے کہا کہ ابھی تو یہ کہتے تھے کہ ہم چوری کے قریب تک نہیں ہیں اور یا اب غیر حاضر بھائی پر بھی چوری کا الزام لگا رہے ہو جس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہارا خاندان ہی چوری پیشہ ہے یہ کیسا بُرا مقام ہے جو تم نے اختیار کیا ہے۔

برادرانِ یوسف نے جب یہ رنگ دیکھا تو بہت گھبرائے اور باپ کا عہد و پیمان یاد آگیا، آپس میں مشورہ کرنے لگے کہ کس صورت سے بن یمین کو حاصل کریں؟ ہم تو پہلے ہی قول ہار چکے۔ صرف ایک ہی پہلو باقی تھا کہ التجائیں اور خوشامدانہ عرض و معروض کر کے عزیزِ مصر کو بن یمین کی واپسی کی ترغیب دلائیں، کہنے لگے۔ عزیزِ مصر! ہمارا باپ بہت بوڑھا ہے اُس کو اس کے

پہلے بھائی کا بھی بیحد غم ہے اور اسی لیے اس کا عاشق و متوالا ہے اُس پر رحم کیجیے اور اُس کی جگہ ہم میں سے کسی ایک کو اس سزا کے لیے روک لیجیے۔ آپ ہم پر بہت مہربان رہے ہیں اور اُن لوگوں میں سے ہیں جو احسان کرنے والے ہیں۔ عزیزِ مصر یوسفؑ نے کہا پناہ بخدا! یہ کیسے ممکن ہو ہم اگر ایسا کریں تو ظالم ہونگے۔

جب اس جانب سے مایوس ہوگئے تو اب الگ خلوت میں بیٹھ کر مشورہ کرنے لگے، ان میں سے بڑے نے کہا " بھائی تم کو معلوم ہے کہ والد نے بن یمین کے متعلق کس قدر سخت اور پختہ عہد پیمان ہم سے لیا ہے اور اس سے پہلے تم یوسف کے ساتھ جو ظلم و زیادتی کرچکے ہو وہ بھی سامنے ہے۔ اس لیے میں تو اب اس جگہ سے اُس وقت تک ٹلنے والا نہیں کہ یا والد مجھ کو کنعان آنے کی اجازت دیں اور یا خدا میرے لیے کوئی دوسرا فیصلہ کردے" جاؤ تم سب اُن کے پاس جاؤ اور عرض کرو کہ تمہارے بیٹے بن یمین نے چوری کی اور جو بات ہمارے جاننے میں آئی وہی سچ سچ آپ کے سامنے کہہ دی، ہم کو کچھ غیب کا علم تو تھا نہیں کہ پہلے سے جان لیتے کہ اس سے ایسی حرکت سرزد ہونے والی ہے۔ اور یہ بھی کہنا کہ آپ مصر کے لوگوں سے اس کی تصدیق کرلیں نیز اُس قافلہ سے بھی کہ جس کے ساتھ ہم مصر سے یہاں آئے ہیں کہ ہم اس معاملہ میں بالکل سچے ہیں۔

اس مشورہ کے مطابق وہ کنعان واپس آئے اور حضرتِ یعقوبؑ سے بے کم و کاست سارا واقعہ کہہ سُنایا۔ قرآنِ عزیز نے یوسف علیہ السلام کے سوتیلے بھائیوں کی اس گفتگو کو جو اس سلسلہ میں اُنھوں نے یعقوب علیہ السلام سے کی اس طرح نقل کیا ہے۔

" فقولوا یٰآبانا ان ابنك سرق" پس (باپ کے پاس جاکر) کہنا، اے باپ تیرے بیٹے نے چوری کی اور اس سے وہ یہ بتانا چاہتا ہے کہ یوسف کے ان سوتیلے بھائیوں کی شقاوت کا اندازہ کیجیے کہ ایسے سخت وقت میں بھی بوڑھے باپ کو طعن و تشنیع اور ملامت سے نہ چھوڑا اور یہ نہ کہا کہ ہمارے

بھائی سے یہ غلطی ہوگئی بلکہ اُن کی طرف نسبت کر کے یہ کہا کہ تیرے بیٹے ہاں چہیتے اور پیارے بیٹے نے چوری کر کے ہم سب کو ذلیل کیا، ہم کو کیا معلوم تھا کہ اُس کے ایسے گُن ہیں۔

حضرت یعقوب، یوسف علیہ السلام کے معاملہ میں ان کی صداقت کا تجربہ کر چکے تھے اس لیے فرمایا "نہیں تمہارے جی نے ایک بات بنا لی ہے واقعہ یوں نہیں ہے" بن یمین اور چوری "یہ نہیں ہوسکتا۔ خیر اب صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں "ایسا صبر کہ بہتر سے بہتر ہو" خدائے تعالیٰ سے کیا بعید ہے کہ وہ ایک دن ان گم گشتگان کو پھر جمع کر دے اور ایک ساتھ ان دونوں کو مجھ سے ملا دے، بلاشبہ وہ دانا، حکمت والا ہے۔ اور اُن کی جانب سے رُخ پھیر لیا اور فرمانے لگے: "آہ۔ فراقِ یوسف کی غم انگیزی" حضرت یعقوب کی آنکھیں شدتِ غم میں روتے روتے سپید پڑ گئی تھیں اور سینہ غم کی سوزش سے جل رہا تھا۔ مگر صبر کے ساتھ اللہ پر تکیہ کیے بیٹھے تھے۔

بیٹے یہ حال دیکھ کر کہنے لگے "بخدا تم ہمیشہ اسی طرح یوسف کی یاد میں گھلتے رہوگے یا اسی غم میں جان دیدوگے" حضرت یعقوب نے یہ سُن کر فرمایا "میں کچھ تمہارا تو شکوہ نہیں کرتا اور نہ تم کو ستاتا ہوں"۔

انما اشکو بثی وحزنی الی اللہ واعلم من اللہ ما لا تعلمون ۔ (بلکہ) میں تو اپنی حاجت اور اپنا غم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کرتا ہوں میں اللہ کی جانب سے وہ بات جانتا ہوں

ہم نے شاہی پیالہ کے واقعہ کی تفسیر میں عام تفاسیر سے جُدا مفسرین کے اُس قول کو اختیار کیا ہے، جس کو متاخرین کے یہاں "قولِ شاذ کا درجہ" حاصل ہے۔ مگر اس مقام پر سب سے بہتر اور بے غل وغش تفسیر ہے۔ کتبِ تفاسیر میں عام طور پر آیت "جعل السقایۃ فی رحلِ اخیہ" (رکھ دیا یوسف نے پیالہ کو بھائی (بن یمین) کے کجاوہ میں) میں حضرت یوسف کے اس عمل کی یہ وجہ بیان کی ہے کہ وہ چونکہ بن یمین کو روکنا چاہتے تھے اور مصر کا قانون اس کی اجازت نہ دیتا تھا

اس لیے اُنھوں نے یہی سمجھ کر یہ پیالہ رکھ دیا تھا کہ اس طرح بن یمین چور بن جائیگا اور میں اُس کو روک سکونگا، اور پھر آیت "اذّن موذّن" میں پکارنے والی شخصیت بھی یوسف ہی کو بتاتے ہیں، اور اس طرح جب اُن پر جھوٹ کا الزام عائد ہونے لگتا ہے تو اُس کو "توریہ" سے تعبیر کرکے اُن کی معصوم شخصیت کو اس الزام سے بری کرتے ہیں۔ حالانکہ قرآنِ عزیز کے اسلوبِ بیان میں کوئی ایسا اشارہ تک موجود نہیں ہے جس سے حضرت یوسف کی شخصیت پر جھوٹ کا شبہ بھی ہو سکتا ہو یا توریہ کہنے کی ضرورت پیش آتی ہو۔

یہ مانا کہ کسی محمود اور نیک مقصود کی خاطر توریہ بُری اور معیوب بات نہیں ہے۔ بلکہ اچھی بات ہے لیکن یہ کہنے والے اس کو قطعاً بھول جاتے ہیں کہ معاملہ ہمارا تمہارا یا صالحین و ابرار کا نہیں ہے بلکہ خدا کے پیغمبر اور رسول کا معاملہ ہے۔ اُن کی اخلاقی زندگی کا معیار اس قسم کی اصطلاحی تعبیروں سے بہت بلند اور برتر ہے، وہ اپنی نیک خواہشات میں بھی عزیمت کی بلندی کو ہاتھ سے نہیں دیتے، پھر کیا ضرور کہ ایسے موقعہ پر جہاں قرآنِ عزیز کا اسلوبِ بیان مجبور نہ کرتا ہو اور احادیثِ صحیحہ اُس کی تائید نہ کرتی ہوں خواہ مخواہ اُن کی جانب ایسی بات منسوب کیجائے جس کے درست کرنے اور پیغمبرانہ معصومیت کو محفوظ رکھنے کے لیے "توریہ" کی پناہ لینی پڑے۔

اس مقام پر قرآنِ عزیز میں حضرت یوسف کا صرف یہ عمل مذکور ہے کہ اُنھوں نے شاہی پیمانہ (چاندی کے کٹورے) کو بن یمین کی خورجی میں رکھ دیا تاکہ بھائی کے پاس ایک نشانی رہے)

جعل السقایۃ فی رحل اخیہ اُس (یوسف) نے اپنے بھائی (بن یمین) کے کجاوہ میں کٹورہ رکھ دیا

اس کے بعد حضرت یوسف کا کوئی ذکر نہیں بلکہ تمام گفتگو کا معاملہ بھائیوں اور کارندوں کے درمیان دائر نظر آتا ہے۔

ثم اذن موذن ایتہا العیر انکم پھر پکارا پکارنے والے نے اے قافلہ والو تم تو البتہ چور ہو،

لسارقون. قالوا واقبلوا علیهم ماذا تفقدون. قالوا نفقد صواع الملك ولمن جاء به حمل بعیر وانا به زعیم. قالوا تاللّٰہ لقد علمتم ما جئنا لنفسد فی الارض وما کنا سارقین. قالوا فما جزاؤہ من وجد فی رحلہ فھو جزاؤہ کذالك نجزی الظلمین. (یوسف)

وہ کہنے لگے اُن کی جانب منہ کرکے تمہاری کیا چیز گم ہوگئی، وہ (کارندے) بولے ہم نہیں پاتے بادشاہ (یوسف) کا پیمانہ (کٹورا) اور جو کوئی اُس کو لائے اُس کو ملے ایک اونٹ کا بوجھ (غلہ) اور میں ہوں اُس کا ضامن۔ وہ بولے خدا کی قسم تم کو معلوم ہے کہ ہم شرارت کرنے کو نہیں آئے ملک (مصر) میں اور نہ ہم کبھی چور تھے، وہ (کارندے) بولے پھر کیا سزا ہے اُس کی اگر تم نکلے جھوٹے، کہنے لگے اُس کی سزا یہ ہے کہ جس کے اسباب میں سے ہاتھ آئے وہی اُس کے بدلہ میں جائے ہم یہی سزا دیتے ہیں ظالموں کو۔

اس تمام مرحلہ کے بعد پھر یہ معاملہ قانونی طور پر عزیز مصر (یوسف) کے سامنے پیش ہوا اور اُن کی تلاشی لی گئی تو بن یمین کے کجاوہ میں چاندی کا وہ پیمانہ موجود تھا۔

فبدء باوعیتھم قبل وعاء اخیہ ثم استخرجھا من وعاء اخیہ

پھر یوسف نے اُن کی خورجیاں دیکھنی شروع کیں اپنے بھائی کی خرجی سے پہلے، آخر میں وہ برتن نکالا اپنے بھائی کی خرجی سے۔

اس تفصیل کے بعد اللہ تعالیٰ اپنا احسان و انعام کا ذکر کرتا اور بتاتا ہے کہ یوسف جس بات کے لیے بیقرار تھے اور مصری قانون کے ماتحت اُس کو نہیں کرسکتے تھے ہم نے اپنی خفیہ تدبیر سے اُس کا سامان بہم پہنچا دیا۔

کذالك کدنا لیوسف ما کان لیاخذ اخاہ فی دین الملك

یوں خفیہ تدبیر کردی ہم نے یوسف کے لیے، وہ ہرگز نہ لے سکتا تھا اپنے بھائی بن یمین کو اُس بادشاہ (مصر) کے طریقے

الا ان یشاء اللہ نرفع درجات من نشاء وفوق کل ذی علم علیم — مطابق مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ ہی چاہے۔ ہم درجے بلند کرتے ہیں جس کے چاہیں، اور ہر جاننے والے سے اوپر جاننے والا ہے

پس اس قدر صاف اور واضح بات کی ایسی تشریح کس لیے کی جائے کہ جس میں یوسف علیہ السلام کے کلام کو توریہ پر محمول کرنے کی ضرورت پڑے کیوں نہ وہ معنیٰ لیے جائیں کہ جس سے نہ کوئی شبہ پیدا ہو اور نہ اُس کے لیے تاویلات کی ضرورت پیش آئے۔

بہرحال حضرتِ یعقوبؑ نے اپنے بیٹوں سے فرمایا "دیکھو ایک مرتبہ پھر مصر جاؤ اور یوسف اور اُس کے بھائی کی تلاش و جستجو کرو اور خدا کی رحمت سے ناامید اور مایوس نہ ہو، اس لیے کہ خدا کی رحمت سے ناامیدی کافروں کا شیوہ ہے"۔

یٰبنیّ اذھبوا فتحسسوا من یوسف واخیہ ولا تایئسوا من روح اللہ انہ لا یایئس من روح اللہ الا القوم الکفرون۔ — اے میرے بیٹو (مصر) جاؤ اور یوسف اور اس کے بھائی کا سراغ لگاؤ اور اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو، بلاشبہ اللہ کی رحمت سے کافروں کے سوا کوئی ناامید نہیں ہوتا۔

حضرت یعقوبؑ نے بن یمین کے ساتھ یوسف کا بھی نام لیا حالانکہ بظاہر اس مقام پر اُن کے سراغ کا کوئی جوڑ نہیں لگتا، معلوم ہوتا ہے کہ اب حضرتِ حق نے یعقوبؑ کے غم اور دُکھ کی زندگی ختم کرنے کا ارادہ کرلیا اور یعقوب کو یہ اشارہ کر دیا کہ بن یمین کے اس قصہ میں یوسف کی ملاقات کا راز بھی محفوظ ہے اور تب ہی تو یوسف علیہ السلام کے پیغامِ بشارت آنے پر (جس کی تفصیل آنے والی ہے) اُنھوں نے یہ ارشاد فرمایا۔

الم اقل لکم انی اعلم من اللہ ما لا تعلمون۔ — کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں اللہ کی جانب سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

غرض برادرانِ یوسف نے "کچھ تو باپ کے اصرار پر اور کچھ اس لیے کہ واقعی قحط کی شدت انتہائی درجہ پر پہنچی ہوئی تھی اور غلہ کا آس پاس نام ونشان نہ تھا" تیسری بار پھر مصر کا ارادہ کیا، اور جب دربار شاہی میں پہنچے تو کہنے لگے "اے عزیز! ہم کو اور ہمارے گھر والوں کو قحط نے سخت پریشانی میں ڈال دیا ہے اور اس مرتبہ ہم پونجی بھی بہت تھوڑی لائے ہیں۔ یہ حاضر ہے۔ اب معاملہ خرید و فروخت اور لین دین کا نہیں ہے ہم سے قیمت ادا نہیں ہو سکتی اس لیے تیری خدمت میں ہماری یہ درخواست ہے کہ آپ ہم کو غلہ کی پوری تول دیجیے اور ہمیں ضرورتمند سمجھ کر اپنی جانب سے احسان فرمایئے، اللہ تعالیٰ صدقہ وخیرات کرنے والے کو نیک بدلہ دیتا ہے۔

حضرت یوسف نے والدین اور بھائیوں کی اس پریشانی کا حال سُنا اور اُن کی اس عاجزانہ درخواست اور نیازمندانہ طلب کی مجبورکن حالت پر غور کیا تو دل بھر آیا اور راب ضبط نہ ہو سکا کہ خود کو چھپائیں اور راز ظاہر نہ ہونے دیں، آخر فرمانے لگے۔

هل علمتم ما فعلتم بیوسف و اخیه اذ انتم جاهلون ۔ کیوں جی تم جانتے ہو کہ تم نے یوسف اور اُس کے بھائی کے ساتھ کیا معاملہ کیا جبکہ تم جہالت میں سرشار تھے۔

بھائیوں نے اس موقع پر یہ غیر متوقع گفتگو سُنی تو چونکے اور لب و لہجہ پر غور کر کے ایک دم اُن کو کچھ خیال آیا اور کہنے لگے۔

قالوا ءانك لانت یوسف (اُنھوں نے کہا) کیا تو واقعی یوسف ہی ہے۔

یعنی اس حیرانی و پریشانی میں تھے کہ ہم "عزیز مصر" کے دربار میں کھڑے ہیں، اُس سے باتیں کر رہے ہیں یہ بے محل یوسف کا ذکر کیسا؟ صورت شکل اور گفتگو کے طرز و انداز کو اب دوسری نیت سے دیکھا تو یوسف کی شکل نگاہ کے سامنے پھر گئی اور سمجھ گئے کہ بیشک یہ یوسف ہے مگر حالتِ موجودہ کے پیشِ نظر قدرتی طور پر یہ جرأت نہیں کی کہ یہ کہہ اُٹھیں کہ تو یوسف ہے، بلکہ ایسے

موقعہ کے مناسب لب و لہجہ سے کہنے لگے کیا آپ واقعی یوسف ہی ہیں ؟

حضرت یوسف نے فرمایا :-

انا یوسف وھٰذا اخی قد منّ — ہاں میں یوسف ہوں اور یہ (بن یمین) میرا ماں جایا بھائی ہے

اللہ علینا وانہ من یتّق ویصبر — اللہ تعالیٰ نے ہم پر احسان کیا، اور جو شخص بھی برائیوں سے بچے اور (مصیبتوں میں)

فان اللہ لا یضیع اجر المحسنین — (مصیبتوں میں) ثابت قدم رہے تو اللہ تعالیٰ نیک لوگوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

اب برادرانِ یوسف کے پاس ندامت، شرمساری، خفت، اور اعترافِ خطاء و جرم کے سوا کیا تھا، معاً یوسف کی تباہی اور تذلیل کے لیے اپنی تمام بیہودگیوں کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا اور جب اُن پر یہ حقیقت آشکارا ہوگئی کہ جس کو کل کنعان کے کنوئیں میں پھینک کر آئے تھے وہ آج "عزیزِ مصر" بلکہ مصر کے تاج و تخت کا مالک ہے۔ تو سر جھکا کر کہنے لگے۔

قالوا تاللہ لقد اٰثرک اللہ علینا — (انہوں نے کہا) بخدا اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے

وان کنا لخٰطئین ۔ — تجھ کو ہم پر برتری و بلندی بخشی اور بلاشبہ ہم سرتاسر قصوروار تھے۔

حضرت یوسف نے اپنے سوتیلے بھائیوں کی اس خستہ حالی اور پشیمانی کو دیکھا تو اُن کی اخلاقی بزرگی اور پیغمبرانہ رحمت و رأفت اس کو برداشت نہ کر سکی اور عفو و درگذر اور حلم و کرم کے ساتھ فوراً یہ ارشاد فرمایا :-

لا تثریب علیکم الیوم ط یغفر — آج کے دن میری جانب سے تم پر کوئی سرزنش نہیں، اللہ تعالیٰ

اللہ لکم وھو ارحم الرّٰحمین ۔ — تمہارا قصور بخش دے اور وہ تمام رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے

یعنی جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا اب ہم کو اور تم کو اُس تمام داستان کو فراموش کر دینا چاہیے میں درگاہِ الٰہی میں دعا کرتا ہوں کہ وہ تمہاری اس غلطی کو معاف فرمادے کیونکہ وہی سب سے بڑھ کر رحیم و کریم ہے۔

اب تم کنعان واپس جاؤ اور میرا پیراہن لیتے جاؤ یہ والد کی آنکھوں پر ڈال دینا انشاءاللہ شمیم یوسف اُن کی آنکھوں کو روشن کر دیگی، اور تمام خاندان کو مصر لے کر آؤ۔

برادرانِ یوسف کے لیے بھی اس سے بڑھ کر سعادت اور کیا ہو سکتی تھی؟ یوسف کو چاہِ کنعان میں ڈال کر یعقوب علیہ السلام کے پاس خون آلود پیراہن لے کر آئے تھے اور جھوٹ اور فریب کے ساتھ اُن کے دل و جگر کو زخمی کیا تھا، آج بھی اُن ہی کو پیراہنِ یوسف لیجانا چاہیے تاکہ اُس زخم کا مرہم بنے اور رنج و غم، مسرت و شادمانی سے بدل جائے۔

یہاں یہ باتیں ختم ہو کر برادرانِ یوسف کا کارواں کنعان کو پیراہنِ یوسف لے کر چلا تو کنعان میں اُدھر خدا کے برگزیدہ پیغمبر یعقوب علیہ السلام کو وحیِ الٰہی نے شمیمِ یوسف سے مہکا دیا، فرمانے لگے اے خاندانِ یعقوب! اگر تم یہ نہ کہو کہ بڑھاپے میں اس کی عقل ماری گئی ہے تو میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ مجھ کو یوسف کی مہک آرہی ہے، وہ سب کہنے لگے: "بخدا! تم تو اپنے اُسی پرانے خبط میں پڑے ہو۔ یعنی اس قدر عرصہ گذر جانے کے بعد بھی جبکہ یوسف کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہا تمہیں یوسف ہی کی رٹ لگی ہوئی ہے۔

کنعان کا قافلہ بخیریت تمام پہنچ گیا اور برادرانِ یوسف نے حضرت یوسف کے ارشاد کے مطابق اُن کا پیراہن یعقوب کی آنکھوں پر ڈال دیا اور یعقوبؑ کی آنکھیں فوراً روشن ہو گئیں اور وہ فرمانے لگے "دیکھو میں نہ کہتا تھا کہ میں اللہ کی جانب سے وہ بات جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

فلما ان جاء البشیر القٰہ	پھر جب بشارت دینے والا آپہنچا تو اُس نے پیراہنِ یوسف
علی وجھہ فارتد بصیرا	کو یعقوب کے چہرہ پر ڈال دیا، پس اُس کی آنکھیں روشن
قال الم اقل لکم انی اعلم	ہو گئیں (بینائی لوٹ آئی) یعقوب نے کہا کیا میں تم سے

من اللہ مالا تعلمون ۔ نہ کہتا تھا کہ میں اللہ کی جانب سے وہ بات جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے

برادرانِ یوسف کے لیے یہ وقت بہت کٹھن تھا، شرم و ندامت میں غرق سر جھکائے ہوئے بولے "اے باپ آپ خدا کی جناب میں ہمارے گناہوں کی مغفرت کے لیے دعا فرمائیے۔ کیونکہ اب یہ تو ظاہر ہی ہو چکا کہ بلاشبہ ہم سخت خطاکار اور قصوروار ہیں۔

حضرت یعقوبؑ نے فرمایا۔

سوف استغفر لکم ربی انہ هو الغفور الرحیم ۔ عنقریب میں اپنے رب سے تمہارے لیے مغفرت کی دعا کرونگا، بلاشبہ وہ بڑا بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

مفسرین کہتے ہیں کہ برادرانِ یوسف نے مصر میں اپنی خطا کا اعتراف کرتے ہوئے یوسف علیہ السلام سے بھی مغفرت کی دعا کی استدعا کی تھی اور کنعان میں اپنے والد یعقوب علیہ السلام سے بھی یہی درخواست کی۔ مگر حضرت یوسف نے تو اسی وقت اُن کی بات منظور کرلی اور "یغفر اللہ لکم" کہہ دیا مگر حضرت یعقوب نے یہ نہیں کیا بلکہ "سوف استغفر لکم" کہہ کر صرف توقع ہی دلائی، اس فرق کی وجہ کیا ہے؟ اور پھر حسب ذیل دو جواب دیتے ہیں۔

(۱) برادرانِ یوسف کی ان تمام خطاکاریوں کا معاملہ براہِ راست حضرت یوسف سے تعلق رکھتا تھا اور حضرت یعقوب سے بالواسطہ۔ اس لیے حضرت یوسف نے اخلاقِ کریمانہ کی راہ سے اُسی وقت اُن کا اطمینان کردیا۔ مگر حضرت یعقوب نے یہ سمجھ کر کہ چونکہ اس معاملہ کا تعلق یوسف سے ہے اس لیے اُس کی مرضی بھی معلوم کرلینا ضروری ہے، اس طرح جواب دیا یہ توقع اور اُمید تک بات رہے اور ساتھ ہی اپنی طبیعت کا رجحان بھی ظاہر کردیا کہ اُن کی خواہش یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری ان خطاکاریوں کو معاف کردے

(۲) حضرتِ یوسف نوجوان تھے اس لیے اُن کے کریمانہ وصف میں حزم و احتیاط کا پہلو

نہ تھا اُنھوں نے فوراً معاف کر دیا۔ مگر حضرت یعقوب تجربہ کار، محتاط اور پھر باپ تھے، اس لیے چاہتے تھے کہ بیٹوں کا امتحان کریں کہ اُن کا یہ انفعال اور ندامت کا اظہار محض وقتی اور ہنگامی ہے اور صرف دفع الوقتی کے لیے ہے یا اب اُن کی طبیعت میں حقیقی ندامت و شرمساری کا جذبہ پیدا ہو چکا ہے اور یہ واقعی اپنی خطا پر صداقت سے نادم ہیں۔ اس لیے اُن کو بالکل مایوس بھی نہیں کیا اور رجحانِ طبیعت کا اظہار کرتے ہوئے صرف توقع اور اُمید تک ہی معاملہ کو چھوڑ دیا۔

خاندانِ یعقوب علیہ السلام مصر میں

غرض حضرت یعقوب اپنے سب خاندان کو لے کر مصر روانہ ہو گئے۔ تورات میں اس واقعہ کی تفصیل ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔

"اور یہی ذکر فرعون کے گھر میں سُنا گیا کہ یوسف کے بھائی آئے ہیں اور اُس سے فرعون اور اُس کے چاکر بہت خوش ہوئے، اور فرعون نے یوسف کو کہا کہ اپنے بھائیوں کو کہہ تم یہ کام کرو، اپنے جانور لادو اور جاؤ اور کنعان کی سرزمین میں جا پہنچو اور اپنے باپ اور اپنے گھرانے کو لو اور مجھ پاس آؤ اور میں تم کو مصر کی سرزمین کی اچھی چیزیں دونگا اور تم اس سرزمین کے تحائف کھاؤ گے۔ اب تجھے حکم ملا تو اُن کو کہہ تم یہ کرو کہ اپنے لڑکوں اور اپنی جوروؤں کے لیے مصر کی زمین سے گاڑیاں لے جاؤ اور اپنے باپ کو لے آؤ اور اپنے اسباب کا کچھ افسوس نہ کرو کیونکہ مصر کی ساری زمین کی خوشی تمہارے لیے ہے۔ اور اسرائیل کے فرزندوں نے یہی کیا .... اور یعقوب اپنی سب نسل سمیت مصر میں آیا، وہ اپنے بیٹوں اور اپنے بیٹوں کے بیٹوں کو جو اُس کے ساتھ تھے اور اپنی بیٹیوں اور اپنے بیٹوں کی بیٹیوں کو اور اپنی سب نسل کو اپنے ساتھ مصر میں لایا .... سو وہ سب جو یعقوب کے گھرانے کے تھے اور مصر میں آئے ستر جانیں تھیں۔"[۱]

---

[۱] پیدائش باب ۴۵۔ آیات ۱۶-۲۰ ۔ و باب ۴۶۔ آیت ۷، ۲۷۔

جب حضرت یوسف کو اطلاع ہوئی کہ اُن کے والد خاندان سمیت شہر کے قریب پہنچ گئے تو وہ فوراً استقبال کے لیے باہر نکلے۔ حضرت یعقوب نے جب مدت دراز کے بچھڑے ہوئے لختِ جگر کو دیکھا تو سینہ سے چمٹا لیا اور جب یہ مسرت افزا اور رقت آمیز ملاقات ہو چکی تو حضرت یوسف نے والد سے عرض کیا کہ اب آپ عزت و احترام اور امن و حفاظت کے ساتھ شہر میں تشریف لے چلیں۔

اس وقت مصر کا دار السلطنت رعمسیس تھا اور وہ "جشن کا شہر" کہلاتا تھا۔ حضرت یوسف، والد ماجد اور تمام خاندان کو بڑے کروفر کے ساتھ شاہی سواریوں میں بٹھا کر شہر میں لائے، اور شاہی محل میں اُتارا۔

جب ان تمام باتوں سے فراغت پائی تو اب ارادہ کیا کہ دربار منعقد کریں تاکہ مصریوں کا بھی بزرگ باپ اور خاندان سے تعارف ہو جائے۔ اور تمام درباری اُن کے عزت و احترام سے آگاہ ہو جائیں، دربار منعقد ہوا، تمام درباری اپنی مقررہ نشستوں پر بیٹھ گئے، یوسف کے حکم سے اُن کے والدین[1] کو تختِ شاہی پر ہی جگہ دی گئی اور باقی تمام خاندان نے حسب مراتب نیچے جگہ پائی، جب یہ سب انتظامات مکمل ہو گئے تب حضرت یوسف شاہی محل سے نکل کر تختِ شاہی پر جلوہ افروز ہوئے، اُسی وقت تمام درباری "حکومت کے دستور کے مطابق" تخت کے سامنے تعظیم کے لیے سجدہ میں گر پڑے۔ موجودہ صورت کو دیکھ کر تمام خاندانِ یوسف نے بھی یہی عمل کیا[2]۔ یہ دیکھ کر حضرت یوسف کو فوراً اپنے بچپنے کا خواب یاد آگیا، اور اپنے والد سے کہنے لگے۔

وقال یٰابت ھٰذا تاویل رؤیای	اور یوسف نے کہا: اے باپ یہ ہے تعبیر اُس خواب کی
من قبل قد جعلھا ربی حقا و	جو مدت ہوئی میں نے دیکھا تھا۔ میرے پروردگار نے اُسے

---

[1] حضرت یوسف کی حقیقی والدہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ [2] تعظیم کا یہ طریقہ انبیاء سابقین میں شاید جائز رہا ہو، اگرچہ مجھے اس میں بھی شک ہے اور میرے نزدیک اس آیت کی دوسری تفسیر ہے جس کو میں نے اس جگہ قصداً ذکر نہیں کیا، تاہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قسم کی تعظیم کو اپنی اُمت کے لیے حرام قرار دیا ہے اور اس کو صرف ذاتِ الٰہی کے لیے ہی مخصوص بتایا ہے۔ (ترمذی و

قد احسن بی اذ اخرجنی من	سچ ثابت کر دیا، یہ اُسی کا احسان ہے کہ مجھے قید سے رہائی
السجن وجاء بکم من البدو	دی تم سب کو صحرا سے نکال کر میرے پاس پہنچا دیا اور یہ
من بعد ان نزغ الشیطن	سب کچھ اس کے بعد ہوا کہ شیطان نے مجھ میں اور میرے
بینی وبین اخوتی ان ربی	بھائیوں میں اختلاف ڈال دیا تھا۔ بلاشبہ میرا پروردگار
لطیف لما یشاء انہ ھو العلیم	اُن باتوں کے لیے جو وہ کرنی چاہے بہتر تدبیر کرنے والا ہے کہ وہ
الحکیم ۔	سب کچھ جاننے والا اور (اپنے کاموں میں) حکمت والا ہے

اور جبکہ یہ تمام واقعات ایک عجیب وغریب ترتیب سے وقوع میں آئے اور قدم قدم پر اللہ تعالیٰ کی کرشمہ سنجیوں اور چارہ سازیوں کے بے نظیر مظاہر پیش آتے رہے تو ان تمام آغاز و انجام کے اس حُسن خاتمہ کو دیکھ کر یوسف (علیہ السلام) بے اختیار ہو گئے اور خدا کی جناب میں شکر و دعا کا اس طرح اظہار فرمانے لگے ۔

ربّ قد اٰتیتنی من الملك و	اے پروردگار تو نے مجھے حکومت عطا فرمائی، اور باتوں کا مطلب
علمتنی من تاویل الاحادیث	اور نتیجہ نکالنا تعلیم فرمایا اے آسمان اور زمین کے بنانے والے تو
فاطر السمٰوٰت والارض انت	ہی میرا کارساز ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ تو یہ بھی کیجیو
ولیّ فی الدّنیا والاخرۃ توفّنی	کہ دنیا سے جاؤں تو تیری فرمانبرداری کی حالت میں جاؤں
مسلماً والحقنی بالصّٰلحین	اور اُن لوگوں میں داخل ہو جاؤں جو تیرے نیک بندے ہیں

توراۃ میں ہے کہ اس واقعہ کے بعد حضرت یوسف (علیہ السلام) کا تمام خاندان مصر ہی میں آباد ہو گیا، کیونکہ فرعون نے حضرت یوسف (علیہ السلام) سے اصرار کے ساتھ یہ کہا کہ تم اپنے خاندان کو مصر ہی میں آباد کرو، میں اُن کو بہت عمدہ زمین دونگا اور ہر قسم کی اُن کی عزت کرونگا۔ یہ دیکھ کر حضرت یوسف (علیہ السلام) نے اپنے والد بزرگوار اور خاندان کے دوسرے افراد کو یہ سمجھا دیا

کہ فرعون جب اُن سے مصر میں رہنے کی درخواست کرتے ہوئے زمین اور مقام کے انتخاب کے لیے کہے تو تم فلاں حصۂ زمین طلب کرنا، اور کہنا کہ چونکہ ہم قبائلی زندگی کے عادی اور مویشی چرانے کا شوق رکھتے ہیں اس لیے ہم عام شہری زندگی سے علیحدگی پسند کرتے ہیں، چنانچہ فرعون نے خاندان یوسف کو وہ سرزمین بطور جاگیر بخش دی اور اس طرح بنی اسرائیل سرزمینِ مصر میں آباد ہو گئے۔

اور فرعون نے یوسف کو کہا کہ اپنے بھائیوں کو کہہ تم یہ کام کرو، اپنے جانور لاد دو اور جاؤ اور کنعان کی سرزمین میں جا پہنچو اور اپنے باپ اور اپنے گھرانے کو لو اور مجھ پاس آؤ، اور میں تم کو مصر کی سرزمین کی اچھی چیزیں دونگا اور تم اس زمین کے تحائف کھاؤ گے، اب تجھے حکم ملا کہ تو اُن کو کہے کہ تم یہ کرو کہ اپنے لڑکوں اور اپنی جوروؤں کے لیے مصر کی زمین سی گاڑیاں لیجاؤ اور اپنے باپ کو لے آؤ اور اپنے اسباب کا کچھ فکر نہ کرو کیونکہ مصر کی ساری زمین کی خوشی تمہارے لیے ہے اور اسرائیل کے فرزندوں نے یونہی کیا[۱]۔

. . . .

اور یوں ہوگا کہ جب فرعون تم کو بلائے اور کہے کہ تمہارا پیشہ کیا ہے؟ تو تم کہیو کہ تیرے غلام جوانی سے لے کے اب تک چوپانی کرتے رہے ہیں۔ کیا ہم اور کیا ہمارے آبا، تا کہ تم جشن کی زمین میں رہو اس لیے کہ مصریوں کو ہر ایک چوپان سے نفرت ہے[۲]۔

حضرت یوسف (علیہ السلام) کا مطلب یہ تھا کہ اس طرح مصریوں سے الگ رہنے سے بنی اسرائیل اپنی مذہبی زندگی پر قائم، مصری بُت پرستی سے متنفر، اور مصری بداخلاقی اور مبتذل شہری عادات و خصائل سے محفوظ رہینگے، اور اپنی شجاعانہ بدویانہ زندگی کو کبھی نہ بھولینگے۔

وفات: بہر حال حضرت یوسف (علیہ السلام) نے اپنی زندگی کے طویل حصۂ عمر کو مصر ہی میں گذارا اور جب اُنکی

[۱] پیدائش باب ۴۶ آیات ۱۶-۱۹ [۲] پیدائش باب ۴۶ آیات ۳۲-۳۴

عمر ایک سو دس سال کو پہنچی تو اُن کی وفات ہوگئی، حضرت یوسف (علیہ السلام) نے اپنی وفات سے پہلے اپنے خاندان والوں سے یہ عہد لیا کہ وہ مجھ کو مصر کی زمین میں نہ دفن کرینگے بلکہ جب خدا کا یہ وعدہ پورا ہو کہ بنی اسرائیل دوبارہ فلسطین یعنی آباء و اجداد کی سرزمین میں واپس ہوں تو میری ہڈیاں ہیں لیجا کر سپردِ خاک کرنا، چنانچہ اُنہوں نے وعدہ کیا اور جب حضرت یوسف کا انتقال ہوگیا تو اُن کو حنوط (ممی) کر کے تابوت میں محفوظ رکھ دیا اور جب موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں بنی اسرائیل مصر سے نکلے تو اُس تابوت کو بھی ساتھ لیتے گئے اور آباؤ اجداد کی سرزمین ہی میں لیجا کر سپردِ خاک کر دیا۔

توراۃ کا بیان ہے :-

اور یوسف اور اُس کے باپ کے گھرانے نے مصر میں سکونت کی اور یوسف ایک سو دس برس جیا اور یوسف نے افرائیم کے لڑکے جو تیسری پشت تھے دیکھے اور منسّی کے بیٹے مکیر کے بیٹے بھی یوسف کے گھٹنوں پر پالے گئے اور یوسف نے اپنے بھائیوں سے کہا میں مرتا ہوں اور خدا یقیناً تم کو یاد کریگا اور تم کو اس سرزمین سے باہر اُس زمین میں جس کی بابت اُس نے ابراہام اور اضحٰق اور یعقوب سے قسم کی ہے لیجائیگا اور یوسف نے بنی اسرائیل سے قسم لے کے کہا خدا یقیناً تم کو یاد کریگا اور تم میری ہڈیوں کو یہاں سے لیجائیو، سو یوسف ایک سو دس برس کا بوڑھا ہو کے مرگیا، اور اُنہوں نے اُس میں خوشبو بھری اور اُسے مصر میں صندوق میں رکھا۔[۱] ....

اور موسیٰ نے یوسف کی ہڈیاں ساتھ لیں کیونکہ اُس نے بنی اسرائیل کو تاکیداً قسم دے کر کہا تھا کہ خدا یقیناً تمہاری خبر گیری کریگا تم یہاں سے میری ہڈیاں اپنے ساتھ لیجائیو۔[۲]

اہم اخلاقی مسائل	حضرت یوسف (علیہ السلام) کا یہ عجیب و غریب قصہ اربابِ بصیرت کے لیے

[۱] پیدائش باب ۵۰ آیات ۲۲-۲۶ (۲) خروج باب ۱۳، آیات ۱۹

اپنی آغوش میں نہایت اہم اخلاقی مسائل رکھتا ہے۔ دراصل یہ قصہ ایک واقعہ نہیں ہے بلکہ فضائلِ اخلاق کی ایسی زریں داستان ہے جس کا ہر پہلو موعظت و بصیرت کے جواہر سے لبریز ہے۔

قوّتِ ایمانی، استقامت، ضبطِ نفس، صبر، شکر، عفت، دیانت و امانت، عفو و درگذر جذبۂ تبلیغ و اعلاء کلمۃ اللہ کا عشق، اور صلاح و تقویٰ جیسے اخلاقِ فاضلہ اور صفاتِ کاملہ کا ایک نادر سلسلۃ الذہب ہے جو اس قصہ کے ہر نقش میں منقش نظر آتا ہے مگر ان میں سے یہ چند امور خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

(۱) اگر کسی شخص کی ذاتی سرشت عمدہ ہو اور اُس کا ماحول بھی پاک، مقدس اور لطیف ہو تو اُس شخص کی زندگی اخلاقِ کریمانہ میں نمایاں اور صفاتِ عالیہ میں ممتاز ہو گی اور وہ ہر قسم کے شرف و مجد کا حامل ہو گا۔

حضرت یوسف (علیہ السلام) کی مقدس زندگی اس کی بہترین مثال ہے۔ وہ یعقوبؑ، اسحٰقؑ، اور ابراہیم علیہم السلام جیسے جلیل القدر نبیوں اور پیغمبروں کی اولاد تھے اس لیے نبوت و رسالت کے گہوارہ میں نشو و نما پائی اور خانوادۂ نبوت کے ماحول میں تربیت حاصل کی۔ ذاتی نیک نہادی اور فطری پاکی نے جب ایسے لطیف ماحول کو دیکھا تو تمام فضائلؒ اوصافِ حمیدہ چمک اُٹھے، اور بچپن، جوانی، اور کہولت کی زندگی کے تمام گوشے تقویٰ، عفت، صبر و استقامت دیانت، اور عشقِ الٰہی کے ایسے روشن مظہر بن گئے کہ عقلِ انسانی اس مجموعۂ کمالات ہستی کو دیکھ کر محوِ حیرت ہو جاتی ہے

(۲) اگر کسی شخص میں ایمان باللہ مستقیم و مستحکم ہو اور اُس پر اُس کا یقین راسخ اور مضبوط ہو تو پھر اس راہ کی تمام صعوبتیں اور مشکلات اُس پر آسان بلکہ آسان تر ہو جاتی ہیں اور دعوتِ حق کے بعد تمام خطرات اور مصائب ہیچ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ حضرت یوسف کی تمام زندگی میں یہ بات

نمایاں نظر آتی ہے۔

(۳) ابتلاء و آزمائش، مصیبت و ہلاکت کی شکل میں ہو یا دولت و ثروت اور خواہشاتِ نفسانی کے خوبصورت اسباب کی صورت میں، ہر حالت میں انسان کو خدائے تعالیٰ کی جانب ہی رجوع کرنا چاہیے اور اُسی سے التجاء کرنی چاہیے کہ وہ امرِ حق پر ثابت قدم رکھے اور استقامت بخشے عزیز کی بیوی اور حسین مصری عورتوں کی ترغیبات اور اُن کی مرضیات پوری نہ کرنے پر قید کی دھمکیاں، اور پھر قید و بند کے مصائب، ان تمام حالات میں حضرت یوسف کا اعتماد اور اُن کی دعاؤں اور التجاؤں کا مرکز صرف ایک ہی ہستی سے وابستہ نظر آتا ہے، وہ نہ عزیز مصر کے سامنے عرض رساں نظر آتے ہیں نہ فرعون کے سامنے ملتجی، وہ نہ اُن خوبرویانِ مصر اور عشوہ طرازانِ حسن و جمال سے جی لگاتے ہیں اور نہ اپنے مربی کی خوبرو بیوی سے، بلکہ ہر موقعہ پر خدائے تعالیٰ ہی سے مدد کے طالب نظر آتے ہیں۔

"رب السجن احب الیّ مِمّا یدعوننی الیہ۔ معاذ اللہ انہ ربی احسن مثوای"

(۴) جب خدائے تعالیٰ کی محبت اور اُس کا عشق قلب کی گہرائیوں میں اُتر جاتا ہے تو پھر انسان کی زندگی کا تمام تر مقصد وہی بن جاتا ہے اور اُس کے دین کی دعوت و تبلیغ کا عشق ہر وقت رگ و پے میں دوڑتا رہتا ہے چنانچہ قید خانہ کی سخت مصیبت کے وقت اپنے رفیقوں سے سب سے پہلا کلام یوسف (علیہ السلام) کا یہی تھا "یا صاحبی السجن ءارباب متفرقون خیر ام اللہ الواحد القہار"

(۵) دیانت و امانت ایک ایسی نعمت ہے کہ اس کو انسان کی دینی و دنیوی سعادتوں کی کلید کہنا چاہیے۔ عزیز مصر کے یہاں یوسف علیہ السلام جس طرح داخل ہوئے تھے وہ واقعہ کی تفصیلات سے معلوم ہو چکا ہے، یہ حضرت یوسف کی دیانت و امانت ہی کا نتیجہ تھا کہ پہلے وہ

عزیزِ مصر کی نظروں میں بلند و باوقار اور محبوب بنے پھر مصر کی حکومت کے مالک ہو گئے۔

(۶) خود اعتمادی، انسان کے بلند اوصاف میں سے ایک بڑا وصف ہے، خدائے تعالیٰ نے جس شخص کو یہ دولت بخشدی ہے وہی دنیا کے مصائب و آلام سے گذر کر دنیوی و دینی رفعت و بلندی حاصل کر سکتا ہے۔

خود اعتمادی کی مختلف اقسام میں سے ایک قسم "عزتِ نفس" بھی ہے، جو شخص خودداری اور عزتِ نفس سے محروم ہے وہ انسان نہیں ایک مضغۂ گوشت ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی عزتِ نفس کے تحفظ کا یہ عالم ہے کہ برسوں کے بعد جب قید خانہ سے رہائی کا حکم ملتا، اور بادشاہِ وقت کا پیغام سربلندی حاصل ہوتا ہے تو مسرت و شادمانی کے ساتھ فوراً اُس کو لبیک نہیں کہتے بلکہ صاف انکار کر دیتے ہیں کہ میں اُس وقت تک قید خانہ سے باہر نہیں آؤنگا تا وقتیکہ یہ فیصلہ نہ ہو جائے کہ مصری عورتوں نے مکر و فریب کا جس قسم کا معاملہ میرے ساتھ کیا تھا اُس کی اصل حقیقت کیا ہے؟ "فلمّا جاءہ الرسول قال ارجع الی ربك فاسئله ما بال النسوة اللّٰتی قطعن ایدیهن"

(۷) صبر ایک عظیم الشان "خلق" ہے، اور بہت سی برائیوں کے لیے سپر اور ڈھال کا کام دیتا ہے۔ قرآنِ حکیم میں ستر سے زیادہ مقامات پر اس کی فضیلت کا اعلان کیا گیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے بہت سے مراتبِ علیا اور درجاتِ رفیعہ کا مدار "اسی فضیلت" پر رکھا ہے۔

وجعلنا منهم ائمة يهدون	اور ہم نے اُن میں سے مقتدا بنایا جو ہمارے احکام کے ہادی
بامرنا لمّا صبروا۔	بنے جبکہ وہ فضیلتِ صبر سے مزین ثابت ہوئے۔
وتمت كلمة ربك الحسنىٰ علىٰ	اور پورا ہوا تیرے رب کا نیک کلمہ بنی اسرائیل پر اس وجہ
بنی اسرائیل بما صبروا۔ (اعراف)	سے کہ وہ صابر رہے۔

وبشر الصّٰبرین الذین اذا اصابتهم مصیبة قالوا انا للّٰه وانا الیه راجعون ۔ (بقرہ) — اور بشارت دیدو اُن صبر کرنے والوں کو کہ جب اُن پر کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے تو کہہ اُٹھتے ہیں "بیشک ہم اللہ ہی کے لیے ہی ہیں اور بیشک ہم اُسی جانب لوٹ جانے والے ہیں۔

فاصبر کما صبر اولوا العزم من الرسل ۔ (احقاف) — (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم اُسی طرح صبر کرو جس طرح بلند عزمیت والے پیغمبروں نے صبر کیا۔

واستعینوا بالصبر والصلوٰة (بقرہ) اور مدد چاہو صبر اور نماز کے ذریعہ سے ۔

وقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم الصبر نصف الایمان (بیہقی فی شعب الایمان) — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "صبر نصف ایمان ہے"۔

وسئل عن الایمان فقال الصبر والسماحة ۔ (بیہقی) — نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک مرتبہ ایمان کی تعریف پوچھی گئی تو آپ نے فرمایا "صبر اور دریا دلی"

حقیقت میں "صبر" ایک ایسی صفت کا نام ہے جس کے ذریعہ سے انسان بُرائیوں سے باز رہ سکے اور نفس اُن کی طرف اقدام سے رُک جائے۔ اس لیے یہ صرف انسان ہی کا خاصہ ہے اور تمام حیوانات سے اُس کو امتیاز بخشتا ہے۔

صبر کی مختلف اقسام ہیں یا یوں کہیے کہ اُن اشیاء کی نسبت کے لحاظ سے جن کی جانب "صبر" کو منسوب کیا جاتا ہے وہ مختلف ناموں سے موسوم ہے۔

پس اگر پیٹ اور شرمگاہ کی خواہشات کے مقابلہ میں صبر ہے تو اس کا نام "عفت" ہے۔ اور اگر مصائب پر صبر ہے تو اُس کو "صبر" ہی کہتے ہیں اور اُس کی ضد کا نام "جزع فزع" ہے۔ اور اگر ثروت و دولت کی بہتات کی حالت میں صبر ہے تو اُس کا نام "ضبطِ نفس" ہے اور اس کی ضد کو "بطر" (چھچھورپن) کہتے ہیں۔ اور اگر میدانِ جنگ اور اسی قسم کے مہلک حالات

پر صبر ہے تو وہ "شجاعت" کہلاتا ہے اور اس کی ضد کا نام "جُبن" (بزدلی) ہے اور اگر غیظ و غضب کے حالات پر صبر ہے تو اُس کو "حلم" کہتے ہیں اور اس کی ضد کو "تذمّر" (بے قابو) کہا جاتا ہے۔ اور اگر حوادثاتِ زمانہ پر صبر ہے تو اُس کا نام "سِعَۃِ صدر" (کشادہ دلی اور حوصلہ مندی) ہے۔ اور اس کی مخالف صفت کو "ضجر" (تنگ دلی اور بے صبری) کہتے ہیں۔ اور اگر دوسروں کے پوشیدہ رازوں پر صبر ہے تو اس کا نام "کتمانِ سر" (پردہ پوشی) ہے۔ اور اگر بقدرِ کفاف معیشت پر صبر ہے تو اس کو "قناعت" کہتے ہیں۔ اور اگر ہر قسم کی عیش پسندی کے مقابلہ میں صبر ہے تو اُس کا نام "زہد" ہے۔

صبر کی ان تمام اقسام کا بیان جامع اور ایجاز و اعجاز کے ساتھ قرآنِ عزیز کی اس آیت میں کیا گیا ہے۔

والصّابرین فی البأساءِ والضرّاءِ	اور ہر قسم کی مصیبتوں اور مضرتوں اور میدانِ جنگ کی
وحین البأس اولٰئك الذین	ہولناکیوں میں صبر کرنے والے ہی دراصل صادق
صدقوا واولٰئك هم المتقون ۔	ہیں اور یہی متقی و پرہیزگار ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف (علیہ السلام) کو صبر و رضا کے ان تمام مراحل میں وہ کمال عطا فرمایا تھا جس کو "مثلِ اعلیٰ" کہا جاتا ہے۔ مثلاً

(۱) برادرانِ یوسف کی ایذا رسانیوں پر صبر (۲) آزاد ہونے کے باوجود غلام بنائے جانے اور ایسے ملک اور ایسی قوم کے ہاتھوں میں فروخت ہو جانے پر صبر جو معاشرت و معیشت میں بھی مخالف اور دین و ایمان میں بھی دشمن تھی (۳) عزیزِ مصر کی بیوی اور مصری عورتوں کی پُر فریب ترغیبات پر صبر (۴) قید خانہ کے مصائب پر صبر (۵) عزیزِ مصر کی تمام دولت و ثروت کے وکیل بن جانے پر صبر یعنی خدا کی شکر گذاری کا اظہار اور شیخی سے پرہیز (۶) مملکتِ

وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْآ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۔ (بقرہ)
اور بشارت دیدو اُن صبر کرنے والوں کو کہ جب اُن پر کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے تو کہہ اُٹھتے ہیں "بیشک ہم اللہ ہی کے لیے ہی ہیں اور بیشک ہم اُسی جانب لوٹ جانے والے ہیں۔

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ ۔ (احقاف)
(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) تم اُسی طرح صبر کرو جس طرح بلند عزمیت والے پیغمبروں نے صبر کیا۔

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ (بقرہ) اور مدد چاہو صبر اور نماز کے ذریعہ سے۔

وَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلصَّبْرُ نِصْفُ الْاِيْمَانِ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "صبر نصف ایمان ہے"۔ (بیہقی فی شعب الایمان)

وَسُئِلَ عَنِ الْاِيْمَانِ فَقَالَ اَلصَّبْرُ وَالسَّمَاحَةُ ۔ (بیہقی)
نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک مرتبہ ایمان کی تعریف پوچھی گئی تو آپ نے فرمایا "صبر اور دریا دلی"

حقیقت میں "صبر" ایک ایسی صفت کا نام ہے جس کے ذریعہ سے انسان بُرائیوں سے باز رہ سکے اور نفس اُن کی طرف اقدام سے رُک جائے۔ اس لیے یہ صرف انسان ہی کا خاصہ ہے اور تمام حیوانات سے اُس کو امتیاز بخشتا ہے۔

صبر کی مختلف اقسام ہیں یا یوں کہیے کہ اُن اشیاء کی نسبت کے لحاظ سے جن کی جانب "صبر" کو منسوب کیا جاتا ہے وہ مختلف ناموں سے موسوم ہے۔

پس اگر پیٹ اور شرمگاہ کی خواہشات کے مقابلہ میں صبر ہے تو اس کا نام "عفت" ہے۔ اور اگر مصائب پر صبر ہے تو اُس کو "صبر" ہی کہتے ہیں اور اُس کی ضد کا نام "جزع فزع" ہے۔ اور اگر ثروت و دولت کی بہتات کی حالت میں صبر ہے تو اُس کا نام "ضبطِ نفس" ہے اور اس کی ضد کو "بطر" (چھچھورپن) کہتے ہیں۔ اور اگر میدانِ جنگ اور اسی قسم کے مہلک حالات

پر صبر ہے تو وہ "شجاعت" کہلاتا ہے اور اس کی ضد کا نام "جُبن" (بزدلی) ہے اور اگر غیظ و غضب کے حالات پر صبر ہے تو اُس کو "حلم" کہتے ہیں اور اس کی ضد کو "تذمّر" (بے قابو) کہا جاتا ہے۔ اور اگر حوادثاتِ زمانہ پر صبر ہے تو اُس کا نام "سِعَۃِ صدر" (کشادہ دلی اور حوصلہ مندی) ہے۔ اور اس کی مخالف صفت کو "ضَجَر" (تنگ دلی اور بے صبری) کہتے ہیں۔ اور اگر دوسروں کے پوشیدہ رازوں پر صبر ہے تو اس کا نام "کتمانِ سر" (پردہ پوشی) ہے۔ اور اگر بقدرِ کفاف معیشت پر صبر ہے تو اس کو "قناعت" کہتے ہیں۔ اور اگر ہر قسم کی عیش پسندی کے مقابلہ میں صبر ہے تو اُس کا نام "زہد" ہے۔

صبر کی ان تمام اقسام کا بیان جامع اور ایجاز و اعجاز کے ساتھ قرآنِ عزیز کی اس آیت میں کیا گیا ہے۔

والصّابرين في البأساء والضرّاء وحين البأس اولٰئك الذين صدقوا واولٰئك هم المتقون ۔

اور ہر قسم کی مصیبتوں اور مضرتوں اور میدانِ جنگ کی ہولناکیوں میں صبر کرنے والے یہی دراصل صادق ہیں اور یہی متقی و پرہیزگار ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف (علیہ السلام) کو صبر و رضا کے ان تمام مراحل میں وہ کمال عطا فرمایا تھا جس کو "مثلِ اعلیٰ" کہا جاتا ہے۔ مثلاً

(۱) برادرانِ یوسف کی ایذا رسانیوں پر صبر (۲) آزاد ہونے کے باوجود غلام بنائے جانے اور ایسے ملک اور ایسی قوم کے ہاتھوں میں فروخت ہو جانے پر صبر جو معاشرت و معیشت میں بھی مخالف اور دین و ایمان میں بھی دشمن تھی (۳) عزیزِ مصر کی بیوی اور مصری عورتوں کی پُرفریب ترغیبات پر صبر (۴) قید خانہ کے مصائب پر صبر (۵) عزیزِ مصر کی تمام دولت و ثروت کے وکیل بن جانے پر صبر یعنی خدا کی شکر گذاری کا اظہار اور شیخی سے پرہیز (۶) مملکتِ

مصر کے حاکمِ مطلق ہونے پر صبر یعنی ظلم، کبر، شیخی سے پرہیز (۷) ہر دو حالتوں میں قناعت و زہد کی زندگی کو ترجیح (۸) ایذا رسا بھائیوں کی ندامت کے وقت اختیارِ صبر یعنی وسعتِ قلب کا ثبوت "لا تثریب علیکم الیوم یغفر اللہ لکم"

(۸) اخلاقِ حسنہ میں "شکر" بھی بہترین خلق ہے اس لیے کہ یہ اخلاقِ الٰہیہ میں سے بہت بلند خُلق ہے۔ قرآنِ عزیز میں ہے "واللہ شکور حلیم" انسانی اوصاف میں "شکر" ایسی صفت کا نام ہے جس کے ذریعہ منعمِ حقیقی کی نعمت کا اعتراف کیا جائے، اور اُس پر مسرت و شادمانی کا اظہار ہو، اور اُس کو محسن و منعم کے مرغوب اور پسندیدہ طریقہ پر استعمال کیا جائے۔ قرآنِ عزیز میں ہے:

فاذکرونی اذکرکم واشکروا لی ولا تکفرون۔ (بقرہ) — پس تم مجھ کو یاد کرو میں تم کو یاد کرونگا۔ اور تم میرا شکر کرو، اور ناشکری نہ کرو۔

ما یفعل اللہ بعذابکم ان شکرتم وآمنتم (النساء) — اللہ تم پر عذاب نہ لائیگا، اگر تم اُس کے شکر گذار اور اُس پر ایمان والے رہے۔

ولئن شکرتم لازیدنکم (ابراہیم) — اور اگر تم شکر گذار رہو تو ہم (تمہاری نعمتوں میں) اضافہ کرتے رہینگے۔

مگر افسوس یہ ہے کہ انسانی دنیا میں حقیقی شکر گذار اور سپاس گذار بہت ہی کم ہیں۔

وقلیل من عبادی الشکور (سبا) — اور میرے بندوں میں حقیقی شکر گذار بہت کم ہیں۔

لیکن حضرت یوسف (علیہ السلام) کو اللہ تعالیٰ نے یہ صفت بھی بدرجۂ کمال عطا فرمائی تھی، اُن کی زندگی کے حالات پڑھو اور اندازہ کرو کہ کس طرح جگہ جگہ شکر اور سپاس گذاری کا منظر نمایاں نظر آتا ہے خصوصاً ختمِ قصہ پر اُن کی جو دعا مذکور ہے وہ اُن کے اس وصف کو اور زیادہ نمایاں کرتی ہے۔

رب قد اٰتیتنی من الملک وعلّمتنی — اے پروردگار بلاشبہ تونے مجھ کو حکومت بخشی اور باتوں کے فیصلہ

من تاویل الاحادیث فاطر السمٰوٰت والارض انت ولی فی الدنیا والاخرۃ توفنی مسلما والحقنی بالصّٰلحین۔ (یوسف)

کی سمجھ بوجھ عطا فرمائی، اے آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے تو ہی دنیا اور آخرت میں میرا مددگار ہے، تو مجھ کو اپنی اطاعت پر موت دیجیو اور صالحین کے زمرہ میں شامل کر لیجیو۔

(۹) حسد اور بغض کا انجام حاسد اور بغض کرنے والے کے حق ہی میں مضر ہوتا ہے اور اگرچہ کبھی محسود و مبغوض کو بھی دنیوی نقصان پہنچ جانا ممکن ہے لیکن حاسد کسی حال میں بھی فلاح نہیں پاتا، اور خسر الدنیا والآخرۃ کا مصداق ہی رہتا ہے۔ الّا یہ کہ تائب ہو جائے اور حاسدانہ زندگی کو ترک کر دے۔

برادرانِ یوسف کے واقعات ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں اور ان کا انجام بھی مگر چشمِ بصیرت شرط ہے۔

(۱۰) صداقت، دیانت، امانت، صبر اور شکر جیسے صفاتِ عالیہ سے متصف زندگی ہی حقیقی اور کامیاب زندگی ہے، اور اگر انسان میں یہ اوصاف نہیں پائے جاتے تو پھر وہ انسان نہیں بلکہ حیوان ہے بلکہ اُس سے بھی بدتر۔

اولٰئک کالانعام بل هم اضل۔ (بقرہ)

(یہ تمرد و سرکش انسان) چوپاؤں جیسے ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گئے گذرے۔

(۱۱) حضرتِ یوسف کے اخلاقِ کریمانہ اور صفاتِ عالیہ کی مدحت و منقبت میں سب سے اہم وہ جملہ ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے حق میں فرمایا الکریم بن الکریم بن الکریم بن الکریم یوسف بن یعقوب بن اسحٰق بن ابراہیم یعنی وہ سلسلۂ نسب جو چار پشتوں سے کرامتِ نبوت سے مستفیض ہے یوسف بن یعقوب بن اسحٰق بن ابراہیم کا سلسلہ ہے۔ اور ایک روایت میں ہے۔ اکرم الناس یوسف نبی اللہ بن نبی اللہ بن نبی اللہ بن خلیل اللہ (بخاری کتاب التفسیر)

حضرت شعیب (علیہ السلام)

حضرت شعیب کا ذکر قرآنِ عزیز میں - قوم شعیب - مدین و اصحابِ ایکہ، زمانہ بعثت، دعوتِ حق - قوم کی سرکشی - سرکشی کا انجام - بصائر و عبر -

حضرت شعیبؑ کا ذکر قرآن میں

قرآنِ حکیم میں حضرت شعیب اور اُن کی قوم کا تذکرہ اعراف، ہود اور شعراء میں قدرے تفصیل سے کیا گیا ہے اور حجر اور عنکبوت میں مختصر ہے، اِن سورتوں میں حجر کے علاوہ حضرت شعیب کا نام دس جگہ مذکور ہے - ذیل کا نقشہ اس کی تصدیق کرتا ہے -

سورة	آیات	شمار
اعراف	۸۵ - ۸۸ - ۹۰ - ۹۲	۴
ہود	۸۴ - ۸۷ - ۹۰ - ۹۵	۴
شعراء	۱۷۷	۱
عنکبوت	۳۶	۱
		۱۰

قوم شعیب

حضرت شعیب (علیہ السلام) کی بعثت "مدین" یا "مدیان" میں ہوئی تھی، مدین کسی مقام کا نام نہیں ہے بلکہ "قبیلہ"[1] کا نام ہے - یہ قبیلہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے بیٹے مدین کی نسل سے تھا" جو اُن کی تیسری بیوی قطورا سے پیدا ہوا - اس لیے حضرت ابراہیم کا یہ خاندان بنی قطورا کہلاتا ہے -

"مدین" اپنے اہل و عیال کے ساتھ اپنے سوتیلے بھائی حضرت اسمٰعیل (علیہ السلام) کے پہلو ہی میں حجاز میں آباد ہو گیا تھا، یہی خاندان آگے چل کر ایک بڑا قبیلہ بن گیا، اور شعیب علیہ السلام

[1] اسی قبیلہ کے نام پر بستی کا بھی نام "مدین" مشہور ہوا -

بھی چونکہ اسی نسل اور اسی قبیلہ سے تھے اس لیے اُن کی بعثت کے بعد یہ "قومِ شعیب" کہلایا۔

مدین یا اصحاب ایکہ

یہ قبیلہ کس مقام پر آباد تھا؟ اس کے متعلق عبدالوہاب نجار کہتے ہیں کہ یہ حجاز میں شام کے متصل ایسی جگہ آباد تھا کہ جس کا عرض البلد افریقہ کے جنوبی صحرا کے عرض البلد کے مطابق پڑتا ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ شام کے متصل معان کے حصۂ زمین پر آباد تھا۔

قرآنِ عزیز نے اس قبیلہ کی آبادی کے متعلق ہم کو دو باتوں سے تعارف کرایا ہے ایک یہ کہ وہ "امام مبین" پر آباد تھا۔

وانهما لبامام مبين ۔ اور لوط کی قوم اور مدین دونوں بڑی شاہراہ پر آباد تھے۔

عرب کے جغرافیہ میں جو شاہراہ حجاز کے تاجر قافلوں کو شام فلسطین، یمن بلکہ مصر تک لیجاتی تھی اور بحرِ قلزم کے مشرقی کنارہ سے ہو کر گذرتی تھی قرآن اُسی کو "امامِ مبین" (کھلی اور صاف شاہراہ) کہتا ہے، کیونکہ صیف (گرمی) اور شِتاء (سردی) دونوں زمانوں میں قریشی قافلوں کے لیے یہ متعارف اور بڑی تجارتی سڑک تھی جس کا سلسلہ برّی مسافت کے ساتھ بحری تجارت سے بھی ڈانڈے مِلا دیتا تھا۔

دوسرے یہ کہ وہ "اصحابِ ایکہ" (جھنڈ والے) تھے۔ عربی میں "ایکہ" اُن سرسبز و شاداب جھاڑیوں کو کہتے ہیں جو ہرے بھرے درختوں کی کثرت کی وجہ سے جنگلوں اور بنوں میں اُگی رہتی ہیں، اور جھاڑے کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔

اِن دونوں باتوں کے جان لینے کے بعد مدین کی آبادی کا پتہ آسانی سے معلوم ہو سکتا ہے۔ وہ یہ کہ مدین کا قبیلہ بحرِ قلزم کے مشرقی کنارہ اور عرب کے مغرب شمال میں ایسی جگہ آباد تھا جو شام کے متصل حجاز کا آخری حصہ کہا جا سکتا ہے اور حجاز والوں کو شام فلسطین بلکہ مصر تک جانے میں اُس کے کھنڈر راہ میں پڑتے تھے۔[1]

[1] معجم البلدان جلد ۵ ص ۴۱۸۔

مفسرین اس بارہ میں مختلف ہیں کہ مدین اور اصحابِ ایکہ ایک ہی قبیلہ کے دو نام ہیں یا دو جدا جدا قبیلے ہیں بعض کا خیال ہے کہ دونوں جدا جدا قبیلے ہیں۔ مدین متمدن اور شہری قبیلہ تھا اور "اصحابِ ایکہ" دیہاتی اور بدوی قبیلہ جو جنگل اور بن میں آباد تھا، اس لیے اس کو "بن والا" یا "جنگل والا" کہا گیا۔ اور آیت انھما لبامامٍ مبین" میں "ھما" ضمیر تثنیہ سے یہی دونوں مراد ہیں نہ کہ مدین اور قومِ لوط۔

اور دوسرے مفسرین دونوں کو ایک ہی قرار دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ آب و ہوا کی لطافت، نہروں اور آبشاروں کی کثرت نے اس مقام کو اس قدر شاداب اور پُرفضا بنا دیا تھا، اور یہاں میوؤں، پھلوں، اور خوشبودار پھولوں کے اس قدر باغات اور چمن تھے کہ اگر ایک شخص آبادی سے باہر کھڑے ہو کر نظارہ کرتا تھا تو اُس کو یہ معلوم ہوتا کہ یہ نہایت خوبصورت اور شاداب گھنے درختوں کا ایک بن ہے، اسی وجہ سے قرآنِ عزیز نے اُس کو "ایکہ" کہہ کر تعارف کرایا۔

ان مفسرین میں سے حافظ عماد الدین ابن کثیر کا یہ خیال ہے کہ یہاں "ایکہ" نام کا ایک درخت تھا، اہل قبیلہ چونکہ اس کی پرستش کرتے تھے لہذا اُس کی نسبت سے مدین کو "اصحابِ ایکہ" کہا گیا۔ نیز چونکہ یہ نسبت نسبی نہ تھی بلکہ مذہبی تھی اس لیے جن آیات میں ان کو اس لقب سے یاد کیا گیا ہے اُن میں حضرت شعیب کو "اخوھم" (اُن کا بھائی) یا اسی قسم کے نسبی علاقے سے یاد نہیں کیا، البتہ جن آیات میں قومِ شعیب کو مدین کہہ کر یاد کیا ہے اُن میں حضرت شعیب کو بھی اُن کے نسبی رشتہ میں منسلک ظاہر کیا ہے۔

بہرحال راجح یہی ہے کہ مدین اور اصحابِ ایکہ ایک ہی قبیلہ ہے جو باپ کی نسبت سے مدین کہلایا اور زمین کی طبعی اور جغرافی حیثیت سے "اصحاب ایکہ" کے لقب سے مشہور ہوا۔

زمانۂ بعثت اور ایک غلطی کا ازالہ

عبد الوہاب نجار اپنی کتاب "قصص الانبیاء" میں تحریر فرماتے ہیں کہ

ابو العباس احمد قلقشندی نے صبح الاعشیٰ جلد ۴ ص ۱۶ میں یہ تحریر کیا ہے :۔

ثم ملك بعده ۔یعنی یوثام ۔ابنه	پھر یوثام کے بعد آحاز نے بھی سولہ سال حکومت
أحاز ستة عشرة سنة ایضاً وکانت	کی اور اُس کے اور دمشق کے بادشاہ کے درمیان
الحرب بینه وبین ملك دمشق و	جنگ رہی اور اُسی زمانہ میں حضرت شعیب علیہ
فی زمنه کان شعیب علیه السلام	السلام کی بعثت ہوئی ۔

قلقشندی کی عبارت سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے صدیوں بعد پیدا ہوئے یعنی سات سو برس بعد آٹھویں صدی کے اوائل میں کیونکہ آحاز کی حکومت کا یہی زمانہ تھا۔ حالانکہ یہ بالکل غلط اور خلاف واقعہ ہے۔ اس لیے کہ حضرتِ شعیب (علیہ السلام) حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے بڑے ہیں اور حضرتِ موسیٰ نے حضرت شعیب کا زمانہ پایا ہے یا نہیں یہ شبہ البتہ اختلافی ہے۔

اسی بنا پر قرآنِ عزیز نے سورۂ اعراف میں حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح حضرت لوط اور حضرت شعیب (علیہم السلام) کے ذکر کے بعد فرمایا " ثم بعثنا من بعدھم موسیٰ" اور اسی طرح سورۂ یونس، سورۂ حج، سورۂ ہود اور سورۂ عنکبوت میں بیان کیا گیا۔

تو قلقشندی سے اس جگہ یہ لغزش ہوگئی ہے کہ اُس نے شعیا (علیہ السلام) کی جگہ شعیب (علیہ السلام) تحریر کردیا، بلا شبہ آحاز کی حکومت کا زمانہ شعیا نبی کا زمانہ ہے۔

دعوتِ حق بہرحال شعیب (علیہ السلام) جب اپنی قوم میں مبعوث ہوئے تو اُنہوں نے دیکھا کہ خدا کی نافرمانی اور معصیت کا ارتکاب صرف افراد و احاد میں ہی نہیں پایا جاتا بلکہ ساری قوم گردابِ ہلاکت میں مبتلا ہے اور اپنی بداعمالیوں میں اس قدر سرمست و سرشار رہے کہ ایک لمحہ کے لیے بھی اُن کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے معصیت اور گناہ ہے، بلکہ اپنے اِن

اعمال کو باعثِ فخر سمجھتے ہیں۔

ان کی بہت سی بداخلاقیوں اور نافرمانیوں سے قطع نظر جن قبیح امور نے خصوصیت کے ساتھ اُن میں رواج پالیا تھا وہ یہ تھے۔

(۱) بت پرستی اور مشرکانہ رسوم وعوائد (۲) خرید وفروخت میں پورا لینا اور کم تولنا یعنی دوسرے کو اُس کے حق سے کم دینا اور اپنے لیے حق کے مطابق لینا بلکہ اُس سے زیادہ (۳) تمام معاملات میں کھوٹ اور ڈاکہ زنی۔

قوموں کے عام رواج کے مطابق دراصل ان کی رفاہیت، خوش عیشی، دولت و ثروت کی فراوانی، زمین اور باغوں کی زرخیزی اور شادابی نے اُن کو اس قدر مغرور بنا دیا تھا کہ وہ ان تمام اُمور کو اپنی ذاتی میراث اور اپنا خاندانی ہنر سمجھ بیٹھے تھے۔ اور ایک ساعت کے لیے بھی اُن کے دل میں یہ خطرہ نہیں گذرتا تھا کہ یہ سب کچھ خدائے تعالیٰ کی عطا و بخشش ہے کہ شکرگذار ہوتے اور سرکشی سے باز رہتے۔ غرض اُن کی فارغ البالی نے اُن میں طرح طرح کی بداخلاقیاں اور قسم قسم کے عیوب پیدا کر دیے تھے۔

آخر غیرتِ حق حرکت میں آئی اور سُنت اللہ کے مطابق اُن کو راہِ حق دکھلانے فسق و فجور سے بچانے اور امین و متقی اور با اخلاق بنانے کے لیے اُن ہی میں سے ایک ہستی کو چن لیا اور شرفِ نبوت و رسالت سے نواز کر اُس کو دعوتِ اسلام اور پیغام حق کا امام بنایا یہ ہستی حضرت شعیب علیہ السلام کی ذاتِ گرامی تھی۔

خدا کی توحید۔ اور شرک سے بیزاری کا اعتقاد تو تمام انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کی مشترک بنیاد اور اصل ہے جو حضرت شعیب علیہ السلام کے حصہ میں بھی آئی تھی مگر قوم کی مخصوص بداخلاقیوں پر توجہ دلانے اور اُن کو راہِ راست پر لانے کے لیے اُنھوں نے اس قانون کو بھی اہمیت دی

کہ خرید و فروخت کے معاملہ میں یہ ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ جو جس کا حق ہے وہ پورا پورا اُس کو ملے کہ دنیوی معاملات میں یہی ایک ایسی بنیاد ہے جو متزلزل ہو جانے کے بعد ہر قسم کے ظلم، فسق و فجور، اور مہلک خرابیوں اور بداخلاقیوں کا باعث بنتی ہے۔

الحاصل حضرت شعیب (علیہ السلام) نے بھی اپنی قوم کی بداعمالیوں کو دیکھ کر سخت دُکھ محسوس کیا اور رشد و ہدایت کی تعلیم دیتے ہوئے قوم کو اُن ہی اصول کی طرف بلایا جو انبیاء علیہم السلام کی دعوت و ارشاد کا خلاصہ ہے۔

اُنھوں نے فرمایا "اے قوم! ایک خدا کی عبادت کر، اُس کے علاوہ کوئی پرستش کے قابل نہیں ہے۔ اور خرید و فروخت میں ماپ تول کو پورا رکھ، اور لوگوں کے ساتھ معاملات میں کھوٹ نہ کر۔ کل تک ممکن ہے کہ تجھ کو ان بداخلاقیوں کی برائیوں کا حال معلوم نہ ہوا ہو مگر آج تیرے پاس خدا کی حجت، نشانی، اور برہان آچکا، اب جہل و نادانی عفو و درگذر کے قابل نہیں ہے، حق کو قبول کر اور باطل سے باز آ کہ یہی کامرانی اور کامیابی کی راہ ہے۔ اور خدا کی زمین میں فتنہ و فساد نہ کر جبکہ اللہ تعالیٰ نے اُس کی صلاح و خیر کے تمام سامان مہیا کر دیے اگر تجھ میں ایمان اور یقین کی صداقت موجود ہے تو سمجھ کہ یہی فلاح اور بہبودی کی راہ ہے۔ اور دیکھ ایسا نہ کر کہ دعوتِ حق کی راہ کو روکنے اور لوگوں کو لوٹنے کے لیے ہر راہ پر جا بیٹھے اور جو آدمی بھی ایمان لائے اُس کو خدا کی راہ اختیار کرنے پر دھمکیاں دینے لگے، اور اُس میں کجروی پیدا کرنے کے درپے ہو جائے۔ اے افرادِ قوم! اُس وقت کو یاد کرو اور خدا کا احسان مانو کہ تم بہت تھوڑے تھے، پھر اُس نے امن و عافیت دے کر تمہاری تعداد کو بیش از بیش بڑھا دیا۔

اے میری قوم! ذرا اس پر بھی غور کر کہ جن لوگوں نے خدا کی زمین پر فساد پھیلانے کا شیوہ اختیار کیا تھا اُن کا انجام کس قدر عبرتناک ہوا۔ اور اگر تم میں سے ایک جماعت مجھ پر ایمان

لے آئی اور ایک جماعت ایمان نہیں لائی تو صرف اتنی ہی بات پر معاملہ ختم ہو جانے والا نہیں بلکہ صبر کے ساتھ انتظار کر تا آنکہ اللہ تعالیٰ ہمارے درمیان آخری فیصلہ کرے، اور وہی بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔

حضرت شعیب (علیہ السلام) بڑے فصیح و بلیغ مقرر تھے، شیریں کلامی، حسنِ خطابت طرزِ بیان، اور طلاقتِ لسانی میں بہت نمایاں امتیاز رکھتے تھے۔ اسی لیے مفسرین اُن کو "خطیب الانبیاء" کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ پس اُنھوں نے نرم و گرم ہر طریقہ سے قوم کو رشد و ہدایت کے یہ کلمات ارشاد فرمائے، مگر اُس بدبخت قوم پر مطلق کوئی اثر نہ ہوا اور چند ضعیف اور کمزور ہستیوں کے علاوہ کسی نے پیغامِ حق پر کان نہ دھرا، وہ خود بھی اُسی طرح بداعمال رہے اور دوسروں کی راہ بھی مارتے رہے، وہ راستوں میں بیٹھ جاتے اور حضرت شعیب کے پاس آنے جانے والوں کو قبولِ حق سے روکتے اور اگر موقعہ لگ جاتا تو لوگوں کو لوٹ لیتے، اور اگر اس پر بھی کوئی خوش قسمت حق پر لبیک کہہ دیتا تو اُس کو ڈراتے اور دھمکاتے، اور طرح طرح سے کجروی پر آمادہ کرتے۔ اور ان تمام باتوں کے باوجود بھی جب حضرت شعیب کی دعوتِ حق کا سلسلہ برابر جاری رہا تو اُن میں سے سربر آوردہ اشخاص نے "کہ جن کو اپنی شوکت و طاقت پر غرور تھا حضرت شعیب سے کہا، اے شعیب! دو باتوں میں سے ایک بات ضرور ہو کر رہیگی۔ یا ہم تجھ کو اور تجھ پر ایمان لانے والوں کو اپنی بستی میں سے نکال دینگے اور تیرا دیس نکالا کر دینگے یا تم کو مجبور کرینگے کہ پھر ہمارے دین میں واپس آجاؤ۔

حضرت شعیب نے فرمایا "اگر ہم تمہارے دین کو غلط اور باطل سمجھتے ہوں تب بھی زبردستی مان لیں؟ یہ تو بڑا ظلم ہے۔ جبکہ ہم کو خدائے تعالیٰ نے تمہارے اس دین سے نجات دے دی تو پھر اگر ہم اس کی طرف لوٹ آئیں تو اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ ہم نے جھوٹ بول کر خدائے تعالیٰ پر بہتان

باندھا - یہ ناممکن ہے۔ ہاں اگر اللہ کی" جو کہ ہمارا پروردگار ہے" یہی مرضی ہو تو وہ جو چاہیگا کریگا - ہمارے رب کا علم تمام اشیاء پر چھایا ہوا ہے، ہمارا تو صرف اُسی پر بھروسہ ہے۔ اے پروردگار! تو ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان حق اور سچائی کے ساتھ فیصلہ کردے اور تو بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔ قوم کے سرداروں نے جب حضرت شعیب علیہ السلام کا یہ عزم و استقلال دیکھا تو اب اُن سے روئے سخن پھیر کر اپنی قوم کے لوگوں سے کہنے لگے" خبردار، اگر تم نے شعیب کا کہا مانا تو تم ہلاک و برباد ہو جاؤ گے۔

حضرت شعیب نے یہ بھی فرمایا" دیکھو، خدائے تعالیٰ نے مجھ کو اس لیے بھیجا ہے کہ میں اپنی مقدور بھر تمہاری اصلاح کی سعی کروں اور میں جو کچھ کہتا ہوں اُس کی صداقت اور سچائی کے لیے خدا کی حجت اور دلیل اور نشانی بھی پیش کر رہا ہوں مگر افسوس کہ تم اس واضح حجت کو دیکھ کر بھی سرکشی اور نافرمانی پر قائم ہو اور مخالفت کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو تم سے چھوٹا ہوا ہو۔ پھر میں تم سے اپنی اس رشد و ہدایت کے بدلہ میں کوئی اُجرت بھی تو نہیں مانگتا، اور نہ کوئی دنیوی نفع کا طالب ہوں میرا اجر تو اللہ کے پاس ہے۔ اور اگر تم اب بھی نہ مانو گے تو مجھے ڈر ہے کہ کہیں خدا کا عذاب تم کو ہلاک و برباد نہ کر ڈالے، اُس کا فیصلہ اٹل ہے اور کسی کی مجال نہیں کہ اُس کو رد کر دے۔

قوم کے سردار تیوری چڑھا کر بولے" شعیب! کیا تیری نماز ہم سے یہ چاہتی ہے کہ ہم اپنے باپ دادا کے دیوتاؤں کو پوجنا چھوڑ دیں، اور ہم کو اپنے مال و دولت میں یہ اختیار نہ رہے کہ جس طرح چاہیں معاملہ کریں۔ اگر ہم کم تولنا چھوڑ دیں، لوگوں کے کاروبار میں کھوٹ نہ کریں تو مفلس و قلاش ہو کر رہ جائیں۔ تو کیا ایسی تعلیم دینے میں تجھ کو کوئی متین اور سچا رہبر کہہ سکتا ہے؟

حضرت شعیب نے نہایت دلسوزی اور محبت کے ساتھ فرمایا" اے قوم! مجھے یہ خوف

لگ رہا ہے کہ تیری یہ بیباکیاں اور خدا کے مقابلہ میں نافرمانیاں کہیں تیرا بھی وہی انجام نہ کر دیں، جو تجھ سے پہلے قومِ نوحؑ، قومِ ہودؑ، قومِ صالحؑ اور قومِ لوطؑ کا ہوا۔ اب بھی کچھ نہیں گیا خدا کے سامنے جھک جا اور اپنی بدکرداریوں کے لیے بخشش کی طلبگار بن اور ہمیشہ کے لیے اُن سے تائب ہو جا بلاشبہ میرا پروردگار رحم کرنے والا اور بہت ہی مہربان ہے وہ تیری تمام خطائیں بخشدیگا۔

قوم کے سرداروں نے یہ سُن کر جواب دیا "شعیبؑ! ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ تو کیا کہتا ہے؟ تو ہم سب سے کمزور اور غریب ہے، اگر تیری باتیں سچی ہوتیں تو تیری زندگی ہم سے زیادہ اچھی ہوتی، اور ہم کو صرف تیرے خاندان کا خوف ہے ورنہ تو تجھ کو سنگسار کر چھوڑتے تو ہرگز ہم پر غالب نہیں آسکتا؟"

حضرت شعیبؑ نے فرمایا "افسوس ہے تم پر! کیا تمہارے لیے خدا کے مقابلہ میں میرا خاندان زیادہ ڈر کا باعث بن رہا ہے حالانکہ میرا رب تمہارے تمام اعمال کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور وہ دانا و بینا ہے"

"خیر، اگر تم نہیں مانتے تو تم جانو، تم وہ سب کچھ کرتے رہو جو کر رہے ہو۔ عنقریب خدا کا فیصلہ بتا دیگا کہ عذاب کا مستحق کون ہے اور کون جھوٹا اور کاذب ہے۔ تم بھی انتظار کرو اور میں بھی انتظار کرتا ہوں؟"

آخر وہی ہوا جو قانونِ الٰہی کا ابدی و سرمدی فیصلہ ہے "یعنی حجت اور برہان کی روشنی آنے کے بعد بھی جب باطل پر اصرار ہو اور اُس کی صداقت کا مذاق اُڑایا جائے اور اُس کی اشاعت میں رکاوٹیں ڈالی جائیں تو پھر خدا کا عذاب اُس مجرمانہ زندگی کا خاتمہ کر دیتا، اور آنے والی قوموں کے لیے اُس کو عبرت و موعظت بنا دیا کرتا ہے"۔

نوعِ عذاب | قرآنِ عزیز کہتا ہے کہ نافرمانی اور سرکشی کی پاداش میں قومِ شعیب کو دو قسم کے عذاب نے آگھیرا۔ ایک زلزلہ کا عذاب اور دوسرا آگ کی بارش کا عذاب، یعنی جب وہ اپنے گھروں میں آرام کر رہے تھے تو یک بیک ایک ہولناک زلزلہ آیا اور ابھی یہ ہولناکی ختم نہ ہوئی تھی کہ اوپر سے آگ برسنے لگی اور نتیجہ یہ نکلا کہ صبح کو دیکھنے والوں نے دیکھا کہ کل کے سرکش اور مغرور آج گھٹنوں کے بل اوندھے جھلسے ہوئے پڑے ہیں۔

فاخذتهم الرجفة فاصبحوا	پھر آ پکڑا اُن کو زلزلہ نے پس صبح کو رہ گئے اپنے اپنے
فی دارهم جثمین . (الحجر)	گھروں کے اندر اوندھے پڑے۔
فکذبوه فاخذهم عذاب یوم	پھر اُنھوں نے شعیب کو جھٹلایا پس آ پکڑا اُن کو بادل
الظلة انه کان عذاب یوم	والے عذاب نے (جس میں آگ تھی) بیشک وہ بڑے
عظیم . (الشعراء)	ہولناک دن کا عذاب تھا۔
وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاهُمْ شُعَیْبًا	اور ہم نے (قبیلہ) مدین کی طرف اس کے بھائی شعیب کو بھیجا
قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ	اُس نے کہا اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو، اُس کے
مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ وَ	سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ اور ماپ تول میں کمی نہ کیا کرو، میں
لَا تَنْقُصُوا الْمِكْیَالَ وَ	دیکھ رہا ہوں کہ تم خوشحال ہو (یعنی خدا نے تمہیں بہت کچھ دے
الْمِیْزَانَ اِنِّیْۤ اَرٰىكُمْ بِخَیْرٍ	رکھا ہے۔ پس کفرانِ نعمت سے بچو) میں ڈرتا ہوں کہ تم پر
وَّاِنِّیْۤ اَخَافُ عَلَیْكُمْ عَذَابَ	عذاب کا ایسا دن نہ آجائے جو سب پر چھا جائیگا" اور اے
یَوْمٍ مُّحِیْطٍ . وَیٰقَوْمِ اَوْفُوا	میری قوم کے لوگو! ماپ تول انصاف کے ساتھ پوری پوری
الْمِكْیَالَ وَالْمِیْزَانَ بِالْقِسْطِ	کیا کرو۔ لوگوں کو اُن کی چیزیں (اُن کے حق سے) کم نہ دو۔
وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْیَآءَهُمْ	ملک میں فساد پھیلاتے نہ پھرو۔ اگر تم میرا کہا مانو تو جو کچھ اللہ

وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ۔
بَقِيَّتُ اللَّهِ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُم
مُّؤْمِنِينَ ۚ وَمَا أَنَا عَلَيْكُم
بِحَفِيظٍ ۔ قَالُوا يَا شُعَيْبُ أَصَلَاتُكَ
تَأْمُرُكَ أَن نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ
آبَاؤُنَا أَوْ أَن نَّفْعَلَ فِي أَمْوَالِنَا
مَا نَشَاءُ ۖ إِنَّكَ لَأَنتَ الْحَلِيمُ
الرَّشِيدُ ۔ قَالَ يَا قَوْمِ أَرَأَيْتُمْ
إِن كُنتُ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّي
وَرَزَقَنِي مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ۚ
وَمَا أُرِيدُ أَنْ أُخَالِفَكُمْ إِلَىٰ
مَا أَنْهَاكُمْ عَنْهُ ۚ إِنْ أُرِيدُ
إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ۚ
وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ ۚ عَلَيْهِ
تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ ۔ وَيَا قَوْمِ
لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِي أَن يُصِيبَكُم
مِّثْلُ مَا أَصَابَ قَوْمَ نُوحٍ
أَوْ قَوْمَ هُودٍ أَوْ قَوْمَ صَالِحٍ ۚ وَ
مَا قَوْمُ لُوطٍ مِّنكُم بِبَعِيدٍ ۔

کا دیا کاروبار میں بچ رہے، اُسی میں تمہارے لیے
بہتری ہے، اور دیکھو (میرا کام تو صرف نصیحت
کر دینا ہے) میں کچھ تم پر نگہبان نہیں" (کہ جبراً اپنی
راہ پر چلا دوں) لوگوں نے کہا "اے شعیب! کیا تیری
یہ نمازیں (جو تو اپنے خدا کے لیے پڑھتا ہے) تجھے یہ حکم دیتی
ہیں کہ ہمیں آکر کہے: اِن معبودوں کو چھوڑ دو جنہیں
تمہارے باپ دادے پوجتے رہے ہیں۔ یا یہ کہ تمہیں اختیار
نہیں کہ اپنے مال میں جس طرح کا تصرف کرنا چاہو، کرو؟
بس تم ہی ایک نرم دل اور راست باز آدمی رہ گئے ہو۔
شعیب نے کہا "اے میری قوم کے لوگو! کیا تم نے اس بات
پر غور نہیں کیا کہ اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے ایک
دلیل روشن رکھتا ہوں، اور (اُس کے فضل و کرم کا یہ حال
ہو کہ) اچھی (سے اچھی) روزی عطا فرما رہا ہو، (تو پھر بھی
میں چپ رہوں اور تمہیں راہِ حق کی طرف نہ بلاؤں؟)
اور میں یہ نہیں چاہتا کہ جس بات سے تمہیں روکتا ہوں، اُس سے
تمہیں تو روکوں اور خود اُس کے خلاف چلوں۔ (میں
تمہیں جو کچھ کہتا ہوں، اسی پر عمل بھی کرتا ہوں) میں اس کے
سوا کچھ نہیں چاہتا کہ جہاں تک میرے بس میں ہے، اصلاح
حال کی کوشش کروں۔ میرا کام بنا ہے تو اللہ ہی کی مدد سے بنا ہے

وَاسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ
إِنَّ رَبِّي رَحِيمٌ وَدُودٌ . قَالُوا
يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيرًا مِّمَّا
تَقُولُ وَإِنَّا لَنَرٰىكَ فِينَا ضَعِيفًا
وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ وَمَا
أَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيزٍ . قَالَ يٰقَوْمِ
أَرَهْطِي أَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ
وَاتَّخَذْتُمُوهُ وَرَاءَكُمْ ظِهْرِيًّا
إِنَّ رَبِّي بِمَا تَعْمَلُونَ مُحِيطٌ .
وَيٰقَوْمِ اعْمَلُوا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ
إِنِّي عَامِلٌ سَوْفَ تَعْلَمُونَ
مَنْ يَأْتِيهِ عَذَابٌ يُخْزِيهِ وَ
مَنْ هُوَ كَاذِبٌ وَارْتَقِبُوا إِنِّي
مَعَكُمْ رَقِيبٌ . وَلَمَّا جَاءَ
أَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَالَّذِينَ
اٰمَنُوا مَعَهُ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَ
أَخَذَتِ الَّذِينَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ
فَأَصْبَحُوا فِي دِيَارِهِمْ جٰثِمِينَ .
كَأَنْ لَمْ يَغْنَوْا فِيهَا أَلَا بُعْدًا

میں نے اُسی پر بھروسہ کیا، اور اُسی کی طرف رجوع ہوں"
اور اے میری قوم کے لوگو! میری ضد میں آکر کہیں ایسی
بات نہ کر بیٹھنا کہ تمہیں بھی ویسا ہی معاملہ پیش آجائے جیسا
قومِ نوح کو یا قومِ ہود کو یا قومِ صالح کو پیش آچکا ہے، اور قوم
لوط (کا معاملہ) تم سے کچھ دور نہیں"۔ اور دیکھو اللہ سے (اپنے گناہوں
کی) معافی مانگو۔ اور اُس کی طرف لوٹ جاؤ۔ میرا پروردگار
بڑا ہی رحمت والا، بڑا ہی محبت والا ہے!" لوگوں نے کہا "اے
شعیب! تم جو کچھ کہتے ہو، اس میں سے اکثر باتیں تو ہماری سمجھ
ہی میں نہیں آتیں اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ تم ہم لوگوں میں ایک
کمزور آدمی ہو۔ اگر (تمہارے ساتھ) تمہاری برادری کے آدمی نہ
ہوتے تو ہم ضرور تمہیں سنگسار کر دیتے۔ تمہاری ہمارے
سامنے کوئی ہستی نہیں" شعیب نے کہا۔ "اے میری قوم کے لوگو
کیا اللہ سے بڑھکر تم پر میری برادری کا دباؤ ہوا؟ اور اللہ تمہارے
لیے کچھ نہ ہوا کہ اُسے پیچھے ڈال دیا؟ (اچھا) جو کچھ تم کرتے ہو میرے
پروردگار کے احاطہ (علم) سے باہر نہیں۔ اے میری قوم
کے لوگو! تم اپنی جگہ کام کیے جاؤ۔ میں بھی (اپنی جگہ) سرگرم
عمل ہوں۔ بہت جلد معلوم کر لوگے کہ کس پر عذاب آتا ہے
جو اُسے رسوا کریگا اور کون فی الحقیقۃ جھوٹا ہے۔ انتظار کرو میں
بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں۔ اور پھر جب ہماری ٹھہرائی

لِمَدْيَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ ۔ ہوئی) بات کا وقت آپہنچا، تو ایسا ہوا کہ ہم نے شعیب کو اور اُن کو
(ہود) جو اُس کے ساتھ ایمان لائے تھے، اپنی رحمت سے بچالیا اور جو
لوگ ظالم تھے، اُنہیں ایک سخت آواز نے آپکڑا۔ پس جب صبح
ہوئی تو اپنے اپنے گھروں میں اوندھے پڑے تھے! (وہ اس طرح
اچانک ہلاک ہوگئے) گویا اِن گھروں میں کبھی بسے ہی نہ تھے!
تو سُن رکھو کہ قبیلۂ مدین کے لیے بھی محرومی ہوئی جس طرح قومِ ثمود
کے لیے محرومی ہوئی تھی!

قبرِ شعیب علیہ السلام حضر موت میں ایک قبر ہے جو زیارتگاہِ عوام و خواص ہے، وہاں کے باشندوں کا یہ دعویٰ ہے کہ یہ شعیب (علیہ السلام) کی قبر ہے۔ حضرت شعیب مدین کی ہلاکت کے بعد یہاں آکر بس گئے تھے اور یہیں اُن کی وفات ہوئی۔ حضر موت کے مشہور شہر "سیئون" کے مغربی جانب میں ایک مقام ہے جس کو "شبام" کہتے ہیں۔ اس جگہ اگر کوئی مسافر وادی ابن علی کی راہ ہوتا ہوا شمال کی جانب چلے تو وادی کے بعد وہ جگہ آتی ہے جہاں یہ "قبر" ہے، یہاں مطلق کوئی آبادی نہیں ہے اور جو شخص بھی یہاں آتا ہے صرف زیارت ہی کے لیے آتا ہے۔

عبدالوہاب نجار کہتے ہیں کہ مجھ کو اس قبر کے متعلق شک ہے کہ یہ حضرت شعیب (علیہ السلام) کی قبر ہے لیکن اُنہوں نے اس شک کے لیے کوئی وجہ بیان نہیں فرمائی۔

بصائر و عبر پچھلی امتوں اور قوموں کے یہ واقعات کہانیاں نہیں ہیں بلکہ عبرت بیں نگاہوں کے لیے سرمایۂ صد ہزار عبرت ہیں۔ اگر زیادہ غور و فکر سے بھی کام نہ لیا جائے تب بھی بآسانی مسطورۂ بالا واقعات سے ہم حسب ذیل نتائج اخذ کرسکتے ہیں۔

---

(۱) سورہ اعراف میں مذکور ہے کہ حضرت شعیب نے اپنی قوم سے فرمایا کہ بلاشبہ تمہارے پاس تمہارے رب کی حجت و بیّنہ آچکی "قد جاء تکم بیّنۃ من رّبکم" مگر قرآنِ عزیز نے دیگر انبیاء علیہم السلام کی طرح حضرتِ شعیب کے کسی معجزہ "آیۃ اللہ" کا ذکر نہیں کیا۔ علماء نے اس سے دو نتیجے نکالے ہیں، ایک یہ کہ اگر نبی اور پیغمبر کسی قسم کا معجزہ نہ بھی لائے اور صرف خدا کے پیغامِ حق کے لیے روشن دلائل و براہین کی حجت ہی پیش کرے تو یہ روشن بُرہان ہی اُس کا سب سے بڑا اور عظیم الشان معجزہ ہے۔ دوسرے یہ کہ اس مقام پر "بیّنہ" کی تفصیلات کو خدا کے سپرد کرنا چاہیے اس لیے کہ ہوسکتا ہے کہ شریعت کے روشن دلائل کے علاوہ حضرت شعیب کو بھی خدا کی جانب سے دوسرے انبیاء علیہم السلام کی طرح کوئی نشان (آیۃ اللہ) بطور معجزہ عطا کیا گیا ہو اور اگرچہ قرآن نے اس جگہ اس کی تصریح نہیں کی مگر شعیب علیہ السلام کے اس خطاب میں اُسی جانب اشارہ ہو۔

(۲) ہماری غلطیوں میں سب سے بڑی مہلک غلطی عرصہ سے یہ رہی ہے کہ ہم قرآنِ عزیز کی تعلیم سے یکسر غافل ہونے کی وجہ سے یہ سمجھ بیٹھے کہ اسلامی زندگی کے ارکان میں صرف "عبادات" ہی اہم رکن ہیں، اور معاملات میں درست کاری اور اصلاحِ معاشرت کو اسلام میں کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ دور میں فساقِ اُمت کا تو ذکر ہی کیا اکثر اتقیاء اور پرہیزگار بھی حقوق العباد اور معاملات میں بے پرواہ نظر آتے ہیں۔ مگر حقوق العباد کی حفاظت معاشرتی درست کاری اور معاملات میں دیانت و امانت کو اسلام میں کس درجہ اہم شمار کیا گیا ہے وہ اس سے ظاہر ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک جلیل القدر پیغمبر کی بعثت کا مقصد اسی کو قرار دیا، اور اُن کو اُن ہی اُمور کی اصلاحِ حال کے لیے رسول بنا کر بھیجا۔

(۳) خرید و فروخت میں دوسروں کے حق کو پورا نہ دینا اور اس کا لحاظ نہ رکھنا انسانی زندگی میں ایسا روگ لگا دیتا ہے کہ یہ بداخلاقی بڑھتے بڑھتے تمام حقوق العباد کے بارہ میں حق تلفی کی

خصلت پیدا کر دیتی۔ اور اس طرح انسانی شرافت اور باہمی اخوت و مودت کے رشتہ کو منقطع کر کے لالچ،
حرص، خود غرضی، اور خست و دنائت جیسے رذائل کا حامل بنا دیا کرتی ہے۔ اسی لیے خدائے برتر کا ارشاد
ہے:-

ویل للمطففین الذین اذا اکتالو	ہلاکت ہے اُن لوگوں کے لیے جو دوسروں سے جب لیتے
علی الناس یستوفون واذا کالوھم	ہیں تو پورے پیمانہ سے لیتے ہیں اور جب خود اپنی چیز دیتے
او وزنوھم یخسرون (مطففین)	ہیں تو ناپ تول میں کمی کرتے ہیں اور کم تولتے اور ناپتے ہیں۔

(۴) اصلاحِ حال کے بعد خدا کی زمین میں فساد پیدا کرنے سے بڑھ کر کوئی جرم نہیں ہے
اس لیے کہ ظلم، کبر، قتل اور عصمت ریزی جیسے بڑے بڑے جرائم کی بنیاد اور اصل یہی رذیلہ ہے
(۵) باطل کی ایک بڑی شناخت یہ ہے کہ نہ وہ اپنے لیے دلائل کی روشنی رکھتا ہے اور نہ
روشن دلائل کو برداشت کرتا ہے بلکہ جب اُس کے سامنے روشنی آتی ہے تو وہ مُنہ پھیر لیتا ہے، اور
آنکھیں بند کر لیتا ہے اور اُس کی موجودگی کو برداشت نہ کرتے ہوئے دلائل کا جواب، غصہ، دھمکی
اور قتل سے دینے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ تم انبیاء علیہم السلام اور اُن کے پیروانِ حق کی زندگی اور پھر
اُن کے مقابل اور مخالف باطل پرستوں کی زندگی کا موازنہ کرو اور تاریخ کے اوراق سے شہادت
حاصل کرو تو تم کو قدم قدم پر یہ حقیقت آشکارا اور روشن نظر آئیگی۔ انبیاء علیہم السلام روشن دلائل دے
رہے ہیں، آیات اللہ اور خدا کی نشانیاں دکھا رہے ہیں، محبت اور رحم کے جذبات کا اظہار
کر رہے ہیں، اور اپنی دعوت و تبلیغ پر مخاطبین پر مالی دباؤ نہ ڈالنے کا اطمینان دلا رہے ہیں مگر ان
تمام باتوں کے باوجود دوسری جانب سے اُن کو کہا جا رہا ہے کہ ہم تمہارا دیس نکالا کر دینگے، ہم
تم کو سنگسار کر دینگے، ہم تم کو قتل کر دینگے، اور اگر خدا کے پیغمبر آخری طور پر یہ کہتے ہیں کہ اگر تم ہماری
آواز پر لبیک نہیں کہتے تو کم از کم ہمارے وجود کو برداشت کرو اور اتنا تو صبر کرو کہ خدا تمہارے اور

ہمارے درمیان حق و باطل کا خود ہی فیصلہ کر دے تو دوسری جانب سے اس کے جواب میں بھی انکار، تمسخر اور یہ مطالبہ پیش ہوتا ہے کہ بس اب اپنی نصیحت ختم کرو اور اگر سچے ہو تو جس عذاب سے ڈراتے ہو وہ ابھی لے آؤ، ورنہ تو ہم ہمیشہ کے لیے تمہارا اور تمہارے مشن کا خاتمہ کر دینگے۔

(۶) حق و باطل کا یہی وہ آخری مرحلہ ہے جس کے بعد خدائے تعالیٰ کا وہ قانون جس کو "قانونِ پاداشِ عمل" کہا جاتا ہے ایسی سرکش اور متکبر قوموں کے لیے دنیا ہی میں نافذ ہو جاتا ہے اور اُن کو ہلاک و تباہ کر کے آنے والی نسلوں اور قوموں کے لیے سامانِ عبرت و موعظت مہیا کر دیتا ہے۔

حضرت موسیٰ و ہارون (علیہما السلام)

بنی اسرائیل مصر میں ۔ موسیٰ و ہارون کا ذکر قرآن میں ۔ نسب و ولادت موسیٰ ۔ ارضِ مدین اور موسیٰ کا مصر سے خروج ۔ وادی مقدس و بعثت موسیٰ ۔ واپسی مصر اور فرعون کو دعوتِ اسلام ۔ آیات اللہ اور فرعون کا انکار ۔ قتل موسیٰ کا مشورہ ۔ بنی اسرائیل کی ہجرت اور فرعون کی مزاحمت ۔ نجات بنی اسرائیل و غرقِ فرعون ۔ تیہ کے میدان میں بنی اسرائیل کی حماقتیں اور موسیٰ علیہ السلام کو ایذا رسانی ۔ گوسالہ پرستی ۔ مسئلہ ذبح بقرہ ۔ قارون و موسیٰ ۔ موسیٰ و خضر ۔ بنی اسرائیل کو تذکیر نعمہائے الٰہی نصائح و بصائر

بنی اسرائیل مصر میں

قرآنِ عزیز نے حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ میں بنی اسرائیل کا ذکر صرف اسی قدر کیا تھا کہ حضرت یعقوب اور اُن کا خاندان حضرتِ یوسف سے ملنے مصر میں آئے مگر اس کے صدیوں بعد حضرت موسیٰ کے واقعات میں پھر ایک مرتبہ قرآنِ حکیم بنی اسرائیل کے واقعات تفصیل کے ساتھ سناتا ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل حضرت یوسف کے زمانہ میں مصر ہی میں بس گئے تھے اور ان تمام پچھلی صدیوں میں ان کی تاریخ مصر ہی سے وابستہ رہی ہے ۔ تورات کی یہ تفصیلات بھی اسی کی تائید کرتی ہیں ۔

> تب فرعون یوسف سے متکلم ہوا اور کہا کہ تیرا باپ اور تیرے بھائی تجھ پاس آئے ہیں ۔ مصر کی زمین تیرے آگے ہے ۔ اپنے باپ اور اپنے بھائیوں کو اس سرزمین کے ایک مقام میں جو سب سے بہتر ہے بسا جشن کی زمین میں انہیں رہنے دے ۔ اور اگر تو جانتا ہے کہ بعضے اُن کے درمیان چالاک ہیں تو اُن کو میری مواشی پر مختار کر[1]

[1] پیدائش باب ۴۷ ۔ آیات ۵ ۔ ۶ ۔

اور یوسف نے اپنے باپ اور بھائیوں کو ملکِ مصر کی ایک بہتر زمین میں جو رعمسیس کی زمین ہے جیسا فرعون نے فرمایا تھا بٹھایا اور اُنہیں اُس کا مالک کیا۔ اور یوسف نے اپنے باپ اور اپنے بھائیوں اور اپنے باپ کے سب گھرانے کی اُن کے لڑکے بالوں کے موافق روٹی سے پرورش کی۔[1]

اور اسرائیل نے مصر کی زمین میں جشن کے ملک میں سکونت کی اور وہ وہاں ملکیتیں رکھتے تھے، اور وہ بڑھے اور بہت زیادہ ہوئے، اور یعقوب مصر کی زمین میں سترہ برس جیا، سو یعقوب کی ساری عمر ایک سو سینتالیس برس کی ہوئی۔[2]

توراۃ میں یہ بھی مذکور ہے کہ حضرت یوسف (علیہ السلام) نے فرعون سے اپنے باپ اور اہل خاندان کے لیے "ارض جاشان" طلب کی جو فرعون نے بخوشی اُن کے سپرد کردی۔[3] مصری نقشہ میں یہ جگہ بلبیس کے شمال میں واقع ہے۔ اس علاقہ کا ایک موجودہ شہر "فکوسہ" (سفط الحنۃ) ہے۔

حضرت یوسف کے واقعہ میں ہم بتا چکے ہیں کہ شہری آبادی سے دور حضرت یوسف نے اپنے خاندان کے لیے یہ جگہ غالباً اس لیے منتخب کی تھی کہ یہاں رہ کر اُن کے خاندان کی بدویانہ زندگی بحال باقی رہیگی، اور اس کی وجہ سے مصری بُت پرست اُن کے ساتھ اختلاط نہ کرسکینگے، اور اُن کی مشرکانہ رسوم اور بداخلاقیاں بنی اسرائیل میں سرایت نہ کرسکینگی کیونکہ مصری لوگ چرواہوں، کاشتکاروں اور بدوی لوگوں کو کمتر اور نجس سمجھتے، اور اُن کے ساتھ اختلاط کو معیوب جانتے تھے۔

توراۃ میں یہ بھی مذکور ہے کہ جب حضرت یعقوبؑ کی وفات کا وقت قریب آیا

---

[1] پیدائش باب ۴۷ آیات ۱۱-۱۲۔ [2] پیدائش باب ۴۷ آیات ۲۷-۲۸ [3] ایضاً آیات ۳۰-۳۱

تو اُنہوں نے حضرت یوسفؑ کو بُلا کر وصیت کی کہ مجھ کو سرزمینِ مصر میں دفن نہ کیا جائے بلکہ باپ دادا کے وطن فلسطین ہیں میری قبر بنائی جائے، حضرتِ یوسفؑ نے باپ کو پورا اطمینان دلایا اور انتقال کے بعد اُن کے جسدِ اطہر کو حنوط (ممی) کر کے تابوت میں رکھا اور فلسطین لیجا کر سپردِ خاک کیا۔

حضرت یعقوب (علیہ السلام) نے وفات سے پہلے اپنی ساری اولاد کو جمع کیا اور حضرت یوسف کے صاجزادوں افرائیم اور منسی کو بھی بلایا، اور ان سب کو اوّل دعاءِ برکت دی اور محبت و شفقت کے ساتھ اُن کو نوازا اس کے بعد اُن کو نصیحت کی کہ "دیکھو میرے بعد اپنے ایمانیات و اعتقادات کو کہیں خراب نہ کر لینا اور خدا کے اُس پاک رشتہ کو جو میں نے اور میرے باپ دادا نے ہمیشہ مضبوط رکھا مشرکانہ رسوم و عوائد سے شکست و ریخت نہ کر دینا[1]۔

قرآنِ عزیز نے بھی یعقوب علیہ السلام کی اس مقدس وصیت کا ان معجزانہ جملوں میں ذکر کیا ہے۔

ام كنتم شهداء اذ حضر يعقوب الموت اذ قال لبنيه ما تعبدون من بعدی قالوا نعبد الهك واله اباءك ابراهيم واسمعيل واسحق الهًا واحدًا ونحن له مسلمون ۔ (بقرہ)

(اے محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم) کیا تم اُس وقت موجود تھے جب یعقوب کی موت کا وقت تھا، جبکہ اُس نے اپنی اولاد سے کہا "میرے بعد کس کی پرستش کرو گے" یعنی کون سا دین اختیار کرو گے" تو اُنہوں نے جواب دیا "ہم اُسی ایک خدا کی پرستش کرینگے جو تیرا اور تیرے باپ دادا ابراہیم اسمٰعیل اور اسحٰق کا خدا ہے اور جس کا کوئی شریک نہیں، اور ہم تو اُسی کے فرمانبردار ہیں۔

توراۃ نے حضرت یوسف (علیہ السلام) کی وفات کے حالات پر بھی روشنی ڈالی ہے اور اُن کی عمر اور اُن کی نسل کا بھی ذکر حسب ذیل عبارت میں کیا ہے۔

[1] پیدائش باب ۴۷ آیات ۳۰-۳۱۔

اور یوسف اور اس کے باپ کے گھرانے نے مصر میں سکونت کی اور یوسف ایک سو دس برس جیا اور یوسف نے افرائیم کے لڑکے جو تیسری پشت میں تھے دیکھے، اور منسی کے بیٹے مکیر کے بیٹے بھی یوسف کے گھٹنوں پر پالے گئے۔ اور یوسف نے اپنے بھائیوں سے کہا۔ میں مرتا ہوں اور خدا یقیناً تم کو یاد کریگا، اور تم کو اس زمین سے باہر اُس زمین جس کی بابت اُس نے ابراہام اور اضحاق اور یعقوب سے قسم کی ہے لیجائیگا، اور یوسف نے بنی اسرائیل سے قسم لے کے کہا خدا یقیناً تم کو یاد کریگا اور تم میری ہڈیوں کو یہاں سے لیجاؤ، سو یوسف ایک سو دس برس کا بوڑھا ہو کے مرگیا۔ اور اُنہوں نے اُس میں خوشبو بھری اور اُسے مصر میں صندوق میں رکھا۔[۱]

اور موسیٰ نے یوسف کی ہڈیاں ساتھ لیں کیونکہ اُس نے بنی اسرائیل کو تاکیداً قسم دے کے کہا تھا کہ خدا یقیناً تمہاری خبرگیری کریگا، تم یہاں سے میری ہڈیاں اپنے ساتھ لیجائیو۔[۲]

چنانچہ حضرت یوسف کی وصیت کے مطابق اُن کی اولاد نے اُن کے جسمِ مبارک کو بھی حنوط (ممّی) کرکے تابوت میں محفوظ کر دیا، اور جب موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں بنی اسرائیل مصر سے ہجرت کر کے چلے ہیں تو یوسف (علیہ السلام) کی وصیت کو پورا کرنے کے لیے اُن کا تابوت بھی ساتھ لیتے گئے اور نبیوں کی سرزمین میں لاکر دفن کر دیا، یہ مقام کونسا ہے؟ اس کے متعلق اہل جبرون یہ کہتے ہیں کہ وہ جبرون میں مدفون ہیں اور "حرمِ خلیلی" میں مکفیلہ کے قریب ایک محفوظ تابوت کے متعلق یہ دعوے کرتے ہیں کہ یہی تابوتِ یوسف ہے لیکن عبدالوہاب مصری اس کو وہم بتاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ مجھ سے حضرتِ فاضل محمد نمر حسن نابلسی، اور نابلس کے سرکردہ عالم حضرت فاضل امین بک عبدالہادی نے بیان کیا کہ حضرت یوسف کی ضریحِ مبارک نابلس میں ہے اور یہی صحیح ہے

---

[۱] پیدائش باب ۵۰ آیات ۲۲۔۲۶ [۲] خروج باب ۱۳ آیات ۱۹ -

اس لیے کہ تورات کہتی ہے کہ حضرت یوسف ارض فرائیم میں دفن ہوئے اور نابلس ارض فرائیم ہی میں ہے۔ اور اس کو قدیم زمانہ میں شکیم کہتے تھے[1]

بہرحال ان تفصیلات سے یہ واضح ہوگیا کہ بنی اسرائیل حضرت یوسف اور حضرت موسیٰ کی درمیانی صدیوں میں

فرعون موسیٰ | گذشتہ واقعات میں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ "فرعون" شاہانِ مصر کا لقب ہے کسی خاص بادشاہ کا نام نہیں ہے، تین ہزار سال قبل مسیح سے شروع ہو کر عہدِ سکندر تک فراعنہ کے اکتیس خاندان مصر پر حکمراں رہے ہیں، سب سے آخری خاندان فارس کی شہنشاہی کا تھا جو ۳۳۲ سنہ قبل از مسیح سکندر کے ہاتھوں مفتوح ہوگیا۔ ان میں سے حضرت یوسف کا فرعون "ہیکسس" (عمالقہ) کے خاندان سے تھا۔ جو دراصل عرب خاندانوں ہی کی ایک شاخ تھی تو اب سوال یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد کا فرعون کون ہے اور کس خاندان سے متعلق ہے؟

عام مورخینِ عرب اور مفسرین اس کو بھی "عمالقہ" ہی کے خاندان کا فرد بتاتے ہیں۔ اور کوئی اس کا نام ولید بن مصعب بن ریّان بتاتا اور کوئی مصعب بن ریان کہتا ہے اور ان میں سے اربابِ تحقیق کی رائے یہ ہے کہ اُس کا نام ریّان یا ریان ابا تھا۔ ابن کثیر کہتے ہیں کہ اس کی کنیت ابو مرہ تھی۔

یہ سب اقوال قدیم مورخین کی تحقیقی روایات پر مبنی تھے مگر اب جدید مصری اثری تحقیقات اور حجری کتبات کے پیشِ نظر اس سلسلہ میں دوسری رائے سامنے آئی ہے۔ وہ یہ کہ موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کا فرعون رمیسیس ثانی کا بیٹا منفتاح ہے جس کا دورِ حکومت ۱۲۹۲ سنہ ق م سے شروع ہو کر ۱۲۲۵ سنہ ق م پر ختم ہوتا ہے۔

اس تحقیقی روایت کے متعلق احمد یوسف احمد آفندی نے ایک مستقل مضمون لکھا ہے یہ مصری دارالآثار کے مصوّر ہیں اور اثری و حجری تحقیق کے بہت بڑے عالم ہیں۔ ان کے اس مضمون

[1] قصص الانبیاء ص ۱۸۷۔

کا خلاصہ نجار نے قصص الانبیاء میں نقل کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے۔

"یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ یوسف علیہ السلام جب مصر میں داخل ہوئے ہیں تو یہ فراعنہ کے سولھویں خاندان کا زمانہ تھا اور اس فرعون کا نام "ابابی الاول" تھا ہمیں نے اس کی شہادت اس حجری کتبہ سے حاصل کی جو عزیز مصر "فوتی فارع" (فوطیفار) کے مقبرہ میں پایا گیا۔ اور سترہویں خاندان کے بعض آثار سے یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ اس خاندان سے قبل مگر قریب ہی زمانہ میں مصر میں ہولناک قحط پڑ چکا تھا، لہٰذا ان تعینات کے بعد آسانی سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ حضرت یوسف کا داخلۂ مصر "ابابی الاول" کے زمانہ میں تقریباً ۱۷۰۰ ق م ہوا ہے۔ اور حضرت یوسف کا عزیز مصر کے یہاں رہنا اور پھر قید خانہ کی زندگی بسر کرنا ان دونوں کی مدت کا اندازہ کر کے کہا جا سکتا ہے کہ بنی اسرائیل حضرت یوسف سے تقریباً ستائیس سال بعد مصر میں اُس نشان سے داخل ہوئے جس کا ذکر قرآن حکیم اور تورات میں کیا گیا۔ ہم اگرچہ فراعنۂ مصر کی حکومت اور شاہی خاندانوں کے متعلق اچھی طرح آگاہی پا چکے ہیں اور مصری آثار نے اس میں ہم کو کافی مدد دی ہے۔ مگر ابھی تک ان اثریات میں وہ تفصیلی تصریحات دستیاب نہیں ہوئیں جو فرعون اور بنی اسرائیل کی عداوت، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت اور غرقِ فرعون و نجات بنی اسرائیل سے متعلق ہیں تورات میں مذکور ہے کہ جس فرعون نے بنی اسرائیل کے ساتھ عداوت کا معاملہ کیا اور اُن کو سخت مصائب میں مبتلا رکھا اُس نے بنی اسرائیل سے دو شہروں رعمسیس اور فیثوم کی تعمیر کی خدمت بھی لی اور اُن کو مزدور بنایا، تو اثری حفریات (پرانے آثار کی کھدائی) میں ان دو شہروں کا پتہ تو لگ چکا ہے۔ ایک کے کتبہ سے

معلوم ہوا ہے کہ اُس کا نام "پر۔ توم" یا "فیتوم" ہے اس کا ترجمہ ہے "خدائے توم کا گھر" اور دوسرے کا نام "پر رعمسیس" ہے جس کا ترجمہ "قصرِ رعمسیس" ہوتا ہے۔

اور شرقی جانب میں جو مقام اب "تلِ مسخوطہ" کے نام سے مشہور ہے یہیں "فیتوم" کی آبادی تھی اور جس جگہ اب "قنتیر" یا قدیم مصری زبان کے اعتبار سے "خنت نفر" واقع ہے اس مقام پر "رعمسیس" آباد تھا۔ اس کو "رعمسیس ثانی" نے اس لیے آباد کیا تھا کہ یہ مصر کی بحری جانب کے سینٹر میں بہترین قلعہ کا کام دے اور فیتوم کی آبادی کا بھی یہی مقصد تھا۔ اس شہر کی چار دیواری کے جو کھنڈر معلوم ہوئے ہیں وہ بلا شبہ اس کی شہادت دیتے ہیں کہ یہ دونوں شہر مصر کے بہترین حفاظتی قلعے تھے نہ کہ تورات کے بیان کے مطابق غلوں کے گودام۔

اس تمام قیل وقال کا مطلب یہ ہے کہ جس فرعون نے بنی اسرائیل کو مصائب میں مبتلا کیا وہ یہی "رعمسیس دوم" ہو سکتا ہے یہ مصر کے حکمرانوں کا انیسواں خاندان تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کے زمانہ میں پیدا ہوئے اور اسی کی آغوش میں پرورش پائی، تاریخ اثریات سے پتہ چلتا ہے کہ "اسیویہ" قبائل جو مصر کے قریب آباد تھے اُن کے اور فراعنہ کے اس خاندان کے درمیان پیہم نو سال تک سخت جنگ دپیکار رہی بدیں وجہ یہ قرین قیاس ہے کہ رعمسیس دوم نے اس خوف سے کہ کہیں بنی اسرائیل کا یہ عظیم الشان قبیلہ جو لاکھوں نفوس پر مشتمل تھا، اندرونی بغاوت پر آمادہ نہ ہو جائے بنی اسرائیل کو اُن مصائب میں مبتلا کرنا ضروری سمجھا جن کا ذکر توراۃ اور قرآن حکیم میں کیا گیا ہے [1]۔

[1] تورات سے بھی اس قیاس کی تائید ہوتی ہے، اُس میں کہا گیا ہے "اور اُس نے اپنے لوگوں سے کہا دیکھو کہ بنی اسرائیل کے لوگ ہم کو زیادہ اور قوی تر ہیں۔ آؤ ہم اُن سے دانشمندانہ معاہدہ کریں تا نہ ہو کہ جب وہ اور زیادہ ہوں اور جنگ پڑے تو وہ ہمارے دشمنوں سے مل جائیں اور ہم سے لڑیں اور ملک سے نکل جائیں۔ (خروج باب ۱ آیت ۱۰-۱۱)

رمسیس دوم اس زمانہ میں بہت مُسن اور معمر ہو چکا تھا، اس لیے اُس نے اپنی زندگی ہی میں اپنے بڑے بیٹے "منفتاح" کو شریکِ حکومت کر لیا تھا۔ رمسیس کی ڈیڑھ سو اولاد میں سے یہ تیرہواں لڑکا تھا۔

لہٰذا منفتاح ہی وہ "فرعون" ہے جس کو حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام نے اسلام کی دعوت دی اور بنی اسرائیل کی رہائی کا مطالبہ کیا، اور اسی کے زمانہ میں بنی اسرائیل مصر سے نکلے اور یہی غرقِ دریا ہوا، چونکہ اُس نے حضرت موسیٰ کو اپنے گھر میں پرورش پاتے دیکھا تھا اس لیے جب حضرتِ موسیٰ نے اس کو اسلام کا پیغام سنایا تو قرآنِ عزیز کے ارشاد کے مطابق اُس نے یہ طعنہ دیا۔

الم نربّك فينا وليدًا ولبثت فينا من عمرك سنين (شعراء) کیا ہم نے اپنے یہاں تیرے بچپن میں تیری پرورش نہیں کی؟ اور تو اپنی عمر کے چند سال ہم میں بسر کر چکا ہے

تورات میں ہے کہ خروج سے پہلے مصر کے بادشاہ کا انتقال ہو گیا، اس سے مُراد وہی رمسیس دوم ہے جو منفتاح کا باپ تھا۔

علامہ فلانڈرس نے ایک حجری کتبہ دریافت کیا ہے جس پر سیاہ حروف کندہ ہیں اور وہ ۵۹۹ سنہ مصری میں لکھا گیا ہے۔ یہ دراصل ایک بہت بڑی چٹان ہے جس کی بلندی ۳ میٹر[1] اور ۱۴ سم[2] ہے۔ "یہ کتبہ" دو وجہ سے معرضِ تحریر میں آیا تھا، ایک یہ کہ اُن تمام تفصیلات کو بیان کیا جائے جو اٹھارویں خاندان کے بادشاہ "امنحب" نے "معبدِ امون" کی خدمات کے متعلق انجام دی تھیں۔ اور دوسرے یہ کہ انیسویں خاندان کے بادشاہ "منفتاح" بن رمسیس دوم کی تعریف میں کچھ لکھا جائے، اس لیے اس کتبہ کی عبارت شاعرانہ

---

[1] ۱ میٹر = ۰۹۳ء۱ گز [2] سم (سینٹی میٹر) میٹر کا ۱/۱۰۰ حصہ

اسلوب پر لکھی گئی ہے اور منفتاح نے یوسین پر جو فتح حاصل کی تھی اُس کا بڑے فخر و مباہات کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ اور عسقلان، جیزر، یانوعیم جو فلسطین کے علاقہ کے مشہور شہر تھے اُن کے سقوط کی جانب اشارات کیے گئے ہیں۔

اسی کے ضمن میں بنی اسرائیل کے متعلق بھی مختصر عبارت میں اظہارِ خیال کیا گیا ہے اور یہ سب سے پہلا اثری نقش اور حفریاتِ مصری کا پہلا کتبہ ہے جس میں بنی اسرائیل کا صراحت کے ساتھ ذکر موجود ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے:۔

لقد سحق بنو اسرائیل ولم یبق لھم بذر۔	بنی اسرائیل تمام ہلاک ہوگئے اور اب اُن کی نسل کا خاتمہ ہوگیا۔

ایک باریک بیں اس عبارت کو دیکھ کر بآسانی یہ علم حاصل کر سکتا ہے کہ یہ تحریر "منفتاح" کے زمانہ میں نہیں لکھی گئی ورنہ تو مصری دستور کے مطابق بنی اسرائیل جیسے عظیم الشان قبیلہ کی ہلاکت کے واقعہ کو اس معمولی اور مختصر الفاظ میں درج نہ کیا جاتا بلکہ منفتاح کی شان میں بڑے زبردست قصیدہ کے ساتھ اس دشمن پر کامیابی کا اظہار کیا جاتا، اور جن واقعات پر اس کتبہ میں اشارہ کیا گیا ہے اُن کی اہمیت اور عظمت کا تقاضہ یہی تھا کہ وہ یونہی ضمنی طور پر اور وہ بھی سابق بادشاہ کے حالات سے متعلق کتبہ پر درج نہ کر دیے جاتے بلکہ اُن اہم واقعات کے لیے منفتاح کے زمانہ میں مستقل الگ ایک کتبہ اسی غرض سے تحریر کیا جاتا۔

مگر ایسا کیوں نہ ہوا؟ سو بات بہت واضح ہے وہ یہ کہ مصری کاہنوں کو اس واقعہ ہائلہ کی ہرگز توقع نہ تھی جو موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں "غرقِ فرعون" کی شکل میں ظاہر ہوا اور وہ "منفتاح" کی موت کے لیے اس عجلت کے متوقع نہ تھے، اُس زمانہ کی عمرِ طبعی کے

لحاظ سے ابھی کافی زمانہ تھا کہ منفتاح کے کاہن، مصری دستور کے مطابق اس انیسویں خاندان کے بادشاہ کے ان حالات کو مرتب کر کے لوح پر محفوظ کر دیں تاکہ وہ بادشاہ کے مقبر پر کندہ ہو سکے۔ اب جبکہ یہ واقعہ ہائلہ پیش آگیا تو اصل حقیقت کو چھپانے کی سعی کی گئی تاکہ آئندہ قبطی نسلیں اُس ذلت و رسوائی کو معلوم نہ کر سکیں جو اُن کے واجب الاحترام دینی عقائد پر خدا کی طرف سے سخت ضرب کا باعث بن چکی تھی۔

پس اُنہوں نے بے جا جسارت اور تاریخی بد دیانتی کے ساتھ حالات کو منقلب کر کے معاملہ کو بالکل مخالف شکل میں تحریر کر دیا اور بنی اسرائیل کی کامیاب واپسی وطن کو ان مسطورۂ بالا الفاظ میں ظاہر کیا تاکہ "غرقِ فرعون" کا قصہ آئندہ مصریوں کے سامنے باقی ہی نہ رہے۔

اس نتیجہ کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ مصری دستور کے مطابق ہر ایک بادشاہ کا مقبرہ جُدا ہوتا تھا اور اُس کے تمام حالات اور خصوصی نمایاں امتیازات کی تاریخ اور اُس کے زمانہ کی بعض شاہی اشیاء اور جواہرات اُس کے قبر کے ساتھ ہی محفوظ کر کے رکھی جاتی تھی لیکن منفتاح کی اُس شان کے باوجود جس کا مسطورہ بالا کتبہ میں اشارہ کیا گیا ہے نہ اُس کا علیحدہ مقبرہ بنایا گیا اور نہ وہ تمام رسوم انجام پا سکیں جو ہمیشہ بادشاہوں کے لیے ضروری سمجھی جاتی تھیں بلکہ اس کو عجلت کے ساتھ "امنحب" کے مقبرہ ہی میں دفن کر دیا گیا اور اٹھارہویں خاندان کے بادشاہ اور انیسویں خاندان کے بادشاہ کی نعشیں ایک ہی جگہ جمع کر دی گئیں[1]۔

مصری عجائب خانہ میں یہ نعش آج بھی محفوظ ہے اور قرآنِ عزیز کے اس کلام بلاغت نظام

---

[1] قصص الانبیاء "نجار" ص ۲۳۹-۲۴۱۔

کی تصدیق کر رہی ہے۔

فالیوم ننجیك ببدنك لتکون لمن خلفك آیۃ ۔ پس آج کے دن ہم تیرے جسم کو (دریا سے نجات دینگے تاکہ وہ تیرے بعد آنیوالوں کے لیے (خدا کا) نشان رہے

اور محمد احمد عدوی کتاب "دعوۃ الرسل الی اللہ" میں لکھتے ہیں کہ اس نعش کی ناک کے سامنے کا حصہ ندارد ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی حیوان کا کھایا ہوا ہے غالباً دریائی مچھلی نے خراب کیا ہے اور پھر اس کی نعش خدائی فیصلہ کے مطابق کنارہ پر پھینکدی گئی[1]

ان نقول کے لیے کسی شرح کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ یہ یورپ کے اُن مقلدین کے لیئے ضرور سرمایۂ صد عبرت ہیں جو جلد بازی کے ساتھ مستشرقین کی ہر ایک تحقیق پر بغیر کسی پس و پیش کے آمنا و صدقنا کہہ دینے کے عادی ہیں، جو قرآن اور خدا کے نبی کے احکام پر شک کر سکتے ہیں اور کرتے رہتے ہیں مگر یوروپین مورخین، اور مستشرقین کی تحقیقاتِ علمی کو وحی الٰہی سے زیادہ سمجھتے ہیں، جو اپنے علماءِ اسلام کی تقلید کو حرام جانتے مگر علماءِ یورپ کے ہر نوشتہ کو نوشتۂ الٰہی یقین کرتے ہیں۔

چنانچہ جب یورپ کے مورخینِ جدید نے یہ دعویٰ کیا کہ حضرت یوسف اور حضرت موسیٰ (علیہما السلام) اور فراعنۂ مصر کے درمیان جو واقعات تورات و قرآنِ عزیز سے ثابت ہوتے ہیں وہ تاریخی معیار پر اس لیے غلط اور بے اصل ہیں کہ مصری "حفریات و اثریات" میں ان اہم اور عظیم الشان حالات و واقعات کا اشارہ تک نہیں پایا جاتا حالانکہ یہ مسلم ہے کہ مصری اپنی تاریخ کی تدوین میں بہت زیادہ چست و چالاک اور سب سے پیش پیش ثابت ہوئے ہیں اور آج اُن کے اس طرزِ عمل کی بدولت تین ہزار قبل مسیح کے حالات کی صحیح تاریخ مرتب ہو سکی ہے"

---

[1] دعوۃ الرسل الی اللہ ص ۱۸۱ ۔

تو اس دعویٰ کی کورانہ تقلید میں ہندوستان کے بعض یورپ زدہ مسلمانوں نے بھی ان واقعات کی صحت سے انکار کردیا اور خدا کی "سچی وحی" سے اعراض کرتے ہوئے ان تخمینی قیاسات کو یقین اور الہامی نوشتہ کی حیثیت دی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

لیکن آج جبکہ مصری حفریات و اثریات میں صراحت کے ساتھ اُس زمانہ کے فرعون اور بنی اسرائیل کی عداوت کا حال روشنی میں آچکا ہے اور مسطورہ بالا ترتیبی واقعات خود بخود ان حقائق کو سامنے لے آتے ہیں جن کا ذکر قرآنِ عزیز میں موجود ہے تو اب نہ معلوم جلدبازی سے انکار کرنے والے ان مدعیانِ علم کی علمی روش کیا صورت اختیار کریگی؟ اپنی نادانی اور کورانہ تقلید کی پردہ دری کے خوف سے انکار پر اصرار، یا حقیقت کے اقرار کے ساتھ ساتھ پیغمبرِ خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بتائی ہوئی راہِ یقین (وحی الٰہی) کے سامنے اظہار ندامت و تاسف؟

بہرحال وہ اپنا معاملہ جو کچھ بھی رکھیں یہ ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ اذعان اور یقین کی جو راہ "وحی الٰہی" یعنی قرآن عزیز کے ذریعہ حاصل ہوچکی ہے، اُس کو ذرہ برابر اپنی جگہ سے ہٹنے کی ضرورت پیش نہیں آئیگی اور استقراء و قیاس سے حاصل شدہ علم اُس وقت تک برابر گردش میں رہیگا جب تک قرآنی صداقت پر آکر نہ ٹھہر جائے۔

فرعون کا خواب تورات اور مورخین کہتے ہیں کہ فرعون کو بنی اسرائیل کے ساتھ اس لیے عداوت ہوگئی تھی کہ اُس زمانہ کے کاہنوں، نجومیوں اور قیافوں نے اُس کو بتایا تھا کہ تیری حکومت کا زوال ایک اسرائیلی لڑکے کے ہاتھ سے ہوگا اور بعض تاریخی روایات میں ہے کہ فرعون نے ایک بھیانک خواب دیکھا تھا جس کی تعبیر دربار کے منجموں اور کاہنوں نے دہی دی تھی جس کا ذکر ابھی گذر چکا ہے۔ مفسرین نے بھی ان ہی روایات کو کتبِ تفسیر میں نقل فرمایا ہے۔ تورات میں یہ اور اضافہ ہے کہ فرعون نے "دایہ" مقرر کردی تھیں کہ قلمروِ مصر میں جس اسرائیلی کے یہاں

لڑکا پیدا ہو اُس کو قتل کر دیا جائے مگر اُن عورتوں کے دلوں میں ایسی ہمدردی پیدا ہوئی کہ اُنھوں نے اس عمل کے لیے کوئی اقدام نہیں کیا، اور جب فرعون نے باز پرس کی تو یہ معذرت پیش کی کہ اسرائیلی عورتیں شہری عورتوں کی طرح نازک اندام نہیں ہیں وہ خود ہی بچہ جن لیتی ہیں اور ہم کو مطلق خبر نہیں دیتیں۔ اس پر فرعون نے ایک جماعت کو اس لیے مقرر کیا کہ وہ تفتیش اور تلاش کے ساتھ اسرائیلی لڑکوں کو قتل کر دیں اور لڑکیوں کو چھوڑ دیا کریں۔[1]

حضرت موسیٰ اور ہارون کا ذکر قرآن میں

قرآنِ عزیز میں حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کا ذکر بے شمار مقامات میں آیا ہے، چونکہ اُن کے بیشتر حالات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک حالات سے بہت زیادہ مطابقت رکھتے ہیں، اور ان واقعات میں غلامی اور آزادی کے باہم معرکہ آرائی اور حق و باطل کے مقابلہ کی بے نظیر داستان ودیعت ہے نیز اُن کے اندر بصائر و مواعظ کا نادر ذخیرہ جمع ہے، اس لیے قرآنِ عزیز نے حسب ضرورت اور حسب موقع و محل جگہ جگہ اس قصہ کے اجزاء کو مجمل اور مفصل طریقہ پر بیان کیا ہے۔

مندرجہ ذیل نقشہ سے اعداد و شمار کے ساتھ ساتھ اس واقعہ کی اہمیت کا بھی صحیح اندازہ ہو سکیگا۔ اور اس اولوالعزم پیغمبر کی عظمتِ شان کا بھی۔

اس نقشہ کے دو حصّے ہیں پہلے حصّہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ یا بنی اسرائیل اور فرعون کے واقعات کن کن سورتوں اور کتنی آیات میں مذکور ہیں، اور دوسرا حصّہ یہ واضح کرتا ہے کہ قرآنِ عزیز میں حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کے نامہائے مبارک کتنی جگہ

---

[1] خروج باب ۱ آیات ۱۵-۲۲۔

مذکور ہیں اور اُن کی مجموعی تعداد کیا ہے ؟

نقشہ (۱)

سورة	آیات	شمار	سورة	آیات	شمار
بقرہ	۴۷ تا ۶۱، ۶۳ تا ۷۵، ۸۳ تا ۸۷		طٰہٰ	۹ تا ۹۸	۹۰
	۹۲ تا ۹۳، ۱۰۸، ۱۳۶، ۲۴۳		انبیار	۴۸، ۴۹	۲
	۲۵۱ ۔	۶۵	مؤمنون	۴۵ تا ۴۹	۵
نسار	۱۵۳ تا ۱۵۶، ۱۶۴	۱۲	فرقان	۳۵، ۳۶	۲
مائدہ	۱۲، ۱۳، ۲۰ تا ۲۵، ۳۲، ۴۵		شعراء	۱۰ تا ۶۶	۵۷
	۷۰، ۷۱، ۷۸، ۷۹ ۔	۳۷	نمل	۷ تا ۱۴	۸
انعام	۴۸ تا ۹۰، ۱۴۶، ۱۵۴، ۱۵۹	۲۱	قصص	۳ تا ۴۸	۴۶
اعراف	۱۰۳ تا ۱۵۷، ۱۵۹ تا ۱۷۱	۶۷	عنکبوت	۳۹، ۴۰	۲
انفال	۵۴	۱	سجدہ	۲۳-۲۴	۲
یونس	۷۴ تا ۹۳	۲۰	احزاب	۶۹	۱
ہود	۹۶ تا ۹۹، ۱۱۰	۱۵	الصّٰفّٰت	۱۱۴ تا ۱۲۲	۹
ابراہیم	۵، ۶، ۸	۳	مؤمن	۲۳ تا ۴۵	۲۰
نحل	۱۲۴	۱	زخرف	۴۶ تا ۵۶	۲۱
بنی اسرائیل	۲ تا ۷، ۱۰۱ تا ۱۰۴	۱۱	دخان	۱۷ تا ۳۳	۱۷
کہف	۶۰ تا ۸۲	۲۳	جاثیہ	۱۶، ۱۷	۲
مریم	۵۱ تا ۵۳	۳	الذاریات	۳۸ تا ۴۰	۳

سورۃ	آیات	شمار	سورۃ	آیات	شمار
قمر	۴۱ تا ۵۵	۱۵	الحاقہ	۹-۱۰	۲
صف	۵	۱	مزمل	۱۵-۱۶	۲
جمعہ	۵-۶	۲	النزعت	۱۵ تا ۲۵	۱۱
تحریم	۱۱	۱	فجر	۱۰ تا ۱۳	۴
					۵۱۴

نقشہ (۲)

نام		نام		نام		نام	
موسیٰ (علیہ السلام)		ہارون (علیہ السلام)		موسیٰ (علیہ السلام)		ہارون (علیہ السلام)	
سورۃ	شمار	سورۃ	شمار	سورۃ	شمار	سورۃ	شمار
بقرہ	۱۲	بقرہ	۱	کہف	۲	۰	۰
نساء	۲	نساء	۱	مریم	۱	۰	۰
مائدہ	۲	۰	۰	طٰہٰ	۱۴	طٰہٰ	۳
انعام	۲	انعام	۱	انبیاء	۱	انبیاء	۱
اعراف	۱۶	اعراف	۱	مؤمنون	۲	مومنون	۱
یونس	۸	یونس	۱	فرقان	۱	فرقان	۱
ہود	۲	۰	۰	شعراء	۸	شعراء	۲
ابراہیم	۳	۰	۰	نمل	۳	۰	۰
بنی اسرائیل	۳	۰	۰	قصص	۱۴	قصص	۱

نام		نام		نام		نام	
موسیٰ (علیہ السلام)		ہارون (علیہ السلام)		موسیٰ (علیہ السلام)		ہارون (علیہ السلام)	
سورۃ	شمار	سورۃ	شمار	سورۃ	شمار	سورۃ	شمار
سجدہ	۱	۰	۰	زخرف	۱	۰	۰
احزاب	۱	۰	۰	ذٰرٰیت	۱	۰	۰
صٰفّٰت	۲	۰	۰	صف	۱	۰	۰
مؤمن	۴	۰	۰	النّٰزعٰت	۱	۰	۰
					۱۰۸		۱۶

نسب ولادت حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کا نسب چند واسطوں سے حضرت یعقوب (علیہ السلام) تک پہنچتا ہے، ان کے والد کا نام عمران اور والدہ کا نام یوکابد تھا، باپ کا سلسلہ نسب یہ ہے عمران بن قاہت بن لاوی بن یعقوب (علیہ السلام) اور حضرت ہارون (علیہ السلام) حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے حقیقی اور بڑے بھائی تھے۔

عمران کے گھر میں موسیٰ (علیہ السلام) کی ولادت ایسے زمانہ میں ہوئی جبکہ فرعون اسرائیلی لڑکوں کے قتل کا فیصلہ کر چکا تھا اس لیے اُنکی والدہ اور اہل خاندان اُن کی ولادت کے وقت سخت پریشان تھے کہ کس طرح بچہ کو قاتلوں کی نگاہ سے محفوظ رکھیں؟ بہر حال جوں توں کر کے تین مہینے تک اُن کو ہر ایک کی نگاہ سے اوجھل رکھا اور اُن کی پیدائش کی مطلق کسی کو خبر نہ ہونے دی لیکن جاسوسوں کی دیکھ بھال اور حالات کی نزاکت کی وجہ سے زیادہ دیر تک اس واقعہ کے پوشیدہ رہنے کی توقع نہ ہو سکی، اور اس لیے اُن کی والدہ سخت پریشان رہنے لگیں۔[1]

[1] خروج باب ۲ آیت ۲۰۔

اس سخت اور نازک وقت میں آخر خدائے تعالیٰ نے مدد کی اور موسیٰ (علیہ السلام) کی والدہ کے دل میں یہ القاء کیا کہ ایک تابوت کی طرح کا صندوق بناؤ جس پر رال اور روغن کی پالش کرو تاکہ پانی اندر اثر نہ کر سکے، اور اُس میں اس بچہ کو محفوظ رکھ دو اور پھر اُس صندوق کو نیل کے بہاؤ پر چھوڑ دو۔

موسیٰ (علیہ السلام) کی والدہ نے ایسا ہی کیا اور ساتھ ہی اپنی بڑی لڑکی اور موسیٰ (علیہ السلام) کی ہمشیر کو مامور کیا کہ وہ اس صندوق کے بہاؤ کے ساتھ کنارہ کنارہ چل کر صندوق کو نگاہ میں رکھے اور دیکھے کہ خدا اس کی حفاظت کا وعدہ کس طرح پورا کرتا ہے۔ کیونکہ موسیٰ (علیہ السلام) کی والدہ کو خدائے تعالیٰ نے یہ بشارت پہلے ہی سُنا دی تھی کہ ہم اس بچہ کو تیری ہی جانب واپس کر دینگے اور یہ ہمارا پیغمبر اور رسول ہوگا۔

فرعون کے گھر میں تربیت

حضرتِ موسیٰ کی ہمشیر برابر صندوق کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ کنارہ کنارہ نگہداشت کرتی جا رہی تھیں کہ اُنھوں نے دیکھا کہ صندوق تیرتے ہوئے شاہی محل کے کنارے آ لگا۔ اور فرعون کے گھرانے میں سے ایک عورت نے اپنے خادموں کے ذریعہ اُس کو اُٹھوا لیا اور شاہی محل میں لے گئی۔ حضرت موسیٰ کی ہمشیر یہ دیکھ کر بہت خوش ہوئیں اور حالات کی صحیح تفصیل معلوم کرنے کے لیے شاہی محل کی خاداؤں میں شامل ہوگئیں۔

قرآنِ عزیز نے اس شاہی خاندان کی عورت کو "فرعون کی بیوی بتایا ہے اور تورات کے حصۂ "خروج" میں اس کو فرعون کی بیٹی کہا ہے، مگر مورخین اس اختلاف کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے اور کہتے ہیں کہ یہ ہو سکتا ہے کہ پانی میں بہتے ہوئے صندوق کو فرعون کی بیٹی نے اُٹھایا ہو اور پھر بیٹا بنانے کی آرزو اور فرعون سے اُس بچہ کے قتل نہ کرنے اور خود پالنے کی خواہش کا اظہار اور فرعون سے سفارش فرعون کی بیوی (آسیہ) نے کی ہو۔

قرآن کریم کے اسلوب بیان سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کیونکہ اُس نے موسیٰ کو دریا سے نکالنے والے کے متعلق کہا ہے "فالتقطه آل فرعون" اُس کو اُٹھایا فرعون کے گھر والوں نے) اور بیٹا بنانے کی آرزو، اور اُس کے قتل نہ کرنے کی سفارش کرنے والے کے متعلق فرمایا "وقالت امراۃ فرعون" اور فرعون کی بیوی نے کہا حضرت ابن عباسؓ سے یہی منقول ہے[1]

بہرحال فرعون کے گھر والوں نے جب صندوق کھولا تو دیکھا کہ ایک حسین اور تندرست بچہ آرام سے لیٹا ہوا انگوٹھا چوس رہا ہے، فرعون کی بیٹی فوراً اُس کو محل میں لے گئی، فرعون کی بیوی نے بچہ کو دیکھا تو باغ باغ ہوگئی اور انتہائی محبت سے اُس کو پیار کیا، محل کے شاگرد پیشہ میں سے کسی نے کہا کہ یہ تو اسرائیلی معلوم ہوتا ہے اور ہمارے دشمنوں کے خاندان کا بچہ ہے اس کا قتل کر دینا ضروری ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ یہی ہمارے بادشاہ کے خواب کی تعبیر ثابت ہو؟ اس بات کو سُن کر فرعون کو بھی خیال پیدا ہوا، فرعون کی بیوی نے شوہر کے تیور دیکھے تو کہنے لگی کہ ایسے پیارے بچہ کو قتل نہ کرو، کیا عجب کہ یہ میرے اور تیرے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک بنے یا ہم اس کو اپنا بیٹا ہی بنالیں اور ہمارے لیے اس کا وجود نفع بخش ثابت ہو۔ یعنی اگر یہ وہی اسرائیلی بچہ ثابت ہو جو تیرے خواب کی تعبیر بننے والا ہے تو ہماری محبت اور آغوش تربیت شاید اس کو مضر ہونے کی بجائے مفید ثابت کر دے۔ مگر فرعون اور اُس کے خاندان کو یہ کیا معلوم کہ خدا کی تقدیر اُن پر ہنس رہی ہے کہ رب العلمین کی کرشمہ سازی دیکھو کہ تم اپنی نادانی اور بے خبری میں اپنے دشمن کی پرورش پر نگراں مقرر کیے گئے ہو۔

غرض اب یہ سوال پیدا ہوا کہ بچہ کے لیے دودھ پلائی مقرر کی جائے، مگر خدائے تعالیٰ نے موسیٰ کی والدہ سے کیے گئے وعدہ کو پورا کرنے کے لیے بچہ کی طبیعت میں یہ بات

[1] روح المعانی جلد ۲۰ سورۂ قصص۔

پیدا کردی کہ وہ کسی عورت کے پستان کو منہ ہی نہیں لگاتا، شاہی دایہ تھک کر بیٹھ گئیں مگر موسیٰ نے کسی ایک پستان سے بھی دودھ نہ پیا، یہ سارا حال موسیٰ (علیہ السلام) کی ہمشیر "مریم" دیکھ رہی تھیں، کہنے لگیں اگر اجازت ہو تو میں ایک ایسی دایہ کا پتہ بتاؤں جو نہایت نیک اور اس خدمت کے لیے بہت موزوں ہے، بلکہ حکم ہو تو میں خود اس کو ساتھ لے کر آؤں؟ فرعون کی بیوی نے دایہ کو لانے کا حکم دے دیا اور موسیٰ (علیہ السلام) کی ہمشیر خوش خوش گھر کو روانہ ہوئیں کہ والدہ کو لے کر آئیں۔

شاہ عبدالقادر دہلوی رحمہ اللہ موضح القرآن میں فرماتے ہیں "فرعون کی عورت تھی اسرائیل میں کی حضرت موسیٰ کے چچا کی بیٹی اس لفظ سے وہ پہچان گئی کہ لڑکا ان کا ہے"۔[1]

یہاں یہ گفتگو ہو رہی تھی اور موسیٰ (علیہ السلام) کی والدہ کا اُدھر بُرا حال تھا۔ ایک الہامی خیال سے بچہ کو سپردِ دریا تو کر آئیں مگر ماں کی مامتا نے زور کیا اور بیچین ہو کر اس پر آمادہ ہو گئیں کہ اپنے اس راز کو افشا کر دیں۔ اِسی اضطراب اور بیچینی کی حالت میں خدائے تعالیٰ نے اُن پر اپنے فضل و کرم کی بارش کی اور اُن کے قلب میں اطمینان و سکون نازل کیا، اب یہ لطیفۂ غیبی کے انتظار میں چشم براہ تھیں کہ لڑکی نے آکر پوری داستان کہہ سنائی اور بتایا کہ جب موسیٰ نے کسی دایہ کا بھی دودھ نہ پیا تو میں نے کہا اسرائیلی قبیلہ میں ایک نہایت شریف اور نیک عورت ہے وہ اس بچہ کو اپنی اولاد کی طرح پرورش کر سکتی ہے؟ فرعون کی بیوی نے یہ سُن کر مجھ کو حکم دیا ہے کہ فوراً آپ کو لے کر آؤں، یہ ہم پر خدا کا بڑا احسان اور فضل و کرم ہوا، اب تم چل کر اپنے بچہ کو سینہ سے لگاؤ اور آنکھیں ٹھنڈی کرو اور اُس کا شکر ادا کرو کہ اُس نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔

---

[1] مفسرین نے فرعون کی اس بیوی کا نام "آسیہ" بتایا ہے، اور قرآن عزیز امراۃ فرعون کو مؤمنہ قرار دیتا ہے، بایں ہمہ یہ قول کہ وہ اسرائیلی تھیں اور حضرت موسیٰ کی چچا زاد بہن ضعیف ہے۔ صحیح یہ ہے کہ وہ فرعون ہی کے خاندان سے تھیں۔
(روح المعانی جلد ۲۰ ص ۴۱)

اردو	عربی
اور ہم نے حکم بھیجا موسیٰ کی ماں کو کہ اُس کو دودھ پلاتی	وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى اَنْ اَرْضِعِيْهِ
رہ پھر جب تجھ کو ڈر ہو اُس کا تو ڈال دے اُس کو دریا	فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِى الْيَمِّ
میں اور نہ خطرہ کر اور نہ غمگین ہو۔ ہم پھر پہنچا دینگے اُس کو	وَلَا تَخَافِىْ وَلَا تَحْزَنِىْ اِنَّا رَآدُّوْهُ
تیری طرف اور کرینگے اُس کو رسولوں سے۔ پھر اُٹھا	اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ
لیا اُس کو فرعون کے گھر والوں نے کہ ہو اُن کا دشمن	فَالْتَقَطَهٗٓ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ
اور غم میں ڈالنے والا بیشک فرعون اور ہامان اور	لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا اِنَّ فِرْعَوْنَ
ان کے لشکر تھے چوکنے والے اور بولی فرعون کی	وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا كَانُوْا خٰطِئِيْنَ
عورت یہ تو آنکھوں کی ٹھنڈک ہے میرے لیے اور تیرے	وَقَالَتِ امْرَاَتُ فِرْعَوْنَ قُرَّتُ
لیے اس کو مت مارو کچھ بعید نہیں جو ہمارے کام آئے	عَيْنٍ لِّيْ وَلَكَ لَا تَقْتُلُوْهُ عَسٰٓى
یا ہم اس کو بنالیں بیٹا، اور اُن کو کچھ خبر نہ تھی اور صبح کو	اَنْ يَّنْفَعَنَآ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا وَّهُمْ
موسیٰ کی ماں کے دل میں قرار نہ رہا۔ قریب تھی کہ	لَا يَشْعُرُوْنَ ۔ وَاَصْبَحَ فُؤَادُ
ظاہر کر دے بیقراری کو اگر نہ ہم مضبوط کر دیتے اُس کے	اُمِّ مُوْسٰى فٰرِغًا اِنْ كَادَتْ
دل کو تا کہ .... رہے یقین کرنے والوں میں	لَتُبْدِيْ بِهٖ لَوْلَآ اَنْ رَّبَطْنَا
اور کہہ دیا اُس کی بہن کو پیچھے چلی جا۔ پھر دیکھتی رہی	عَلٰى قَلْبِهَا لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ
اُس کو اجنبی ہو کر اور اُن کو خبر نہ ہوئی، اور روک رکھا	وَقَالَتْ لِاُخْتِهٖ قُصِّيْهِ فَبَصُرَتْ
تھا ہم نے موسیٰ سے دائیوں کو پہلے سے۔ پھر	بِهٖ عَنْ جُنُبٍ وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ
بولی میں بتلاؤں تم کو ایک گھر والے کہ اُس کو	وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ مِنْ قَبْلُ
پال دیں تمہارے لیے اور وہ اُس کا بھلا چاہتے	فَقَالَتْ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰٓى اَهْلِ
والے ہیں۔ پھر ہم نے پہنچا دیا اُس کو اُس کی	بَيْتٍ يَّكْفُلُوْنَهٗ لَكُمْ وَهُمْ لَهٗ

نَاصِحُوْنَ ۔ فَرَدَدْنٰهُ اِلٰٓى اُمِّهٖ كَىْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ وَلِتَعْلَمَ اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۔ (القصص)

ماں کی طرف کہ ٹھنڈی رہے اُس کی آنکھ اور غمگین نہ ہو اور جانے کہ اللہ کا وعدہ ٹھیک ہے۔ پر بہت لوگ نہیں جانتے ۔

وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً اُخْرٰٓى ۔ اِذْ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّكَ مَا يُوْحٰٓى ۙ اَنِ اقْذِفِيْهِ فِى التَّابُوْتِ فَاقْذِفِيْهِ فِى الْيَمِّ فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ يَاْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّىْ وَعَدُوٌّ لَّهٗ ؕ وَاَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّىْ ۚ وَلِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِىْ ۘ اِذْ تَمْشِىْٓ اُخْتُكَ فَتَقُوْلُ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى مَنْ يَّكْفُلُهٗ ؕ فَرَجَعْنٰكَ اِلٰٓى اُمِّكَ كَىْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ ؕ

(طٰہٰ)

اور (تجھے معلوم ہے) ہم تجھ پر پہلے بھی ایک مرتبہ کیا احسان کر چکے ہیں؟ ہم تجھے بتاتے ہیں، اُس وقت کیا ہوا تھا جب ہم نے تیری ماں کے دل میں بات ڈال دی تھی۔ ہم نے اُسے سجھایا تھا کہ بچہ کو ایک صندوق میں ڈال دے، وہ صندوق کو دریا میں چھوڑ دے۔ دریا اُسی کنارے پر دھکیل دیگا۔ پھر اُسے وہ اُٹھا لیگا جو میرا (یعنی میری قوم کا) دشمن ہے۔ نیز اس بچہ کا بھی دشمن۔ اور (اے موسیٰ!) ہم نے اپنے فضل خاص سے تجھ پر محبت کا سایہ ڈال دیا تھا (کہ اجنبی بھی تجھ سے محبت کرنے لگے) اور یہ اس لیے تھا کہ ہم چاہتے تھے تو ہماری نگرانی میں پرورش پائے۔ تیری بہن جب وہاں سے گذری، تو (یہ ہماری ہی کارفرمائی تھی کہ) اُس نے (فرعون کی لڑکی سے) کہا: میں تمہیں ایسی عورت بتلا دوں جو اسے پالے پوسے؟ اور اس طرح ہم نے تجھے پھر تیری ماں کی گود میں لوٹا دیا کہ اس کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں اور (بچے کی جدائی سے) غمگین نہ ہو۔

توراۃ میں ہے کہ جب موسیٰ (علیہ السلام) کی والدہ نے موسیٰ کا دودھ چھڑایا تو اُنھوں نے اُن کو فرعون کی بیٹی کے سپرد کر دیا، اور اُس کے بعد عرصہ تک وہ شاہی محل میں زیرِ تربیت رہے اور وہیں نشو و نما پائی، مگر توراۃ کا یہ کہنا واقعہ کے بالکل خلاف ہے کہ موسیٰؑ فرعون کی لڑکی کے بیٹے بنے۔

جب لڑکا بڑھا وہ اُسے فرعون کی بیٹی پاس لائی اور وہ اُس کا بیٹا ٹھہرا اور اُس نے اُس کا نام موسیٰ (عبرانی موشی) رکھا اور کہا۔ اس سبب سے کہ میں نے اُسے پانی سے نکالا[1]۔

موسیٰ کا مصر سے نکلنا

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) ایک عرصہ تک شاہی تربیت میں بسر کرتے کرتے شباب کے دور میں داخل ہوئے تو نہایت قوی الجثہ اور بہادر جوان نکلے، چہرہ سے رعب ٹپکتا، اور گفتگو سے ایک خاص وقار اور شانِ عظمت ظاہر ہوتی تھی۔ اُن کو یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ وہ اسرائیلی ہیں اور مصری خاندان سے اُن کا کوئی رشتہ قرابت نہیں ہے۔ اُنھوں نے یہ بھی دیکھا کہ بنی اسرائیل پر سخت مظالم ہو رہے ہیں اور وہ مصر میں نہایت ذلت اور غلامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں، یہ دیکھ دیکھ کر اُن کا خون کھولنے لگتا، اور موقعہ بہ موقعہ عبرانیوں کی حمایت و نصرت میں پیش پیش ہو جاتے

طبریؒ نے اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے کہ جب موسیٰ (علیہ السلام) جوان ہو گئے اور قوی ہیکل جوان ثابت ہوئے تو عبرانیوں کے معاملات میں اُن کی نصرت و حمایت کا یہ اثر ہوا کہ مصری گماشتوں کے مظالم عبرانیوں پر کم ہونے لگے[2]۔

اور اس میں شک نہیں کہ موسیٰ (علیہ السلام) کا بنی اسرائیل کی ذلت و غلامی پر غم و غصہ اور اُن کی حمایت و نصرت کا عمیق اور بے پناہ جذبہ ایک فطری اور قدرتی جذبہ تھا۔

اب اللہ تعالیٰ کی عطاء و نوال کا ہاتھ اور آگے بڑھا اور جسمانی طاقت و قوت کے ساتھ اُس نے اُن کو زیورِ علم و حکمت سے بھی نوازا اور سن رشد کو پہنچ کر اُن کی قوتِ فیصلہ اور دقتِ علم و نظر بھی عروج

---

[1] خروج باب ۱ آیت ۱۰ [2] [illegible]

تک پہنچ گئے اور اس طرح اُن کو جسمانی و روحانی تربیت کا کمال حاصل ہو گیا۔

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰٓى اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ (قصص)

اور جب (موسیٰ) پہنچا اپنے زور پر اور سنبھلا تو بخشا ہم نے اُس کو (قوت) فیصلہ اور علم، اور اس طرح ہم نیکو کاروں کو بدلا دیا کرتے ہیں۔

غرض حضرتِ موسیٰ شہر میں گشت کرتے ہوئے اکثر ان حالات کا مشاہدہ کرتے رہتے اور گاہے گاہے بنی اسرائیل کی مدد کرتے۔

ایک مرتبہ شہری آبادی سے ایک کنارہ جا رہے تھے کہ دیکھا ایک مصری ایک اسرائیلی کو بیگار کے لیے گھسیٹ رہا ہے، اسرائیلی نے موسیٰ علیہ السلام کو دیکھا تو لگا فریاد کرنے اور مدد چاہنے، حضرت موسیٰ کو مصری کی اس جابرانہ حرکت پر سخت غصہ آیا اور اُس کو باز رکھنے کی کوشش کی، مگر مصری نہ مانا، موسیٰ علیہ السلام نے غصہ میں آکر ایک طمانچہ رسید کر دیا، مصری اس ضرب کو برداشت نہ کر سکا اور اُسی وقت مر گیا، حضرت موسیٰ نے یہ دیکھا تو بہت افسوس کیا کیونکہ اُن کا ارادہ ہرگز اُس کے قتل کا نہ تھا، اور ندامت و شرمندگی کے ساتھ دل میں کہنے لگے کہ بلا شبہ یہ کارِ شیطان ہے۔ وہی انسان کو ایسی غلط راہ پر لگاتا ہے۔ اور خدائے تعالیٰ کی درگاہ میں عرض کرنے لگے کہ یہ جو کچھ ہوا نادانستگی میں ہوا، میں تجھ سے مغفرت کا خواستگار ہوں خدا نے بھی اُن کی غلطی کو معاف کر دیا اور مغفرت کی بشارت سے نوازا۔ اور شہر میں مصری کے قتل کی خبر شائع ہو گئی مگر قاتل کا کچھ پتہ نہ چلا، آخر مصریوں نے فرعون کے پاس استغاثہ کیا کہ یہ کام کسی اسرائیلی کا ہے لہذا آپ دادرسی فرمائیے۔ فرعون نے کہا کہ اس طرح ساری قوم سے تو بدلہ نہیں لیا جا سکتا تم قاتل کا پتہ لگاؤ، میں ضرور اُس کو کیفر کردار تک پہنچاؤں گا۔

سوءِ اتفاق کہیے یا حُسنِ اتفاق کہ دوسرے دن بھی حضرت موسیٰ شہر کے آخری کنارہ پر سیر فرمارہے تھے کہ دیکھا وہی اسرائیلی ایک قبطی سے جھگڑ رہا ہے اور قبطی غالب ہے موسیٰ علیہ السلام کو دیکھ کر کل کی طرح آج بھی اُس نے فریاد کی اور دادرسی کا خواستگار ہوا۔

اس واقعہ کو دیکھ کر حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے دوہری ناگواری محسوس کی، ایک جانب قبطی کا ظلم تھا اور دوسری جانب اسرائیلی کا شور و غوغا اور گذشتہ واقعہ کی یاد تھی۔ اسی جھنجھلاہٹ میں ایک طرف اُنھوں نے مصری کو باز رکھنے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور ساتھ ہی اسرائیلی کو بھی جھڑکتے ہوئے فرمایا "انك لغوی مبین" تو بھی بلاشبہ کھُلا ہوا گمراہ ہے۔ یعنی خواہ مخواہ جھگڑا مول لے کر داد فریاد کرتا رہتا ہے۔

اسرائیلی نے حضرت موسیٰ کو ہاتھ بڑھاتے، اور پھر اپنے متعلق ناگوار اور تلخ الفاظ کہتے سُنا تو یہ سمجھا کہ یہ مجھ کو مارنے کے لیے ہاتھ بڑھا رہے ہیں اور مجھ کو گرفت میں لینا چاہتے ہیں، اس لیے شرارت آمیز انداز سے کہنے لگا۔

اترید ان تقتلنی کما قتلت نفسًا بالامس۔ — جس طرح تو نے کل ایک جان (قبطی) کو ہلاک کر دیا تھا اسی طرح آج مجھ کو قتل کر دینا چاہتا ہے۔

مصری نے جب یہ سُنا تو اُسی وقت فرعونیوں سے جا کر ساری داستان کہہ سُنائی، اُنھوں نے فرعون کو اطلاع دی کہ مصری کا قاتل موسیٰ ہے۔ فرعون نے یہ سُنا تو جلاد کو حکم دیا کہ موسیٰ کو گرفتار کر کے حاضر کرے۔ مصریوں کے اس مجمع میں ایک معزز مصری وہ بھی تھا جو دل سے حضرت موسیٰ سے محبت رکھتا اور اسرائیلی مذہب کو حق جانتا تھا، یہ فرعون ہی کے خاندان کا فرد تھا اور دربار کا حاضر باش، اُس نے فرعون کا یہ حکم سُنا تو فرعونی جلادوں سے پہلے ہی دربار سے نکل کر دوڑتا ہوا حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی خدمت میں حاضر ہوا، اور اُن سے سارا قصہ بیان

کیا، اور اُن کو مشورہ دیا کہ اس وقت مصلحت یہی ہے کہ خود کو مصریوں کے پنجہ سے نجات دلائے اور کسی ایسے مقام میں ہجرت کر جائے جہاں ان کی دسترس نہ ہو سکے، حضرت موسیٰ نے اس کے مشورہ کو قبول فرمایا اور ارضِ مدین کی جانب خاموشی کے ساتھ روانہ ہو گئے۔

اس مقام پر یہ بات قابلِ غور ہے کہ قرآنِ عزیز نے اس شخص کے متعلق صرف اس قدر کہا ہے۔

وجاء رجل من اقصی المدینۃ یسعیٰ اور شہر کے آخری کنارہ سے ایک شخص دوڑتا ہوا آیا۔

مگر ہم نے اُس کے اوصاف میں "شریف" اور معزز کا اضافہ کر دیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآنِ حکیم نے اس آنیوالے شخص کے متعلق دو صفات بیان کی ہیں

(۱) وہ شہر کے آخری کنارے سے آیا تھا۔ اور عرب میں یہ مثل مشہور ہے کہ "الاطراف مسکنی الاشراف" (شہر کے کنارے شرفاء کے رہنے کی جگہ ہیں۔

(۲) اُس نے آکر حضرت موسیٰ سے یہ کہا " ان الملاء یأتمرون بك لیقتلوك" (مصری جماعت تیرے قتل کا مشورہ کر رہی ہے) اور یہ ظاہر ہے کہ یہ علم اُسی شخص کو ہو سکتا ہے جو فرعون اور اُس کے ارکان کے درمیان نمایاں حیثیت رکھتا ہو۔

وَدَخَلَ الْمَدِیْنَةَ عَلٰی حِیْنِ غَفْلَةٍ	اور آیا شہر کے اندر جس وقت بے خبر ہوئے تھے وہاں
مِّنْ اَهْلِهَا فَوَجَدَ فِیْهَا رَجُلَیْنِ	کے لوگ، پھر پائے اُس میں دو مرد لڑتے ہوئے یہ ایک
یَقْتَتِلٰنِ ۫ هٰذَا مِنْ شِیْعَتِهٖ وَهٰذَا	اس کے رفیقوں میں اور یہ دوسرا اُس کے دشمنوں
مِنْ عَدُوِّهٖ ۚ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِیْ	میں پھر فریاد کی اُس سے اُس نے جو تھا اُس کے
مِنْ شِیْعَتِهٖ عَلَی الَّذِیْ مِنْ	رفیقوں میں اس کی جو تھا اُس کے دشمنوں
عَدُوِّهٖ ۙ فَوَكَزَهٗ مُوْسٰی فَقَضٰی	میں پھر مُکّا مارا اُس کو موسیٰ نے پھر اُس کو تمام

عَلَيْهِ قَالَ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ ؕ	کر دیا۔ بولا یہ ہوا شیطان کے کام سے۔
اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ . قَالَ	بیشک وہ دشمن ہے بہکانے والا صریح
رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْ لِيْ	موسیٰ بولا اے میرے رب میں نے برا کیا اپنا سو بخش
فَغَفَرَ لَهٗ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ .	مجھ کو، پھر اس کو بخش دیا بیشک وہی ہے بخشنے والا مہربان
قَالَ رَبِّ بِمَآ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ فَلَنْ	بولا اے رب جیسا تو نے فضل کر دیا مجھ پر پھر میں کبھی
اَكُوْنَ ظَهِيْرًا لِّلْمُجْرِمِيْنَ . فَاَصْبَحَ	نہ ہونگا مددگار گنہگاروں کا۔ پھر صبح کو اٹھا اُس
فِي الْمَدِيْنَةِ خَآئِفًا يَّتَرَقَّبُ فَاِذَا	شہر میں ڈرتا ہوا انتظار کرتا ہوا پھر ناگہاں دیکھا جس نے
الَّذِي اسْتَنْصَرَهٗ بِالْاَمْسِ	کل مدد مانگی تھی وہ آج پھر فریاد کرتا ہے
يَسْتَصْرِخُهٗ ؕ قَالَ لَهٗ مُوْسٰى	اُس سے، کہا موسیٰ نے بیشک تو بے راہ ہے
اِنَّكَ لَغَوِيٌّ مُّبِيْنٌ . فَلَمَّآ	صریح۔ پھر جب چاہا کہ ہاتھ ڈالے اُس پر
اَرَادَ اَنْ يَّبْطِشَ بِالَّذِيْ هُوَ	جو دشمن تھا اُن دونوں کا۔ بول اُٹھا فریاد
عَدُوٌّ لَّهُمَا ۙ قَالَ يٰمُوْسٰٓى	کرنے والا اے موسیٰ کیا تو چاہتا ہے کہ خون کرے
اَنْ تُرِيْدُ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ جَبَّارًا فِي	میرا جیسے خون کرچکا ہے کل ایک جان کا تیرا
الْاَرْضِ وَمَا تُرِيْدُ اَنْ تَكُوْنَ	یہی جی چاہتا ہے کہ زبردستی کرتا پھرے ملک میں
مِنَ الْمُصْلِحِيْنَ . وَجَآءَ رَجُلٌ	اور نہیں چاہتا کہ ہو صلح کرا دینے والا۔ اور آیا شہر کے
مِّنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ يَسْعٰى قَالَ	پرلے سرے سے ایک مرد دوڑتا ہوا۔ کہا اے موسیٰ
يٰمُوْسٰٓى اِنَّ الْمَلَاَ يَاْتَمِرُوْنَ	دربار والے مشورہ کرتے ہیں تیرے متعلق کہ تجھ کو مار ڈالیں
بِكَ لِيَقْتُلُوْكَ فَاخْرُجْ اِنِّيْ	سو نکل جا میں تیرا بھلا چاہنے والا ہوں
لَكَ مِنَ النّٰصِحِيْنَ . فَخَرَجَ	پھر نکلا وہاں سے ڈرتا ہوا راہ دیکھتا

مِنْهَا خَآئِفًا يَّتَرَقَّبُ ۫ قَالَ رَبِّ نَجِّنِيْ | بولا اے رب بچالے مجھ کو اس قوم
مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۔ (قصص) | بے انصاف سے۔
وَقَتَلْتَ نَفْسًا فَنَجَّيْنٰكَ مِنَ الْغَمِّ | اور تو نے ایک شخص کو مار ڈالا پھر ہم نے تجھ کو غم سے نجات
وَفَتَنّٰكَ فُتُوْنًا ۔ (طٰہٰ) | دی اور جانچا تجھ کو ہمعمولی جانچنا۔

اس مقام پر قرآن عزیز اور توراۃ کے بیانات میں قدرے اختلاف پایا جاتا ہے۔

(۱) قرآن حکیم نے دوسرے دن کے جھگڑا کرنے والوں میں سے ایک کو عبرانی بتایا ہے اور دوسرے کو مصری (فرعونی) اور توراۃ دونوں کا عبرانی ہونا ظاہر کرتی ہے۔

(۲) توراۃ میں اس شخص کا کوئی ذکر نہیں ہے جس نے موسیٰ علیہ السلام کو فرعونیوں کے مشورہ کی اطلاع دی تھی۔

مگر ان دونوں باتوں کے متعلق "بلالحاظ جانبداری" عقل اور فطرت اسی جانب رہنمائی کرتی ہے کہ قرآن عزیز کی تفصیلات صحیح ہیں، اور اسی پر یقین رکھنا ضروری ہے۔ اس لیے کہ فرعون اور فرعونیوں کے نزدیک تو اسرائیلیوں کی جان کی کوئی وقعت ہی نہ تھی کہ موسیٰ (علیہ السلام) جیسی شاہی خاندان میں رہنے والے شخص کے مقابلہ میں قصاص کے طالب ہوتے اور دوسری بات توراۃ کے بیان پر ایک فطری اضافہ ہے جو علم و یقین کے ساتھ کیا گیا۔

موسیٰ اور ارض مدین حضرت شعیب (علیہ السلام) کے واقعات میں "مدین" کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے جب مصر سے روانہ ہونے کا ارادہ کیا تو اسی جگہ کو منتخب فرمایا مدین کی آبادی مصر سے آٹھ منزل پر واقع تھی[۱]۔ غالباً یہ انتخاب اس لیے کیا گیا کہ یہ قبیلہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے نزدیک کی قرابت رکھتا تھا، اس لیے کہ حضرت موسیٰ، حضرت اسحٰق بن ابراہیم (علیہما السلام) کی نسل سے ہیں اور یہ قبیلہ اسحٰق ؑ کے بھائی مدین بن ابراہیم (علیہما السلام)

---

[۱] طبری عن سعید بن جبیر جلد ۱ ص ۲۰۵۔

کی نسل سے۔

حضرت موسیٰ چونکہ فرعون کے خوف سے بھاگے تھے اس لیے اُن کے ہمراہ نہ کوئی رفیق اور رہنما تھا اور نہ زادِ راہ، اور تیز روی کی وجہ سے برہنہ پا تھے۔ طبری بروایت سعید بن جبیرؓ لکھتے ہیں کہ اس تمام سفر میں موسیٰ (علیہ السلام) کی خوراک درختوں کے پتوں کے علاوہ اور کچھ نہ تھی، اور برہنہ پا ہونے کی وجہ سے سفر کی طوالت نے پاؤں کے تلووں کی کھال تک اُڑا دی تھی، اس پریشان حالی میں موسیٰ (علیہ السلام) ارضِ مدین میں داخل ہوئے[1]۔

بارِ مدین

جب مدین کی سرزمین میں قدم رکھا تو دیکھا کہ کوئیں کے سامنے پانی کے حوض (پیاؤ) پر بھیڑ لگی ہوئی ہے اور جانوروں کو پانی پلایا جا رہا ہے مگر اس جماعت سے ذرا فاصلہ پر دو لڑکیاں کھڑی ہیں اور وہ اپنے جانوروں کو پانی پر جانے سے روک رہی ہیں۔

حضرت موسیٰ سمجھ گئے کہ یہاں بھی وہی سب ہو رہا ہے جو دنیا کی ظالم طاقتوں نے اختیار کر رکھا ہے اور خدائے برتر کے بہترین قانون کو توڑ کر قوموں کا سارا نظام ظلم کی بنیادوں پر قائم کر دیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ لڑکیاں کمزور اور ضعیف گھرانوں سے تعلق رکھتی ہیں تب ہی تو اس انتظار میں ہیں کہ قوی اور سرکش جب اپنے جانوروں کو سیراب کر چکیں اور ہر وارد و صادر پانی پر سے چلا جائے تو بچا کھچا پانی اُن کے جانوروں کا حصہ بنے۔ ہر قوی نے ضعیف کے لیے یہی قانون تجویز کر دیا ہے کہ ہر فائدہ میں وہ مقدم ہے اور ضعیف مؤخر اور قوی کا "اولش خور"

عرب کا مشہور شاعر عمرو بن کلثوم کہتا ہے:۔

ونشرب ان وردنا الماء صفوًا　　　ویشرب غیرنا کدرًا وطینًا

اور ہم جب کسی پانی پر آتے ہیں تو عمدہ اور صاف پانی ہمارے حصہ میں آتا ہے اور ہمارے

[1] جلد ا ص ۲۰۶

غیروں کے (جو ہم سے کمزور ہیں) حصہ میں گدلا پانی اور مٹی ہے۔

درحقیقت یہ شعر تنہا عمرو بن کلثوم اور اُس کے قبیلہ کی حالت کا نقشہ نہیں ہے بلکہ ساری دنیا کے ظالمانہ نظام کا ٹھیک ٹھیک آئینہ دار ہے

بہرحال حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے یہ حالت نہ دیکھی گئی اور آگے بڑھ کر لڑکیوں سے دریافت کیا "تم کیوں پانی نہیں پلاتیں پیچھے کس لیے کھڑی ہو؟" دونوں نے جواب دیا "ہم مجبور ہیں اگر جانوروں کو آگے لے کر بڑھتے ہیں تو یہ طاقتور زبردستی ہم کو پیچھے ہٹا دیتے ہیں، اور ہمارے والد بہت بوڑھے ہیں اُن میں اب یہ طاقت نہیں ہے کہ وہ ان کی مزاحمت کو دور کر سکیں، پس جب یہ سب پانی پلا کر واپس ہو جائینگے تب بچا ہوا پانی ہم پلا کر لوٹینگے، یہی ہمارا روز کا دستور ہے"

حضرتِ موسیٰ کو جوش آگیا اور آگے بڑھ کر تمام بھیڑ کو چیرتے ہوئے کوئیں پر جا پہنچے اور کوئیں کا بڑا ڈول اُٹھایا اور تنہا کھینچ کر لڑکیوں کے مویشیوں کو پانی پلا دیا، حضرت موسیٰ جب مجمع کو چیرتے ہوئے درّانہ گھسنے لگے تو اگرچہ لوگوں کو ناگوار گذرا مگر ان کی پُرجلال صورت اور جسمانی طاقت سے مرعوب ہو گئے، اور ڈول کو تنہا کھینچتے دیکھ کر اُسی قوت سے ہار مان گئے جس کے بل بوتہ پر کمزوروں اور ناتوانوں کو پیچھے ہٹا دیا کرتے، اور اُن کو اور اُن کی حاجات کو پامال کرتے رہتے تھے۔

بعض مفسرین نے بیان کیا ہے کہ موسیٰ (علیہ السلام) نے دیکھا کہ کوئیں کے مُنہ پر بہت بڑا پتھر ڈھکا ہوا ہے جو ایک جماعت کے متفقہ زور لگانے سے اپنی جگہ سے ہٹتا ہے، مگر وہ آگے بڑھے اور تنہا اُس کو ہٹا کر لڑکیوں کے مویشیوں کے لیے پانی بھر دیا، عبدالوہاب نجار کہتے ہیں کہ یہ قول قرآن حکیم کی تصریح کے خلاف ہے۔ قرآن کہتا ہے

وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ أُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُونَ. (قصص)	اور جب وہ مدین کے پانی پر پہنچے تو اُس پر ایک جماعت کو دیکھا کہ وہ پانی پلا رہی ہے

تو پھر یہ کیسے صحیح ہوسکتا ہے کہ کوئیں کا منہ پتھر سے ڈھکا ہوا ہو، اور جس طرح یہ قول صحیح نہیں ہے اُسی طرح یہ تاویل بھی درست نہیں ہے کہ اس مقام پر دو کوئیں تھے، ایک سے مدین کے لوگ پانی پلا رہے تھے اور دوسرے کا منہ پتھر سے ڈھکا ہوا تھا، اور یہ کہ اس زمانہ میں بھی اُس مقام پر دو کوئیں موجود پائے گئے ہیں۔

اس تاویل کے درست نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اول تو قرآن حکیم نے دوسرے کوئیں کا قطعی کوئی ذکر نہیں کیا اور جو کچھ بیان کیا ہے ایک ہی سے متعلق بیان کیا ہے، دوسرے بعد میں اس جگہ دو کوئیں ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اُس وقت بھی وہاں اسی طرح دو کوئیں موجود تھے۔ ہوسکتا ہے کہ عرصہ دراز کے بعد یا اسلامی عہد میں ضرورت کے لحاظ سے یہاں دوسرا کواں تیار کیا گیا ہو، پس قرآنِ حکیم کے صاف اور سادہ بیان کو محض ایک غیر مستند روایت کی خاطر پیچیدہ بنانا قطعی بے محل اور غیر مناسب ہے"

غرض جب ان لڑکیوں کے گلہ نے پانی پی لیا تو وہ گھر کو واپس چلیں، گھر پہنچیں تو خلاف عادت جلد واپسی پر اُن کے والد کو سخت تعجب ہوا، دریافت کرنے پر لڑکیوں نے گذرا ہوا ماجرا کہہ سُنایا کہ کس طرح ایک "مصری" نے اُن کی مدد کی، باپ نے کہا عجلت سے جاؤ اور اُس کو میرے پاس لے کر آؤ۔

یہاں تو باپ بیٹی کے درمیان یہ گفتگو ہو رہی تھی اور اُدھر حضرت موسیٰ پانی پلانے کے بعد قریب ہی ایک درخت کے سایہ میں بیٹھ کر سستانے لگے، مسافرت و غربت، اور پھر بھوک پیاس۔ حضرت موسیٰ نے دعا کی "پروردگار! اس وقت جو بھی بہتر سامان میرے لیے تو اپنی قدرت سے نازل کرے میں اُس کا محتاج ہوں"

لڑکی تیزی سے وہاں پہنچی تو دیکھا کہ کوئیں کے قریب ہی وہ بیٹھے ہوئے ہیں۔ شرم و حیا کے ساتھ

نیچی نظریں کیے لڑکی نے کہا "آپ ہمارے گھر چلیے والد بلاتے ہیں وہ آپ کے اس احسان کا بدلہ دینگے"
حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سوچا کہ شاید اس سلسلہ میں کوئی بہتر صورت نکل آئے اس لیے چلنا ہی بہتر
ہے اور اس کی دعوت کو رد کرنا مناسب نہیں، خدا نے میری دعا سن لی اور یہ اُسی کا پیش خیمہ ہو
حضرت موسیٰ اُٹھ کھڑے ہوئے اور لڑکی کو ہدایت کی کہ وہ آگے نہ چلے بلکہ میرے پیچھے پیچھے چلے اور
ٹھکری یا اشارہ کے ساتھ راہ کی رہنمائی کرے۔

موسیٰ (علیہ السلام) چل تو پڑے لیکن طبعی اور فطری غیرت اور عزتِ نفس کے پیش نظر بار بار اس
جملہ سے متاثر ہو رہے تھے "میرا باپ تم کو اس محنت کا عوض دینا چاہتا ہے" مگر مسافرت اور حالات
کی نزاکت نے آخر یہی مشورہ دیا کہ اس وقت اس گرانی کو بھی انگیز کریں تاکہ اس غربت میں ایک
غمخوار اور مونس وہمدم کی مستقل ہمدردی کو حاصل کر سکیں۔

حضرت موسیٰ چلتے چلتے منزلِ مقصود پر پہنچے اور اُس بزرگ صورت وسیرت انسان کی
خدمت میں حاضر اور شرفِ ملاقات سے بہرہ اندوز ہوئے، بزرگ نے پہلے کھانا کھلایا اور پھر
اطمینان کے ساتھ بٹھا کر اُن کے حالات سُنے، حضرت موسیٰ نے من وعن اپنی ولادت اور
فرعون کے بنی اسرائیل پر مظالم سے شروع کر کے آخر تک ساری داستان کہہ سنائی۔ سب کچھ
سُننے کے بعد بزرگ نے موسیٰ (علیہ السلام) کو تسلی دی اور فرمایا کہ خدا کا شکر کرو کہ اب تم کو ظالموں
کے پنجہ سے نجات مل گئی، اب کوئی خوف کا مقام نہیں ہے۔

یہاں قومِ ظالمین کے ظلم سے بنی اسرائیل کے بچوں کا قتل اور اُن کی غلامی و تباہ
حالی کے واقعات ہی مراد ہو سکتے ہیں نیز اُن کا کفر اور فساد فی الارض، ورنہ تو قبطی کے قتل میں
تو خود موسیٰ (علیہ السلام) بھی اپنے فعل پر نادم تھے اور خود کو قصور وار سمجھتے تھے۔

وَلَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَاءَ مَدْيَنَ قَالَ عَسٰى — اور جب منہ کیا مدین کی سیدھ پر بولا امید ہے

رَبِّیْ اَنْ یَّھْدِیَنِیْ سَوَآءَ السَّبِیْلِ. وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْیَنَ وَجَدَ عَلَیْہِ اُمَّۃً مِّنَ النَّاسِ یَسْقُوْنَ ۵ وَوَجَدَ مِنْ دُوْنِہِمُ امْرَاَتَیْنِ تَذُوْدٰنِ ج قَالَ مَا خَطْبُکُمَا ط قَالَتَا لَا نَسْقِیْ حَتّٰی یُصْدِرَ الرِّعَآءُ ٚ وَ اَبُوْنَا شَیْخٌ کَبِیْرٌ. فَسَقٰی لَھُمَا ثُمَّ تَوَلّٰٓی اِلَی الظِّلِّ فَقَالَ رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ. فَجَآءَتْہُ اِحْدٰھُمَا تَمْشِیْ عَلَی اسْتِحْیَآءٍ ز قَالَتْ اِنَّ اَبِیْ یَدْعُوْکَ لِیَجْزِیَکَ اَجْرَ مَا سَقَیْتَ لَنَا ط فَلَمَّا جَآءَہٗ وَقَصَّ عَلَیْہِ الْقَصَصَ لا قَالَ لَا تَخَفْ نجوت مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ. (القصص)	کہ میرا رب لیجائے مجھ کو سیدھی راہ پر اور جب پہنچا مدین کے پانی پر پایا وہاں ایک جماعت کو لوگوں کی پانی پلاتے ہوئے اور پایا اُن سے ورے دو عورتوں کو کہ روکے ہوئے کھڑی تھیں اپنی بکریاں، بولا تمہارا کیا حال ہے۔ بولیں ہم نہیں پلاتیں پانی چرواہوں کے پھیر لیجانے تک اور ہمارا باپ بوڑھا ہے بڑی عمر کا۔ پھر اُس نے پانی پلا دیا اُن کے جانوروں کو۔ پھر ہٹ کر آیا چھاؤں کی طرف بولا اے رب تو جو چیز اُتارے میری طرف اچھی میں اُس کا محتاج ہوں۔ پھر آئی اُس کے پاس اُن دونوں میں سے ایک چلتی تھی شرم سے۔ بولی میرا باپ تجھ کو بلاتا ہے کہ بدلے میں دے حق اُس کا کہ تو نے پانی پلا دیا ہمارے جانوروں کو۔ پھر جب پہنچا اُس کے پاس اور بیان کیا اُس سے احوال کہا مت ڈر بچ آیا تو اُس قوم بے انصاف سے۔

توراتؔ میں اس موقعہ پر بھی دو جگہ اختلاف موجود ہے۔

(۱) وہ لڑکیوں کی تعداد دوؔ کی جگہ سات بتاتی ہے۔

(۲) اُس کا بیان ہے کہ لڑکیوں نے حوض کو پانی سے بھر لیا تھا مگر دوسرے لوگوں نے زبردستی اُن کو ہٹا کر اپنے جانوروں کو پانی پلانا شروع کر دیا یہ دیکھ کر حضرت موسیٰ کو غصہ آیا۔

ہم کو اس موقعہ پر بھی قرآنِ عزیز کے بیان پر ہی بھروسہ کرنا چاہیے اول اس لیے کہ سابق اختلافات میں قرآنِ عزیز کے بیانات کی روشن عقل اور فطرت کے مطابق رہی ہے۔ دوسرے اس لیے کہ اس جگہ بھی تعداد کے معاملہ سے قطع نظر توراۃ کی دوسری بات اس لیے صحیح نہیں معلوم ہوتی کہ یہ لڑکیاں مدین ہی کے قبیلہ اور اُن ہی کی بستی کی ساکن تھیں اور پانی کا معاملہ روزانہ ہی ان کے ساتھ پیش آتا رہتا تھا، لہٰذا اُن کو یہ معلوم تھا کہ یہ قوی گروہ کسی حالت میں بھی ہم کو پیش قدمی نہیں کرنے دیگا، اور عرب کے شعراء کے کلام سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ پانی کے معاملہ میں خصوصیت کے ساتھ اُن کے یہاں قوی کو ضعیف پر ترجیح حاصل تھی، اور عرب کے ماسوا دنیا کے ہر گوشہ میں یہی حال تھا، تو پھر وہ کیسے اس اقدام کی جرأت کرسکتی تھیں، صحیح بات یہی ہے کہ وہ ضعیف گھرانے کی فرد ہونے اور پھر عورت ہونے کی وجہ سے اسی پر اکتفا کرتی تھیں کہ جب سب پانی پلا کر واپس ہوجائیں تو بچے ہوئے پانی سے یہ فائدہ اُٹھالیں اور بس۔

رہا لڑکیوں کی تعداد کا معاملہ سو ابن کثیرؒ (رحمہ اللہ) نے ہر دو اقوال کی مطابقت کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ مدین کے اس بزرگ کے سات لڑکیاں ہوں جیسا کہ تورات میں مذکور ہے مگر مدین کے پانی پر جو واقعہ پیش آیا اُس میں صرف دو لڑکیاں ہی موجود تھیں جیسا کہ قرآنِ حکیم کی تصریح سے ظاہر ہوتا ہے۔[۱]

شیخ سے رشتۂ مصاہرت

حضرت موسیٰ اور قبیلۂ مدین کے بزرگ میزبان کے درمیان یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ اُس لڑکی نے جو موسیٰ کو بلانے گئی تھی اپنے باپ سے کہا "اے باپ! آپ اس مہمان کو اپنے مویشیوں کے چرانے اور پانی مہیا کرنے کے لیے اجیر رکھ لیجیے، اجیر وہی بہتر ہے جو قوی بھی ہو اور امانت دار بھی"

---

[۱] تفسیر ابن کثیر۔ سورۂ قصص۔

مفسرین کہتے ہیں کہ باپ کو لڑکی کی یہ گفتگو عجیب سی معلوم ہوئی اور اُس نے دریافت کیا "تجھ کو اس مہمان کی قوت و امانت کا حال کیا معلوم؟" لڑکی نے جواب دیا "میں نے مہمان کی قوت کا اندازہ تو اس سے کیا کہ کوئیں کا بڑا ڈول (چرس) اُس نے تنہا بھر کر کھینچ لیا، اور امانت کی آزمائش اس طرح کی کہ جب میں اس کو بلانے گئی تو اُس نے مجھے دیکھ کر نیچی نظریں کرلیں، اور گفتگو کے دوران میں ایک مرتبہ بھی میری طرف نگاہ اُٹھا کر نہیں دیکھا، اور جب یہاں آنے لگا تو مجھ کو پیچھے چلنے کو کہا اور خود آگے آگے چلا۔ اور صرف اشاروں سے میں اُس کی رہنمائی کرتی رہی"۔

بزرگ باپ نے بیٹی کی ان باتوں کو سُنا تو بہت مسرور ہوئے اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے کہا کہ اگر تم آٹھ سال تک میرے پاس رہو اور میری بکریاں چراؤ تو میں اپنی اس بیٹی کی تم سے شادی کرنے کو تیار ہوں اور اگر تم اس مدت کو دو سال بڑھا کر دس سال کردو تو اور بھی بہتر ہے یہی اس لڑکی کا مہر ہوگا، حضرت موسیٰ نے اس شرط کو منظور کرلیا، اور فرمایا کہ یہ میری خوشی پر چھوڑیے کہ میں ان دونوں مدتوں میں سے جس کو چاہوں پورا کردوں، آپ کی جانب سے مجھ پر اس بارہ میں کوئی جبر نہ ہوگا۔ طرفین کی اس باہمی رضامندی کے بعد بزرگ میزبان نے اس بیان کردہ مدت کو مہر قرار دے کر موسیٰ علیہ السلام سے اپنی اس بیٹی کی شادی کردی۔

اور بعض مفسرین کا خیال ہے کہ مدت ختم ہونے پر "عقد" عمل میں آیا، اور عقد کے فوراً بعد ہی موسیٰ علیہ السلام اپنی بیوی کو لے کر روانہ ہوگئے۔ مفسرین نے حضرت موسیٰ کی بیوی کا نام "صفورہ" بتایا ہے۔[1]

قَالَتْ اِحْدٰىهُمَا يٰٓاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ . قَالَ	بولی اُن دونوں میں سے ایک اے باپ اس کو نوکر رکھ لے البتہ بہتر نوکر جس کو تو رکھنا چاہے وہ ہے

[1] تفسیر ابن جریر سورۂ قصص۔

اِنِّیْٓ اُرِیْدُ اَنْ اُنْكِحَكَ اِحْدَى ابْنَتَیَّ	جو زور آور ہو امانت دار۔ کہا میں چاہتا ہوں کہ بیاہ دوں
هٰتَیْنِ عَلٰٓی اَنْ تَاْجُرَنِیْ ثَمٰنِیَ حِجَجٍ ۚ	تجھ کو ایک بیٹی اپنی ان دونوں میں سے اس شرط پر کہ تو میری
فَاِنْ اَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِنْدِكَ ۚ	نوکری کرے آٹھ برس۔ پھر اگر تو پورے کرے دس برس
وَمَآ اُرِیْدُ اَنْ اَشُقَّ عَلَیْكَ ؕ سَتَجِدُنِیْٓ	تو وہ تیری طرف سے ہے۔ اور میں نہیں چاہتا کہ تجھ پر تکلیف
اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ. قَالَ	ڈالوں تو پائیگا مجھ کو اگر اللہ نے چاہا نیک بختوں سے۔ بولا
ذٰلِكَ بَیْنِیْ وَبَیْنَكَ ؕ اَیَّمَا الْاَجَلَیْنِ	یہ وعدہ ہو چکا میرے اور تیرے بیچ جونسی مدت ان
قَضَیْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَیَّ ؕ وَاللّٰهُ	دونوں میں پوری کر دوں سو زیادتی نہ ہو مجھ پر اور اللہ پر
عَلٰی مَا نَقُوْلُ وَكِیْلٌ ۔ (قصص)	بھروسہ ہے اس چیز کا جو ہم کہتے ہیں۔
فَلَبِثْتَ سِنِیْنَ فِیْٓ اَهْلِ مَدْیَنَ ۵ ثُمَّ	پھر تو نے مدین میں چند سال قیام کیا، پھر تو اے موسیٰ
جِئْتَ عَلٰی قَدَرٍ یّٰمُوْسٰی. وَاصْطَنَعْتُكَ	مقررہ اندازہ پر پورا اُتر آیا اور میں نے تجھ کو اپنے لیے
لِنَفْسِیْ (طٰہٰ)	(اپنے خاص کام کے لیے) بنایا ہے۔

موسیٰ (علیہ السلام) کے خسر کون ہیں؟

قرآنِ عزیز نے حضرت موسیٰ اور مدین کے شیخ کے متعلق جو واقعات بیان کیے ہیں اُن میں کسی ایک جگہ بھی اس شیخ کا نام نہیں بتایا۔ اس لیے تاریخی حیثیت سے شیخِ مدین کے نام میں مورخین و مفسرین کے مختلف اقوال پائے جاتے ہیں، جو مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) مفسرین، اصحابِ سیر اور ادبارِ عرب کی ایک بڑی جماعت کا یہ خیال ہے کہ یہ حضرت شعیب (علیہ السلام) ہیں، یہ قول بہت مشہور اور شائع ذائع ہے۔

مشہور مفسر امام ابن جریر طبریؒ نے حسن بصری رحمہ اللہ کا یہ قول نقل کیا ہے "لوگ کہتے ہیں کہ صاحبِ موسیٰ حضرت شعیب (علیہ السلام) ہیں"[1]

[1] تفسیر سورۂ قصص

اور حافظ عماد الدین بن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ حسن بصریؒ اسی طرف مائل ہیں کہ مدین کے شیخ حضرت شعیب (علیہ السلام) ہیں، اور فرماتے ہیں کہ ابن ابی حاتمؒ نے سلسلۂ سند کے ساتھ مالک بن انسؒ سے روایت نقل کی ہے "کہ اُن کو یہ بات پہنچی ہے کہ صاحبِ موسیٰ حضرت شعیب (علیہ السلام) ہیں[1]"۔

(۲) ایک جماعت کہتی ہے کہ شیخ کا نام "یثرون" تھا اور یہ حضرت شعیب (علیہ السلام) کے بھتیجے تھے۔ طبری نے سند کے ساتھ ایک روایت نقل کی ہے کہ ابو عبیدہؓ فرماتے تھے کہ جس نے حضرت موسیٰ کو اجیر بنایا وہ شعیب علیہ السلام کا برادر زادہ یثرون تھا[2]"

(۳) بعض کہتے ہیں کہ صاحب موسیٰ کا نام "یثری" تھا، طبری نے سند کے ساتھ حضرت ابن عباسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ موسیٰ کو اجیر رکھنے والا مدین کا شیخ "یثری" نامی تھا۔ اور اسی روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں "عورت کے والد کا نام "یثری" تھا۔ مگر یثری والی روایت میں یہ نہیں کہا گیا کہ وہ شعیبؑ کا برادر زادہ تھا[3]۔ اور توراۃ نے اسی سے ملتا جلتا نام "یترو" بتایا ہے۔

(۴) بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہ "شیخ" حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کا ایک "مردِ مومن" تھا[4]

(۵) ایک جماعت کا گمان ہے کہ یہ "شیخ" نہ شعیب ہوسکتے ہیں اور نہ اُن کے بھتیجے اس لیے کہ قرآنِ عزیز سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شعیب کا زمانہ حضرت موسیٰؑ سے بہت پہلے کا زمانہ ہے جس کے درمیان صدیاں ہیں۔ قرآنِ حکیم کہتا ہے کہ حضرت شعیبؑ نے اپنی قوم کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا۔

وَمَا قَوْمُ لُوطٍ مِّنكُم بِبَعِيدٍ ۔ اور قومِ لوط کا معاملہ تم سے کچھ دور نہیں ہے۔

اور یہ ظاہر ہے کہ قومِ لوط کی ہلاکت کا زمانہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا زمانہ ہے اور اُن کے

---

[1] تفسیر ابن کثیر جلد ۷، ص ۲۴۸ [2] ابن جریر جلد ۱ ص ۲۰۶ [3] تفسیر ابن کثیر جلد ۷، ص ۲۴۸

[4] ان حوالجات سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ سید سلیمان صاحب کا یہ فرمانا صحیح نہیں ہے کہ "مسلمان مفسرین بھی علی العموم یثرو حوباب اور شعیب کو ایک ہی سمجھتے ہیں"۔

اور حضرت موسیٰ کے زمانہ کی درمیانی مدت چار سو سال سے بھی زیادہ ہے۔ اور جن لوگوں نے اس مدت کو قریب کردینے کے لیے یہ کہا ہے کہ حضرت شعیب کی عمر غیر معمولی طور پر طویل ہوئی تو یہ دعویٰ بلا دلیل ہے[1]۔

اس قول کی تائید کے لیے یہ دلیل بھی قوت رکھتی ہے کہ اگر "صاحبِ موسیٰ" شعیب (علیہ السلام) ہوتے تو قرآنِ عزیز ضرور اُن کے نام کی تصریح کرتا اور اس طرح مجمل و مبہم نہ چھوڑتا[2]۔

ان مختلف پانچ اقوال کی نقل کے بعد ہمارے نزدیک راجح اور صحیح مسلک وہی معلوم ہوتا ہے جو ابنِ جریر اور ابن کثیر جیسے جلیل القدر محدثین و مفسرین نے اختیار کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ نام کی تصریح کے بارہ میں کوئی روایت صحت کو نہیں پہنچتی، اور جو روایات نقل کی گئی ہیں وہ قابلِ احتجاج نہیں ہیں، اس لیے قرآنِ عزیز نے تصریح کیے بغیر اُس کا ذکر کیا ہے اسی طرح ہم بھی اس کے نام کی تصریح کو خدا کے علم کے حوالہ کردیں۔ ابن کثیر کی عبارت یہ ہے۔

قال ابو جعفر (الطبری) وھذا مما	ابو جعفر طبری نے کہا کہ نام کی تصریح کا یہ معاملہ خبر اور اطلاع
لا یدرک علمہ الا بخبر ولا خبر	کے بغیر طے نہیں ہوسکتا اور اس سلسلہ میں کوئی خبر (روایت)
بذلک تجب حجۃ فلا قول فی ذلک	ایسی موجود نہیں ہے جو حجت اور دلیل بن سکے، پس سب سے
اولی بالصواب مما قالہ اللہ	بہتر قول اس سلسلہ میں وہی ہے جو قرآن میں اللہ جل شانہ نے
جل ثناءہ[3] الخ	اختیار فرمایا (یعنی سکوت)

ابنِ جریر کا اشارہ قرآنِ عزیز کے اس جملہ کی جانب ہے "وابونا شیخ کبیر"۔

عبدالوہاب نجار فرماتے ہیں کہ مجھ سے ایک بڑے فاضل عالم نے یہ بحث کی کہ حضرت موسیٰ جلیل القدر نبی تھے اس لیے اُن کو کوئی معمولی شخص اپنا اجیر رکھنے کا حوصلہ نہیں کرسکتا تھا اور نہ وہ

---

[1] تفسیر ابن کثیر جلد ۷ ص ۲۴۸ [2] ایضاً [3] تفسیر ابن کثیر جلد ۷ ص ۲۴۸

اس کو منظور فرماتے بلکہ اُن کا مستاجر نبی اور پیغمبر ہی ہو سکتا تھا اس لیے مدین کے "شیخ کبیر" حضرت شعیب علیہ السلام ہی ہو سکتے ہیں۔

میں نے عرض کیا کہ آپ کا یہ ارشاد نہ عقلی حجت و بُرہان کی حیثیت رکھتا ہے اور نہ نقلی دلیل وحجت کی، زیادہ سے زیادہ استحسان کے درجہ کا قیاس ہے اور اس سے یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ یہ یقین اور قطعیت کو چاہتا ہے، علاوہ ازیں اُس وقت حضرت موسیٰ نبی بھی نہ تھے نبوت سے بعد کو سرفراز کیے گئے۔

بہرحال یہ طے شدہ امر ہے کہ "شیخ کبیر" کے نام کی تصریح میں کوئی قابلِ حجت روایت موجود نہیں ہے۔ اور ابن جریر اور ابن کثیر نے "وفاءِ مدت" کے سلسلہ میں بھی جس قدر روایات نقل کی ہیں اُن میں بھی بزار اور ابن ابی حاتم کی طویل روایات کے علاوہ کسی میں بھی نام کا ذکر موجود نہیں ہے اور ان دونوں روایات کی اس "زیادت" کے بارہ میں ابن کثیر فرماتے ہیں۔

مدار ھٰذا الحدیث علی عبد اللہ بن لھیعۃ المصری وفی حفظہ سوء واخشیٰ ان یکون رفعہ خطأ۔[1]	اس (نام کی تصریح والی) حدیث کا مدار ابن لہیعہ مصری پر ہے اور اس کا حفظ خراب تھا اور مجھے خوف ہے کہ اس حدیث کو مرفوع کہنے میں غلطی ہوئی ہے۔

اور ابن جریر فرماتے ہیں:۔

ثم قال روی ایضاً نحوہ من حدیث عتبۃ بن المنذر بزیادۃ غریبۃ جدًا[2]	نیز اسی طرح عتبہ بن المنذر سے روایت کی گئی ہے (مگر) ایک یقینی نادر اور غیر معروف زیادت کے ساتھ (وہ زیادت بھی نام کی صراحت ہے)۔

ایفاءِ مدت | غرض حضرتِ موسیٰ اپنے خسر کے یہاں مدتِ اجارہ پورا کرنے یعنی بکریاں چرانے کے لیے

[1] تفسیر ابن کثیر جلد ۷، ص ۲۵۲ [2] تفسیر ابن کثیر جلد ۷

مقیم رہے، مفسرین مستند روایات کے پیشِ نظر فرماتے ہیں کہ موسیٰ (علیہ السلام) نے کامل مدت یعنی دہ سالہ مدت کو پورا کیا۔

قرآنِ عزیز نے یہ نہیں بتایا کہ مدت پوری ہونے کے کس قدر بعد تک موسیٰ (علیہ السلام) نے "شیخ" کے پاس قیام کیا؟ البتہ مفسرین یہ کہتے ہیں کہ مدت ختم ہونے کے فوراً بعد ہی موسیٰ مصر کو روانہ ہوگئے، اور اُن کے خُسر نے روانگی کے سال میں بکریوں نے جس قدر بچے دیے تھے اُن کے حوالہ کردیے اور وہ اپنی بیوی اور اس ریوڑ کو لے کر چل پڑے۔ شاید اُن کا یہ قول اس آیت کے پیشِ نظر ہو۔

فلما قضیٰ موسی الاجل وسار باھلہٖ انس من جانب الطور نارا (قصص) پس جب موسیٰ نے مدت پوری کردی اور اپنے اہل کو لے کر چل دیا تو محسوس کیا طور کی جانب آگ کو۔

ان حضرات نے مدت کے ایفاء اور روانگی کے بیان میں جو قربت ہے اُس سے یہ اندازہ کرلیا کہ وہ فوراً ہی روانہ ہوگئے حالانکہ جب تک خاص قرینہ موجود نہ ہو اُس وقت تک "واؤ" نہ تعقیب پر دلالت کرتی ہے اور نہ ترتیب پر۔

اور معالم التنزیل میں ہے کہ موسیٰ (علیہ السلام) وفاءِ مدت کے بعد دس سال مزید اپنے خسر کے یہاں مقیم رہے۔

توراۃ بھی اسی قول کی تائید کرتی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام مدت ختم ہونے پر فوراً ہی مصر روانہ نہیں ہوگئے تھے بلکہ بکریاں چراتے ہوئے بھولے بھٹکے جب "وادی مقدس" میں پہنچ کر خدا کا حکم ملا کہ بنی اسرائیل کو غلامی سے رہا کراؤ اور مصر جا کر فرعون کے ظلم سے اُن کو نجات دلاؤ تب وہ مصر روانہ ہوئے۔

"اور موسیٰ اپنے سسرے تیرو کے جو مدیان کا کاہن تھا گلّے کی نگہبانی کرتا تھا، تب اُس نے

گلّے کو بیابان کی ایک طرف ہانک دیا اور خدا کے پہاڑ حورب کے نزدیک آیا، اُس وقت خدا کا فرشتہ ایک بوٹے میں سے آگ کے شعلہ میں اُس پر ظاہر ہوا، اُس نے نگاہ کی تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک بوٹا آگ روشن ہے اور وہ جل نہیں جاتا۔ . . . .

. . . . اب دیکھ بنی اسرائیل کی فریاد مجھ تک آئی اور میں نے وہ ظلم جو مصری اُن پر کرتے ہیں دیکھا ہے، پس اب تو جا، میں تجھے فرعون پاس بھیجتا ہوں۔ میرے لوگوں کو جو بنی اسرائیل ہیں مصر سے نکال[1]

تب موسیٰ روانہ ہوا اور اپنے سسرے تیرو پاس گیا اور اُسے کہا کہ میں تیری منت کرتا ہوں کہ مجھے رخصت دے کہ اپنے بھائیوں پاس جو مصر میں ہیں جاؤں[2]

بہتر یہی ہے کہ حقیقت حال کو علمِ الٰہی کے ہی سپرد کر دیا جائے "واللہ اعلم بحقیقۃ الحال" تاہم قرآنِ حکیم کا اسلوب بیان یہ ضرور رہنمائی کرتا ہے کہ عام کتبِ تفسیر میں جو یہ بتایا گیا ہے کہ حضرتِ موسیٰ کی یہ روانگی جو طٰہٰ اور قصص میں مذکور ہے۔ فلما قضیٰ موسی الاجل وسار باھلہ مصر کے لیے تھی غالباً صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ اگر موسیٰ علیہ السلام گھر کے ارادہ سے چلے تھے تو جب وادیِ مقدس میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے اُن کو کہا گیا کہ ظالم فرعون اور اس کی قوم کی طرف جاؤ اور اُن کو سمجھاؤ تو حضرت موسیٰ جواب میں یہ نہ فرماتے

قال رب انی قتلت منھم نفسًا فاخاف ان یقتلون. (قصص) — موسیٰ نے کہا اے پروردگار میں نے اُن (فرعونیوں) کے ایک آدمی کو مار ڈالا تھا پس مجھے یہ ڈر ہے کہ کہیں وہ مجھ کو نہ مار ڈالیں (اگر میں مصر گیا)

ولھم علیّ ذنب فاخاف ان — اور اُن (مصریوں) کا میں نے ایک گناہ کیا ہے پس میں ڈرتا

---

[1] خروج باب ۳ آیت ۱۔۱۰ [2] خروج باب ۴ آیت ۱۸۔

یقتلون (شعراء) ہوں کہ وہ مجھ کو قتل کر دینگے۔

یہ جواب خود بول رہا ہے کہ اس گفتگو کے وقت تک قتل والے معاملہ کی وجہ سے حضرت موسیٰ کو مصر جانے کا حوصلہ نہیں تھا۔ البتہ جب خدائے تعالیٰ کی عطا و بخشش نے اُن کو نبوت و رسالت سے سرفراز فرمایا اور اس وقت مصر جانے کا حکم ملا تو موسیٰ (علیہ السلام) اللہ تعالیٰ سے اپنا اطمینان کر کے یہیں سے مصر روانہ ہو گئے اور حکم الٰہی کے سامنے خسر کے پاس جا کر اجازت لینے کی بھی پرواہ نہ کی۔

بہرحال حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مدین میں ایک عرصہ قیام کیا، اور اس پوری مدت میں اپنے خسر کے مویشیوں کی گلہ بانی کرتے رہے، تورات میں مذکور ہے کہ اس قیام میں حضرت موسیٰ کے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام اُنھوں نے جیرسون رکھا۔ مدیانی عبرانی میں اس کے معنی "غربت و مسافرت" کے ہیں۔ گویا حضرت موسیٰ نے بیٹے کے نام میں اپنی "مسافرت" کو بطور یادگار قائم رکھا تاکہ خاندان والوں کو یاد رہے کہ اس بچہ کی ولادت "غربت و مسافرت" میں ہوئی تھی۔ تورات کی عبارت یہ ہے۔

اور اس نے اپنی بیٹی صفورہ موسیٰ کو دی وہ بیٹا جنی اُس نے اُس کا نام جیرسون رکھا کیونکہ اُس نے کہا کہ میں اجنبی ملک میں مسافر ہوں[۱]

وادیِ مقدس | ایک روز حضرت موسیٰ اپنے اہل و عیال سمیت بکریاں چراتے چراتے مدین سے بہت دور نکل گئے۔ گلہ بان قبائل کے لیے یہ بات کوئی قابلِ تعجب نہ تھی مگر رات ٹھنڈی تھی اس لیے سردی آگ کی جستجو پر مجبور کر رہی تھی سامنے کوہ سینا کا سلسلہ نظر آ رہا تھا، یہ سینا کا مشرقی گوشہ تھا اور مدین سے ایک روز کے فاصلہ پر بحرِ قلزم کے دو شاخہ کے درمیان مصر کو جاتے ہوئے واقع تھا حضرت موسیٰ نے چقماق استعمال کیا مگر سخت خنکی تھی اُس نے کام نہ دیا سامنے وادی "وادی ایمن" میں نگاہ دوڑائی تو ایک شعلہ چمکتا ہوا نظر پڑا بیوی سے کہا کہ تم یہیں ٹھہرو میں آگ لے آؤں تاپنے کا

---

[۱] خروج باب ۲ آیت ۲۱-۲۲۔

بھی انتظام ہوجائیگا اور اگر وہاں کوئی رہبر مل گیا تو بھٹکی ہوئی راہ کا بھی کھوج لگ جائیگا۔

فقال لاھلہ امکثوا انی انست نارا لعلی اتیکم منھا بقبس او اجد علی النار ھدی (طٰہٰ)

پھر موسیٰ نے اپنی بیوی سے کہا تم یہاں ٹھہرو، میں نے آگ دیکھی ہے شاید اُس میں سے کوئی چنگاری تمہارے لیے لاسکوں یا وہاں الاؤ پر کسی رہبر کو پاسکوں۔

بعثت

خدا کے فضل کا موسیٰ سے پوچھیے احوال
کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری ملجائے

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے دیکھا کہ عجیب آگ ہے، درخت پر روشنی نظر آتی ہے مگر نہ درخت کو جلاتی ہے اور نہ گل ہی ہو جاتی ہے، یہ سوچتے ہوئے آگے بڑھے لیکن جوں جوں آگے بڑھتے جاتے تھے آگ اور دور ہوتی جاتی تھی یہ دیکھ کر موسیٰؑ کو خوف سا پیدا ہوا اور اُنھوں نے ارادہ کیا کہ واپس ہو جائیں، جوں ہی وہ پلٹنے لگے آگ قریب آگئی اور قریب ہوئے تو سُنا کہ یہ آواز آرہی ہے۔

یموسیٰ انی انا اللہ رب العلمین (قصص)۔ اے موسیٰ! میں ہوں میں اللہ پروردگار جہانوں کا

فلما اتٰھا نودی یموسیٰ . انی انا ربک فاخلع نعلیک انک بالواد المقدس طوی . وانا اخترتک فاستمع لما یوحی (طٰہٰ)

پس جب موسیٰ اُس (آگ) کے قریب آئے تو پکارے گئے اے موسیٰ! میں ہوں تیرا پروردگار، پس اپنی جوتی اُتار دے تو طویٰ کی مقدس وادی میں کھڑا ہے، اور دیکھ! میں نے تجھے اپنی رسالت کے لیے چن لیا ہے پس جو کچھ وحی کی جاتی ہے اُس کو کان لگا کر سُن۔

قرآنِ عزیز کی سابق آیت اور ان آیات کے پیشِ نظر دو باتیں کتبِ تفسیر میں زیرِ بحث لائی جاتی ہیں۔ (۱) موسیٰ نے جس روشنی کو آگ سمجھا تھا وہ آگ نہ تھی بلکہ تجلّی الٰہی کا نور تھا لیکن

جو آواز اس پردۂ نور سے سُنی گئی وہ فرشتہ کی آواز تھی اور اُس کے واسطہ سے خدا نے موسیٰ کو شرف ہمکلامی بخشا، یا خود اللہ تعالیٰ کی ندا تھی؟ بعض مفسرین کہتے ہیں یہ فرشتہ کی آواز تھی اور اُس کے واسطہ سے موسیٰ کو خدا کی ہمکلامی کا شرف حاصل ہوا، یہ خدا کی آواز نہ تھی اس لیے کہ ؎ قولِ او را لحن نے آواز نے۔

اور ارباب تحقیق کی رائے یہ ہے کہ یہ براہِ راست ندائِ الٰہی تھی اور موسیٰ علیہ السلام نے اس کو کسی بھی واسطہ سے نہیں سُنا بلکہ اُسی طرح سُنا جس طرح پیغمبرانِ خدا وحی الٰہی کو سُنتے اور "من وراء حجاب" اُس سے ہمکلامی کا شرف حاصل کرتے ہیں۔[1]

(۲) وادی مقدس میں موسیٰ (علیہ السلام) کو جوتی اُتارنے کا حکم دیا گیا حالانکہ صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) مساجد میں جوتیوں سمیت نماز ادا کیا کرتے تھے، اور آج اُمت کے لیے بھی یہی اسلامی مسئلہ ہے کہ اگر جوتیاں پاک ہوں تو اُن سے بے تامل نماز پڑھنا درست ہے تو پھر اس جگہ موسیٰ سے یہ کیوں کہا گیا کہ "یہ وادی مقدس ہے پس جوتی اُتار دو" تو اس کا جواب صحیح حدیث میں موجود ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس کی وجہ بیان فرمائی ہے۔

کانتا من جلد حمار میّت موسیٰ (علیہ السلام) کی جوتیاں مردہ گدھے کی کھال سے بنائی گئی تھیں (یعنی غیر مدبوغ تھیں اس لیے طاہر نہ تھیں)

بہر حال اب حضرتِ موسیٰ خدائے تعالیٰ کے پیغمبر اور جلیل القدر رسول ہیں، اللہ تعالیٰ نے اُن کو انبیاء کے سچے دین کی تلقین اور فرعون کی غلامی سے بنی اسرائیل کی رہائی کی اہم خدمات کے لیے چُن لیا، وہ اب "وادی مقدس" میں حق تعالیٰ سے ہم کلامی کا شرف حاصل کر رہے ہیں وہ موسیٰ (علیہ السلام) جو مدین کی راہ سے بھٹکے ہوئے تھے آج مصر جیسے متمدن و مہذب ملک، اور

[1] صفۃ الکلام لابن تیمیہؒ ص ۲۷

اُس کے سرکش و مغرور بادشاہ کی راہنمائی کرنے کے لیے منتخب کیے گئے ہیں اور جو کل تک اونٹوں اور بکریوں کی گلہ بانی کر رہے تھے۔ آج انسانوں کی قیادت کے فرض کو انجام دینے کے لیے چُنے گئے ہیں اور جو نصابِ زندگی کل بکریوں کے گلہ کی چرائی سے شروع ہوا تھا وہ آج "وادیِ مقدس" میں خدا کی بہترین مخلوق "حضرتِ انسان" کی گلہ بانی پر تکمیل کو پہنچ رہا ہے، اور کل کا گلہ بان آج جہانبان بن رہا ہے۔

خدائے تعالیٰ کے یدِ قدرت کی یہی کرشمہ سازیاں ہیں جو زبان سے انکار کرنے والوں کے دلوں میں بھی اقرار کا کانٹا چبھوئے رکھتی ہیں، کہاں خانہ بدوش چرواہا اور کجا متمدن حکومتوں کے لیے خدا کی صداقت کی پیغامبری۔

حضرتِ موسیٰ نے جب خدا کی اس آواز کو سُنا اور اُن کو یہ معلوم ہوا کہ آج اُن کے نصیب میں وہ دولت آگئی ہے جو انسانی شرافت کا طغرائے امتیاز اور خدا کی موہبت کا آخری نشان ہے تو پھولے نہ سمائے اور والہانہ فریفتگی میں مثلِ مورت حیران کھڑے رہ گئے، آخر پھر اُسی جانب سے پہل ہوئی اور پوچھا گیا۔

وما تلك بيمينك يٰموسىٰ   موسیٰ! تیرے داہنے ہاتھ میں یہ کیا ہے؟

بس پھر کیا تھا محبوبِ حقیقی کا سوال عاشقِ صادق سے "یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے"۔ وارفتگیِ عشق میں یہ بھی خیال نہ رہا کہ سوال کے پیمانہ ہی پر جواب کو تولا جائے اور جو کچھ پوچھا گیا ہے صرف اُسی قدر جواب دیا جائے۔ بولے۔

هي عصاي اتوكأ عليها و   یہ میری لاٹھی ہے، اس پر (بکریاں چراتے وقت) سہارا لیا کرتا ہوں،

اهش بها على غنمي   اور اپنی بکریوں کے لیے پتے جھاڑ لیتا ہوں۔

جواب میں صرف یہ کہنا چاہیے تھا "عصا"، مگر محبت کے اُس ولولہ کو کیسے روکیں جو محبوب کے ساتھ

ہمکلامی کے شرف کو طول دے کر سوختہ جانی کے سامان مہیا کرنا چاہتا ہے، کہتے ہیں کہ میری لاٹھی ہے اور اُس کے فوائد بیان کرنے لگتے ہیں مگر یکایک جذبۂ شوق کی جگہ محبوبِ حقیقی کا پاسِ ادب دل میں چٹکی لیتا ہے۔ موسیٰ! خبردار کس دربار میں کھڑے ہو، کہیں یہ طول بیانی گستاخی اور بے ادبی میں نہ شمار ہو جائے۔ موسیٰؑ نے یہ سوچ کر فوراً پہلو بدلا اور جنابِ باری میں عرض کی۔

وَلِیَ فِیْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰی — اور میرے لیے اس سے متعلق اور ضروریات بھی ہیں۔

دل کے ولولے اور روح کی بیتابیاں تو چاہتی ہیں کہ کہے جاؤں اور اس لطفِ بے پایاں کی لذت کو حاصل کیے جاؤں لیکن پاسِ ادب مانع اور چشمِ حقیقت بیں کا حکم ہے کہ خاموش ہو جاؤں اس لیے قصہ کو تاہ کرتا ہوں ورنہ داستانِ عشق تو بہت طویل ہے۔

عشق کہتا ہے جنوں کا جوش رہنا چاہیے — ضبط کی تاکید ہے خاموش رہنا چاہیے
قصۂ موسیٰ ہے سبق ہے ہوش والوں کے لیے — کس طرح عشاق کو خاموش رہنا چاہیے

آیات اللہ | اب اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:۔

اَلْقِهَا یٰمُوْسٰی — موسیٰ! اپنی اس لاٹھی کو زمین پر ڈال دو۔

اور موسیٰ علیہ السلام نے اس ارشادِ عالی کی تعمیل کی۔

فَاَلْقٰهَا فَاِذَا هِیَ حَیَّةٌ تَسْعٰی — موسیٰ نے لاٹھی کو زمین پر ڈال دیا، پس ناگاہ وہ اژدہا بن کر دوڑنے لگا۔

موسیٰ نے جب یہ حیرت زا واقعہ دیکھا تو گھبرا گئے، اور بشریت کے تقاضہ سے متاثر ہو کر بھاگنے لگے پیٹھ پھیر کر بھاگے ہی تھے کہ آواز آئی:۔

قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ سَنُعِیْدُهَا سِیْرَتَهَا الْاُوْلٰی — (اللہ تعالیٰ نے فرمایا) موسیٰ! اس کو پکڑ لو اور خوف نہ کھاؤ ہم اس کو اُس کی اصل حالت پر لوٹا دینگے۔

حضرت موسیٰ کی لکڑی دو شاخہ تھی، اب وہی دوشاخہ اژدہے کا منہ نظر آرہا تھا، سخت پریشان تھے مگر قربتِ الٰہی نے طمانیت و سکون کی حالت پیدا کر دی اور انہوں نے بے خوف ہو کر اُس کے منہ پر ہاتھ ڈال دیا۔ اس عمل کے ساتھ ہی فوراً وہ دوشاخہ پھر لاٹھی بن گئی۔

اب موسیٰ کو دوبارہ پکارا گیا اور حکم ہوا کہ اپنے ہاتھ کو گریبان کے اندر لیجا کر بغل سے مس کیجیو اور پھر دیکھیے وہ مرض سے پاک اور بے داغ چمکتا ہوا نکلیگا۔

واضمم یدك الی جناحك تخرج	اور ملادے اپنے ہاتھ کو اپنی بغل کے ساتھ نکل آئیگا وہ
بیضآء من غیر سوء اٰیۃً اخریٰ	روشن بغیر کسی مرض کے (یعنی برص سے پاک) یہ دوسری
(طٰہٰ)	نشانی ہے۔

موسیٰ! یہ ہماری جانب سے تمہاری نبوت و رسالت کے دو بڑے نشان ہیں، یہ تمہارے پیغام صداقت اور دلائل و براہینِ حق کی زبردست تائید کرینگے پس جس طرح ہم نے تم کو نبوت و رسالت سے نوازا اُسی طرح تم کو یہ دو عظیم الشان نشان (معجزے) بھی عطا کیے۔

لنریك من اٰیٰتنا الکبریٰ (طٰہٰ)	تاکہ ہم تجھ کو اپنی بڑی نشانیوں کا مشاہدہ کرادیں۔
فذانك برھانان من ربك الیٰ	پس تیرے پروردگار کی جانب سے فرعون اور اُس کی جماعت
فرعون وملائہٖ انھم کانوا	کے مقابلہ میں تیرے لیے یہ "دو برہان" ہیں۔ بلاشبہ وہ
قوماً فٰسقین (قصص)	(فرعون اور اُس کی جماعت) نافرمان قوم ہیں۔

اب جاؤ اور فرعون اور اُس کی قوم کو راہِ ہدایت دکھاؤ۔ انہوں نے بہت سرکشی اور نافرمانی اختیار کر رکھی ہے اور اپنے غرور و تکبر اور انتہاءِ ظلم کے ساتھ انہوں نے "بنی اسرائیل" کو غلام بنا رکھا ہے سو اُن کو غلامی سے رستگاری دلاؤ۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جنابِ باری میں عرض کیا "پروردگار! میرے ہاتھ سے ایک

مصری قتل ہوگیا تھا اس لیے یہ خوف ہے کہ کہیں وہ مجھ کو قتل نہ کردیں، مجھے یہ بھی خیال ہے کہ وہ میری بڑے زور سے تکذیب کرینگے اور مجھ کو جھٹلائینگے، یہ منصبِ عالی جب تو نے عطا فرمایا ہے تو میرے سینہ کو فراخ اور نور سے معمور کرنے اور اس اہم خدمت کو میرے لیے آسان بنا دے اور زبان میں پڑی ہوئی گرہ کو کھول دے تاکہ لوگوں کو میری بات سمجھنے میں آسانی ہو اور چونکہ میری گفتگو میں روانی نہیں ہے اور میری بہ نسبت میرا بھائی ہارون مجھ سے زیادہ فصیح بیان ہے اس لیے آپ اس کو بھی اپنی اس نعمت (نبوت) سے نواز کر میرا شریک کار بنا دیں۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو اطمینان دلایا کہ تم ہمارا پیغام لے کر ضرور جاؤ اور اُن کو حق کی راہ دکھاؤ، وہ تمہارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔ ہماری مدد تمہارے ساتھ ہے اور جو نشانات ہم نے تم کو بخشے ہیں وہ تمہاری کامیابی کا باعث ہونگے اور انجام کار تم ہی غالب رہو گے۔ میں تمہاری درخواست منظور کرتا ہوں اور تمہارے بھائی ہارون کو بھی تمہارا شریکِ کار بناتا ہوں، دیکھو! تم دونوں فرعون اور اُس کی قوم کو جب ہماری صحیح راہ کی جانب بلاؤ تو اس پیغامِ حق میں نرمی اور شیریں کلامی سے پیش آنا کیا عجب ہے کہ وہ نصیحت قبول کرلیں، اور خوفِ خدا کر کے ظلم سے باز آجائیں۔

داخلۂ مصر | سدّی کہتے ہیں کہ جب حضرت موسیٰ منصبِ نبوت سے سرفراز ہوکر، کلامِ ربانی سے فیضیاب ہوکر، اور دعوت و تبلیغِ حق میں کامیابی و کامرانی کا مژدہ پاکر "وادیِ مقدس" سے اُترے تو اپنی بیوی کے پاس پہنچے جو وادی کے سامنے جنگل میں اُن کی منتظر اور چشم براہ تھیں، ان کو ساتھ لیا اور یہیں سے تعمیلِ حکمِ الٰہی کے لیے مصر روانہ ہوگئے، منزلیں طے کرتے ہوئے جب مصر پہنچے تو رات ہوگئی تھی، خاموشی کے ساتھ مصر میں داخل ہوکر اپنے مکان پہنچے، مگر اندر داخل نہ ہوئے، اور والدہ کے سامنے ایک مسافر کی حیثیت میں ظاہر ہوئے۔ یہ بنی اسرائیل میں مہمان نواز گھر تھا، حضرت موسیٰ کی خوب خاطر مدارات کی گئی اسی دوران میں اُن کے بڑے بھائی حضرت ہارون (علیہ السلام)

آپہنچے، یہاں پہنچنے سے قبل ہی ہارون کو خدا کی طرف سے منصب رسالت عطا ہوچکا تھا اس لیے اُن کو بذریعہ وحی حضرت موسیٰ کا سارا قصہ بتا دیا گیا تھا، وہ آکر بھائی سے لپٹ گئے اور پھر اُن کے اہل و عیال کو گھر کے اندر لے گئے اور والدہ کو سارا حال سُنایا۔ تب سب خاندان آپس میں گلے ملا، اور بچھڑے ہوئے بھائیوں نے ایک دوسرے کی گذشتہ زندگی سے تعارف حاصل کیا، اور والدہ کی دونوں آنکھوں نے ٹھنڈک حاصل کی ۔۔۔ تورات میں اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا گیا ہے :۔

اور خداوند نے ہارون کو کہا کہ بیابان میں جا کے موسیٰ کی ملاقات کر۔ وہ گیا اور خدا کے پہاڑ پر اُسے ملا اور اُسے بوسہ دیا۔ اور موسیٰ نے خدا کی جس نے اُسے بھیجا ساری باتیں اور معجزے کہ جن کا اُس نے حکم دیا تھا ہارون سے بیان کیے[۲]۔

وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے وادیِ مقدس میں خدائے تعالیٰ کی جناب میں عرض کیا تھا کہ میری زبان میں جو گرہ ہے اُس کو کھول دے اور یہ کہ میرا بھائی ہارون مجھ سے زیادہ فصیح ہے۔ تو مفسرین نے اس "عقدہ" کے متعلق ایک حکایت نقل کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ حضرت موسیٰ زمانۂ طفولیت میں ایک روز فرعون کی آغوش میں بیٹھے ہوئے تھے، اور فرعون کی داڑھی جواہرات اور موتیوں سے مرصع تھی، بچوں کی عادت کے مطابق حضرت موسیٰ نے داڑھی پر ہاتھ چلا دیا اور چمکتے ہوئے موتیوں کے ساتھ فرعون کی داڑھی کے چند بال بھی اُکھڑ آئے، فرعون کو سخت غصہ آیا اور چاہا کہ ان کو قتل کرادے، آسیہ زوجۂ فرعون نے شوہر کا یہ رنگ دیکھا تو عاجزی کے ساتھ عرض کیا کہ بچہ ہے اس کو نہ مارو یہ ان احترامات سے کیا واقف ہے۔ اس کے نزدیک تو تمرہ (کھجور) اور جمرہ (چنگاری) دونوں برابر ہیں "راج ہٹ" پرانی مثل ہے، بادشاہ نے کہا کہ میں ابھی اس کا امتحان کرتا ہوں اگر اس نے انگارہ کو دیکھ کر ہاتھ کھینچا تو ضرور قتل کرا دونگا۔ خدائے تعالیٰ کو موسیٰ سے

[۱] تاریخ ابن کثیر جلد ۱ ص ۲۵۲ [۲] خروج باب ۴ آیت ۲۷-۲۸

کام لینا تھا، اس لیے اُن کی حفاظت کی ذمہ داری کا وعدہ کر لیا تھا۔ لہذا جب فرعون نے چند کھجور کے دانے اور چند دہکتی آگ کے سُرخ انگارے منگا کر موسیٰ کے سامنے رکھے تو موسیٰ نے جلد ہاتھ بڑھا کر ایک سُرخ انگارے کو اُٹھا کر مُنہ میں رکھ لیا، سکنڈ بھر کا کام تھا ہوگذرا مگر زبان پر داغ پڑ گیا اور زبان موٹی ہو گئی، اُس وقت سے موسیٰ علیہ السلام کی زبان میں لکنت آگئی اور مسلسل گفتگو میں رکاوٹ ہونے لگی۔ پس وادی مقدس میں خدائے تعالیٰ کے سامنے موسیٰ علیہ السلام نے اسی "عقدہ" (گرہ) کا ذکر کیا[۱] لیکن عام مفسرین کی اس نقل حکایت سے جُدا اس سلسلہ میں نجار مصری نے اپنی ایک قیاسی رائے بیان کی ہے، وہ فرماتے ہیں۔

میں اس قصّہ کو صحیح نہیں سمجھتا، میرے خیال میں تو صرف موسیٰ علیہ السلام کی غیر فصیح بیانی اور گفتگو میں رکاوٹ کی دو وجہوں میں سے ایک ہو سکتی ہے

(۱) قرآنِ عزیز میں مذکور ہے کہ جب موسیٰ (علیہ السلام) کو دریائے نیل میں سے نکال کر شاہی محل پہنچایا گیا تو دودھ پلانے کے لیے دایہ کی فکر ہوئی شہر کی بیسیوں دایہ آئیں مگر انہوں نے کسی کا دودھ مُنہ سے نہ لگایا، تو اس واقعہ میں ضرور عرصہ لگا ہوگا اور موسیٰ علیہ السلام ایک عرصہ دودھ سے محروم رہے ہونگے، ایسی حالت میں یہ تجربہ کیا گیا ہے کہ بچہ کی زبان موٹی ہو جاتی ہے اور بات کرنے میں رکاوٹ کا مرض پیدا ہو جاتا ہے لہذا حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو بھی یہی صورت پیش آئی ہوگی۔

(۲) حضرت موسیٰ ابتداءِ جوانی ہی میں مصر سے مدین چلے گئے اور وہاں ایک طویل عرصہ رہے اگر "صاحب معالم التنزیل" یا توراۃ کی روایات کو صحیح مان لیا جائے تو تیس سال یا اس سے بھی زیادہ عرصہ ہوتا ہے، ایسی صورت میں یہ قدرتی بات ہے کہ وہ مصری زبان سے ایک حد تک ناآشنا اور اُس کے محاورات اور اُس زبان میں تقریر کے ملکہ سے محروم ہو چکے ہونگے، اسی کو انہوں نے "عقدۃ لسانی" فرمایا اور ہارون (علیہ السلام) کے متعلق فرمایا "ھو افصح منّی" اس دوسری وجہ میں البتہ یہ سوال

[۱] تاریخ ابن کثیر جلد ۱ ص ۲۴۹

پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر اس کو صحیح مان لیا جائے تو پھر حضرت موسیٰ کس طرح حضرت ہارون سے بے تکلف بات چیت کرنے پر قادر رہے ہونگے جبکہ حضرت ہارون کبھی مصر سے باہر ہی نہیں گئے اور صرف مصری زبان ہی میں بات چیت کر سکتے تھے، سو اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت ہارون مصری اور عبرانی دونوں زبانوں کے خوب واقف اور ماہر تھے۔ مصری زبان اُن کی مُلکی زبان تھی، اور عبرانی زبان اُن کی مادری زبان تھی جس کو صدیاں گذرنے کے باوجود بھی بنی اسرائیل نے محفوظ رکھا تھا اور باہمی بات چیت اور نوشت و خواند میں اُسی کو استعمال کرتے تھے، اور مدیانی اور عبرانی میں کچھ زیادہ فرق نہیں تھا اس لیے کہ دونوں زبانیں ایک ہی جدِ ابراہیم کی نسل سے متعلق تھیں۔

اور ان ہر دو وجوہ کو نقل کرنے کے بعد نجار کہتے ہیں کہ میری طبیعت کا میلان پہلی وجہ کی جانب ہے اور میں اُسی کو راجح سمجھتا ہوں[1]۔

مگر ہمارے نزدیک پہلی وجہ تو کسی طرح بھی قرینِ قیاس نظر نہیں آتی۔ اس لیے کہ "دایہ" کی تفتیش کا معاملہ قرآنِ عزیز اور صحیح احادیث میں تو بہت ہی مختصر ہے اور اُس کی تفصیل جو تورات اور تاریخی روایات سے نقل کی گئی ہے اُن سے صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصہ صرف چند گھنٹوں کے اندر طے ہو گیا، اور موسیٰ علیہ السلام کی والدہ اُن کو دودھ پلانے کے لیے لے گئیں اور شاہی احکام کے بعد ایک بچہ کے دودھ پلانے کے معاملہ میں دنوں کی تاخیر ہو بھی کیسے سکتی تھی نیز دوسری وجہ بھی کچھ زیادہ قابلِ قبول نہیں ہے اس لیے کہ اس توجیہ کے مطابق حضرت ہارون کے متعلق "هو افصح منی" کا فقرہ تو سمجھ میں آسکتا ہے لیکن مصری زبان کی فراموشی کو "عُقدۃً من لسانی" کہنا کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے علاوہ ازیں اگر یہ صحیح ہے تو حضرت موسیٰ کی دعا تو قبول کر لی گئی پھر فراموشی کے کیا معنی؟

---

[1] قصص الانبیاء عربی ص ۲۰۸ و ۲۰۹

بلکہ صاف اور بے غل وغش بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) ایسی حالت میں مولود ہوئے کہ اُن کی زبان میں لکنت تھی اور بات کرنے میں رکاوٹ واقع ہوجاتی تھی اور حضرت ہارون لسان اور فصیح البیان تھے، پس حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنے متعلق صرف اسی قدر دعا مانگی کہ زبان کا یہ حصر اور اُس کی لکنت اس درجہ شدید نہ رہے کہ گفتگو میں عاجز ہو جانا پڑے، اگر فطری رکاوٹ دور نہیں ہوتی نہ ہو صرف اس قدر خواہش ہے کہ مخاطبین گفتگو کو اچھی طرح سمجھ سکیں اور فصاحت و طلاقت لسانی کے لیے میری خواہش یہ ہے کہ میرے بھائی ہارون کو میرا قوتِ بازو بنا دیجیے کہ وہ میرا ویسے بھی دست و بازو ہے۔ چنانچہ دربارِ الٰہی میں دونوں ہی باتیں قبول اور منظور ہوگئیں۔

بعض علماءِ تفسیر نے "یفقھوا قولی" میں ایک اور نکتہ پیدا کیا، اور فرمایا کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے صرف یہ دعا مانگی کہ اُن کی زبان کی گرہ اس حد تک کھل جائے کہ جس قوم کو تبلیغ کرنے جا رہے ہیں وہ اُن کی گفتگو سمجھ سکے لہٰذا اُسی درجہ دعا قبول ہوئی اور اُن کی زبان میں قدرے لکنت اور حصر (رکاوٹ) پھر بھی باقی رہی۔ موسیٰ علیہ السلام نے شرط لگا کر دعا کا دائرہ خود ہی تنگ کر دیا ورنہ وہ بھی فصاحت اور طلاقتِ لسانی میں فرد ہو جاتے۔

میرے خیال میں اس نکتہ سنجی کی بھی یہاں مطلق ضرورت نظر نہیں آتی اس لیے کہ جس مقام پر اور جس وقت میں موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہِ الٰہی میں یہ دعا فرمائی ہے اُس کی برکت اور عظمت کو ان نکتہ سنجوں نے بالکل فراموش کر دیا اور یہ غور نہیں فرمایا کہ موسیٰ (علیہ السلام) منصبِ نبوت سے سرفراز کیے جا رہے ہیں خدا کا انتہائی فضل و کرم بارش کی طرح اُن پر برس رہا ہے، آغوشِ رحمت وا ہے، اس حالت میں موسیٰ (علیہ السلام) معاملہ اور ذمہ داری کی اہمیت کو محسوس فرماتے ہوئے آسانیِ کار کے لیے دعائیں اور استدعائیں کر رہے ہیں اور خدائے تعالیٰ خود موسیٰ علیہ السلام کی

مشکلات اور فہم کی نزاکت کا عالم و دانا ہے تو پھر کیا ایسے وقت میں خدائے تعالیٰ کی بے پایاں رحمت کا یہ تقاضا ہو سکتا تھا کہ وہ عطاء و نوال کی بیکراں نوازش کی جگہ مول تول اور سودے کی طرح لین دین کا سا معاملہ کرتی یا حقیقتِ حال کے پیشِ نظر موسیٰ علیہ السلام کے دعائیہ الفاظ کی لفظی گرفت سے درگذر فرما کر وہ سب کچھ عطا کرتی جو اُن کی مشکلات کو ختم کرنے کے لیے معاون و مددگار ثابت ہو سکے۔ بیشک اُس نے ایسا ہی کیا، البتہ موسیٰ علیہ السلام کے اس ارشاد میں ایک راز تھا جس کو وہ اور اُن کا پروردگار دونوں سمجھتے تھے، اُن کی خواہش تھی کہ اُن کی اس اہم خدمت میں اُن کے بھائی ہارون علیہ السلام ضرور شریکِ کار بنیں اس لیے کہ وہ بھائی بھی ہیں اور فطری فصاحت و طلاقت لسانی کے مالک بھی لہٰذا وہ اس سے زیادہ کے خواہشمند ہی نہ تھے کہ ان کو حصر کی دشواری سے نجات مل جائے اور چاہتے تھے کہ کسی طرح ہارون کو بھی یہ دولتِ "نبوت" عطا ہو پس اُن کی سفارش کے لیے اسی وصف "فصاحت بیانی" کو خدا کی درگاہ میں پیش کیا۔ یہ نہ تھا کہ اُنہوں نے الفاظِ دعا میں تنگی کی تھی تو خدا نے بھی کم دینے کی خاطر اُن کے الفاظ کو پکڑ لیا اور اُسی قدر دیا جو اُن کی دعا کے الفاظ میں محدود تھا۔

وَهَلْ أَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰىۘ	اور (اے پیغمبر!) موسیٰ کی حکایت تو نے سُنی؟ جب اُس نے (دور
إِذْ رَاٰ نَارًا فَقَالَ لِأَهْلِهِ	سے) آگ دیکھی، تو اپنے گھر کے لوگوں سے کہا "ٹھہرو۔ مجھے آگ
امْكُثُوْٓا إِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا	دکھائی دی ہے۔ میں جاتا ہوں۔ ممکن ہے تمہارے لیے ایک انگارا
لَّعَلِّيْٓ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ أَوْ	لے آؤں، یا کم از کم الاؤ پر کوئی راہ دکھلانے والا ہی مل جائے۔"
أَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى ۝ فَلَمَّآ	پھر جب وہاں پہنچا، تو اُس وقت پکار اگیا۔ (ایک آواز اُٹھی
أَتٰىهَا نُوْدِيَ يٰمُوْسٰىؕ إِنِّيْٓ	کہ) "اے موسیٰ! میں ہوں تیرا پروردگار! پس اپنی جوتی اُتار
أَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ۚ	دے۔ تو طویٰ کی مقدس وادی میں کھڑا ہے۔ اور دیکھ

إِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۝	میں نے تجھے (اپنی رسالت کے لیے) چن لیا ہے۔ پس جو
وَأَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوحَىٰ	کچھ وحی کی جاتی ہے، اُسے کان لگا کر سن۔ میں ہی اللہ
إِنَّنِي أَنَا اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنَا	ہوں۔ میرے سوا کوئی معبود نہیں۔ پس میری ہی بندگی
فَاعْبُدْنِي وَأَقِمِ الصَّلَاةَ	کر، اور میری ہی یاد کے لیے نماز قائم کر۔ بلاشبہ (مقررہ)
لِذِكْرِي ۝ إِنَّ السَّاعَةَ آتِيَةٌ	وقت آنے والا ہے۔ میں اُسے پوشیدہ رکھنے کو ہوں۔
أَكَادُ أُخْفِيهَا لِتُجْزَىٰ كُلُّ نَفْسٍ	تاکہ (لوگوں کے یقین و عمل کی آزمائش ہو جائے، اور)
بِمَا تَسْعَىٰ ۝ فَلَا يَصُدَّنَّكَ	جس شخص کی جیسی کچھ کوشش ہو اُسی کے مطابق بدلہ پائے"
عَنْهَا مَنْ لَا يُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ	"پس دیکھ! ایسا نہ ہو کہ جو لوگ اس وقت کے ظہور پر یقین
هَوَاهُ فَتَرْدَىٰ ۝	نہ رکھتے ہوں، اور اپنی خواہش کے بندے ہوں، وہ تجھے بھی
(طٰہٰ)	(قدم بڑھانے سے) روک دیں، اور نتیجہ یہ نکلے کہ تو تباہ ہو جائے!"
إِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِأَهْلِهِ إِنِّي آنَسْتُ	جب کہا موسیٰ نے اپنے گھر والوں کو میں نے دیکھی ہے ایک آگ
نَارًا سَآتِيكُمْ مِنْهَا بِخَبَرٍ أَوْ آتِيكُمْ	اب لاتا ہوں تمہارے پاس وہاں سے کچھ خبر یا لاتا ہوں
بِشِهَابٍ قَبَسٍ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُونَ ۝	انگارا سلگا کر تاکہ تم تاپو۔ پھر جب پہنچا اُس کے پاس
فَلَمَّا جَاءَهَا نُودِيَ أَنْ بُورِكَ مَنْ	آواز ہوئی کہ برکت ہے اُس پر جو کوئی آگ میں ہے اور
فِي النَّارِ وَمَنْ حَوْلَهَا وَسُبْحَانَ	جو اُس کے آس پاس ہے اور پاک ہے ذات اللہ کی
اللَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ يَا مُوسَىٰ إِنَّهُ أَنَا	جو رب ہے سارے جہان کا۔ اے موسیٰ وہ میں اللہ
اللَّهُ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝ (النمل)	ہوں زبردست حکمتوں والا۔
وَمَا تِلْكَ بِيَمِينِكَ يَا مُوسَىٰ ۝ قَالَ	"اور (صدائے غیبی نے پوچھا:) اے موسیٰ! تیرے داہنے ہاتھ
هِيَ عَصَايَ أَتَوَكَّأُ عَلَيْهَا	میں کیا ہے؟" عرض کیا "میری لاٹھی ہے جس پر میں اس کا سہارا

وَاَهُشُّ بِهَا عَلٰی غَنَمِیْ وَلِیَ فِیْهَا
مَاٰرِبُ اُخْرٰی ۝ قَالَ اَلْقِهَا
یٰمُوْسٰی ۝ فَاَلْقٰهَا فَاِذَا هِیَ حَیَّةٌ
تَسْعٰی ۝ قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ
سَنُعِیْدُهَا سِیْرَتَهَا الْاُوْلٰی ۝
وَاضْمُمْ یَدَكَ اِلٰی جَنَاحِكَ
تَخْرُجْ بَیْضَآءَ مِنْ غَیْرِ سُوْٓءٍ
اٰیَةً اُخْرٰی ۝ لِنُرِیَكَ مِنْ
اٰیٰتِنَا الْكُبْرٰی ۝
(طٰهٰ)

لیتا ہوں۔ اسی سے اپنی بکریوں کے لیے درختوں کے پتے
جھاڑ لیتا ہوں۔ میرے لیے اس میں اور بھی طرح طرح کے
فائدے ہیں۔ حکم ہوا "اے موسیٰ! اسے ڈال دے" موسیٰ نے
ڈال دیا، اور کیا دیکھتا ہے، ایک سانپ ہے جو دوڑ رہا ہے۔
حکم ہوا "اسے اب پکڑ لے، خوف نہ کھا۔ ہم اسے پھر اس کی
اصلی حالت پر کیے دیتے ہیں" اور (نیز حکم ہوا) "اپنا ہاتھ
اپنے پہلو میں رکھ، اور پھر نکال، بغیر اس کے کہ کسی طرح کا
عیب ہو، چمکتا ہوا نکلیگا۔ یہ (تیرے لیے) دوسری نشانی
ہوئی۔ (اور یہ دونوں نشانیاں) اس لیے دی گئی ہیں کہ آئندہ
تجھے اپنی قدرت کی بڑی بڑی نشانیاں دکھائیں"۔

وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِیِّ اِذْ قَضَیْنَا
اِلٰی مُوْسَی الْاَمْرَ وَمَا كُنْتَ مِنَ
الشّٰهِدِیْنَ ۝ وَلٰكِنَّآ اَنْشَاْنَا قُرُوْنًا
فَتَطَاوَلَ عَلَیْهِمُ الْعُمُرُ ۚ وَمَا كُنْتَ
ثَاوِیًا فِیْٓ اَهْلِ مَدْیَنَ تَتْلُوْا عَلَیْهِمْ
اٰیٰتِنَا ۙ وَلٰكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِیْنَ ۝ وَ
مَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ اِذْ نَادَیْنَا
وَلٰكِنْ رَّحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ
قَوْمًا مَّآ اَتٰهُمْ مِّنْ نَّذِیْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ

اور تو نہ تھا غرب کی طرف جب ہم نے بھیجا موسیٰ کو حکم
اور نہ تھا تو دیکھنے والا۔ لیکن ہم نے پیدا کیں
کئی جماعتیں پھر دراز ہوئی اُن پر مدت۔ اور
تو نہ رہتا تھا مدین والوں میں کہ اُن کو سُناتا
ہماری آیتیں پر ہم رہے رسول بھیجتے۔ اور تو
نہ تھا طور کے کنارے جب ہم نے آواز دی،
لیکن یہ انعام ہے تیرے رب کا تاکہ تو ڈر سُنا
دے اُن لوگوں کو جن کے پاس نہیں آیا کوئی
ڈر سنانے والا تجھ سے پہلے ....

لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۝ (قصص) — تاکہ وہ یاد رکھیں۔

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ۘ اِذْ — کچھ پہنچی ہے تجھ کو بات موسیٰ کی۔ جب پکارا اُس کو

نَادٰىهُ رَبُّهٗ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۚ — اس کے رب نے پاک میدان میں جس کا نام طویٰ ہے

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۘ فَقُلْ — جا فرعون کے پاس اُس نے سر اُٹھایا۔ پھر کہہ تیرا جی

هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى ۙ وَاَهْدِيَكَ — چاہتا ہے کہ تو سنور جائے اور راہ بتاؤں تجھ کو تیرے

اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى ۝ (النازعات) — رب کی طرف پھر تجھ کو ڈر ہو؟

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۝ — (حکم ہوا) "اے موسیٰ! تو فرعون (یعنی بادشاہ مصر) کی طرف جا

قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ — وہ بڑا سرکش ہو گیا ہے"۔ موسیٰ نے عرض کیا "اے پروردگار!

وَيَسِّرْ لِيْٓ اَمْرِيْ ۙ وَاحْلُلْ عُقْدَةً — میرا سینہ کھول دے (کہ بڑے سے بڑا بوجھ اُٹھانے کے لیے مستعد

مِّنْ لِّسَانِيْ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ ۠ وَ — ہو جاؤں) میرا کام میرے لیے آسان کر دے (کہ راہ کی کوئی

اجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ۙ — دشواری بھی غالب نہ آسکے) میری زبان کی گرہ کھول دے

هٰرُوْنَ اَخِي ۙ اشْدُدْ بِهٖٓ — کہ (خطاب و کلام میں پوری طرح رواں ہو جائے، اور)

اَزْرِيْ ۙ وَاَشْرِكْهُ فِيْٓ اَمْرِيْ ۝ — میری بات لوگوں کے دلوں میں اُتر جائے۔ نیز میرے گھر

كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا ۙ وَّنَذْكُرَكَ — والوں میں سے میرے بھائی ہارون کو میرا وزیر بنا دے۔ اُس

كَثِيْرًا ۭ اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًا ۝ — کی وجہ سے میری قوت مضبوط ہو جائے۔ وہ میرے کام میں

قَالَ قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى ۝ — میرا شریک ہو۔ ہم (دونوں یک دل ہو کر تیری پاکی اور بڑائی

(طٰہٰ)

کا بکثرت اعلان کریں۔ تیری یاد میں زیادہ سے زیادہ لگے رہیں۔ اور بلاشبہ تو ہمارا حال دیکھ رہا ہے (ہم کسی حال میں غافل نہیں)" ارشاد ہوا "اے موسیٰ! تیری درخواست منظور ہوئی۔"

اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ ۚ اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۝ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ۝ قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَآ اَوْ اَنْ يَّطْغٰى ۝ قَالَ لَا تَخَافَآ اِنَّنِيْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰى ۝ فَاْتِيٰهُ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۥ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ ۭ قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ ۭ وَالسَّلٰمُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى ۝ (طٰہٰ)

اب تو اور تیرا بھائی، دونوں میری نشانیاں لے کر جائیں اور میری یاد میں کوتاہی نہ کریں۔ ہاں تم دونوں (یعنی موسیٰ اور ہارون کیونکہ اب دونوں اکٹھے ہو گئے تھے، اور مصر کے قریب وحی الٰہی نے انہیں دوبارہ مخاطب کیا تھا) فرعون کے پاس جاؤ۔ وہ سرکشی میں بہت بڑھ چلا ہے۔ پھر جب اُس کے پاس پہنچو تو سختی کے ساتھ پیش نہ آنا) نرمی سے بات کرنا (تمہیں کیا معلوم؟) ہو سکتا ہے کہ نصیحت پکڑ لے، یا (عواقب سے) ڈر جائے" دونوں نے عرض کیا "پروردگار! ہمیں اندیشہ ہے فرعون ہماری مخالفت میں جلدی نہ کرے، یا سرکشی سے پیش آئے" ارشاد ہوا کچھ اندیشہ نہ کرو میں تمہارے ساتھ ہوں میں سب کچھ سنتا ہوں، سب کچھ دیکھتا ہوں! تم اُس کے پاس بے دھڑک جاؤ، اور کہو۔ ہم تیرے پروردگار کی نشانی لے کر تیرے سامنے آ گئے۔ اُس پر سلامتی ہو جو سیدھی راہ اختیار کرے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنَا مَعَهٗٓ اَخَاهُ هٰرُوْنَ وَزِيْرًا ۝ فَقُلْنَا اذْهَبَآ اِلَى الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۭ فَدَمَّرْنٰهُمْ تَدْمِيْرًا ۝ (فرقان)

اور ہم نے دی موسیٰ کو کتاب اور کر دیا ہم نے اُس کے ساتھ اُس کا بھائی ہارون کام بٹانے والا۔ پھر کہا ہم نے تم دونوں جاؤ اُن لوگوں کے پاس جنہوں نے جھٹلایا ہماری باتوں کو پھر دے مارا ہم نے اُن کو اُکھاڑ کر۔

وَاِذْ نَادٰى رَبُّكَ مُوْسٰٓى اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ قَوْمَ فِرْعَوْنَ ۭ اَلَا

اور جب پکارا تیرے رب نے موسیٰ کو کہ جا اُس قوم گنہگار کے پاس۔ قوم فرعون کے پاس۔ کیا وہ ڈرتے

يتقون ۝ قَالَ رَبِّ اِنِّیْٓ اَخَافُ	نہیں۔ بولے رب میں ڈرتا ہوں کہ مجھ کو جھٹلائیں
اَنْ يُّكَذِّبُوْنِ ۝ وَيَضِيْقُ صَدْرِيْ	اور رُک جاتا ہے میرا جی اور نہیں چلتی ہے
وَلَا يَنْطَلِقُ لِسَانِيْ فَاَرْسِلْ اِلٰی هٰرُوْنَ ۝	میری زبان سو پیغام دے ہارون کو۔ اور اُن کو مجھ
وَلَهُمْ عَلَیَّ ذَنْبٌ فَاَخَافُ اَنْ	پر ہے ایک گناہ کا دعویٰ سو ڈرتا ہوں کہ مجھ کو مار ڈالیں
يَّقْتُلُوْنِ ۝ قَالَ كَلَّا ۚ فَاذْهَبَا بِاٰيٰتِنَآ	فرمایا کبھی نہیں تم دونو جاؤ لے کر ہماری نشانیاں ہم
اِنَّا مَعَكُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ ۝ فَاْتِيَا فِرْعَوْنَ	ساتھ تمہارے سُنتے ہیں۔ سو جاؤ فرعون کے پاس اور
فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (الشعراء)	کہو ہم پیغام لے کر آئے ہیں پروردگار عالم کا
وَاَلْقِ عَصَاكَ ۚ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ	اور ڈال دے لاٹھی اپنی پھر جب دیکھا اُس کو پھن ہلاتے
كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰی مُدْبِرًا وَّلَمْ	جیسے سفید پتلا سانپ۔ لوٹا پیٹھ پھیر کر اور مڑ کر نہ دیکھا اے
يُعَقِّبْ ۚ يٰمُوْسٰی لَا تَخَفْ ۚ اِنِّیْ	موسیٰ مت ڈر میں جو ہوں میرے پاس نہیں ڈرتے
لَا يَخَافُ لَدَیَّ الْمُرْسَلُوْنَ ۝	رسول۔ مگر جس نے زیادتی کی پھر بدلے میں
اِلَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًا	نیکی کی بُرائی کے پیچھے تو میں بخشنے والا
بَعْدَ سُوْٓءٍ فَاِنِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝	ہوں۔ اور ڈال دے ہاتھ اپنا اپنے گریبان میں
وَاَدْخِلْ يَدَكَ فِیْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ	کہ نکلے سفید ہو کر بغیر کسی عیب کے یہ دونوں مل کر
بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ فِیْ تِسْعِ	نو نشانیاں لے کر جا فرعون اور اُس کی قوم
اٰيٰتٍ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَقَوْمِهٖ ۭ اِنَّهُمْ	کی طرف۔ بیشک وہ تھے لوگ نافرمان۔
كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ۝ (النمل)	
فَلَمَّا قَضٰی مُوْسَی الْاَجَلَ وَسَارَ	پھر جب پوری کرچکا موسیٰ وہ مدت اور لے کر چلا اپنے
بِاَهْلِهٖٓ اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ	گھر والوں کو دیکھی کوہ طور کی طرف سے ایک آگ۔ کہا

نَارًا ۚ قَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا اِنِّیْٓ	اپنے گھر والوں کو ٹھہرو میں نے دیکھی ہے ایک آگ
اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّیْٓ اٰتِیْكُمْ مِّنْهَا	شاید لے آؤں تمہارے پاس وہاں کی کچھ خبر
بِخَبَرٍ اَوْ جَذْوَةٍ مِّنَ النَّارِ لَعَلَّكُمْ	یا انگارا آگ کا تاکہ تم تاپو۔ پھر جب پہنچا
تَصْطَلُوْنَ ۝ فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِیَ مِنْ	اُس کے پاس آواز ہوئی میدان کے داہنے
شَاطِئِ الْوَادِ الْاَیْمَنِ فِی الْبُقْعَةِ	کنارے سے، برکت والے تختے میں ایک
الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ اَنْ یّٰمُوْسٰٓی	درخت سے کہ اے موسیٰ میں ہوں میں اللہ
اِنِّیْٓ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ وَاَنْ	جہان کا رب۔ اور یہ کہ ڈال دے اپنی لاٹھی
اَلْقِ عَصَاكَ ۚ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ	پھر جب دیکھا اُس کو پھن ہلاتے جیسے پتلا سانپ
كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰی مُدْبِرًا وَّلَمْ	اُلٹا پھرا مُنہ موڑ کر اور نہ دیکھا پیچھے پھر کر۔ اے
یُعَقِّبْ ۚ یٰمُوْسٰٓی اَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ	موسیٰ آگے آ اور مت ڈر تجھ کو کچھ خطرہ
اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِیْنَ ۝ اُسْلُكْ یَدَكَ	نہیں۔ ڈال اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں نکل
فِیْ جَیْبِكَ تَخْرُجْ بَیْضَآءَ مِنْ غَیْرِ	آئے سفید ہو کر نہ کہ کسی بُرائی سے، اور ملا لے
سُوْٓءٍ وَّاضْمُمْ اِلَیْكَ جَنَاحَكَ	اپنی طرف اپنا بازو ڈر سے۔ سو یہ دو سندیں
مِنَ الرَّهْبِ فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ	ہیں تیرے رب کی طرف سے فرعون اور اُس کے
مِنْ رَّبِّكَ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ ؕ	سرداروں پر۔ بیشک وہ تھے لوگ
اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِیْنَ ۝ قَالَ	نافرمان۔ بولا اے رب میں نے خون کیا
رَبِّ اِنِّیْ قَتَلْتُ مِنْهُمْ نَفْسًا فَاَخَافُ	ہے اُن میں ایک جان کا سو ڈرتا ہوں کہ مجھ کو
اَنْ یَّقْتُلُوْنِ ۝ وَاَخِیْ هٰرُوْنُ هُوَ	مار ڈالینگے۔ اور میرا بھائی ہارون اُس کی زبان
اَفْصَحُ مِنِّیْ لِسَانًا فَاَرْسِلْهُ مَعِیَ	چلتی ہے مجھ سے زیادہ سو اُس کو بھیج میرے ساتھ

رِدْءًا یُّصَدِّقُنِیْٓ اِنِّیْٓ اَخَافُ اَنْ	مدد کو کہ میری تصدیق کرے میں ڈرتا ہوں کہ مجھ کو
یُّکَذِّبُوْنِ ۝ قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَکَ	جھوٹا کریں۔ فرمایا ہم مضبوط کر دینگے تیرے بازو کو
بِاَخِیْکَ وَنَجْعَلُ لَکُمَا سُلْطٰنًا	تیرے بھائی سے اور دینگے تم کو غلبہ پھر وہ
فَلَا یَصِلُوْنَ اِلَیْکُمَا ۚ بِاٰیٰتِنَآ ۚ	نہ پہنچ سکیں گے تم تک ہماری نشانیوں سے
اَنْتُمَا وَمَنِ اتَّبَعَکُمَا الْغٰلِبُوْنَ ۝ (قصص)	تم اور جو تمہارے ساتھ ہو غالب رہوگے۔
وَاٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ وَجَعَلْنٰہُ ھُدًی	اور دی ہم نے موسیٰ کو کتاب اور کیا اُس کو ہدایت
لِّبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِیْ	بنی اسرائیل کے واسطے کہ نہ ٹھہراؤ میرے سوا
وَکِیْلًا ۝ ذُرِّیَّۃَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ	کسی کو کارساز۔ تم جو اولاد ہو اُن لوگوں کی جن کو
اِنَّہٗ کَانَ عَبْدًا شَکُوْرًا ۝ (بنی اسرائیل)	چڑھایا ہم نے نوح کے ساتھ بیشک وہ تھا بندہ حق ماننے والا۔
وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ فَلَا تَکُنْ	اور ہم نے دی ہے موسیٰ کو کتاب سو تو مت رہ
فِیْ مِرْیَۃٍ مِّنْ لِّقَآئِہٖ وَجَعَلْنٰہُ ھُدًی	دھوکے میں اُس کے ملنے سے اور کیا ہم نے اُس کو
لِّبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ۚ وَجَعَلْنَا مِنْھُمْ	ہدایت بنی اسرائیل کے واسطے اور کیے ہم نے اُن
اَئِمَّۃً یَّھْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا ۫	میں پیشوا جو راہ چلاتے تھے ہمارے حکم سے جب وہ
وَکَانُوْا بِاٰیٰتِنَا یُوْقِنُوْنَ ۝ اِنَّ رَبَّکَ	صبر کرتے رہے اور رہے ہماری باتوں پر یقین کرتے
ھُوَ یَفْصِلُ بَیْنَھُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ فِیْمَا	تیرا رب جو ہے وہی فیصلہ کریگا اُن میں دن قیامت کے
کَانُوْا فِیْہِ یَخْتَلِفُوْنَ ۝ (سجدہ)	جس بات میں کہ وہ اختلاف کرتے تھے۔

اِن آیات میں "عصاء موسیٰ کے معجزہ یا آیۃ اللہ ہونے کو" مختلف تعبیرات سے ادا کیا گیا ہے، سورۂ طٰہٰ میں "حَیَّۃٌ تَسْعٰی" فرمایا، اور سورۂ نمل اور قصص میں "جَآنٌّ" کہا گیا، اور شعراء میں "ثُعْبَانٌ مُّبِیْنٌ" ظاہر کیا۔ پس مفسرین فرماتے ہیں کہ "عصاء موسیٰ" کی اگرچہ یہ تعبیرات لفظی اعتبار سے مختلف

ہیں لیکن حقیقت اور معنیٰ کے لحاظ سے مختلف نہیں ہیں۔ بلکہ ایک حقیقت کے مختلف اوصاف کو ادا کیا گیا ہے یعنی جنس کے اعتبار سے وہ "حیۃ" (سانپ) تھا، اور تیزروی کے اعتبار سے "جان" (تیزرو سانپ) تھا اور جسامت کے پیشِ نظر وہ "ثعبان" (اژدھا) تھا۔

اور سورۂ قصص میں موسیٰ (علیہ السلام) کے دونوں معجزوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے

واضمم الیک جناحک من الرھب — اور اپنی جانب اپنے بازو ملالے خوف کی حالت میں

اس آیت میں کس قسم کے خوف کا ذکر ہے؟ اس کے متعلق حضرت شاہ صاحب دہلوی نور اللہ مرقدہ ارشاد فرماتے ہیں۔ "بازو بلا ڈر سے یعنی سانپ کا ڈر جاتا رہے[1]"

اور بعض علماء کہتے ہیں کہ اس خوف سے فرعون کے دربار کا خوف مراد تھا یعنی اگر فرعون کے سامنے کسی وقت خوف محسوس ہونے لگے تو اے موسیٰ! تو اپنے بازو کو بدن کے ساتھ ملا لینا فوراً ڈر جاتا رہیگا۔ اور دل میں سکون واطمینان کی کیفیت پیدا ہو جائیگی، یہ دو نشانیوں کے علاوہ تیسری نشانی نہیں تھی بلکہ خوف اور ڈر دور کرنے کا ایک فطری علاج بتلایا گیا تھا جو ایسے موقع پر عموماً فائدہ مند ثابت ہوتا ہے اور اب جبکہ خدائے تعالیٰ کا فرمودہ تھا تو اُس کے راست آنے میں موسیٰ کو شک کی گنجائش ہی باقی نہیں رہی[2]۔

ہمارے نزدیک آیت کا سیاق حضرت شاہ عبد القادرؒ کی تائید کرتا ہے اور نجار کی توجیہ ایک دور کی بات معلوم ہوتی ہے۔

فرعون کے دربار میں دعوتِ حق — بہرحال حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون (علیہما السلام) کے درمیان جب ملاقات اور گفتگو کا سلسلہ ختم ہوا تو اب دونوں نے طے کیا کہ خدائے تعالیٰ کے امتثالِ حکم کے لیے فرعون کے پاس چلنا اور اُس کو پیغامِ الٰہی سُنانا چاہیے۔

---

[1] موضح القرآن [2] قصص الانبیاء للنجار ص ۲۱۲۔

بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ جب دونوں بھائی فرعون کے دربار میں جانے لگے تو والدہ نے غایتِ شفقت کی بنا پر روکنا چاہا کہ تم ایسے شخص کے پاس جانا چاہتے ہو جو صاحبِ تخت و تاج بھی ہے اور ظالم و مغرور بھی، وہاں نہ جاؤ، وہاں جانا بے سود ہوگا، مگر دونوں نے والدہ کو سمجھایا کہ خدائے تعالیٰ کا حکم ٹالا نہیں جا سکتا اور اُس کا وعدہ ہے کہ ہم کامیاب ہونگے۔

غرض دونوں بھائی اور خدا کے سچے پیغمبر و نبی فرعون کے دربار میں پہنچے اور بغیر خوف و خطر اندر داخل ہوگئے۔ جب فرعون کے تخت کے قریب پہنچے تو حضرت موسیٰ و ہارون نے اپنے آنے کی وجہ بیان کی اور گفتگو شروع ہوئی، اُنہوں نے فرمایا۔

"فرعون! ہم کو خدا نے اپنا پیغمبر اور رسول بنا کر تیرے پاس بھیجا ہے، ہم تجھ سے دو اہم باتیں چاہتے ہیں ایک یہ کہ خدا پر یقین لا، اور کسی کو اُس کا ساجھی اور سہیم نہ بنا۔ دوسرے یہ کہ ظلم سے باز آ اور بنی اسرائیل کو اپنی غلامی سے نجات دے۔ ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں یقین رکھ کہ یہ بناوٹ اور تصنع نہیں ہے، اور نہ ہم کو یہ جرأت ہو سکتی ہے کہ خدائے تعالیٰ کے ذمہ غلط بات لگائیں، ہماری صداقت کے لیے جس طرح ہماری یہ تعلیم خود شاہد ہے اُسی طرح خدائے تعالیٰ نے ہم کو اپنی دو زبردست نشانیاں (معجزات) بھی عطا فرمائی ہیں۔ لہٰذا تیرے لیے مناسب یہی ہے کہ صداقت و حق کے اس پیغام کو قبول کر اور بنی اسرائیل کو رستگاری دے کر میرے ساتھ کر دے تاکہ میں انہیں پیغمبروں کی اُس سرزمین میں لیجاؤں جہاں بجز ذاتِ واحد کے یاد اور کسی کی پرستش نہ کریں کہ یہی راہِ حق ہے اور ان کے باپ دادوں کا ابدی شعار۔

وقال موسیٰ یا فرعون اِنّی رسولٌ	اور موسیٰ نے کہا اے فرعون! میں جہانوں کے پروردگار
مِّنْ رَّبِّ العٰلمین ٥ حقیقٌ علیٰ اَنْ	کا بھیجا ہوا ایلچی ہوں، میرے لیے کسی طرح زیبا نہیں
لا اقول علی اللّٰہِ اِلّا الحق قد جئتکم	کہ اللہ پر حق اور سچ کے علاوہ کچھ اور کہوں بلاشبہ

ببینۃ من ربکم فارسل معی بنی — میں تمہارے لیے تمہارے پروردگار کے پاس سے دلیل اور

اسرائیل (اعراف) — نشان لایا ہوں پس تو میرے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دے

فرعون نے جب یہ سُنا تو کہنے لگا کہ "موسیٰ! آج تو پیغمبر بن کر میرے سامنے بنی اسرائیل کی رہائی کا مطالبہ کرتا ہے وہ دن بھول گیا جب تو نے میرے ہی گھر میں پرورش پائی اور بچپن کی زندگی گذاری اور کیا تو یہ بھی بھول گیا کہ تو نے ایک مصری کو قتل کیا اور یہاں سے بھاگ گیا" حضرتِ موسیٰ نے فرمایا" فرعون! یہ صحیح ہے کہ میں نے تیرے گھر میں پرورش پائی اور ایک مدت تک شاہی محل میں رہا، اور مجھے یہ بھی اعتراف ہے کہ غلطی کی بنا پر مجھ سے نادانستہ ایک شخص قتل ہو گیا تھا اور میں اس خوف سے چلا گیا تھا، لیکن یہ خدائے تعالیٰ کی رحمت کا کرشمہ ہے کہ اُس نے ان تمام بیکسانہ مجبوریوں کی حالت میں تیرے ہی گھرانے میں میری پرورش کرائی اور پھر مجھ کو اپنی سب سے بڑی نعمت "نبوت و رسالت" سے سرفراز کیا۔

فرعون! کیا یہ طریقۂ عدل و انصاف کا طریقہ ہو گا کہ مجھ ایک اسرائیلی کی پرورش کا بدل یہ ٹھہرے کہ بنی اسرائیل کی تمام قوم کو تو غلام بنائے رکھے؟"

فاتیا فرعون فقولا انا رسول — پھر وہ دونوں فرعون کے پاس آئے پس اُنہوں نے کہا

رب العلمین . ان ارسل معنا — "ہم بلاشبہ جہانوں کے پروردگار کے پیغمبر اور ایلچی ہیں، یہ پیغام

بنی اسراءیل . قال الم نربك — لے کر آئے ہیں کہ تو بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دے"۔

فینا ولیدا ولبثت فینا من — فرعون نے کہا "کیا ہم نے تجھ کو اپنے یہاں لڑکا سا نہیں پالا

عمرك سنین وفعلت فعلتك — اور تو ہمارے یہاں ایک مدت نہیں رہا، اور تو نے جو کچھ اُس

التی فعلت وانت من الکفرین — زمانہ میں کام کیا وہ تجھے خود بھی معلوم ہے اور تو ناشکر گذار ہے"

قال فعلتها اذا وانا من الضالین — موسیٰ نے کہا "میں نے وہ کام (مصری کا قتل) ضرور کیا اور میں اُس

ففررت منكم لما خفتكم	میں چوک جانے والوں میں سے ہوں پھر یہاں سے تمہارے خوف سے
فوهب لی ربی حکما وجعلنی	بھاگ گیا، پھر میرے رب نے مجھ کو صحیح فیصلہ کی سمجھ دی اور مجھ کو اپنے
من المرسلین . وتلك نعمة	پیغمبروں میں سے بنا لیا (یہ اُس کی حکمت کی کرشمہ سازیاں ہیں)
تمنها علی ان عبدت بنی	اور میری (پرورش کا) یہ احسان جس کو تو مجھ سے جتا رہا ہے کیا ایسا
اسرائیل ۰ (شعراء)	احسان ہے کہ تو بنی اسرائیل کو غلام بنائے رکھے۔

سورۂ شعراء کی اس آیت "وتلك نعمة الخ" کا ترجمہ عام مفسرین کی تفسیر کے مطابق کیا گیا ہے۔ لیکن اس کے برعکس عبدالوہاب نجار اس آیت کے یہ معنی کرتے ہیں "اور تیرا یہ انعام ہوگا اور تو مجھ پر احسان کریگا کہ تو بنی اسرائیل کو عزت بخشے یعنی اُن کو میرے ساتھ بھیجدے کہ وہ اپنے خدا کی عبادت میں آزاد ہو جائیں"

اور اس معنی کے جواز میں فرماتے ہیں کہ "عبدت" بمعنی "کرمت" لغتِ عرب سے ثابت ہے۔ چنانچہ لسان العرب ص ۲۶۳ جلد ۴ میں ہے "المعبد، المکرم" اور یہاں یہ معنی لینے اس لیے ضروری ہیں کہ قرآنِ عزیز میں تصریح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو یہ تلقین کر دی تھی کہ فرعون کے سمجھانے میں نرمی اور لطف و مہربانی کو پیشِ نظر رکھنا غصہ یا سخت کلامی کا اظہار نہ کرنا۔ لہذا حضرت موسیٰ سے یہ بعید ہے کہ وہ اِس ہدایتِ الٰہی کے خلاف طعن و تشنیع یا معاریض و مجازات سے کام لیں جو رفق و تلطف کے قطعی خلاف ہے۔ اور جو معنی عام مفسرین نے لیے ہیں اُن میں طعن و معاریض کا پہلو نکلتا ہے۔

مگر نجار نے اس موقعہ پر جو کچھ کہا ہے وہ خود تکلفِ بارد اور رکیک تاویل کی حیثیت سے زیادہ نہیں ہے، اس لیے کہ عام مفسرین کے معنی کے مطابق یہاں نہ طعن و تشنیع ہے اور نہ معاریض و مجازات بلکہ روشن دلیل اور واضح حجت کے ذریعہ فرعون کو اس کی کج روی اور متمردانہ سرکشی پر توجہ دلانا ہے جو

ایک پیغمبر اور خدا کے سچے رسول کا فرضِ منصبی ہے۔

فرعون نے اپنی مغرورانہ سرشت کے مطابق حضرت موسیٰ کے پیغمبر خدا ہونے کا استخفاف کیا اور مذاق و تحقیر کرتے ہوئے حضرت موسیٰ کی شخصیت سے بحث شروع کر دی، اپنے گھرانے کے احسان جتائے اور مصری کے قتل والا معاملہ یاد دلا کر خوفزدہ کرنے کی سعی کی، مگر موسیٰ علیہ السلام چونکہ ان سب مراحل کے متعلق خدائے برحق سے ہر قسم کا اطمینان حاصل کر چکے تھے، اس لیے ان پر مطلق نہ خوف کا اثر ہوا اور نہ ان کو غصہ آیا۔ بلکہ انہوں نے فرعون کے گھرانے کی تربیت کا اعتراف بھی کیا اور مصری کے قتل کی غلطی کو بھی تسلیم کیا مگر ساتھ ہی ایک ایسا مسکت برہان اور خاموش کن دلیل بھی پیش کر دی کہ فرعون واقعی لاجواب ہو گیا اور اس نے ناراضی اور غصہ کے اظہار کی بجائے گفتگو کا پہلو فوراً بدل دیا اور موسیٰ علیہ السلام سے "رب العٰلمین" کے متعلق بات چیت شروع کر دی، اور وہ دلیل و حجت یہی تھی کہ موسیٰ نے کہا۔ "تو نے یہ جو کچھ کہا میری شخصیت اور ذات سے متعلق ہے لیکن کیا یہ باتیں اس کے لیے جواز کا سبب بن سکتی ہیں کہ بنی اسرائیل کی پوری قوم کو تو غلام بنائے رہے یہ تو صریح ظلم ہے"۔

لہٰذا مفسرین کی تفسیر اور ترجمہ ہی صحیح ہے اور نجار کے ترجمہ کو تسلیم کر لینے کے بعد کلام کی تمام لطافت اور خوبی فنا ہو جاتی ہے اور سیاق سباق کے ساتھ بھی بے تکلف اس کا جوڑ نہیں لگتا۔

ربوبیتِ الٰہی پر حضرت موسیٰ و فرعون کا مذاکرہ

فرعون نے دورانِ گفتگو میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پر جو یہ طعن کیا تھا کہ تو نے ہمارے یہاں تربیت پائی ہے اور میں تیرا مربی ہوں تو اس کے معنی صرف اسی قدر نہیں تھے بلکہ اس کی تہ میں وہ عقیدہ کام کر رہا تھا جس کی شکست و ریخت کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام مبعوث کیے گئے تھے یعنی سلطنتِ مصر کا بادشاہ صرف بادشاہ ہی نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ "راع" (سورج) دیوتا کا اوتار مانا جاتا تھا اور اس لیے فرعون کے لقب سے ملقب تھا، مصریوں کے عقیدہ میں تربیت کائنات کا معاملہ "راع" دیوتا کے سپرد تھا اور دنیا میں اس کا صحیح مظہر شاہِ مصر "فرعون" تھا۔ اب حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام)

نے جب خدائے واحد کی پرستش اور دیوتاؤں کی پوجا کے خلاف آواز بلند کی اور فرمایا "انی رسول من رب العلمین" تو اول اُس نے اپنی اور اپنے باپ دادا کی ربوبیت کو اس طرح ثابت کیا کہ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کی شخصیت پر اُس کا بوجھ پڑے، اور جب اس طرح اصل مسئلہ کو حل ہوتے نہ دیکھا تو اب مسئلہ کو زیادہ عُریاں کر کے حضرتِ موسیٰ کے ساتھ مناظرہ پر آمادہ ہو گیا۔ کہنے لگا "موسیٰ! یہ تو نئی بات کیا سُناتا ہے کیا میرے علاوہ بھی کوئی "رب" ہے کہ جس کو تو "رب العلمین" کہتا ہے، اگر یہ صحیح ہے تو اُس کی حقیقت بیان کر حضرتِ موسیٰ نے ارشاد فرمایا" اگر تم میں یقین اور ایمانِ صحیح کی گنجائش ہے تو تم کو سمجھنا چاہیے کہ میں جس ہستی کو "رب العلمین" کہتا ہوں وہ ذاتِ اقدس ہے جس کے قبضۂ قدرت میں آسمان، زمین، اور ان دونوں کے درمیان کی کل مخلوقات کی ربوبیت ہے فرعون! کیا تو دعویٰ کر سکتا ہے کہ ان آسمانوں، زمینوں، اور ان کے درمیان تمام مخلوقات کو تو نے پیدا کیا ہے یا ان کی ربوبیت کا کارخانہ تیرے یدِ قدرت میں ہے؟ اگر نہیں اور بلاشبہ نہیں! تو پھر "رب العلمین" کی ربوبیتِ عام سے انکار کیوں؟" فرعون نے یہ سُنا تو درباریوں کی جانب مخاطب ہو کر تعجب و حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگا "الا تسمعون" کیا تم سُنتے ہو؟ یہ کیسی عجیب بات کہہ رہا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون اور اُس کے درباریوں کے اس تعجب و حیرانی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اور اپنے سلسلۂ گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا" رب العلمین وہ ہستی ہے جس کی ربوبیت

(حاشیہ صفحہ ۳۴۰) لہ مصری مختلف دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے جن میں سے بعض تو خاص خاص قبیلوں اور علاقوں کے تھے جیسے نیفات، فتاح اور رمات اور بعض عالمگیر قوتوں کے الگ مظاہر تھے جیسے اوزیرس عالم آخرت کا خدا، میہ اورت آسمان کا خدا، کینمو جسم بنانے والا، ابزیز روح بخشنے والی دیوی، طوط عمر کی مقدار مقرر کرنے والا، ہوراس درد و غم دور کرنے والا، حاتو رگائے، رزق بخشنے والی دیوی اور ان سب سے بلند تر آمن رع تھا یعنی سورج دیوتا۔

نیز مصریوں میں الوہیت آمیز شاہی کا تصور بھی پوری طرح نشو و نما پا چکا تھا اور تاجدارانِ مصر نے نیم خدا کی حیثیت اختیار کر لی تھی اُن کا لقب "فارع" اس لیے ہوا کہ وہ "ا ن" یعنی سورج دیوتا کے اوتار سمجھے جاتے تھے۔ (ترجمان القرآن جلد ۲ ص ۴۶۲)

کے اثر سے تیری اور تیرے باپ دادا کا وجود بھی خالی نہیں ہے یعنی جس وقت تو عالمِ وجود میں نہ آیا تھا تو مجھ کو پیدا کیا اور تیری تربیت کی اور اسی طرح وہ تجھ سے پہلے تیرے آباؤ اجداد کو عالمِ وجود میں لایا اور اُن کو اپنی ربوبیت سے نوازا، فرعون نے جب اس مسکت اور زبردست دلیل کو سُنا اور کوئی جواب نہ بن پڑا تو درباریوں سے کہنے لگا "مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ جو خود کو تمہارا پیغمبر اور رسول کہتا ہے مجنون اور پاگل ہے" حضرت موسیٰ نے جب یہ دیکھا کہ اس سے اب کوئی جواب نہیں بن پڑتا اس لیے بہتر ہے کہ اور زیادہ دلنشین پیرایہ بیان میں خدا کی ربوبیت کو واضح کیا جائے تو فرمایا "یہ جو مشرق و مغرب اور اس کے درمیان ساری کائنات نظر آتی ہے اس کی ربوبیت جس کے یدِ قدرت میں ہے اُسی کو میں رب العٰلمین کہتا ہوں، تم اگر ذرا بھی عقل و سمجھ سے کام لو تو بآسانی اس حقیقت کو پا سکتے ہو"

غرض حضرتِ موسیٰ اللہ رب العٰلمین کے حکم کے مطابق برابر شیریں کلامی، نرم گفتاری اور رفق و لطف کے ساتھ فرعون اور اس کے درباریوں کو راہِ حق دکھاتے اور رسالت کا فرض ادا فرماتے رہے اور فرعون کی تحقیر و توہین اور مجنون جیسے سخت الفاظ کو خاموشی کے ساتھ برداشت کرتے ہوئے اُس کی رشد و ہدایت کے لیے بہترین دلائل اور مسکت جوابات دیتے رہے

قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ. قَالَ	بولا فرعون کیا معنی ہیں پروردگار عالم کے کہا پروردگار
رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ط	آسمان اور زمین کا اور جو کچھ اُن کے بیچ میں ہے
اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ. قَالَ لِمَنْ حَوْلَهٗٓ	اگر تم یقین کرو۔ بولا اپنے گرد والوں سے کیا تم نہیں
اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ. قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ	سُنتے ہو؟ کہا پروردگار تمہارا اور پروردگار تمہارے
اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ. قَالَ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ	اگلے باپ دادوں کا۔ بولا تمہارا پیغام لانے والا
الَّذِيْٓ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ. قَالَ	جو تمہاری طرف بھیجا گیا ضرور باؤلا ہے۔ کہا پروردگار
رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا ط	مشرق کا اور مغرب کا اور جو کچھ اُن کے بیچ میں موجود ہے

اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ (شعراء)　　　اگر تم سمجھ رکھتے ہو۔

ایک مرتبہ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو یاد دلایا کہ جو راستہ تو نے اختیار کیا ہے یہ صحیح نہیں ہے "رب العلمین" ہی وہ ذات ہے جو قابل پرستش ہے اور کسی انسان کا دعویٔ "ربوبیت" کھلا ہوا شرک ہے تو اس سے باز آ کیونکہ اُس ہستی نے جس کو میں رب العلمین کہہ رہا ہوں، ہم پر یہ وحی نازل کی ہے کہ جو شخص اس قولِ حق کی خلاف ورزی اور تکذیب کریگا اور اُس سے مُنہ موڑیگا وہ خدا کے عذاب کا مستحق ٹھہریگا۔

فرعون نے پھر وہی پہلا جواب دیا "اے موسیٰ! تم دونوں کا رب کون ہے؟"

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کے جواب میں ایسی لاجواب بات کہی کہ فرعون حیران رہ گیا اور پہلو بدل کر بات کا رُخ دوسری جانب پھیرنے کی اس طرح سعی کرنے لگا جس طرح باطل کوش مناظرین کا قاعدہ ہے کہ جب صحیح جواب نہ بن پڑے، اور حقیقت حال صاف سامنے آجائے تو پھر اُس کو دبلانے کے لیے کجروی کے ساتھ بات کا رُخ دوسری جانب پھیر دیا کرتے ہیں۔

بہرحال حضرت موسیٰ نے فرمایا "ہمارا پروردگار تو وہ ایک ہی پروردگار ہے جس نے دنیا کی ہر چیز کو اُس کا وجود بخشا اور پھر ہر طرح کی ضروری قوتیں (حواس، عقل وغیرہ) دے کر اُس پر زندگی و عمل کی راہ کھول دی، جس نے ہر شئے کو نعمتِ جسم و وجود عطا کی اور پھر سب کو منزلِ کمال کی طرف چلنے کی راہ دکھائی"، تب فرعون نے لاجواب ہو کر بات کا رُخ یوں بدلا کہنے لگا۔ فما بال القرون الاولیٰ تو پھر پہلے زمانہ کے لوگوں کا حال کیا ہوا"، مطلب یہ تھا کہ اگر تیری یہ بات صحیح ہے تو پھر ہم سے پہلے لوگ اور ہمارے باپ دادا جن کا عقیدہ تیرے عقیدہ کی تائید میں نہ تھا کیا وہ سب عذاب میں گرفتار ہیں اور سب جھوٹے تھے۔ حضرت موسیٰ فرعون کی کج بحثی کو سمجھ گئے اور اُنہیں یقین ہو گیا کہ یہ اصل مقصد کو اُلجھانا چاہتا ہے اس لیے فوراً جواب دیا "علمها عند ربی

فی کتٰب لا یضلّ ربی ولا ینسیٰ" اُن پر کیا گذری اور اُن کے ساتھ خدا کا کیا معاملہ رہا اس کی ذمہ داری نہ مجھ پر ہے اور نہ تجھ پر اُن کا علم میرے پروردگار کے پاس محفوظ ہے ہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ میرا پروردگار بھول چوک اور خطا سے پاک ہے جس نے جو کچھ کیا ہے اُس کے معاملہ میں کوئی بھول یا ظلم نہ ہوگا" اس کے بعد حضرت موسیٰ نے پھر گفتگو کو اصل مسئلہ کی طرف پھیر دیا اور "ربّ العالمین" کے اوصاف کا ذکر کر کے مسئلہ کی حقیقت کو اچھی طرح واضح اور مستحکم بنایا۔

اِنَّا قَدْ اُوْحِیَ اِلَیْنَآ اَنَّ الْعَذَابَ	جو کوئی جھٹلائے اور سرتابی کرے، تو ہم پر وحی اُتر چکی اُس کے لیے
عَلٰی مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰی ○	عذاب کا پیام ہے۔ (چنانچہ وہ گئے، اور) فرعون نے پوچھا" اگر
قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا یٰمُوْسٰی ۚ قَالَ	ایسا ہی ہے تو بتلاؤ تمہارا پروردگار کون ہے اے موسیٰ؟" موسیٰ نے
رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی كُلَّ شَیْءٍ	کہا" ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اُس کی خلقت بخشی پھر
خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی ۚ قَالَ فَمَا بَالُ	اُس پر (زندگی و عمل کی) راہ کھول دی" فرعون نے کہا، پھر اُن کا
الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰی ۚ قَالَ عِلْمُهَا	کیا حال ہونا ہے جو پچھلے زمانوں میں گذر چکے ہیں؟ موسیٰ نے کہا
عِنْدَ رَبِّیْ فِیْ كِتٰبٍ ۚ لَا یَضِلُّ	اس بات کا علم میرے پروردگار کے پاس نوشتہ میں ہے میرا پروردگا
رَبِّیْ وَلَا یَنْسَی ۚ الَّذِیْ جَعَلَ	ایسا نہیں کہ کھو یا جائے۔ یا بھول میں پڑجائے" وہ پروردگار
لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّسَلَكَ	جس نے تمہارے لیے زمین بچھونے کی طرح بچھادی، نقل و حرکت کے
لَكُمْ فِیْهَا سُبُلًا وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ	لیے اُس میں راہیں نکال دیں، آسمان سے پانی برسایا، اُس کی
مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْ	آبپاشی سے ہر طرح کی نباتات کے جوڑے پیدا کر دے۔ خود بھی کھاؤ
نَّبَاتٍ شَتّٰی ○ كُلُوْا وَارْعَوْا اَنْعَامَكُمْ ۚ	اور اپنے مویشی بھی چراؤ۔ اس بات میں عقل والوں کے لیے کیسی کھلی
اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی	نشانیاں ہیں؟ اُس نے اسی زمین سے تمہیں پیدا کیا، اسی میں
النُّهٰی ۚ مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِیْهَا	لوٹاتا ہے اور پھر اسی سے دوسری مرتبہ اُٹھائے

نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى o (طٰہٰ) جاؤ گے۔

ہندوستان کے ایک مشہور معاصر عالم نے سورۂ طٰہٰ کی آیت "اعطیٰ کل شیٔ خلقہ ثم ھدیٰ" میں "ہدایت" کے معنیٰ رہنمائی حواس و عقل تسلیم کرتے ہوئے مفسرین کو بے محل مورد طعن بنایا ہے کہ انہوں نے قرآن عزیز کی آیت زیر بحث کی روح کو نہ پاتے ہوئے غلطی سے یہاں بھی "ہدیٰ" کے معنیٰ ہدایت دین و مذہب کے لیے ہیں، اور گویا صرف انہوں نے ہی سب سے پہلی مرتبہ اس روح کو پہچانا اور اس حقیقت پر آگاہی حاصل کی ہے، حالانکہ چند مفسرین کے علاوہ قدیم اور جدید عام مفسرین اور محققین نے بھی اس مقام پر "ہدیٰ" کے وہی معنی بیان کیے ہیں جن کو اچھوتا اور طبعزاد بتایا گیا ہے۔[1]

علماء تفسیر کہتے ہیں کہ فرعون اور موسیٰ (علیہ السلام) کے ان مکالمات میں حضرت ہارون دونوں کے درمیان ترجمان ہوتے اور حضرت موسیٰ کے دلائل و براہین کو نہایت فصاحت و بلاغت کے ساتھ ادا فرماتے تھے۔

بہرحال مختلف مجالس میں مکالمت کا یہ سلسلہ حضرت موسیٰ اور فرعون کے درمیان جاری رہا۔ فرعون حضرت موسیٰ و حضرت ہارون (علیہما السلام) کے روشن اور پُر از صداقت دلائل سن سن کر اگرچہ پیچ و تاب کھاتا مگر لاجواب ہو جانے کی وجہ سے کوئی صورت نہیں بنتی تھی کہ موسیٰ (علیہ السلام) سے رُستگاری حاصل کرے، وہ خوب جانتا تھا کہ میری ربوبیت اور الوہیت کی بنیاد اس قدر کمزور ہے کہ دلائلِ موسیٰ کی صداقت کے سامنے تارِ عنکبوت کی طرح تار تار ہو جاتی ہے اور درباری بھی اس کو اچھی طرح سمجھتے تھے اس لیے فرعون کے لیے یہ بات سخت ناقابلِ برداشت تھی۔ اور جس قلمرو میں اس کے رُعبِ شاہی اور دبدبۂ حکومت کے ساتھ ساتھ اس کی ربوبیت و الوہیت کا جاہ و جلال بھی مانا جاتا ہو وہاں موسیٰ اور ہارون کی یہ جرأتِ حق اندر ہی اندر اس کو سخت خائف اور پریشان کر رہی تھی۔ اس لیے فرعون نے اب اس سلسلۂ بحث کو ختم کرنے کے لیے دوسرے طریقے اختیار کیے جن میں اپنی طاقت و قہرمانیت کا زور، مصری قوم کو موسیٰ اور بنی اسرائیل کے

[1] روح المعانی جلد ۱۶ صفحہ ۱۸۳۔

خلاف مشتعل کرنا، اور ربّ العلمین" سے جنگ کا اعلان کرکے اس بحث کا خاتمہ کر دینا شامل تھا۔

اُس نے اپنی قوم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:۔

وقال فرعون یآیہا الملاء ما علمت	اور فرعون نے کہا اے جماعت میں تمہارے لیے
لکم من الٰہٍ غیری۔ (قصص)	اپنے سوائے کوئی دوسرا خدا نہیں جانتا۔

اور پھر (اپنے مشیر یا وزیر) ہامان کو حکم دیا۔

فاوقد لی یاھامان علی الطین	اے ہامان! اینٹیں پکا اور ایک بہت بلند عمارت
فاجعل لی صرحًا لعلی اطلع الی	بنا شاید اُس پر چڑھ کر میں موسیٰ کے خدا کا پتہ لگا سکوں
الٰہ موسیٰ وانی لاظنہ من الکاذبین۔ (قصص)	اور میں تو بلا شبہ اُس کو جھوٹا سمجھتا ہوں۔
وقال فرعون یاھامان ابن لی	فرعون نے کہا اے ہامان! میرے لیے ایک بلند عمارت
صرحًا لعلی ابلغ الاسباب ۝ اسباب	تیار کرنا کہ میں آسمانوں کی بلندیوں اور ان کے ذرائع تک دسترس
السمٰوٰت فاطلع الی الٰہ موسیٰ	حاصل کر سکوں اور اس طرح موسیٰ کے خدا کا حال معلوم
وانی لاظنہ کاذبا وکذلک زین	کر سکوں، اور میں تو اُس کو جھوٹا سمجھتا ہوں۔ اسی طرح
لفرعون سوءُ عملہ وصدّ عن	فرعون کے لیے اُس کی بدعملی کو خوبصورت کر دیا گیا۔
السبیل ۝ وما کید فرعون الا	اور وہ راہِ حق سے (بدعملی پر اصرار کی وجہ سے) روک دیا گیا
فی تباب ۝ (غافر)	اور فرعون کے مکر کا آخری انجام ہلاکت ہے۔

حضرت شاہ عبدالقادر (نور اللہ مرقدہ) موضح القرآن میں ارشاد فرماتے ہیں کہ آیت "ما علمت لکم من الٰہٍ غیری" سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرعون دہری (ناستک) تھا، اور کتبِ تفسیر و تاریخ میں جو مصرِ قدیم کے تاریخی حوالجات نقل کیے گئے ہیں ان سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ مصری دیوتاؤں کے پرستار تھے اور اُن کا سب سے بڑا دیوتا "آمن راع" (سورج دیوتا) تھا اور وہ خدائے واحد کے کسی

معنی ہیں بھی قائل نہ تھے، بلکہ تمام کائنات کی تخلیق اور اُن کے ہر قسم کے معاملات وحادثات کا تعلق کواکب وسیارات اور اُن دیوتاؤں سے ہی متعلق سمجھتے تھے، غالباً فرعون اور اُس کی قوم کا عقیدہ ہندوستان کے جین مت کے قریب قریب تھا کیونکہ جینی بھی خدا کے منکر مگر دیوتاؤں کے پرستار ہیں۔

ہامان؟ ہامان کے متعلق قرآنِ عزیز نے کوئی تصریح نہیں کی کہ یہ کسی شخصیت کا نام ہے یا عہدۂ اور منصب کا، اور اُس کا منصب وعہدہ فرعون کے دربار میں کیا تھا۔ اور نہ اُس نے اس پر روشنی ڈالی کہ ہامان نے عمارت تیار کرائی یا نہیں اور فرعون نے پھر اُس پر چڑھ کر کیا کیا؟ کیونکہ یہ اس کے مقصد کے لیے غیر ضروری تھا۔ توراۃ نے بھی اس کے متعلق کوئی اشارہ نہیں کیا بلکہ اُس نے فرعون کے عمارت بنانے کے حکم کا بھی کوئی ذکر نہیں کیا۔ البتہ مفسرین نے یہ قصہ ضرور نقل کیا ہے کہ جب ہامان نے ایک بہت اونچا منارہ تیار کرا کے فرعون کو اطلاع دی تو فرعون اُس پر چڑھا اور تیر کمان ہاتھ میں لے کر آسمان کی طرف تیر پھینکا، قدرتِ الٰہی کے فیصلہ کے مطابق وہ تیر خون آلود ہو کر واپس ہوا، فرعون نے یہ دیکھ کر غرور وشیخی کے ساتھ مصریوں سے کہا کہ لو اب میں نے موسیٰ کے خدا کا بھی قصہ تمام کر دیا۔ واللہ اعلم۔

فرعون نے درباریوں، عام قبطیوں اور ہامان پر حضرت موسیٰ کے مقابلہ میں اپنی شکست کو چھپانے کے لیے اگرچہ مسطورۂ بالا طریقہ اختیار کیا مگر وہ خود بھی سمجھتا تھا کہ یہ ایک دھوکا ہے اور بس، اس سے دلوں کی تسلّی نہیں ہو سکتی، اور بہت ممکن ہے کہ بہت سے مصری بھی اس کو سمجھتے ہوں تاہم درباریوں اور خواص وعوام میں ایک بھی ایسا "رجلِ رشید" نہ تھا جو جراءت اور حق گوئی کے ساتھ اس حقیقت کا اعلان کر دیتا، اور رشد وہدایت کی قبولیت کا دروازہ وا کرتا۔

فرعون کے دربار میں "آیات اللہ" کا مظاہرہ غرض فرعون کا خدشہ بڑھتا ہی رہا، اُس کو حق وباطل کی اس

کشمکش میں اپنے لیے سخت خطرہ نظر آرہا تھا، اس لیے اُس نے معاملہ کو صرف یہیں ختم نہیں کردیا بلکہ ضروری سمجھا کہ اپنی سطوت و جبروت اور قہرمانیت کا اثر حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون پر بھی ڈالے، اور اس طرح اُن کو مرعوب کرکے پیغامِ حق کے فرض سے اُن کو باز رکھے۔ چنانچہ کہنے لگا۔

"موسیٰ! اگر تو نے میرے سوائے اور کسی کو معبود قرار دیا تو میں تجھ کو قید میں ڈال دونگا" حضرتِ موسیٰ نے فرمایا "اگرچہ میں تیرے پاس خدائے واحد کی جانب سے واضح نشان لے کر آیا ہوں تب بھی تیرے غلط راستے کو اختیار کرلوں؟" فرعون نے کہا "تو اگر اس بارہ میں واقعی سچا ہے تو کوئی "نشان" دکھا"

قال لئن اتخذت الٰھا غیری	فرعون نے کہا اگر تو نے میرے سوائے کسی کو معبود بنایا
لاجعلنك من المسجونین. قال	تو میں تجھے ضرور قید کردونگا، موسیٰ نے کہا اگرچہ میں
اولو جئتك بشیءٍ مّبین. قال	تیرے پاس ظاہر نشان لایا ہوں تب بھی؟ فرعون نے
فأتِ بہ ان کنت من الصّٰدقین (شعراء)	کہا اگر تو سچا ہے تو وہ نشان دِکھا۔
قال ان کنت جئت بآیۃ فأت	فرعون نے کہا اگر تو اپنے خدا کے پاس سے کوئی نشانی لایا ہے
بھا ان کنت من الصّٰدقین. (اعراف)	اس بارہ میں سچا ہے تو لا وہ نشان دکھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام آگے بڑھے اور بھرے دربار میں فرعون کے سامنے اپنی لاٹھی کو زمین پر ڈالا، اُسی وقت اُس نے اژدہا کی شکل اختیار کرلی اور یہ حقیقت تھی نظر کا دھوکا نہ تھا، اور پھر حضرتِ موسیٰ نے اپنے ہاتھ کو گریبان کے اندر لے جاکر باہر نکالا تو وہ ایک روشن ستارہ کی طرح چمکتا ہوا نظر آرہا تھا۔ یہ دوسری نشانی اور دوسرا معجزہ تھا۔

فرعون کے درباریوں نے جب اس طرح ایک اسرائیلی کے ہاتھوں اپنی قوم اور اپنے بادشاہ کی شکست کو دیکھا تو بلبلا اُٹھے، اور کہنے لگے "بلا شبہ یہ بہت بڑا ماہر جادوگر ہے، اور یہ اس نے

یہ سب ڈھونگ اس لیے رچا ہے کہ تم پر غالب آکر تم کو تمہاری سرزمین (مصر) سے باہر نکال دے لہذا اب ہم کو سوچنا ہے کہ اس کے متعلق کیا ہونا چاہیے" آخر فرعون اور فرعونیوں کے باہمی مشورہ سے یہ طے پایا کہ فی الحال تو اس کو اور ہارون کو مہلت دو اور اس درمیان میں تمام قلمرو سے ماہر جادوگروں کو دارالسلطنت میں جمع کرو اور پھر موسیٰ کا مقابلہ کراؤ بلا شبہ یہ شکست کھا جائیگا اور اس کے تمام ارادے خاک میں ملجائینگے۔ تب فرعون نے حضرت موسیٰ سے کہا "موسیٰ! ہم خوب سمجھ گئے کہ تو اس حیلہ سے ہم کو سرزمینِ مصر سے بے دخل کرنا چاہتا ہے لہذا اب تیرا علاج اس کے سوائے کچھ نہیں ہے کہ بڑے بڑے ماہر جادوگروں کو جمع کر کے تجھ کو شکست دلائی جائے، اب تیرے اور ہمارے درمیان مقابلہ کے دن کا معاہدہ ہو جانا چاہیے اور پھر نہ ہم اس سے ٹلینگے اور نہ تو وعدہ خلافی کرنا" حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اس کام کے لیے سب سے بہتر وقت "یوم الزینۃ" (جشن کا روز) مناسب ہے اُس دن سورج بلند ہونے پر ہم سب کو میدان میں موجود ہونا چاہیے

فالقیٰ عصاہ فاذا ھی ثعبان مبین . ونزع یدہ فاذا ھی بیضاء للناظرین . قال الملاء من قوم فرعون ان ھذا لساحر علیم . یرید ان یخرجکم من ارضکم فماذا تامرون . قالوا ارجہ واخاہ و ارسل فی المدائن حاشرین یاتوک بکل ساحر علیم . (اعراف) (شعرا)	پس موسیٰ نے اپنی لاٹھی کو ڈالا پھر اچانک وہ اژدہا تھی صاف اور ظاہر، اور اس نے ہاتھ کو گریبان سے نکالا تو دیکھنے والوں کے لیے چمکتا ہوا روشن تھا، فرعونیوں کی ایک جماعت نے کہا بلا شبہ یہ ماہر جادوگر ہے، اس کا ارادہ ہے کہ تم کو تمہاری سرزمین (مصر) سے نکال دے پس تمہارا کیا مشورہ ہے، اُنھوں نے کہا اس کو اور اس کے بھائی (ہارون) کو مہلت دو اور شہروں میں ایک جماعت کو بھیجو جو ماہر جادوگروں کو اکٹھا کر کے لائے۔
ثم بعثنا من بعدھم موسیٰ و ھارون	پھر ہم نے ان رسولوں کے بعد موسیٰ اور ہارون کو بھیجا فرعون

إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَإِيْهِ بِآيَاتِنَا
فَاسْتَكْبَرُوا وَكَانُوا قَوْمًا مُّجْرِمِينَ
فَلَمَّا جَاءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا
قَالُوا إِنَّ هَٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِينٌ ○
قَالَ مُوسَىٰ أَتَقُولُونَ لِلْحَقِّ لَمَّا
جَاءَكُمْ أَسِحْرٌ هَٰذَا وَلَا يُفْلِحُ
السَّاحِرُونَ . قَالُوا أَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا
عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا وَتَكُونَ
لَكُمَا الْكِبْرِيَاءُ فِي الْأَرْضِ وَمَا
نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِينَ . وَقَالَ
فِرْعَوْنُ ائْتُونِي بِكُلِّ سِحْرٍ عَلِيمٍ

(یونس)

اور اُس کے درباریوں کی طرف ۔ وہ ہماری نشانیاں
اپنے ساتھ رکھتے تھے ۔ مگر فرعون اور اُس کے درباریوں
نے گھمنڈ کیا ۔ اُن کا گروہ مجرموں کا گروہ تھا! پھر جب
ہماری جانب سے سچائی اُن میں نمودار ہوگئی تو کہنے لگے
"یہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ جادو ہے، صریح جادو"
موسیٰ نے کہا "تم سچائی کے حق میں جب وہ نمودار ہوگئی،
ایسی بات کہتے ہو؟ کیا یہ جادو ہے؟ حالانکہ جادوگر تو کبھی
کامیابی نہیں پا سکتے ۔ اُنھوں نے جواب میں کہا کیا تم
اس لیے ہمارے پاس آئے ہو کہ جس راہ پر ہم نے اپنے
باپ دادوں کو چلتے دیکھا ہے، اُس سے ہمیں ہٹا دو، اور
ملک میں تم دونوں بھائیوں کے لیے سرداری ہو جائے؟
ہم تو تمہیں ماننے والے نہیں ۔

قَالَ أَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ أَرْضِنَا
بِسِحْرِكَ يَا مُوسَىٰ . فَلَنَأْتِيَنَّكَ
بِسِحْرٍ مِّثْلِهِ فَاجْعَلْ بَيْنَنَا وَ
بَيْنَكَ مَوْعِدًا لَّا نُخْلِفُهُ نَحْنُ وَ
لَا أَنتَ مَكَانًا سُوًى . قَالَ
مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّينَةِ وَأَن يُحْشَرَ
النَّاسُ ضُحًى . (طٰہٰ)

اُس نے کہا "اے موسیٰ! کیا تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے
کہ اپنے جادو کے زور سے ہمیں ہمارے ملک سے نکال
باہر کرے؟ اچھا ہم بھی اسی طرح کے جادو کا کرتب تجھے لا دکھائیں گے
ہمارے اور اپنے درمیان ایک دن (مقابلہ کا) مقرر کر دے
نہ تو ہم اُس سے پھریں نہ تو ۔ دونوں کی جگہ برابر ہوگی
موسیٰ نے کہا "جشن کا دن تمہارے لیے مقرر ہوا ۔ دن
چڑھے لوگ اکٹھے ہو جائیں"۔

غرض حضرت موسیٰ اور فرعون کے درمیان "یوم الزینۃ" طے پا گیا، اور فرعون نے اُسی وقت اپنے اعیان وارکان کے نام احکام جاری کر دیے کہ تمام قلمرو میں جو مشہور اور ماہر جادوگر ہوں اُن کو جلد از جلد دار الحکومت روانہ کر دو۔

نجار مصری کہتے ہیں کہ غالباً "یوم الزینۃ" سے مصریوں کی عید کا وہ دن مُراد ہے جو "وفاء النیل" کے نام سے مشہور ہے کیونکہ ان کے یہاں تمام عیدوں میں سب سے بڑی عید کا دن یہی تھا[1]

ساحرینِ مصر

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی بعثت کا زمانہ مصری تمدن کی جو تاریخ پیش کرتا ہے اُس میں یہ بات بہت نمایاں نظر آتی ہے کہ مصری علوم وفنون میں "سحر" کو ایک مستقل علم وفن کی حیثیت حاصل تھی اور اسی بنا پر ساحرین کا رتبہ مصریوں میں بہت بڑا سمجھا جاتا تھا، حتیٰ کہ اُن کو شاہی دربار میں بھی بڑا رسوخ حاصل تھا، اور جنگ وصلح، پیدائش و وفات کی زائچہ کشی، اور اہم سرکاری معاملات میں بھی اُن ہی کی جانب رجوع کیا جاتا تھا اور اُن کے ساحرانہ نتائج کو بڑی وقعت دیجاتی تھی حتیٰ کہ مذہبی معاملات میں بھی ان کو اہم جگہ دیجاتی تھی۔ قدیم شاہی مقبروں میں ممی (حنوط شدہ نعشوں) کے ساتھ جو کاغذات و دستاویزات برآمد ہوئی ہیں اور اُن حجروں میں جو تصاویر ونقوش پائے جاتے ہیں اُن سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

قدیم قوموں کی عام گمراہیوں میں سے ایک گمراہی یہ بھی رہی ہے کہ وہ جادو پر مذہبی حیثیت سے اعتقاد رکھتے اور اُس کو اپنی مذہبی زندگی میں اثر انداز یقین کرتے تھے، اور اسی اعتقاد کے پیشِ نظر وہ اس کو سیکھتے اور سکھاتے بھی تھے اور اس میں طرح طرح کی ایجادات واختراعات کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ بابل (عراق)، مصر، چین، اور ہندوستان کی تاریخ اس کی شاہد ہے۔

یہی وجہ تھی کہ مصری قوم پر فرعون اور اُس کے اعیان وارکانِ حکومت کا یہ جادو چل گیا، کہ موسیٰ جادوگر ہے۔ اور یہ اپنے جادو کی مہارت کے اثر ورسوخ کو کام میں لا کر مصری حکومت

[1] قصص الانبیاء ص

پر قابض ہونا اور تم کو اس سے خارج کر دینا چاہتا ہے اور اب اس کا ایک ہی علاج ہے کہ اپنے قلمرو کے ماہر جادوگروں کو جمع کر کے موسیٰ کو شکست دے دی جائے اور اس کی اس چال کو پادر ہوا بنا دیا جائے۔ موسیٰ علیہ السلام نے بھی اس بات کو اس لیے غنیمت جانا کہ وہ خدائے تعالیٰ کے جس قدر نشانات (معجزات) فرعون اور قوم فرعون کو دکھا چکے تھے اُنھوں نے ان کو یہ کہہ کر رد کر دیا تھا کہ یہ تو جادو اور سحر ہے۔ لہٰذا اب جبکہ ساحروں اور جادوگروں سے مقابلہ کے بعد بھی خدا کا معجزہ غالب رہیگا تو ناچار اُن کو صداقت اور حق کے سامنے جھکنا پڑیگا، اور اقرار کیے بغیر کوئی چارہ نہ رہیگا۔

نیز یہ سوچا کہ اگرچہ "وحی الٰہی" کے یقین اور روشن حجت و برہان کے ذریعہ "آیات اللہ" (معجزات) کی صداقت کا کافی یقین دلایا جا چکا ہے تاہم فرعون اور اعیان سلطنت ہمیشہ ان واقعات کو سحر اور جادو کہہ کر عوام کو اصل حقیقت سے بے خبر رکھنے کی کوشش کرتے رہے یا شاید حسد اور تعصب نے خود ان کو بھی حقیقی روشنی سے محروم رکھا۔ پس اگر جشن کے روز خواص و عوام کے مجمع میں ساحر اور جادوگر عاجز ہو کر میری صداقت کا اقرار کر لیں تو پھر کسی کو بھی لب کشائی کا موقع نہ رہیگا اور بر سر عام حق کا مظاہرہ منصب تبلیغ کے لیے بہترین ذریعہ ثابت ہو گا"

سحر: لغت میں "سحر" کے معنی امر خفی اور پوشیدہ چیز کے ہیں، چنانچہ صبح کے اوّل وقت کو "سحر" اس لیے کہتے ہیں کہ ابھی دن کی روشنی پوری طرح نمودار نہیں ہوئی اور قدرے تاریکی ہے۔ اور علمی اصطلاح میں ایسے عجیب و غریب امور کا نام ہے جن کے وجود پذیر ہونے کے اسباب نظر سے اوجھل ہوں اور بادی النظر میں محسوس نہ ہوتے ہوں۔

اعلم ان لفظ السحر فی عرف الشرع	واضح رہے کہ لفظ "سحر" شریعت کی اصطلاح میں
مختص بکل امر یخفی سببہ ویتخیل	ایسے امر کے لیے مخصوص ہے جس کا سبب پوشیدہ ہو اور
علی غیر حقیقتہ الخ[1]	وہ اصل حقیقت کے خلاف خیال میں آنے لگے۔

[1] تفسیر کبیر جلد ا ص ۴۲۰

"سحر" کی حقیقت کچھ ہے یا وہ محض نظر کا دھوکا اور بے حقیقت شے ہے؟ اس کے متعلق جمہور علماءِ اہل سنت کی یہ رائے ہے کہ سحر واقعی ایک حقیقت ہے اور مضرت رساں اثرات رکھتا ہے حق تعالیٰ نے اپنی حکمتِ بالغہ اور مصلحتِ کاملہ کے پیشِ نظر اُس میں اُسی طرح مضر اثرات رکھ دیے ہیں جس طرح زہر میں یا دوسری نقصان رساں ادویہ میں۔ یہ نہیں ہے کہ "سحر" قدرتِ الٰہی سے بے نیاز ہو کر "العیاذ باللہ" خود موثر بالذات ہے کیونکہ یہ عقیدہ تو کفرِ خالص ہے۔

اور امام اعظم ابو حنیفہؒ، ابو بکر جصّاص صاحبِ احکام القرآن، ابو اسحٰق اسفرائنی شافعیؒ، علامہ ابن حزم ظاہری اور معتزلہ کہتے ہیں کہ "سحر" کی حقیقت شعبدہ، نظر بندی، اور فریبِ خیال کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے بلاشبہ وہ ایک باطل اور بے حقیقت شے ہے، چنانچہ ابو بکر رازی فرماتے ہیں۔

ومتیٰ اطلق فھو اسم لکل امرٍ	اور جب "سحر" کو کسی قید کے بغیر استعمال کیا جائے
ممّوہٍ باطلٍ لاحقیقۃ لہٗ ولا	تو وہ ایک ایسے امر کا نام ہے جو محض دھوکا اور باطل
ثبات[1]	ہو کہ جس کی اس سے زیادہ نہ کوئی حقیقت ہو اور نہ اس کو
	ثبات حاصل ہو۔

اور حافظ عماد الدین ابن کثیرؒ لکھتے ہیں۔

وقد ذکر الوزیر ابو المظفر یحییٰ بن محمد	اور وزیر ابو المظفر یحییٰ بن محمد بن ہبیرہ نے اپنی کتاب
بن ہبیرہ فی کتابہ "الاشراف فی مذاہب	"الاشراف فی مذاہب الاشراف" میں ایک باب
الاشراف" باباً فی السحر فقال اجمعوا	سحر کے متعلق بھی رکھا ہے اُس میں اُنہوں نے
علیٰ ان السحر لہ حقیقۃ الا ابا حنیفۃ	بیان کیا ہے کہ علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ "سحر" کی بھی
فانہ قال لاحقیقۃ لہٗ عندہٗ[2]	حقائق کی طرح ایک حقیقت ہے مگر امام ابو حنیفہؒ فرماتے

[1] احکام القرآن جلد ۱ ص ۴۸ [2] تفسیر ابن کثیر جلد ۱ ص ۱۴۷

قال ابو عبد الله القرطبي وعندنا ان السحر حق وله حقيقة يخلق الله عنده ما يشاء خلافاً للمعتزلة ولابي اسحق الاسفرائيني من الشافعية حيث قالوا انه تمويه وتخييل ۱؎

ابو عبد اللہ قرطبی کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک سحر حقیقت ہے اور ایک واقعی شے اور اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ سے جو چاہتا ہے پیدا کر دیتا ہے۔ مگر معتزلہ اور شوافع میں سے ابو اسحٰق اسفرائنی اس قول کے مخالف ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ "سحر" محض فریبِ نظر اور خیال بندی کا نام ہے۔

اور حافظ ابن حجر عسقلانی تحریر فرماتے ہیں:-

واختلف في السحر فقيل هو تخييل فقط ولا حقيقة له وهذا اختيار ابي جعفر الاستراباذي من الشافعية وابي بكر الرازي من الحنفية وابن حزم الظاهري وطائفة قال النووي والصحيح ان له حقيقة وبه قطع الجمهور وعليه عامة العلماء ۲؎

اور "سحر" کے متعلق اختلاف ہے بعض نے یہ کہا ہے کہ وہ فقط تخییل کا نام ہے اور اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے اور یہ ابو جعفر شافعی ابو بکر رازی حنفی اور ابن حزم ظاہری اور ایک چھوٹی جماعت کا خیال ہے۔ اور نووی فرماتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ "سحر" حقائق میں سے ایک حقیقت ثابت ہے اور جمہور اسی پر یقین رکھتے ہیں اور عام علماء کا یہی مسلک ہے۔

اور جو علماء سحر کو "حقیقت" تسلیم کرتے ہیں پھر ان کے درمیان یہ اختلاف رائے ہے کہ کیا خدائے تعالیٰ نے "سحر" میں یہ تاثیر بخشی ہے کہ وہ حقائق اور ماہیات میں بھی انقلاب کر دے یا مضرت رساں اشیاء کی طرح صرف نقصان دہ ہے اور یہ ناممکن ہے کہ اس کے اثر سے انسان کی حقیقت گھوڑے

۱؎ تفسیر ابن کثیر جلد ۱ ص ۱۴۷ ۲؎ فتح الباری جلد ۱۰ ص ۱۸۲ -

میں تبدیل ہوجائے یا گدھا مثلاً انسان ہوجائے۔ پس ایک چھوٹے سے گروہ کا خیال یہ ہے کہ اس کے اندر انقلابِ ماہیت کی تاثیر بھی ودیعت ہے اور جمہور کی رائے یہ ہے کہ اس میں یہ تاثیر قطعاً ودیعت نہیں اور سحر کے ذریعہ کسی بھی ماہیت کا انقلاب نہیں ہوتا بلکہ اس مرحلہ پر وہ محض نظربندی اور قوتِ متخیلہ کی شعبدہ بازی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ چنانچہ حافظ ابنِ حجرؒ اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

لكن محل النزاع هل يقع بالسحر انقلاب عين اولا؟ فمن قال انه تخييل فقط منع ذلك ومن قال ان له حقيقة اختلفوا هل له تاثير فقط بحيث يغير المزاج فيكون نوعاً من الامراض او ينتهي الى الاحالة بحيث يصير الجماد حيواناً مثلاً وعكسه فالذي عليه الجمهور هو الاول وذهبت طائفة قليلة الى الثاني الخ[1]

لیکن محلِ نزاع یہ امر ہے کہ سحر سے ذات کا انقلاب ہوجاتا ہے یا نہیں پس جس شخص نے یہ کہا ہے کہ محض تخییل کا نام ہے وہ تو انقلاب کے منکر ہیں اور جو سحر کو حقیقت مانتے ہیں وہ اس بارہ میں مختلف الرائے ہیں کہ آیا سحر کی تاثیر اسی حد تک ہے کہ مزاج میں اس قسم کے تغیرات پیدا کردے جس طرح امراض میں ہوا کرتا ہے اور وہ بھی ایک مرض شمار ہو یا اس کی تاثیر اس سے زیادہ ہے کہ ایک شی کی حقیقت کو بدل ڈالے مثلاً جماد کو حیوان بنادے یا اس کا عکس کرے پس جمہور پہلی بات کے قائل ہیں اور ایک چھوٹی سی جماعت دوسری بات کی۔

اور اس تمام این و آں کے بعد ساحرین فرعون کے اس ساحرانہ مظاہرہ کے متعلق جو جشن کے دن حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے مقابلہ میں کیا گیا۔ حافظ ابن حجرؒ تصریح کرتے ہیں کہ تمام علماء

---

[1] فتح الباری جلد ۱۰ ص ۱۸۲۔

کا اس پر اتفاق ہے کہ وہ محض تخییل و تمویہ کی حد تک تھا۔ اور ابو بکر جصاص اور ابن حجرؒ دونوں یہ تفصیل کرتے ہیں کہ ساحرینِ فرعون کی لاٹھیاں اور چمڑے کی رسیاں سانپ نہیں بن گئی تھیں بلکہ ان کے اندر پارہ بھر دیا گیا تھا اور جس زمین میں یہ مظاہرہ کیا گیا تھا اُس کو کھوکھلا کر کے اُس کے اندر آگ بھر دی گئی تھی، چنانچہ وقت معین پر نیچے کی گرمی سے پارہ میں حرکت پیدا ہوگئی اور وہ لاٹھیاں اور رسیاں سانپ کی طرح دوڑتی نظر آنے لگیں[1]۔*

امام رازیؒ نے تفسیر کبیر میں "سحر" پر بحث کرتے ہوئے لغوی معنی کے پیشِ نظر ان تمام اشیاء کو بھی اقسام سحر میں شمار کرایا ہے جو عام نگاہوں میں تعجب خیز اور حیرت زا سمجھے جاتے ہیں۔ مثلاً مسمریزم، ہپناٹزم، تعویذات، حیرت زا نقاشی اور سائنس کی حیرت زا ایجادات اور دنیا کے مختلف عجائبات حتیٰ کے مقرر کی جادو بیانی کو بھی اس عمومیت میں شامل کر لیا ہے۔ ایک موقعہ پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ارشاد فرمایا ہے۔

اِنَّ من البیان لسحرا[2] — بلا شبہ بعض بیان جادو ہوتے ہیں۔

پس یہ واضح رہے کہ ان اقسام کا اُس "سحر" سے کوئی دور کا بھی علاقہ نہیں ہے جو مذہب اور اخلاق کی نگاہ میں مذموم، گمراہی یا کفر سمجھا جاتا ہے۔

---

[1] فتح الباری جلد ۱۰ ص ۱۸۴ و احکام القرآن جلد ۱ ص ۵۰۔

* یہ تفصیل ہے ان اقوال کی جو سحر کے متعلق علماءِ سلف و خلف میں دائر رہے ہیں۔ ہم نے فریقین کے دلائل اور اُن سے متعلق معرکۃ الآراء مباحث کو اس مقام پر قصداً ترک کر دیا ہے اس لیے کہ اس حیثیت سے اس مسئلہ کو چھیڑنا ایسی طوالت کا باعث ہے جو ہم کو کتاب کے مقصد سے دور لیجاتا ہے اور اختصار کے ساتھ بیان کرنا بجائے فائدہ کے نقصان وہ نظر آتا ہے۔

[2] بخاری جلد ۲ باب السحر۔

سحر اور مذہب فقہائے اسلام نے "سحر" کے متعلق تصریح کی ہے کہ جن اعمالِ سحر میں شیاطین، ارواحِ خبیثہ اور غیر اللہ سے استعانت کی جائے اور اُن کو حاجت روا قرار دے کر منتروں کے ذریعہ اُن کی تسخیر سے کام لیا جائے تو وہ شرک کے مرادف ہے اور اس کا عامل کافر ہے۔

اور جن اعمال میں اِن کے علاوہ دوسرے طریقے استعمال کیے جائیں اور اُن سے دوسروں کو نقصان پہنچایا جائے ان کا مرتکب حرام اور گناہِ کبیرہ کا مرتکب ہے۔

قرآنِ عزیز میں حضرت سلیمان (علیہ السلام) کے واقعہ میں مذکور ہے۔

وماکفر سلیمانُ ولٰکنّ الشیاطین کفروا یعلّمون الناس السحر (بقرہ)

اور سلیمان نے کفر نہیں کیا لیکن شیاطین نے کفر کیا سکھاتے تھے وہ لوگوں کو سحر۔

اور حدیث میں ہے۔

اِنّ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال اجتنبوا الموبقات الشرك باللّٰہ والسحر[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مہلک باتوں سے بچو یعنی شرک سے اور جادو سے۔

اور حافظ ابن حجرؒ "حدیثِ سحر" پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

قال النووی عمل السحر حرام وھو من الکبائر بالاجماع وقد عدّہ النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم من السبع الموبقات ومنہ ما یکون کفراً ومنہ لا یکون کفراً بل معصیۃ کبیرۃ فان کان فیہ قول او فعل یقتضی الکفر فھو کفر والا فلا واما تعلّمہ وتعلیمہ فحرام[2] الخ

نوویؒ کہتے ہیں عملِ سحر حرام ہے اور وہ بالاجماع کبائر میں سے ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کو سات مہلک چیزوں میں سے شمار کیا ہے اور سحر کی بعض صورتیں کفر ہیں اور بعض کفر تو نہیں ہیں مگر سخت معصیت ہیں پس اگر سحر کا کوئی منتر یا کوئی عمل کفر کا مقتضی ہے تو وہ کفر ہے ورنہ نہیں بہر حال سحر کا سیکھنا اور سکھانا قطعاً حرام ہے۔

---

[1] بخاری جلد ۲ باب الشرک والسحر۔ [2] فتح الباری جلد ۱۰ ص ۱۸۳۔

معجزہ اور سحر میں فرق

علمائے اسلام میں یہ بحث ہمیشہ سے معرکۃ الآراء رہی ہے کہ "سحر" اور "معجزہ" میں کیا فرق ہے؟ ایک شخص یہ کیسے اندازہ لگائے کہ یہ نبی و پیغمبر کا معجزہ ہے یا ساحر اور جادوگر کا سحر اور جادو؟ اس سلسلہ میں جو اہم علمی دلائل و براہین پیش کیے گئے ہیں اُس کے لیے "علم کلام" کی کتابوں کا مطالعہ ضروری ہے۔ خصوصاً شیخ الاسلام ابن تیمیہ (رحمہ اللہ) کی کتاب النبوات اور شیخ محمد سفارینی کی شرح سفارینی قابلِ مطالعہ ہے۔ البتہ اس مقام پر ایک سہل الوصول اور آسان دلیل پیش کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

نبی اور رسول کا اصل معجزہ اُس کی وہ تعلیم ہوتی ہے جو وہ گم گشتگانِ راہِ حق اور بھٹکی ہوئی قوموں کی ہدایت کے لیے "نسخۂ کیمیا" اور دینی و دنیوی فلاح و کامرانی کے لیے "بے نظیر قانون" کی شکل میں پیش کرتا ہے (یعنی کتاب اللہ) لیکن جس طرح اربابِ علم و حکمت اُس کے لائے ہوئے علوم و حکم اور بتائی ہوئی رشد و ہدایت کی صداقت و کمال کو پرکھتے ہیں اُسی طرح عام انسانی دنیا کی سرشت و نہاد اس پر قائم ہے کہ وہ سچائی اور صداقت کے لیے بھی بعض ایسی چیزوں کے خواہشمند ہوتے ہیں جو لانے والے کے روحانی کرشموں سے تعلق رکھتی ہوں اور جن کے مقابلہ سے تمام دنیوی طاقتیں عاجز ہو جاتی ہوں کیونکہ اُن کا مبلغ علم کسی صداقت کے لیے اسی کو معیار قرار دیتا ہے۔

اس لیے "سنۃ اللہ" یہ جاری رہی ہے کہ وہ انبیاء و رسل کو دینِ حق کی تعلیم و پیغام کے ساتھ ایک یا چند "نشانات" (معجزات) بھی عطا کرتا ہے، اور جب وہ دعوئ نبوت کے ساتھ بغیر اسباب کے ایسا "نشان" دکھاتا ہے جس کا کوئی دنیوی طاقت مقابلہ نہیں کر سکتی تو اُس کا نام "معجزہ" ہوتا ہے۔

اور اسی لیے یہ بھی "سنت اللہ" ہے کہ کسی نبی و رسول کو جو معجزہ یا نشان دیا جاتا ہے وہ اسی نوع میں سے ہوتا ہے جس میں اُس قوم کو جس کو کہ سب سے پہلے اس پیغمبر نے خطاب کیا ہے" درجۂ کمال حاصل ہو، اور وہ اس کے تمام دقائق سے بخوبی آگاہ ہو تاکہ اُس کو یہ سمجھنے میں آسانی ہو سکے کہ پیغمبر کا یہ "نشان" انسان اور بشری طاقت سے بالاتر قوت سے تعلق رکھتا ہے اور اگر تعصب اور ہٹ دھرمی

حائل نہ ہو تو وہ بے ساختہ یہ اقرار کرے کہ "ایں سعادت بزور بازو نیست ÷ تا نہ بخشد خدائے بخشندہ"
اور اس طرح ہر فردِ بشر پر خدا کی حجت تمام ہو جائے۔

پس معجزہ دراصل براہِ راست خدائے تعالیٰ کا فعل ہے جو بغیر اسباب کے ایک صادق کی صداقت کے لیے عالم وجود میں آتا ہے اور وہ کسی اصول و قوانین پر مبنی نہیں ہوتا کہ ایک فن کی طرح سیکھا جا سکے اور نبی ہر وقت اُس کے کر دکھانے پر قادر ہو تاوقتیکہ مخالفین صداقت کے سامنے بطور تحدی (چیلنج) اُس کو دکھانے کی ضرورت پیش نہ آجائے۔ سو جب وہ اہم وقت آتا ہے اور نبی خدا سے رجوع کرتا ہے تو خدائے تعالیٰ کی جانب سے اُس کو کر دکھانے کی قوت عطا ہو جاتی ہے بخلاف سحر اور جادو کے کہ وہ ایک "فن" ہے کہ جس کو اس کے اصول و قوانین کی پابندی کے ساتھ ہر فن داں ساحر ہر وقت کام میں لا سکتا ہے، اُس کے اسباب اگرچہ عام نظروں سے پوشیدہ ہوتے ہیں لیکن اس فن کے تمام واقف کار اُس سے واقف ہوتے ہیں: اسی لیے وہ دوسرے علوم و فنون کی طرح مدوّن و مرتب فن ہے جس کو مصریوں چینیوں اور ہندیوں نے بہت فروغ دیا اور حدِ کمال کو پہنچایا۔

یہ مسئلہ کی علمی حیثیت ہے کہ جس سے معجزہ اور سحر کی حدود قطعاً جُدا اور متمائز ہو جاتی ہیں۔

رہا حس اور مشاہدہ کا معاملہ تو "معجزہ" اور "سحر" میں یہ فرق ہے کہ ساحر کی عام زندگی خوف و دہشت، ایذا رسانی اور بدعملی سے وابستہ ہوتی ہے اور لوگ اس نظر سے ساحر سے خوف کھاتے ہیں یا اُس کے سامنے مرعوب ہو جاتے۔ بخلاف نبی اور رسول کے کہ اُس کی تمام زندگی صداقت، خلوص مخلوق خدا کی ہمدردی و غمگساری، اور تقویٰ و طہارت سے وابستہ ہوتی ہے اور اس کا کیرکٹر بے داغ اور صاف و روشن ہوتا ہے اور وہ معجزہ کو پیشہ نہیں بناتا بلکہ خاص خاص اہم مواقع پر صداقت اور حق کی حمایت میں اس کا مظاہر کرتا ہے اور وہ ایسے وقت معجزہ دکھاتا ہے جبکہ دشمن بھی اُس

کی عصمت، صداقت اور کیرکٹر کی پاکیزگی کے پہلے سے معترف ہوتے ہیں مگر اُس کی دعوت کو یا شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور یا جحود وانکار کے نقطۂ نظر سے اور پھر اُس سے معجزہ کے طالب ہوتے ہیں۔ نیز اگر سحر اور معجزہ کا مقابلہ آن پڑے تو معجزہ غالب رہیگا اور اعلیٰ سے اعلیٰ سحر بھی مغلوب و عاجز اور اس کا عکس محال اور ناممکن ہے۔ چنانچہ ساحرین اور انبیاء و رسل کے مقابلہ کی تاریخ اس کی شاہد عدل ہے۔

الحاصل حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو عصا اور ید بیضاء کے نشانات (معجزات) اس لیے عطا کیے گئے کہ اُن کے زمانہ میں مصر سحر اور جادو کا مرکز تھا اور فنِ سحر شباب پر اور مصریوں نے تمام دنیا کے مقابلہ میں اُس کو اوجِ کمال تک پہنچا دیا تھا۔

لہٰذا "سنۃ اللہ" کا تقاضا تھا کہ ایسے زمانہ میں موسیٰ (علیہ السلام) کو ایسے نشانات (معجزات) عطا کیے جائیں جو اسی نوع سے متعلق ہوں تاکہ جب انکار پر اصرار حد سے بڑھ جائے اور معاندین و مخالفین اپنے محیر العقول سحر اور جادو کے ذریعہ اُن کے مقابلہ پر آ جائیں تو یہ "آیات اللہ" مخالفوں کو یہ باور کرا دیں کہ موسیٰ کے پاس جو قوت و طاقت ہے وہ انسانی صنعتوں اور عجوبہ کاریوں سے بلند اور بشری دسترس سے باہر ہے۔ اور اس طرح عوام و خواص کو اُن کی صداقت اور ان کے "من اللہ" ہونے کا یقین آ جائے اور خواہ زبان اقرار کرے یا نہ کرے لیکن اُن کا عجز اور ان کی درماندگی علیٰ رؤس الاشہاد اُن کے دلوں کے اقرار کی شہادت دینے لگے۔

حضرت موسیٰ اور ساحروں کا مقابلہ

بہرحال "یومِ جشن" آ پہنچا۔ میدانِ جشن میں تمام شاہانہ کروفر کے ساتھ فرعون تخت نشین ہے، درباری بھی حسب مراتب قرینے سے بیٹھے ہیں اور لاکھوں انسان حق و باطل کے معرکہ کا نظارہ دیکھنے کو جمع ہیں، ایک جانب مصر کے مشہور جادوگروں کا گروہ اپنے ساز و سامان سحر سے لیس کھڑا ہے، اور دوسری جانب خدا کے رسول، حق کے پیغامبر، سچائی اور راستی کے پیکر حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون (علیہما السلام) کھڑے ہیں۔ فرعون بہت مسرور ہے اور اس یقین

پر کہ ساحرینِ مصران دونوں کو جلد ہی شکست دیدینگے ساحروں کی حوصلہ افزائی کر رہا ہے اور کہہ رہا ہے، اگر تم نے موسیٰ کو شکست دیدی تو نہ صرف انعام واکرام سے مالا مال کیے جاؤگے بلکہ میرے دربار میں خاص جگہ پاؤگے، ساحر بھی اپنی کامیابی کے یقین پر فرعون سے اپنے اعزاز واکرام کا وعدہ لے رہے ہیں اور اُس کے تصور سے بہت شاداں اور مسرور ہیں :-

وجاء السحرة فرعون قالوا ان لنا	اور جادوگر فرعون کے پاس آئے اور کہنے لگے کیا اگر ہم موسیٰ
لاجرا ان كنا نحن الغالبون قال	پر غالب آجائیں تو ہمارے لیے انعام واکرام ہے؟ فرعون نے
نعم وانكم لمن المقربين . (اعراف)	کہا ہاں ضرور اور یہی نہیں بلکہ تم مقربینِ بارگاہِ شاہی ہوگے
فجمع السحرة لميقات يوم معلوم ٥	پھر وعدہ کے دن جادوگر جمع ہوگئے، اور لوگوں سے کہا گیا
قيل للناس هل انتم مجتمعون	کیا تم (اس میدان میں) جمع ہوگے، شاید ہم جادوگروں کی
لعلنا نتبع السحرة ان كانوا هم الغلبين	پیروی کریں اگر وہ غالب رہیں سو جب جادوگر آگئے تو
فلما جاء السحرة قالوا لفرعون ائن	اُنھوں نے فرعون سے کہا کیا ہمارے لیے اجر ہے اگر ہم
لنا لاجرا ان كنا نحن الغلبين ٥ قال	غالب رہیں؟ فرعون نے کہا ہاں اور تم اس صورت
نعم وانكم اذا لمن المقربين (شعراء)	میں (ہمارے) مقربین میں سے ہوگے۔

جادوگروں نے جب اس طرف سے اطمینان کرلیا تو اب حضرت موسیٰ کی طرف متوجہ ہوئے مگر قبل اس کے کہ ایک دوسرے کو چیلنج کریں حضرت موسیٰ نے حقِ تبلیغ ادا فرماتے ہوئے مجمع کو مخاطب کر کے فرمایا "تمہاری حالت پر سخت افسوس ہے یہ تم کیا کر رہے ہو؟ تم ہم کو جادوگر کہہ کر خدا پر جھوٹا الزام نہ لگاؤ، مجھ کو ڈر ہے کہیں وہ تم کو اس بہتان طرازی کی سزا میں عذاب دے کر تم کو جڑ سے نہ اُکھاڑ پھینکے، کیونکہ جس کسی نے بھی بہتان باندھا وہ نامراد ہی رہا۔ لوگوں نے یہ سُنا تو آپس میں ردوکد شروع کردی اور سرگوشیاں کرنے لگے، درباریوں نے یہ حال دیکھا تو جادوگروں کو مخاطب کر کے کہنے لگے یہ دونوں بھائی

بلا شبہ جادوگر ہیں، یہ چاہتے ہیں کہ جادو کے زور سے تم کو تمہارے وطن سے نکال دیں اور تم پر غلبہ کرلیں، تم اپنا کام شروع کرو اور پرے باندھ کر موسیٰ کے مقابلہ میں ڈٹ جاؤ، آج جو بھی غالب آجائیگا وہی کامیاب ثابت ہوگا۔

قال لهم موسیٰ ویلکم لا تفتروا	موسیٰ نے کہا افسوس تم پر، دیکھو اللہ پر جھوٹی تہمت نہ لگاؤ،
علی اللہ کذبا فیسحتکم بعذاب	ایسا نہ ہو کہ وہ کوئی عذاب بھیج کر تمہاری جڑ اکھاڑ دے۔
وقد خاب من افتریٰ. فتنازعوا	جس کسی نے جھوٹ بات بنائی وہ ضرور نامراد ہوا، پس
امرهم بینهم واسروا النجویٰ .	لوگ آپس میں ردوکد کرنے لگے اور پوشیدہ سرگوشیاں شروع
قالوا ان هٰذٰن لساحران یریدان	ہوگئیں، پھر (درباری) بولے یہ دونوں بھائی ضرور جادوگر
ان یخرجاکم من ارضکم بسحرهما	ہیں، یہ چاہتے ہیں اپنے جادو کے زور سے تمہیں تمہارے
ویذهبا بطریقتکم المثلیٰ. فاجمعوا	ملک سے نکال باہر کریں اور پھر تمہارے شرف اور تمہاری عظمت
کیدکم ثم ائتوا صفا وقد افلح الیوم	کے مالک ہو جائیں۔ پس اپنے سارے [illegible] جمع کرو اور پرا باندھ
من استعلیٰ . (طٰہٰ)	کر ڈٹ جاؤ، جو آج بازی لے گیا وہی کامیاب ہوگا۔

اب جادوگروں نے آگے بڑھ کر موسیٰ علیہ السلام سے کہا موسیٰ! اس قصہ کو چھوڑ اور یہ بتا کہ ابتداء تیری جانب سے ہوگی یا ہماری جانب سے۔ حضرت موسیٰ نے جب یہ دیکھا کہ ان پر اس تنبیہ کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا تو فرمایا کہ ابتداء تم ہی کرو، اور اپنے کمالِ فن کی پوری حسرت نکال لو، چنانچہ ساحروں نے اپنی رسیاں، بان، اور لاٹھیاں زمین پر ڈالیں جو سانپ اور اژدہے کی شکل میں دوڑتی نظر آنے لگیں، حضرت موسیٰ نے یہ دیکھا تو دل میں خوف و ہراس محسوس کیا کہ کہیں لوگ اس مظاہرہ سے متاثر نہ ہو جائیں اور ساحروں کے سحر کو حقیقت نہ سمجھ لیں، کیونکہ اگر ایسا ہوا تو یہ تاثیر اور رعب قبولِ حق کے لیے سدِّ راہ بنیگا۔ تب خدائے تعالیٰ نے اُن کو مطمئن فرمایا اور وحی کے ذریعہ مطلع کیا کہ موسیٰ خوف نہ کھاؤ

ہمارا وعدہ ہے کہ تم ہی غالب رہو گے، اپنی لاٹھی کو زمین پر ڈالو، موسیٰ (علیہ السلام) نے جب لاٹھی کو ڈالا تو اُس نے ساحروں کے تمام شعبدوں کو نگل لیا اور تھوڑی سی دیر میں سارا میدان صاف ہو گیا، اور اس طرح ساحر اپنے سحر میں ناکامیاب رہے۔

قالوا یٰموسیٰ امّا ان تلقی واِمّا ان
نکون اوّل من القیٰ ۔ قال بل
القوا فاذا حبالھم وعصیّھم
یخیّل الیہ من سحرھم انھا تسعیٰ ۝
فاوجس فی نفسہ خیفۃً موسیٰ ۝
قلنا لا تخف انک انت الاعلیٰ ۝
والق ما فی یمینک تلقف ما
صنعوا انما صنعوا کید ساحر
ولا یفلح الساحر حیث اتیٰ ۝
(طٰہٰ)

جادوگروں نے کہا "اے موسیٰ! تم پہلے اپنی لاٹھی پھینکو،
یا پھر ہماری طرف سے پہل ہو" موسیٰ نے کہا "نہیں تم
ہی پہلے پھینکو" چنانچہ اُنھوں نے اپنا کرتب دکھایا اور
اچانک موسیٰ کو ان کے جادو کی وجہ سے ایسا دکھائی دیا
کہ اُن کی رسیاں اور لاٹھیاں سانپ کی طرح دوڑ رہی
ہیں! موسیٰ نے دل میں ہراس محسوس کیا (کہ اس منظر سے
لوگ متاثر نہ ہو جائیں) ہم نے کہا "اندیشہ نہ کر تو ہی غالب
رہیگا، تیرے دائیں ہاتھ میں جو لاٹھی ہے فوراً پھینک دے
جادوگروں کی تمام بناوٹیں نگل جائیگی، اُنھوں نے جو کچھ کیا ہے
محض جادوگروں کا فریب ہے اور جادوگر کسی راہ سے آئے کبھی

قالوا یٰموسیٰ اما ان تلقی واما
ان نکون نحن الملقین ۝ قال القوا
فلما القوا سحروا اعین الناس و
استرھبوھم وجاء و بسحر عظیم ۝
واوحینا الی موسیٰ ان الق
عصاک فاذا ھی تلقف ما یافکون

جادوگروں نے کہا اے موسیٰ! یا تم اپنی لاٹھی پھینکو یا پھر ہم پھینکیں
موسیٰ نے کہا تم ہی پہلے پھینکو، پھر جب جادوگروں نے
جادو کی بنائی ہوئی لاٹھیاں اور رسیاں پھینکیں تو لوگوں کی
نگاہیں جادو سے ماردیں، اور اپنے کرتبوں سے اُن میں
دہشت پھیلادی اور بہت بڑا جادو بنالائے، اور اس وقت
ہم نے موسیٰ پر وحی کی کہ تم بھی اپنی لاٹھی ڈال دو جوں ہی

فوقع الحق وبطل ما كانوا يعملون ○ فغلبوا هنالك وانقلبوا صاغرين (اعراف)

اُس نے لاٹھی پھینکی تو اچانک کیا ہوا کہ جو کچھ جھوٹی نمائش جادوگروں کی تھی سب اُس نے نگل کر نابود کر دی۔

فلما جاء السحرة قال لهم موسى القوا ما انتم ملقون ○ فلما القوا قال موسى ما جئتم به السحر ان الله سيبطله ان الله لا يصلح عمل المفسدين ويحق الله الحق بكلمته ولو كره المجرمون. (یونس)

جب جادوگر آموجود ہوئے تو موسیٰ نے کہا "تمہیں جو کچھ میدان میں ڈالنا ہے ڈال دو" جب اُنہوں نے جادو کی رسیاں اور لاٹھیاں ڈال دیں تو موسیٰ نے کہا تم جو کچھ بنا کر لائے ہو یہ جادو ہے اور یقیناً اسے اللہ ملیامیٹ کر دیگا، اللہ کا یہ قانون ہے کہ وہ مفسدوں کا کام نہیں سنوارتا، وہ حق کو اپنے احکام کے مطابق ضرور ثابت کر دکھائیگا، اگرچہ مجرموں کو ایسا ہونا پسند نہ آئے۔

جادوگروں نے "جو کہ اپنے فن کے ماہر و کامل تھے" جب عصائے موسیٰ کا یہ کرشمہ دیکھا تو وہ حقیقتِ حال سمجھ گئے اور جس کو اس وقت تک فرعون اور اُس کے درباری لوگ پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتے رہے تھے وہ اس کو نہ چھپا سکے، اور اُنہوں نے برسرِ مجلس یہ اقرار کر لیا کہ موسیٰ کا یہ عمل جادو سے بالاتر خدا کا معجزہ ہے اس کا سحر سے دور کا بھی واسطہ نہیں اور پھر فوراً سجدہ میں گر پڑے اور اعلان کر دیا کہ ہم موسیٰ اور ہارون کے پروردگار پر ایمان لے آئے کیونکہ وہی "رب العلمین" ہے۔

فَأُلْقِيَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا قَالُوا آمَنَّا بِرَبِّ هَارُونَ وَمُوسَىٰ. (طٰہٰ)

پس سب جادوگر سجدہ میں گر گئے اور کہنے لگے ہم ہارون اور موسیٰ کے رب پر ایمان لے آئے۔

وَأُلْقِيَ السَّحَرَةُ سَاجِدِينَ ○ قَالُوا آمَنَّا بِرَبِّ الْعَالَمِينَ ○ رَبِّ مُوسَىٰ وَهَارُونَ (اعراف، شعراء)

اور سب جادوگر سجدہ میں گر پڑے، کہنے لگے ہم تو جہانوں کے پروردگار پر ایمان لے آئے جو موسیٰ اور ہارون کا پروردگار ہے۔

فرعون نے جب یہ دیکھا کہ میرا تمام دامِ فریب تار تار ہو گیا، اور موسیٰ کو شکست دینے کی جو آخری پناہ تھی وہ بھی منہدم ہو گئی، اب کہیں ایسا نہ ہو کہ مصری عوام بھی ہاتھ سے جائیں اور موسیٰ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے"۔ تو اُس نے مکر و فریب کا دوسرا طریقہ اختیار کیا۔ اور ساحروں سے کہنے لگا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ تم سب کا اُستاذ ہے اور تم سب نے آپس میں سازش کر رکھی تھی، تب ہی تو میری رعایا ہوتے ہوئے میری اجازت کے بغیر تم نے موسیٰ کے خدا پر ایمان لانے کا اعلان کر دیا، اچھا میں تم کو عبرتناک سزا دونگا تاکہ آئندہ کسی کو ایسی غداری کی جرأت نہ ہو، پہلے تمہارے ہاتھ پاؤں اُلٹے سیدھے کٹواؤنگا اور پھر سب کو سولی پر چڑھاؤنگا۔

قال اٰمنتم لہٗ قبل ان اٰذن لکم انہ لکبیرکم الذی علمکم السحر فلاُقطعنّ ایدیکم وارجلکم من خلاف ولاُصلبنّکم فی جذوع النخل ولتعلمن اینا اشدّ عذابًا وابقیٰ ۰ (طٰہٰ)	فرعون نے کہا "تم بغیر میرے حکم کے موسیٰ پر ایمان لے آئے؟ ضرور یہ تمہارا سردار ہے جس نے تمہیں جادو سکھایا ہے، اچھا دیکھو میں کیا کرتا ہوں میں تمہارے ہاتھ پاؤں اُلٹے سیدھے کٹواؤنگا، اور کھجور کے تنوں پر سولی دونگا پھر تمہیں پتہ چلیگا ہم دونوں میں کون سخت عذاب دینے والا ہے اور کس کا عذاب دیرپا ہے"۔
قال فرعون اٰمنتم بہ قبل ان اٰذن لکم ان ھٰذا لمکر مکرتموہ فی المدینۃ لتخرجوا منھا اھلھا فسوف تعلمون ۰ (اعراف)	فرعون نے کہا "مجھ سے اجازت لیے بغیر تم موسیٰ پر ایمان لے آئے؟ ضرور یہ ایک پوشیدہ تدبیر ہے جو تم نے مل جُل کر شہر میں کی ہے تاکہ اس کے باشندوں کو اُس سے نکال باہر کرو، اچھا تھوڑی دیر میں تمہیں اس کا نتیجہ معلوم ہو جائیگا"

مگر سچا ایمان جب کسی کو نصیب ہو جاتا ہے" خواہ وہ ایک لمحہ کا ہی کیوں نہ ہو" وہ ایسی بے پناہ روحانی قوت پیدا کر دیتا ہے کہ کائنات کی کوئی زبردست سے زبردست طاقت بھی اُس کو مرعوب

نہیں کرسکتی۔ دیکھیے، وہی جادوگر جو فرعون سے تھوڑی دیر پہلے انعام واکرام اور عزت وجاہ کی آرزوئیں اور التجائیں کر رہے تھے ایمان لانے کے بعد ایسے نڈر اور بے خوف ہوگئے کہ اُن کے سامنے سخت سے سخت مصیبت اور دردناک سے دردناک عذاب بھی ہیچ ہوکر رہ گیا اور کوئی دہشت بھی اُن کے ایمان کو متزلزل نہ کرسکی۔ اور اُنہوں نے فرعون کی موجودگی ہی میں بے دھڑک اسلام کا اعلان کردیا۔ اور جب اُنہوں نے فرعون کی اس جابرانہ دھمکیوں کو سُنا تو کہنے لگے۔

قالوا لن نؤثرك على ما جاء نا من	انہوں نے کہا "ہم یہ کبھی نہیں کرسکتے کہ سچائی کی جو روشن دلیلیں
البينات والذى فطرنا فاقض	ہمارے سامنے آگئی ہیں اور جس خدا نے ہمیں پیدا کیا ہے اُس
ما انت قاض انما تقضى هذه	سے مُنہ موڑ کر تیرا حکم مان لیں، تو جو فیصلہ کرنا چاہتا ہے کرگذر،
الحيوة الدنيا ۔ انا امنا بربنا	تو زیادہ سے زیادہ جو کچھ کرسکتا ہے وہ یہی ہے کہ دنیا کی اس زندگی
ليغفر لنا خطايانا وما اكرهتنا	کا فیصلہ کردے۔ ہم تو اپنے پروردگار پر ایمان لاچکے کہ وہ ہماری خطائیں
عليه من السحر والله خير وابقى ۝	بخشدے خصوصاً جادوگری کی خطا کہ جس پر تو نے ہمیں مجبور کیا تھا،
(طٰہٰ)	ہمارے لیے اللہ ہی بہتر ہے اور وہی باقی رہنے والا ہے"
قالوا لا ضير انا الى ربنا منقلبون ۝	جادوگروں نے کہا (تیرا یہ عذاب ہمارے لیے) کوئی نقصان کی بات
انا نطمع ان يغفر لنا ربنا خطايانا	نہیں، بلاشبہ ہم اپنے پروردگار کی طرف لوٹ جانے والے ہیں،
ان كنا اول المؤمنين ۝	بیشک ہم اس کے حریص ہیں کہ وہ ہماری خطاؤں کو بخش دے
(شعراء)	کیونکہ ہم ہوگئے مومنوں میں اول۔

غرض حق و باطل کی اس کشمکش میں فرعون اور اُس کے اعیان وارکان کو سخت شکست اُٹھانی پڑی اور وہ برسرِعام ذلیل ورسوا ہوئے اور حضرت موسیٰ پر خدا کا وعدہ پورا ہوا اور کامیابی کا سہرا ان ہی کے سر رہا۔

اِس صورتِ حال کو دیکھ کر جادوگروں کے علاوہ اسرائیلی نوجوانوں میں سے بھی ایک مختصر جماعت مسلمان ہوگئی، مگروہ فرعون کے ظلم وستم کی وجہ سے اعلان نہ کرسکی کیونکہ مسلمانوں کے ساتھ اُس کی عام قاہرانہ ستم کیشیوں اور ظلم پرستیوں کے علاوہ اس وقت کی ذلت نے اس کو اور زیادہ غضبناک بنادیا تھا حضرت موسیٰ نے ان کو تلقین فرمائی کہ اب مومن ہونے کے بعد تمہارا سہارا صرف خدا پر ہونا چاہیے، جماعت مومنین نے اس پر لبیک کہا اور وہ خدا کے سامنے گڑگڑا کر رحمت ومغفرت کی دعائیں کرنے اور ظالموں کے عذاب ومصیبت سے محفوظ رہنے کی التجائیں کرنے لگے۔

فما اٰمن لموسیٰ الا ذریۃ من قومہ	پھر موسیٰ پر کوئی ایمان نہیں لایا مگر صرف ایک گروہ جو اُس کی
علیٰ خوفٍ من فرعون وملائھم	قوم کے نوجوانوں کا گروہ تھا، وہ بھی فرعون اور اس کے سرداروں
ان یفتنھم وانّ فرعون لعالٍ	سے ڈرتا ہوا کہ کہیں کسی مصیبت میں نہ ڈال دیں اور اس میں
فی الارض وانہ لمن المسرفین ۝	شک نہیں کہ ظلم واستبداد میں وہ بالکل چھوٹ تھا۔
وقال موسیٰ یٰقوم ان کنتم	اور موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا "لوگو! اگر تم فی الحقیقت اللہ پر
اٰمنتم باللہ فعلیہ توکلوا ان	ایمان لائے ہو اور اُس کی فرمانبرداری کرنی چاہتے ہو تو چاہیے
کنتم مسلمین ۝ فقالوا علی	کہ صرف اُسی پر بھروسہ کرو اور فرعون کی طاقت سے نہ ڈرو"۔
اللہ توکلنا ربنا لا تجعلنا فتنۃ	پس اُنہوں نے کہا "ہم صرف اللہ پر ہی بھروسہ کرتے ہیں، اے
للقوم الظّٰلمین ۝ ونجنا برحمتک	ہمارے پروردگار! ہم کو ظالم قوم کی آزمائش میں نہ ڈال اور ہم
من القوم الکٰفرین ۝	کو اپنی رحمت سے منکروں سے نجات دے۔

الحاصل فرعون حضرت موسیٰ کی روحانی قوت کا یہ مظاہرہ دیکھ کر بیحد مرعوب ہوگیا اور اگرچہ وہ جادوگروں پر اپنے انتہائی غیظ وغضب کا اظہار کرتا رہا لیکن حضرتِ موسیٰ سے اُس وقت کچھ کہنے کی مطلق ہمت نہ پڑی، اور درباریوں اور ارکانِ سلطنت نے جب یہ احتجاج کیا کہ تو موسیٰ کو قتل کیوں

نہیں کرادیتا، کیا اُس کو اور اس کی قوم کو یہ موقعہ دیا جا رہا ہے کہ وہ مصر میں فساد پھیلائیں اور تجھ کو اور تیرے دیوتاؤں کو ٹھکراتے رہیں؟ تو کہنے لگا کہ تم گھبراتے کیوں ہو، میں اسرائیلیوں کی طاقت کو بڑھنے نہ دونگا اور مقابلہ کے قابل ہی نہ رکھونگا۔ اب ہی یہ حکم جاری کرتا ہوں کہ ان کی اولادِ نرینہ کو پیدا ہوتے ہی قتل کر دیا کرو اور صرف لڑکیوں کو چاکری کے لیے زندہ رہنے دو۔

وقال الملاء من قوم فرعون اتذر موسٰی وقومہ لیفسدوا فی الارض ویذرك والھتك قال سنقتّل ابناءھم ونستحیی نساءھم وانا فوقھم قاھرون ۔ (اعراف)	اور فرعون کی قوم میں سے ایک جماعت نے فرعون سے کہا کیا تو موسیٰ اور اُس کی قوم کو یونہی چھوڑ دیگا کہ وہ زمین (مصر) میں فساد کرتے پھریں اور تجھ کو اور تیرے دیوتاؤں کو ٹھکرائیں" فرعون نے کہا "ہم اُن کے لڑکوں کو قتل کر دینگے اور ان کی لڑکیوں کو (باندیاں بنانے کے لیے) زندہ رکھیں گے اور ہم اُن پر ہر طرح غالب ہیں اور وہ ہمارے ہاتھوں میں بے بس ہیں۔
ولقد ارسلنا موسٰی باٰیٰتنا و سلطٰن مبین ۝ الی فرعون و ھامان وقارون فقالوا ساحر کذّاب ۝ فلما جاءھم بالحق من عندنا قالوا اقتلوا ابناء الذین اٰمنوا معہ واستحیوا نساءھم وما کید الکٰفرین الا فی ضلال ۝ (غافر)	اور بلا شبہ ہم نے فرعون، ہامان، اور قارون کی طرف موسیٰ کو رسول بنا کر اور واضح نشان دے کر بھیجا۔ پس اُنہوں نے کہا کہ یہ تو جادوگر ہے جھوٹا، پھر جب وہ ہمارے پاس سے اُن کے پاس حق لے کر آیا تو کہنے لگے کہ جو لوگ اس (موسیٰ) پر ایمان لے آئے ہیں اُن کے لڑکوں کو مار ڈالو اور اُن کی لڑکیوں کو باقی رہنے دو اور (انجام کار) کافروں کا مکر و فریب باطل و برباد ہو کر رہا۔

گویا فرعون کا یہ دوسرا اعلان تھا جو بنی اسرائیل کے بچوں کے قتل سے متعلق کیا گیا۔

حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل

تاریخ کا یہ مسلّمہ مسئلہ ہے کہ جب کسی قوم پر غلامی کی حالت میں صدیاں گذر جاتی ہیں تو اُس کی زبوں حالی اور پستی کے حدود یہیں ختم نہیں ہو جاتے کہ وہ مفلس و بدحال ہوں اور کاہل و پریشاں بال، بلکہ اُن کے قوایِ عملی کی خرابی سے زیادہ اُن کے قوائے دماغی بیکار، مضمحل، اور ناکارہ ہو جاتے ہیں، اُن میں سے ہمت و شجاعت مفقود ہو جاتی ہے اور وہ پستی پر ہی قناعت کر لیتے ہیں، نا اُمیدی ان کا شیوہ ہو جاتا ہے اور ذلت و نکبت کو وہ صبر و قناعت سمجھنے لگتے ہیں۔ اس لیے جب کوئی مصلح یا پیغمبر و رسول اُس دماغی و عملی پستی سے نکلنے کے لیے ان کو پکارتا، اور ہمت و شجاعت پر آمادہ کرتا ہے تو یہ اُن کے لیے سب سے مشکل اور ناممکن العمل پیغام نظر آتا ہے اور کبھی وہ اس راہ کی سختیوں سے گھبرا کر آپس میں دست بگریباں ہونے لگتے، اور کبھی اپنے نجات دہندہ پر شک و شبہ کی نگاہ ڈالنے لگتے ہیں، اور اگر اس جد و جہد میں اُن کو کوئی فائدہ حاصل ہو جاتا ہے تو وقار اور سنجیدگی سے بھی گزر کر اظہارِ مسرت کرنے لگتے ہیں اور اگر اس راہ میں کوئی آزمائش اور مصیبت کا سوال آپڑتا ہے تو مصلح یا پیغمبر کو الزام دینے لگتے ہیں کہ ہم کو خواہ مخواہ تو نے اس مصیبت میں پھنسایا ہم تو اپنی حالت پر ہی شاکر و صابر تھے۔

یہی حال بنی اسرائیل کا حضرت موسیٰ کے ساتھ تھا، چنانچہ حضرت موسیٰ کی تبلیغِ حق سے لے کر مصر سے خروج کے وقت تک جو حالات پیش آئے وہ اس امر کی زندہ شہادت ہیں۔

غرض حضرت موسیٰ کو جب فرعون اور اس کے درباریوں کی گفتگو کا حال معلوم ہوا تو اُنھوں نے بنی اسرائیل کو جمع کر کے صبر اور توکل علی اللہ کی تلقین کی، بنی اسرائیل نے سُن کر جواب دیا کہ موسیٰ! ہم تو پہلے سے ہی مصیبتوں میں گرفتار تھے، اب تیرے آنے پر کچھ اُمید بندھی تھی مگر تیرے آنے کے بعد بھی وہی مصیبت باقی رہی یہ تو سخت آفت کا سامنا ہے۔

حضرت موسیٰ نے تسلی دی کہ خدا کا وعدہ سچا ہے گھبراؤ نہیں تم ہی کامیاب ہو گے اور

تمہارے دشمن کو ہلاکت کا منہ دیکھنا پڑیگا۔ زمین کا مالک فرعون یا اُس کی قوم نہیں ہے، بلکہ رب العلمین اور مختارِ مطلق خدا ہے۔ پس وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے اُس کا مالک بنادے۔ اور انجام کار یہ انعام متقیوں کا ہی حصہ ہے۔

قال موسیٰ لقومہ استعینوا باللہ واصبروا ان الارض للہ یورثھا من یشاء من عبادہ والعاقبۃ للمتقین قالوا اوذینا من قبل ان تأتینا ومن بعد ما جئتنا قال عسیٰ ربکم ان یھلک عدوکم ویستخلفکم فی الارض فینظر کیف تعملون ۰ (اعراف)

موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا "اللہ سے مدد چاہو اور صبر کرو، بلاشبہ زمین اللہ کی ملک ہے وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے وارث بنا دیتا ہے اور انجام (کی کامیابی) متقیوں کے لیے ہی ہے۔ اُنھوں نے جواب دیا "تیرے آنے سے پہلے بھی ہم مصیبت میں تھے اور تیرے پیغام لانے کے بعد بھی مصیبت ہی میں گرفتار ہیں" موسیٰ نے کہا "وہ وقت قریب ہے کہ تمہارا پروردگار تمہارے دشمن کو برباد کردیگا اور تم کو اس زمین کا خلیفہ بنا دیگا اور پھر دیکھیگا کہ تم کس طرح

اس کے بعد حضرت موسیٰ نے مسلمانوں سے کہا کہ فرعون کے مظالم کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا، اور وہ بنی اسرائیل اور قبطی مومنوں کو آزادی کے ساتھ مصر سے چلے جانے پر راضی نہیں ہے۔ اس لیے خدا کے فیصلہ تک تم سرزمینِ مصر ہی میں اپنے گھروں کو مساجد بنا لو اور اُن کو قبلہ رُخ کر کے خدائے واحد کی عبادت میں مشغول ہو جاؤ کہ خدا کی وحی کا یہی فیصلہ ہے۔ اور ساتھ ہی خدائے تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کی۔ بارِ الہا! فرعون اور فرعونیوں کو تو نے جو دولت وسطوت عطا فرمائی ہے اُس پر شکریہ ادا کرنے کے بجائے وہ تیرے بندوں پر غرور اور ظلم وستم کرنے پر آمادہ ہو گئے ہیں اور تیری راہِ حق کو نہ یہ خود قبول کرتے ہیں اور نہ دوسروں کو قبول کرنے دیتے ہیں بلکہ جبر وتشدد سے کام لے کر اُن کے آڑے آتے ہیں لہذا اب تو ان کے مظالم کا ذائقہ چکھا، اور ان کی اس دولت وثروت کو

تباہ و ہلاک کر دے جس پر یہ نازاں ہیں۔ اور جس طرح یہ ایمان کی سچائی کو ٹھکرا رہے ہیں تو بھی ان کو ایمان کی دولت کی بجائے اب ایسا دردناک عذاب دے کہ اُن کی داستان دوسروں کے لیے عبرت بن جائے۔

واوحینا الیٰ موسیٰ واخیہ ان	اور ہم نے موسیٰ اور اُس کے بھائی ہارون پر وحی کی کہ اپنی
تبوّأ لقومکما بمصر بیوتا واجعلوا	قوم کے لیے مصر میں مکان بناؤ اور اُن کو قبلہ رُخ تعمیر
بیوتکم قبلۃ واقیموا الصلوٰۃ و	کرو اور ان میں نماز قائم کرو اور جو ایمان لائے ہیں اُنہیں
بشر المومنین ہ وقال موسیٰ	کامیابی کی بشارت دو۔ اور موسیٰ نے دعا مانگی "خدایا! تو
ربنا انک اٰتیت فرعون وملاہ	نے فرعون اور اُس کے سرداروں کو اس دنیا کی زندگی میں
زینۃ واموالا فی الحیوۃ الدنیا	زیب و زینت کی چیزیں اور مال و دولت کی شوکتیں بخشی
ربنا لیضلوا عن سبیلک ربنا	ہیں، تو خدایا! کیا یہ اس لیے ہے کہ تیری راہ سے یہ لوگوں کو
اطمس علیٰ اموالھم واشدد علیٰ	بھٹکائیں، خدایا ان کی دولت زائل کر دے اور ان کے
قلوبھم فلا یؤمنوا حتیٰ یروا	دلوں پر مہر لگا دے کہ اُس وقت تک یقین نہ کریں جب
العذاب الالیم ہ قال قد اجیبت	تک عذاب دردناک اپنے سامنے نہ دیکھ لیں۔ اللہ نے فرمایا
دعوتکما فاستقیما ولا تتبعٰن	"میں نے تم دونوں کی دعا قبول کی تو اب تم اپنی راہ میں جم کر
سبیل الذین لا یعلمون ہ	کھڑے ہو جاؤ اور ان لوگوں کی پیروی نہ کرو جو میرا طریق کار
(یونس)	نہیں جانتے۔

فرعون نے اپنے سرداروں سے اگرچہ اطمینان کا اظہار کر دیا تھا لیکن حضرت موسیٰ کے روحانی غلبہ کا خیال اُس کو اندر ہی اندر گھلائے ڈالتا تھا، اور بنی اسرائیل کی اولادِ نرینہ کے قتل کے حکم سے بھی اُس کو سکونِ قلب نصیب نہ تھا، آخر اُس نے یہی فیصلہ کیا کہ موسیٰ کو قتل کیے بغیر یہ معاملہ ختم نہیں ہوگا، لہٰذا سرداروں اور ندیموں سے ایک روز کہنے لگا "اگر موسیٰ کو ہم نے یونہی چھوڑے رکھا تو مجھے یہ خوف ہے

کہ یہ تمہارے دین کو بھی آہستہ آہستہ بدل ڈالیگا، اور تمام مصر میں فساد مچا دیگا، اب یہی بات ٹھیک معلوم ہوتی ہے کہ موسیٰ کو قتل کر دیا جائے۔

حضرت موسیٰ کو جب یہ معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا کہ میں ایسے متکبر و مغرور سے کیا ڈرتا ہوں جو خدا کے یوم حساب سے نہیں ڈرتا میرا پشت پناہ تو وہ ہے جو میرا بھی پروردگار ہے اور تم سب کا بھی میں صرف اُسی کی پناہ چاہتا ہوں۔

وقال فرعونُ ذرونی اقتل موسیٰ	اور فرعون نے کہا مجھے موسیٰ کو قتل ہی کر لینے دو اور اس
ولیدع ربہ انی اخاف ان یبدل	کو چاہیے کہ اپنے رب کو پکارے میں ڈرتا ہوں کہ وہ
دینکم اوان یظھر فی الارض	تمہارے دین کو بدل ڈالے یا زمین میں فساد برپا
الفساد ہ وقال موسیٰ انی عذتُ	کر دے، اور موسیٰ نے کہا "میں اپنے اور تمہارے رب
بربی وربکم من کل متکبر لایومن	کی پناہ چاہتا ہوں ہر اُس متکبر سے جو حساب کے دن
بیوم الحساب ہ (مومن)	پر ایمان نہیں لاتا۔

فرعون اور اُس کے سردار جب اس گفتگو میں مصروف تھے تو اُس مجلس میں ایک مصری "مردِ مومن" بھی تھا، جس نے ابھی تک اپنے اسلام کو پوشیدہ رکھا تھا، اُس نے جب یہ سُنا تو اپنی قوم کے ان افراد کے مقابلہ میں حضرت موسیٰ کی جانب سے مدافعت کی کوشش شروع کی، اور اُن کو سمجھایا کہ تم ایسے شخص کو قتل کرنے چلے ہو جو یہ سچی بات کہتا ہے کہ میرا پروردگار اللہ ہے اور جو تمہارے سامنے اپنی صداقت پر بہترین دلائل و نشانات لایا ہے، اور بالفرض اگر وہ جھوٹا ہے تو اُس کے جھوٹ سے تم کو کچھ نقصان نہیں پہنچ رہا ہے اور اگر وہ سچا ہے تو پھر اُس کی اُن وعیدوں سے ڈرو جو وہ تم کو خدا کی جانب سے سُناتا ہے۔"

فرعون نے مردِ مومن کا کلام قطع کرتے ہوئے کہا کہ میں تم کو وہی مشورہ دے رہا ہوں جس

کو اپنے خیال میں درست سمجھتا ہوں اور تمہاری بھلائی کی بات کہہ رہا ہوں۔

مردِ مومن نے آخری نصیحت کے طور پر پھر کہا "اے میری قوم! مجھے یہ خوف ہے کہ تمہارا حال کہیں اُن پچھلی قوموں کا سا نہ ہو جائے جو قومِ نوح، عاد اور ثمود کے نام سے مشہور ہیں۔ یا اُن کے بعد جو قومیں آئیں، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر کبھی ظلم نہیں کرتا، بلکہ ان قوموں کی ہلاکت خود اپنے اسی قسم کے اعمال کی بدولت پیش آئی تھی جو آج تم موسیٰ کے خلاف سوچ رہے ہو۔ تم تو آج دنیا کی وجاہت کے سوچ میں پڑے ہو اور میں تمہارے لیے اُس دن سے ڈر رہا ہوں جب قیامت کا دن ہوگا اور سب ایک دوسرے کو پکاریں گے مگر اُس وقت تمہیں کوئی خدا کے عذاب سے بچانے والا نہ ہوگا

اے قوم کے سردارو! تمہارا حال تو یہ ہے کہ اس سرزمین میں جب یوسف (علیہ السلام) نے خدا کا پیغام سنایا تھا تب بھی تم یعنی تمہارے باپ دادا اسی شک و تردد میں پڑے رہے اور اُن پر ایمان نہ لائے اور جب اُن کی وفات ہوگئی تو کہنے لگے کہ اب خدا اپنا کوئی رسول نہیں بھیجیگا، اب یہی معاملہ تم موسیٰ کے ساتھ کر رہے ہو، خدا را سمجھو اور سیدھی راہ اختیار کرو۔

وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ	اور بولا ایک مرد ایماندار فرعون کے لوگوں میں جو
يَكْتُمُ اِيْمَانَهٗۤ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ	چھپاتا تھا اپنا ایمان کیا مارے ڈالتے ہو ایک مرد کو
يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ وَقَدْ جَآءَكُمْ	اس بات پر کہ کہتا ہے میرا رب اللہ ہے اور لایا
بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَاِنْ يَّكُ كَاذِبًا	تمہارے پاس کھلی نشانیاں تمہارے رب کی، اور اگر وہ
فَعَلَيْهِ كَذِبُهٗ ۚ وَاِنْ يَّكُ صَادِقًا	جھوٹا ہوگا تو اُس پر پڑیگا اُس کا جھوٹ اور اگر وہ سچا
يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ ؕ اِنَّ	ہوگا تو تم پر پڑیگا کوئی نہ کوئی وعدہ جو تم سے کرتا ہے۔
اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ	بیشک اللہ راہ نہیں دیتا اُس کو جو ہو بے لحاظ جھوٹا
يٰقَوْمِ لَكُمُ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ظٰهِرِيْنَ	اے میری قوم آج تمہارا راج ہے غالب ہو رہے ہو ملک

فِي الْأَرْضِ فَمَنْ يَنْصُرُنَا مِنْ بَأْسِ
اللّٰهِ إِنْ جَاءَنَا قَالَ فِرْعَوْنُ مَا أُرِيكُمْ
إِلَّا مَا أَرَىٰ وَمَا أَهْدِيكُمْ إِلَّا سَبِيلَ
الرَّشَادِ ۝ وَقَالَ الَّذِي آمَنَ يَا قَوْمِ
إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ مِثْلَ يَوْمِ الْأَحْزَابِ
مِثْلَ دَأْبِ قَوْمِ نُوحٍ وَعَادٍ وَثَمُودَ
وَالَّذِينَ مِنْ بَعْدِهِمْ ۚ وَمَا اللّٰهُ يُرِيدُ
ظُلْمًا لِلْعِبَادِ ۝ وَيَا قَوْمِ إِنِّي أَخَافُ
عَلَيْكُمْ يَوْمَ التَّنَادِ ۝ يَوْمَ تُوَلُّونَ
مُدْبِرِينَ مَا لَكُمْ مِنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ
وَمَنْ يُضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ ۝
وَلَقَدْ جَاءَكُمْ يُوسُفُ مِنْ قَبْلُ
بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا زِلْتُمْ فِي شَكٍّ مِمَّا
جَاءَكُمْ بِهِ ۖ حَتَّىٰ إِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ
لَنْ يَبْعَثَ اللّٰهُ مِنْ بَعْدِهِ رَسُولًا ۚ
كَذَٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ
مُرْتَابٌ ۚ الَّذِينَ يُجَادِلُونَ فِي آيَاتِ
اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطَانٍ أَتَاهُمْ ۖ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ
اللّٰهِ وَعِنْدَ الَّذِينَ آمَنُوا ۚ كَذَٰلِكَ

میں۔ پھر کون مدد کریگا ہماری اللہ کی آفت سے اگر
آگئی ہم پر۔ بولا فرعون میں تو وہی بات سجھاتا ہوں
تم کو جو سوجھی مجھ کو اور وہی راہ بتلاتا ہوں جس میں
بھلائی ہے۔ اور کہا اُس ایماندار نے اے میری قوم
میں ڈرتا ہوں کہ آئے تم پر دن اگلے فرقوں کا سا۔
جیسے حال ہوا قوم نوح کا اور عاد اور ثمود کا اور
جو لوگ اُن کے پیچھے ہوئے۔ اور اللہ بے انصافی نہیں
چاہتا بندوں پر۔ اور اے میری قوم میں ڈرتا ہوں کہ
تم پر آئے دن چیخ پکار کا۔ جس دن بھاگو گے پیٹھ
پھیر کر۔ کوئی نہیں تم کو اللہ سے بچانے والا اور جس
کو غلطی میں ڈالے اللہ تو کوئی نہیں اُس کو سجھانے والا
اور تمہارے پاس آچکا ہے یوسف اس سے پہلے
کھلی باتیں لے کر پھر تم رہے دھوکے ہی میں اُن
چیزوں سے جو وہ تمہارے پاس لے کر آیا یہاں تک کہ
جب مر گیا لگے کہنے ہرگز نہ بھیجیگا اللہ اُس کے بعد کوئی
رسول۔ اسی طرح بھٹکاتا ہے اللہ اُس کو جو ہو بیباک
شک کرنیوالا۔ وہ جو کہ جھگڑتے ہیں اللہ کی باتوں میں
بغیر کسی سند کے جو پہنچی ہو اُن کو بڑی بیزاری ہے اس
جھگڑنے سے اللہ کے یہاں اور ایمانداروں کے یہاں

يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ	اِسی طرح مُہر لگا دیتا ہے اللہ ہر دل پر غرور والے سرکش کے
(مومن)	
وَقَالَ الَّذِيْٓ اٰمَنَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوْنِ اَهْدِكُمْ	اور کہا اُس ایماندار نے اے قوم راہ چلو میری پہنچادوں
سَبِيْلَ الرَّشَادِ ۚ يٰقَوْمِ اِنَّمَا هٰذِهِ	تم کو نیکی کی راہ پر۔ اے میری قوم یہ جو زندگی ہے دنیا
الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا مَتَاعٌ ۫ وَّاِنَّ الْاٰخِرَةَ	کی سو کچھ فائدہ اُٹھا لینا ہے اور وہ گھر جو پچھلا ہے وہی
هِيَ دَارُ الْقَرَارِ ۚ مَنْ عَمِلَ سَيِّئَةً فَلَا	ہے جم کر رہنے کا گھر جس نے کی ہے بُرائی تو وہی بدلا
يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا ۚ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا	پائیگا اُس کی برابر، اور جس نے کی ہے بھلائی مرد
مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ	ہو یا عورت اور وہ یقین رکھتا ہو سو وہ لوگ جائینگے
يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ يُرْزَقُوْنَ فِيْهَا بِغَيْرِ	بہشت میں روزی پائینگے وہاں بے شمار۔ اور
حِسَابٍ ۝ وَيٰقَوْمِ مَا لِيْٓ اَدْعُوْكُمْ اِلَى النَّجٰوةِ وَ	اے قوم مجھ کو کیا ہوا ہے بُلاتا ہوں تم کو نجات کی طرف
تَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَى النَّارِ ۝ تَدْعُوْنَنِيْ لِاَكْفُرَ بِاللّٰهِ	اور تم بُلاتے ہو مجھ کو آگ کی طرف۔ تم چاہتے ہو مجھ کو کہ
وَاُشْرِكَ بِهٖ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ ۫	منکر ہو جاؤں اللہ سے اور شریک ٹھہراؤں اُس کا اُس
وَّاَنَا اَدْعُوْكُمْ اِلَى الْعَزِيْزِ الْغَفَّارِ ۝	کو جس کی مجھ کو خبر نہیں، اور میں بلاتا ہوں تم کو اُس
لَا جَرَمَ اَنَّمَا تَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَيْهِ لَيْسَ	زبردست گناہ بخشنے والے کی طرف۔ آپ ہی ظاہر ہے کہ جس کی
لَهٗ دَعْوَةٌ فِي الدُّنْيَا وَلَا فِي الْاٰخِرَةِ	طرف تم مجھ کو بُلاتے ہو اُس کا بُلاوا کہیں نہیں دنیا میں
وَاَنَّ مَرَدَّنَآ اِلَى اللّٰهِ وَاَنَّ الْمُسْرِفِيْنَ	اور نہ آخرت میں۔ اور یہ کہ ہم کو پھر جانا ہے اللہ کے پاس
هُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ ۝ فَسَتَذْكُرُوْنَ مَآ	اور یہ کہ زیادتی والے وہی ہیں دوزخ کے لوگ۔ سو آگے
اَقُوْلُ لَكُمْ ۭ وَاُفَوِّضُ اَمْرِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ	یاد کرو گے جو میں کہتا ہوں تم کو اور میں سونپتا ہوں اپنا
اِنَّ اللّٰهَ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۝ (مومن)	معاملہ اللہ کو بیشک اللہ کی نگاہ میں ہیں سب بندے

جب فرعون اور اُس کے سرداروں نے اس مردِ مومن کی یہ باتیں سُنیں تو اُن کا رُخ موسیٰ (علیہ السلام) سے ہٹ کر اُس کی طرف ہو گیا اور فرعونیوں نے چاہا کہ پہلے اس ہی کی خبر لیں اور اس کو قتل کر دیں مگر اللہ تعالیٰ نے اس ناپاک ارادہ میں اُن کو کامیاب نہ ہونے دیا۔

فوقٰہ اللہ سیّاٰت ما مکروا وحاق	سو اللہ تعالیٰ نے اُس کو اُن کی تدبیروں کے شر سے
بآل فرعون سوء العذاب النار	بچا لیا اور فرعون کے لوگوں کو بُرے عذاب نے آ لیا
یعرضون علیہا غدوًا وعشیًا ویوم	نارِ جہنم ہے جس پر وہ صبح و شام پیش کیے جاتے ہیں
تقوم الساعۃ ادخلوا آل فرعون	اور جس دن قیامت آ جائیگی (تو کہا جائیگا) فرعونیوں
اشدّ العذاب ۝ (مؤمن)	کو سخت عذاب میں داخل کرو۔

توراۃ میں اگرچہ گذشتہ واقعات کا اکثر حصّہ مذکور ہے مگر دو باتوں کا کوئی تذکرہ نہیں کیا گیا ایک فرعون کے اس دوسرے حکم کا ذکر نہیں ہے کہ بنی اسرائیل کی اولادِ نرینہ کو قتل کیا جائے اور دوسرے اس واقعہ کا کہ فرعون کی قوم میں سے بھی بعض آدمی ایمان لائے تھے اور ان میں سے ایک مردِ مومن نے فرعون اور اپنی قوم کو حضرت موسیٰ کے قتل سے باز رکھنے کی کوشش کی، اُن کو دین کی تبلیغ کی اور سچائی کو قبول کر لینے کی دعوت دی۔

بظاہر اس دوسرے دعوے کے ترک کر دینے کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ بنی اسرائیل کو فرعون اور فرعونیوں کے مظالم کی وجہ سے انتہائی رنج و غصّہ تھا اور اُس نے بغض و کینہ کی شکل اختیار کر لی تھی لہذا اُس نے اجازت نہ دی کہ اس قوم کے کسی فرد کے لیے بھی یہ ثابت کریں کہ اس میں سعادت اور حمایتِ حق کی روح موجود تھی۔

فرعون کا دعوائے ربوبیت و الوہیت

فرعون اور اُس کے سرداروں کا موسیٰ (علیہ السلام) کو شکست دینے میں جب کوئی مکر و فریب، اور غیظ و غضب کام نہ آیا، اور ارادہ قتل کے باوجود موسیٰ (علیہ السلام)

کو قتل کرنے کی بھی ہمت نہ پڑی تو اب فرعون نے دل کا بخار نکالنے کا یہ طریقہ نکالا کہ ایک جانب حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی توہین کے درپے رہتا اور دوسری جانب یہ اعلان کرتا کہ تمہارا "رب اعلیٰ" اور "معبود" میرے علاوہ کوئی نہیں ہے، موسیٰ بن دیکھے خدا کو "رب" بتا رہا ہے اور میں بایں صد ہزار شوکت و سطوت تمہارے سامنے موجود ہوں، چنانچہ "مصری قوم" پر جو اثر حضرت موسیٰ کے "آیاتِ بینات" دیکھ کر ہوا تھا وہ آہستہ آہستہ کم ہونے لگا اور دنیوی شوکت و سطوت کی مرعوبیت اور عزت، جاہ کی حرص میں دب کر رہ گیا، اور اس طرح وہ سب حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل کی مخالفت میں پھر فرعون کے ہمنوا ہو گئے

ونادٰی فرعون فی قومہ یقوم الیس	اور فرعون نے اپنی قوم میں اعلان کیا اے قوم! کیا میں
لی ملك مصر وھٰذہ الانھار تجری	مصر کے تاج و تخت کا مالک نہیں ہوں، اور میری
من تحتی افلا تبصرون ۝ ام انا خیر	حکومت کے قدموں کے نیچے یہ نہریں بہہ رہی ہیں۔ کیا
من ھٰذا الذی ھو مھین ولا یکاد	تم (میرے اس جاہ و جلال کو) نہیں دیکھتے؟ (اب بتاؤ)
یبین ۝ فلولا القی علیہ اسورۃ من	کیا میں بلند و بالا ہوں یا یہ جس کو نہ عزت نصیب اور جو
ذھب او جاء معہ الملئکۃ مقترنین	بات بھی صاف نہ کر سکتا ہو؟ اگر یہ سچا خدا کے یہاں عزت
فاستخف قومہ فاطاعوہ انھم کانوا	والا ہے) تو کیوں اس پر (آسمان سے) سونے کے کنگن نہیں
قوما فاسقین ۝ (زخرف)	گرتے یا فرشتے ہی اس کے سامنے پرا باندھ کر کھڑے نہیں ہوتے
	پس عقل کھو دی فرعون نے اپنی قوم کی سو انہوں نے اسی
	کی اطاعت کی، اور تھے وہ نافرمان۔

فرعون نے اس جگہ "بلند و بالا ہونے کا معیار دو باتوں پر رکھا" اور عام طور پر دنیا کو مقصدِ زندگی سمجھنے والوں کی یہی شان رہی ہے۔ ایک دولت و ثروت، دوسرے دنیوی جاہ و حشم، اور

یہ دونوں فرعون کے پاس موجود تھے موسیٰ (علیہ السلام) کے پاس نہ تھے۔

حضرت شاہ عبدالقادر (نور اللہ مرقدہ) نے ان دونوں باتوں کو موضح القرآن میں ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔

وہ آپ کنگن پہنتا تھا جواہر کے مکلف اور جس امیر پر مہربان ہوتا سونے کے کنگن پہناتا تھا، اور اس کے سامنے فوج کھڑی ہوتی تھی پرا باندھ کر۔

اس لیے اس نے ان ہی باتوں کا ذکر کیا کہ اگر موسیٰ کا خدا مجھ سے الگ کوئی اور ہستی ہے تو وہ موسیٰ کو سونے کے کنگن آسمان سے کیوں نہیں برساتا اور فرشتے اس کے جلو میں پرا باندھ کر کیوں کھڑے نہیں ہوتے، اور چونکہ قوم کی نگاہ میں بھی دینی و دنیوی عزت کا معیار یہی تھا اس لیے فرعون کا داؤں ان پر چل گیا اور انہوں نے یک زبان ہو کر فرعون کی اطاعت کا دوبارہ اعلان کر دیا، یہ بدبخت یہ نہ سمجھے کہ خدائے تعالیٰ کے یہاں عزت کا معیار "صدق و خلوص" اور "خدا کی وفادارانہ عبودیت" ہے نہ کہ دنیوی دولت و ثروت اور جاہ و حشمت، البتہ جو شخص اصل عزت کو حاصل کر لیتا ہے تو خدائے تعالیٰ یہ چیزیں بھی اس کے قدموں پر نثار کر دیتا ہے، اور صرف دنیوی عظمت پر اترانے والوں کو ابدی ذلت و رسوائی کے سوا کچھ حاصل نہیں رہتا، چنانچہ آخر میں یہی صورت موسیٰ اور ان کی قوم بنی اسرائیل اور فرعون اور اس کی قوم کے ساتھ پیش آئی

فلما آسفونا انتقمنا منهم فاغرقناهم	پھر جب ہم کو غصہ آیا تو ہم نے (اُن کی بدکرداریوں کا)
اجمعین. فجعلناهم سلفا ومثلا	بدلہ لیا پس ڈبو دیا اُن سب کو اور کر دیا گئے گذرے
للآخرین ۰ (زخرف)	اور آنے والی نسلوں کے واسطے اُن کو کہاوت بنا دیا۔
ثم ادبر یسعی ۰ فحشر فنادی ۰ فقال	پس پیٹھ پھیر کر چل دیا پھر (قوم کو) جمع کیا، پھر پکارا اور
انا ربکم الاعلیٰ ۰ فاخذه الله نکال الآخرة	کہنے لگا "میں ہی تمہارا سب سے بڑا رب ہوں" پس اُس کو

والاولیٰ ○ انّ فی ذٰلک عبرۃ لمن یخشیٰ ○ (النازعات)

پچھلے (آخرت کے) اور پہلے (دنیا کے) عذاب نے آپکڑا بلاشبہ اس واقعہ میں اُس شخص کے لیے عبرت ہے جو خوفِ خدا رکھتا ہو۔

مصریوں پر قہرِ خدا غرض حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) کی رشد و ہدایت کا فرعون اور اُس کے سرداروں پر مطلق اثر نہ ہوا اور معدودے چند کے سوائے عام مصریوں نے بھی اُن ہی کی پیروی کی اور صرف یہی نہیں بلکہ فرعون کے حکم سے بنی اسرائیل کی نرینہ اولاد قتل کی جانے لگی۔ موسیٰ (علیہ السلام) کی توہین و تذلیل ہونے لگی اور فرعون نے اپنی ربوبیت اور معبودیت کی زور شور سے تبلیغ شروع کردی تب حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) کو وحی آئی کہ فرعون اور قومِ فرعون کو مطلع کردو کہ اگر تمہارا یہی طور طریق رہا تو عنقریب تم پر خدا کا عذاب نازل ہونے والا ہے، چنانچہ جب اُنہوں نے اس پر بھی دھیان نہ دیا تو اب یکے بعد دیگرے عذابِ الٰہی آنے لگے، یہ دیکھ کر فرعون اور اس کی قوم نے اب یہ وطیرہ اختیار کیا کہ جب عذابِ الٰہی کسی ایک شکل میں ظاہر ہوتا تو فرعون اور قومِ فرعون حضرتِ موسیٰ سے وعدہ کرنے لگتی کہ اچھا ہم ایمان لے آئیں گے تو اپنے خدا سے دعا کر کہ یہ عذاب جاتا رہے۔ اور جب وہ عذاب جاتا رہتا تو پھر سرکشی اور نافرمانی پر اُتر آتے۔ پھر عذاب جب دوسری شکل میں آتا تو کہتے کہ اچھا ہم بنی اسرائیل کو آزاد کر کے تیرے ساتھ روانہ کردینگے، دعا کر کہ یہ عذاب دفع ہوجائے، اور جب حضرت موسیٰ کی دعا سے اُن کو پھر مہلت ملجاتی اور عذاب دفع ہوجاتا تو پھر اسی طرح مخالفت پر کمربستہ ہوجاتے، اس طرح خدا کی جانب سے مختلف قسم کے نشانات ظاہر ہوئے اور فرعون اور قومِ فرعون کو بار بار مہلت عطا ہوتی رہی لیکن جب انہوں نے اس کو بھی ایک مذاق بنالیا تب خدا کا آخری عذاب آیا اور فرعون اور اس کے سرکش سردار سب ہی غرق کردیے گئے۔

آیات اللہ کی تفصیل اللہ تعالیٰ نے حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) کو بہت سے نشانات (معجزات) عطا فرمائے

تھے جن کا ذکر بقرہ، اعراف، نمل، قصص، اسراء، طٰہٰ، زخرف، مومن، قمر اور النازعات میں مختلف طریقوں سے کیا گیا ہے، چنانچہ اسراء میں ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ	اور بلاشبہ ہم نے موسیٰ کو نو نشانات واضح عطا کیے پس
فَاسْئَلْ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اِذْ جَاۗءَهُمْ	تو بنی اسرائیل سے دریافت کر کہ جب یہ نشانات
فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّىْ لَاَظُنُّكَ يٰمُوْسٰي	ان کے پاس آئے تو حضرت موسیٰ سے فرعون نے
مَسْحُوْرًا ۝ قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ	یہ کہا اے موسیٰ بلاشبہ میں تجھ کو جادو کا مارا ہوا
هٰٓؤُلَاۗءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	سمجھتا ہوں، موسیٰ نے کہا تو خوب جانتا ہے کہ ان کو
بَصَاۗىِٕرَ ۚ وَاِنِّىْ لَاَظُنُّكَ يٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا	بصیرتیں بنا کر آسمانوں اور زمین کے پروردگار کے سوا
(اسراء)	اور کسی نے نہیں اُتارا اور (اس لیے) بلاشبہ اے فرعون
	میں تجھ کو ہلاکت زدہ سمجھتا ہوں۔

اور طٰہٰ، نمل، زخرف اور النازعات میں شمار بتائے بغیر صرف آیات کہہ کر ذکر کیا گیا ہے پھر کسی جگہ "اٰیٰتٍ بیّنٰت" اور کہیں "اٰیٰتٍ مفصّلٰتٍ" اور کسی موقعہ پر "الاٰیۃ الکبریٰ" اور کہیں صرف "اٰیٰتنا" سے تعبیر کیا ہے۔

اور ان تفصیلی اور اجمالی تعبیرات کے علاوہ مسطورۂ بالا تمام سوروں میں علٰحدہ علٰحدہ نشانات (معجزات) کا بھی ذکر موجود ہے۔ اور اگر ان سب کو یکجا جمع کیا جائے تو حسب ذیل فہرست مرتب کی جا سکتی ہے۔

عصا، ید بیضا، سنین (قحط)، نقصِ ثمرات (پھلوں کا نقصان) طوفان، جراد (ٹڈی دل) قُمَّل[1] (جوں) ضفادع (مینڈک)، دم (خون)، فلقِ بحر (قلزم کا پھٹ کر دو حصّہ ہو جانا) مَنّ وسلویٰ

[1] مفسرین کہتے ہیں کہ جوں اور مینڈک کے عذاب کی صورت یہ تھی کہ برتنے کھانے، پینے اور رہنے سہنے (بقیہ بر صفحہ ۴۴۴)

(حلوا و بٹیر) غمام[12] (بادلوں کا سایہ) انفجار عیون[13] (پتھر سے چشموں کا بہہ پڑنا) نتق جبل[14] (پہاڑ کا اکھڑ کر سروں پر آجانا) اور نزولِ تورات۔

پس مسطورۂ بالا مختلف تعبیرات و تفصیلات کی بنا پر مفسرین کو حیرانی ہے کہ کونسا طریقہ اختیار کیا جائے جس سے "تسع آیات" کی تعیین بھی ہو جائے اور باقی آیات اللہ کی تفصیل بھی صحیح اسلوب پر باقی رہ جائے۔ چنانچہ قاضی بیضاوی اور بعض دوسرے مفسرین نے یہ تشریح فرمائی کہ سورۂ اسرا میں جن "تسع آیات" کا تذکرہ ہے اُن سے وہ نشان (معجزات) مُراد نہیں ہیں جو فرعون اور قوم فرعون کے مقابلے میں بطور سرزنش عذاب اور عبرت کے لیے بھیجے گئے بلکہ اس سے وہ احکام مراد ہیں جو بنی اسرائیل کو قلزم عبور کر لینے کے بعد دیے گئے تھے۔ اور اپنی اس تشریح کی تائید میں حضرت صفوان بن عسال[1] کی حدیث پیش کی جس کا مفہوم یہ ہے کہ ایک مرتبہ دو یہودیوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوئے نبوت کا امتحان لیا جائے اور مشورہ کے بعد آپ سے دریافت کیا کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ کو جو "تسع آیات" دیے تھے اُن کی تشریح کیجیے۔ آپ نے ارشاد فرمایا وہ یہ احکام ہیں۔ شرک[1] نہ کرنا، زنا[2] نہ کرنا، ناحق[3] کسی کو قتل نہ کرنا، چوری[4] نہ کرنا، جادو[5] نہ کرنا، حکام رسی کے ذریعہ جرم سے پاک انسان کو قتل نہ کرنا، سود[6] نہ کھانا۔ پاکدامن[7] کو تہمت نہ لگانا، میدانِ[8] جنگ سے نہ بھاگنا (شعبہ کو شک ہو گیا کہ نواں حکم یہی فرمایا یا کوئی اور) اور اے یہود تمہارے لیے خصوصیت کے ساتھ یہ کہ سبت کی خلاف ورزی نہ کرنا[9]۔

مگر ان مفسرین کی یہ تشریح اس لیے صحیح نہیں کہ اسرا میں "تسع آیات" کے ذکر کے ساتھ فرعون اور حضرت موسیٰ کا مقابلہ بھی درج ہے۔ فرعون ان آیات کو دیکھ کر کہتا ہے کہ اے موسیٰ! یہ سب

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۴۳) کی کوئی شے اور کوئی جگہ ایسی نہ تھی جس کو ان دلوں نے فاسد اور خراب نہ کر دیا ہو اور زندگی تلخ نہ کر دی ہو۔ اور خون کے عذاب کی شکل یہ تھی کہ قلزم اور کنوؤں کا تمام پانی خون آلود ہو گیا تھا جس کو کسی حالت میں پیا نہ جا سکتا تھا۔

[1] ترمذی کتاب التفسیر جلد ۲ ص ۱۵۹

جادو کا دھندا ہے اور حضرت موسیٰ فرماتے ہیں۔ اے فرعون یہ اللہ تعالیٰ کے نشانات ہیں اور تو انکار کر کے ہلاکت میں پڑ رہا ہے۔ پس اس جگہ "احکام" مراد لینا کیسے صحیح ہو سکتا ہے کیونکہ ان کا نزول خود ان مفسرین کے نزدیک بھی غرقِ فرعون کے بعد ہوا ہے۔ چنانچہ یہی اشکال ترمذی کی حدیث پر بھی وارد ہوتا ہے۔ نیز یہ بات بھی خدشہ سے خالی نہیں کہ قرآنِ عزیز کی آیتِ زیرِ بحث میں "نو آیات" کا ذکر ہے اور صفوانؓ کی حدیث میں دس[1] احکام شمار کرائے ہیں تو یہ گنتی کا تعارض اور پھر احکام عشر کو تسع آیات کی تشریح بتانا کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟

ان ہر دو اہم خدشات کے علاوہ اس قول اور حدیثِ صفوان کی تشریح پر جو سخت اشکال لازم آتا ہے وہ یہ ہے کہ سورۂ نمل میں تسع آیات کا ذکر کرتے ہوئے ید بیضا کو نو میں کا ایک بتایا گیا ہے، اور یہ بھی صراحت کی گئی ہے کہ یہ آیات (نشانات فرعون اور قوم فرعون کی عبرت و بصیرت کے لیے بھیجے گئے تھے۔

وادخل یدك فی جیبك تخرج	اور داخل کر تو اپنے ہاتھ کو اپنے گریباں میں وہ
بیضاء من غیر سوءٍ فی تسع ایٰتٍ	نکلیگا روشن بغیر کسی مرض کے (یہ ان) نو آیات
الی فرعون وقومه انهم کانوا	میں سے (ہے) جو فرعون اور اس کی قوم کے لیے
قومًا فٰسقین۔ (نمل)	(بھیجی گئیں) بلاشبہ تھے وہ نافرمان گروہ۔

پس قرآنِ عزیز کی اس صراحت کے بعد نہ حدیث نکارت سے خالی رہی ہے اور نہ مفسرین کا یہ قول صحیح ہو سکتا ہے۔ اس لیے حافظِ حدیث ابن کثیرؒ نے اس حدیث کے متعلق یہ فرمایا ہے۔

فھذا الحدیث رواہ ھکذا الترمذی	پس اس حدیث کو اس طرح ترمذی نسائی ابن ماجہ

---

[1] تورات میں بھی ان احکام کا ذکر موجود ہے "اور اس نے ان لوحوں پر ان عہد کی باتوں کو یعنی موجودہ دس احکام کو لکھا" (خروج باب ۳۴ آیت ۲۸)

والنسائی وابن ماجة وابن جرير في
تفسيره من طرق عن شعبة بن الحجاج
به وقال الترمذي حسن صحيح وهو حديث
مشكل وعبد الله بن سلمة في حفظه
شيء وقد تكلموا فيه ولعله اشتبه عليه
التسع الآيات بالعشر الكلمات فإنها
وصايا في التوراة لا تعلق لها
لقيام الحجة على فرعون والله أعلم
ولهذا قال موسى لفرعون لقد علمت
ما أنزل هؤلاء إلا رب السموات
والارض بصائر أي حجة وادلة على
صدق ما جئتك به وإني لأظنك
يا فرعون مثبورا۔

(تفسیر ابن کثیر جلد ۲ صـ ۱۱۲)

نے اور ابن جریر نے اپنی تفسیر میں مختلف طریقوں سے
شعبہ بن الحجاج سے روایت کیا ہے اور ترمذی نے
کہا ہے کہ یہ "حسن صحیح ہے" مگر اس حدیث میں اشکال
ہے، اور عبداللہ بن سلمہ راوی کے حفظ میں کچھ خرابی
ہے اور محدثین نے اس کے بارہ میں کلام کیا ہے
اور شائد اُس کو اشتباہ ہوگیا کہ اُس نے نبی اکرم
صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودہ دس احکام کو تسع آیات
سمجھ کر ایک کو دوسرے کے ساتھ جوڑ دیا حالانکہ یہ
وہ دس وصیتیں ہیں جو تورات میں بیان کی گئی
ہیں۔ ان کا فرعون پر قیام حجت و دلیل سے مطلق
کوئی تعلق نہیں۔ (واللہ اعلم) اور تسع آیات میں
قیام حجت مقصود ہے اسی لیے حضرت موسیٰ نے فرعون
کو یہ فرمایا "تو خوب جانتا ہے کہ ان آیات (معجزات) کو
آسمانوں اور زمین کے پروردگار نے نہیں اُتارا مگر
عبرت و بصیرت کے لیے یعنی جو حق کا پیغام لے کر آیا ہوں
اُس کی تصدیق کے لیے حجت و دلیل بنا کر بھیجا ہے، اور میں
بلاشبہ اے فرعون تجھ کو ہلاکت زدہ سمجھتا ہوں۔

بہرحال یہ تشریح قطعاً مخدوش اور مجروح ہے۔ اور بعض مفسرین نے اس کے خلاف "تسع آیات"
کی تعیین میں اُن ہی آیات (معجزات) کو شمار کرایا ہے جو عبرت و بصیرت اور مخالفین کے مقابلہ

میں حضرت موسیٰ کی صداقت کے لیے عطا کیے گئے تھے، لیکن یہ اقوال بھی مختلف ہیں اور ان میں کافی انتشار موجود ہے۔ اس لیے کہ ان میں قبل از عبور اور بعد از عبور نشانات کو خلط کر دیا گیا ہے۔ البتہ ان سب اقوال میں قابلِ ترجیح حضرت عبداللہ بن عباس کا یہ قول ہے کہ تسع آیات سے مراد حسب ذیل "آیات اللہ" مراد ہیں۔

عصا[1]، یدِ بیضا[2]، سنین[3]، نقصِ ثمرات[4]، طوفان[5]، جراد[6]، قمل[7]، ضفادع[8]، دم[9]۔ اور حضرت ابن عباس کے علاوہ مجاہد، عکرمہ، شعبی اور قتادہ (رضی اللہ عنہم) بھی اسی کی تائید فرماتے ہیں۔

گویا حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہ) کی اس تشریح کا حاصل یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جس قدر بھی آیات (معجزات) عطا کیے گئے وہ دو حصوں پر تقسیم ہیں۔ ایک حصہ بحرِ قلزم کے عبور سے قبل اور دوسرا حصہ عبور کے بعد سے متعلق ہے۔ اور پہلے حصہ کا تعلق اُن تمام وقعات سے ہے جو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اور فرعون کے درمیان پیش آئے اور معرکۂ حق و باطل کا باعث بنے اور یہ نو ہیں، ان میں سے عصا، اور یدِ بیضا، آیاتِ کبریٰ ہیں۔

فاریٰہ الآیۃ الکبریٰ (النازعات) پس دکھایا اس (فرعون) کو ایک بڑا نشان (یعنی عصا کا نشان)

وادخل یدك فی جیبك تخرج اور داخل کر تو اپنے ہاتھ کو اپنے گریبان میں نکلیگا وہ

بیضاء من غیر سوءٍ فی تسع ایٰت (نمل) روشن بغیر کسی مرض کے نو نشانات (معجزات) میں سے

اور باقی سات "آیاتِ عذاب" ہیں جس نے فرعون اور اہل مصر (قبطیوں) کی زندگی تنگ کر دی تھی۔

وَلَقَدْ اَخَذْنَا اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِیْنَ — اور ہم نے پکڑ لیا فرعون والوں کو قحطوں میں اور

وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ یَذَّكَّرُوْنَ۝ — میووں کے نقصان میں تا کہ وہ نصیحت مانیں۔

فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ — پھر جب پہنچی اُن کو بھلائی کہنے لگے یہ ہی ہمارے لائق

وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى	اور اگر پہنچتی بُرائی تو نحوست تبلاتے موسیٰ کی اور اُس کے
وَمَنْ مَّعَهٗ ؕ اَلَآ اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمْ عِنْدَ	ساتھ والوں کی سن لو اُن کی شومی تو اللہ کے پاس
اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ و	ہے۔ پر اکثر لوگ نہیں جانتے۔ اور کہنے لگے
قَالُوْا مَهْمَا تَاْتِنَا بِهٖ مِنْ اٰيَةٍ لِّتَسْحَرَنَا	جو کچھ تو لائیگا ہمارے پاس نشانی کہ ہم پر اُس کی وجہ
بِهَا ۙ فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝ فَاَرْسَلْنَا	سے جادو کرے سو ہم ہرگز تجھ پر ایمان نہ لائینگے۔ پھر
عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ	ہم نے بھیجا اُن پر طوفان اور ٹڈی اور چچڑی اور مینڈک
وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ	اور خون بہت سی نشانیاں جُدی جُدی

(الاعراف)

اور "آیاتِ بینات" کے دوسرے حصہ کا تعلق حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اور بنی اسرائیل سے متعلق واقعات سے ہے جن میں سے بعض (معجزات) اُن کو ہلاکت سے محفوظ رکھنے اور صداقت موسیٰ علیہ السلام کو قوت دینے کے لیے ہیں۔ مثلاً من وسلویٰ کا نزول۔ غمام (بادلوں کا سایہ) اور انفجار عیون (پتھر سے بارہ چشموں کا پھوٹ نکلنا) اور بعض بنی اسرائیل کی سرکشی پر تہدید و تخویف کے لیے ہیں مثلاً نتق جبل (طور کے ایک حصہ کا اپنی جگہ سے اُکھڑ کر بنی اسرائیل کے سر پر آ جانا)

وَاَنْزَلْنَا عليكم المن والسلوٰی	اور اے بنی اسرائیل ہم نے تم پر من (حلوا شیریں) اور
كلوا من طيبات ما رزقناكم	سلویٰ (بٹیریں) نازل کیا۔ پس تم ان پاک چیزوں کو
(البقرہ)	کھاؤ جو ہم نے تم کو رزق بنا کر دی ہیں۔
وظللنا عليكم الغمام (بقرہ)	اور اے بنی اسرائیل ہم نے تم پر بادل کا سایہ قائم کر دیا
واذا استسقٰی موسٰی لقومہ فقلنا	اور جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لیے پانی طلب کیا تو ہم
اضرب بعصاك الحجر فانفجرت	نے کہا اے موسیٰ تو پتھر پر اپنی لاٹھی مار بس بہہ پڑے

منه اثنتا عشرة عيناً (بقرہ) اُس سے بارہ چشمے۔

اور دونوں قسم کے نشانات کے لیے حدِ فاصل وہ عظیم الشان نشان ہے جو فلقِ بحر (قلزم) کے دو ٹکڑے ہو کر راہ نکل آنا) کے عنوان سے معنون ہے اور در اصل جو جبر و قہر کی ہلاکت اور مظلومانہ زندگی کی نصرت و حمایت کے لیے ایک فیصلہ کن نشان تھا۔ یا یوں کہہ دیجیے کہ واقعات قبل از عبور کے انجام اور بعد از عبور کے روشن آغاز کے لیے نمایاں حدِ فاصل کی حیثیت رکھتا تھا۔ چنانچہ اعراف، اسراء، طٰہٰ، شعراء، قصص، زخرف، دخان اور الذاریات میں اس کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اور یہ تمام نشانات (معجزات) درحقیقت توطیہ اور تمہید تھے ایک ایسے عظیم الشان اور جلیل المرتبت نشان کے جو اس پوری تاریخ کا حقیقی مقصد اور بنیادی اساس تھا۔ اور وہ "نزولِ تورات" کا نشانِ اعظم ہے۔

وانزلنا التوراۃ فیہا ھدیً و نور اور ہم نے اُتاری تورات جس میں ہدایت اور نور کا ذخیرہ ہے

الحاصل حضرت ابن عباسؓ کا یہ اثر زیرِ بحث مسئلہ کے لیے قولِ فیصل ہے۔ اسی لیے حافظ عماد الدین بن کثیرؒ نے اس کے متعلق یہ ارشاد فرمایا ہے۔

وھذا القول ظاھرٌ جلیٌّ حسنٌ قویٌّ[1] اور یہ قول صاف ہے، واضح ہے، عمدہ ہے اور قوی ہے۔

بہرحال فرعون اور اُس کی قوم کی پیہم اور مسلسل سرکشی، ظلم، حق کے ساتھ استہزاء و تمسخر اور نافرمانی کے باعث خدائے تعالیٰ کی جانب سے مصریوں پر مختلف ہلاکتیں اور عذاب آتے رہے اور وقفہ کے ساتھ ان "نشانات" کا ظہور ہوتا رہا جب ایک عذاب آتا تو سب واویلا کرنے لگتے اور

[1] تفسیر ابن کثیر جلد ۶ ص ۱۱۱۔
اس بحث کے لیے روح المعانی، ابن کثیر، تفسیر کبیر اور البحر المحیط خصوصیت کے ساتھ قابلِ مراجعت ہیں۔ ان کے مطالعہ کے بعد مؤلف کے قولِ فیصل کی اہمیت اور لطافت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ وذٰلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم۔

حضرتِ موسیٰ سے کہتے کہ اگر اس مرتبہ تو نے اپنے خدا سے کہہ کر اس عذاب کو ٹال دیا تو ہم سب ایمان لے آئینگے اور جب وہ ٹل جاتا تو پھر سرکشی شروع کر دیتے آخر پھر دوسرا عذاب آپکڑتا اور پھر وہی صورت پیش آجاتی۔

اس تفصیلی واقعہ کا ذکر ابھی سورۂ اعراف کی آیات میں گذر چکا ہے۔

ان آیات میں بیان کردہ نشانیوں میں سے قمل[1] (جوں) اور ضفادع (مینڈک) کے متعلق علماءِ سیر نے لکھا ہے کہ ان دونوں چیزوں کی یہ حالت تھی کہ بنی اسرائیل کے کھانے پینے پہننے اور برتنے کی کوئی چیز ایسی نہ تھی جن میں یہ موجود نظر نہ آتے ہوں حتیٰ کہ قومِ فرعون کی تمام زندگی تنگ ہوگئی اور وہ عاجز آگئے۔ اور خون کے متعلق لکھا ہے کہ دریائے نیل کا پانی لہو کی رنگت کا ہوگیا تھا اور اس کے ذائقہ نے اس کا پینا دشوار کر دیا تھا۔ اور پانی میں مچھلیاں تک مرگئی تھیں۔ تورات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

ولقد اتینا موسیٰ تسع ایات بینات — اور بیشک ہم نے موسیٰ کو نو ظاہر نشانات دیے

---

[1] قمل سے یہاں کیا مراد ہے؟ اس کے متعلق حضرت ابن عباسؓ سے ایک روایت ہے کہ وہ کیڑا مراد ہے جو اناج میں پیدا ہو کر اس کو خراب کر دیتا ہے (اردو میں اس کو سرسری کہتے ہیں) اور ان ہی سے ایک روایت ہے کہ اس سے وہ چھوٹی ٹڈی مراد ہے جس کے پر نہیں ہوتے، وہ بھی غلہ کو گھن لگا دیتی ہے۔ مجاہد، عکرمہ، قتادہ کی بھی یہی رائے ہے۔ اور ابن جریر کہتے ہیں کہ جوں کی طرح کا ایک کیڑا ہوتا ہے جو اونٹوں میں ہلاکت پھیلا دیتا ہے، اور راغب اصفہانی کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہ چھوٹی مکھی ہے جو انسانی صحت کے لیے بیحد مضرت رساں ہے۔

قمل عربی میں عام طور پر "جوں" کو کہتے ہیں، تورات میں بھی اس جگہ جوں ہی کا ذکر ہے لیکن ابن عباسؓ، مجاہدؒ، قتادہؒ عکرمہؒ، ابن جریرؒ اور راغبؒ جیسے ائمہ لغت اس لفظ کا اطلاق مسطورۂ بالا مختلف کیڑوں پر کر رہے ہیں تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قمل اپنے معنی میں ان مصادیق کے لیے وسیع ہے۔ اس لیے ان تمام اطلاقات کی تطبیق کے لیے یہ کیوں نہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے فرعونیوں پر یہ عذاب نازل فرمایا کہ انسانوں پر جوئیں مسلط کر دیں، ان کے کھانے پینے کی چیزوں میں چھوٹی مکھیوں کو پھیلا دیا، ان کے جانوروں میں ہلاک کرنے والا کیڑا پیدا کر دیا، اور ان کے اناج اور غلہ میں گھن لگا کر خراب کر دینے والی سرسری کی تباہی پھیلا دی اور ان سب مہلک کیڑوں کو قرآن کے اعجاز نے قمل کی وسیع تعبیر میں بیان فرما دیا ہے۔ (منہ)

فاسئل بنی اسرائیل اذ جاءھم فقال	پس (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) تو بنی اسرائیل سے
لہ فرعون انی لاظنک یموسی	دریافت کر کہ جب وہ اُن کے پاس آیا تو فرعون نے
مسحورا ہ قال لقد علمت ما انزل	موسیٰ سے کہا "اے موسیٰ! میں تجھ کو جادو کا مارا ہوا گمان
ھٰؤلاء الا رب السمٰوٰت والارض	کرتا ہوں۔ موسیٰ نے کہا" تو خوب جانتا ہے کہ آسمان
بصائر وانی لاظنک یفرعون مثبورا	زمین کے پروردگار نے ان نشانات کو عبرتیں بنا کر اُتارا
(اسراء)	ہے اور اے فرعون میں سمجھتا ہوں کہ تو نے اپنے آپ کو ہلاکت میں پڑا ہوا سمجھتا ہوں
ولقد اریناہ ایتنا کلھا فکذب و	اور بیشک ہم نے فرعون کو اپنے سب نشانات (معجزات)
ابی ہ (طٰہٰ)	دکھائے پھر بھی اُس نے جھٹلایا اور انکار ہی کیا۔
فلما جاءتھم ایتنا مبصرۃ قالوا	پھر جب اُن کے پاس ہمارے نشانات بصیرت کے لیے
ھذا سحر مبین ہ وجحدوا بھا و	آپہنچے تو وہ کہنے لگے "یہ تو صریح جادو ہے" اور انہوں
استیقنتھا انفسھم ظلما وعلوا فانظر	نے اپنے جی میں یقین رکھتے ہوئے "کہ یہ صحیح ہیں" ظلم اور
کیف کان عاقبۃ المفسدین ہ (نمل)	غرور کی وجہ سے ان کا انکار کر دیا پس دیکھ (اے مخاطب)
	مفسدوں کا انجام کیسا ہوا۔
فلما جاءھم موسی بایتنا بینت	پھر جب اُن کے پاس ہماری صریح نشانیاں پہنچیں
قالوا ما ھذا الا سحر مفتری وما	کہنے لگے یہ کچھ نہیں ہے مگر گھڑا ہوا جادو اور ہم نے اپنے
سمعنا بھذا فی ابائنا الاولین ہ	پہلے باپ دادوں میں یہ باتیں نہیں سُنیں۔ اور موسیٰ
وقال موسی ربی اعلم بمن جاء	نے کہا "میرا پروردگار خوب جانتا ہے کہ کون شخص
بالھدی من عندہ ومن تکون	لایا ہے اُس کے پاس سے ہدایت کو اور کون ہے
لہ عاقبۃ الدار انہ لا یفلح	جس کے لیے آخرت کا انجام مقرر ہے۔ بلاشبہ وہ

الظّٰلمون ۝ (قصص) — بے انصافوں کو فلاح نہیں دیتا۔

ولقد ارسلنا موسٰی بِاٰیٰتنا الٰی فرعون وملائہٖ فقال انّی رسول ربّ العٰلمین ۝ فلمّا جاءھم بِاٰیٰتنا اذا ھم منھا یضحکون ۝ وما نریھم من اٰیۃ الّا ھی اکبر من اختھا واخذنٰھم بالعذاب لعلّھم یرجعون ۝ وقالوا یاایّہ الساحر ادع لنا ربّک بما عھد عندک اننا لمھتدون ۝ فلمّا کشفنا عنھم العذاب اذا ھم ینکثون ۝ (زخرف)

اور بے شک ہم نے موسٰی کو فرعون اور اُس کی قوم کی طرف اپنی نشانیاں دے کر بھیجا پس موسٰی نے کہا میں جہانوں کے پروردگار کا رسول ہوں پھر جب وہ ہماری نشانیاں لایا اچانک وہ اُس کا مذاق اُڑانے لگے، اور ہم نے جو نشان اُن کو دکھایا اُن میں سے ایک دوسرے سے بڑا ہی تھا اور ہم نے اُن کو (دنیوی) عذاب میں گرفتار کیا تاکہ وہ باز آجائیں۔ اور وہ کہنے لگے اے جادوگر تو اپنے پروردگار سے اپنے اس عہد (نبوت) کی بنا پر ہمارے لیے دعا کر کہ یہ مصیبت جاتی رہی تو ہم بلاشبہ ہدایت قبول کرلینگے، پھر جب ہم نے اُن سے عذاب کو دور کردیا تو پھر وہ بدعہد ہوگئے۔

ولقد جاء اٰل فرعون النذر ۝ کذبوا باٰیٰتنا کلّھا فاخذنٰھم اخذ عزیز مقتدر ۝ (قمر)

اور بلاشبہ آلِ فرعون کے پاس (بدکرداریوں کے انجام سے) ڈرانے والے آئے، اُنہوں نے ہماری سب نشانیوں کو جھٹلایا، پس ہم نے اُن کو (اپنے عذاب میں) پکڑ لیا ایک غالب اور قدرت والے کی پکڑ کی طرح۔

فاریہ الاٰیۃ الکبرٰی ۝ فکذّب وعصٰی ۝ (النازعات)

پھر دکھلائی (موسٰی نے) اُس کو بڑی نشانی، پس اُس (فرعون) نے جھٹلایا اور نافرمانی کی۔

بنی اسرائیل کا خروج اور فرعون کا تعاقب — جب معاملہ اس حد کو پہنچ گیا تو خدائے تعالٰی نے حضرت موسٰی

(علیہ السلام) کو حکم دیا کہ اب وقت آگیا ہے کہ تم بنی اسرائیل کو مصر سے نکال کر باپ دادا کی سرزمین کی جانب لیجاؤ۔

مصر سے فلسطین یا ارضِ کنعان جانے کے دو راستے ہیں، ایک خشکی کا راستہ ہے اور وہ قریب ہے۔ اور دوسرا بحرِ احمر (قلزم) کا راستہ یعنی اُس کو عبور کر کے بیابانِ سور اور سینا (تیہ) کی راہ ہے اور یہ دور کی راہ ہے۔ مگر خدائے تعالیٰ کی مصلحت کا تقاضہ یہی ہوا کہ وہ خشکی کی راہ چھوڑ کر دور کی راہ اختیار کریں اور قلزم کو پار کر کے جائیں۔

واقعات رونما ہو جانے کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ اس راہ کو حق تعالیٰ نے اس لیے ترجیح دی کہ خشکی کی راہ سے گذرنے میں فرعون اور اُس کی فوج سے جنگ ضروری ہو جاتی۔ کیونکہ اُنھوں نے بنی اسرائیل کو قریب ہی آلیا تھا اور اگر دریا کا "معجزہ" پیش نہ آتا تو فرعون بنی اسرائیل کو واپس مصر لیجانے میں کامیاب ہو جاتا اور چونکہ صدیوں کی غلامی نے بنی اسرائیل کو بزدل اور پست ہمت بنا دیا تھا۔ تو وہ خوف اور رعب کی وجہ سے کسی طرح فرعون کے ساتھ جنگ پر آمادہ نہ ہوتے

تورات سے بھی اس توجیہ کی تائید نکلتی ہے، اس میں مذکور ہے۔

اور جب فرعون نے اُن لوگوں کو جانے کی اجازت دیدی تو خدا اُن کو فلستیوں کے ملک کے راستہ سے نہیں لے گیا اگرچہ اُدھر سے نزدیک پڑتا کیونکہ خدا نے کہا ایسا نہ ہو کہ یہ لوگ لڑائی بھڑائی دیکھ کر پچھتانے لگیں، اور مصر کو لوٹ جائیں، بلکہ خداوند اُن کو چکر کھلا کر بحرِ قلزم کے بیابان کے راستہ سے لے گیا۔ (خروج۔ باب ۱۳ آیت ۱۷-۱۸)

علاوہ ازیں فرعون اور قومِ فرعون کو ان کی نافرمانی اور سرکشی کی پاداش، اور عظیم الشان اعجاز کے ذریعہ ظالم و قاہر اقتدار سے مظلوم قوم کی نجات کا عدیم النظیر مظاہرہ کرنا بھی مقصود تھا اسی لیے یہ راستہ موزوں سمجھا گیا۔

غرض حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اور ہارون (علیہ السلام) بنی اسرائیل کو لے کر راتوں رات بحر احمر کی راہ پر ہو لیے۔ اور روانہ ہونے سے پہلے مصری عورتوں کے زیورات اور قیمتی پارچات جو ایک تہوار میں مستعار لیے تھے وہ بھی واپس نہ کر سکے کہ کہیں مصریوں پر اصل حال نہ کھل جائے۔

اِدھر پرچہ نویسوں نے فرعون کو اطلاع کی کہ بنی اسرائیل مصر سے فرار ہونے کے لیے شہروں سے نکل گئے فرعون نے اُسی وقت ایک زبردست فوج کو ساتھ لیا اور دارِ رعمسیس سے نکل کر اُن کا تعاقب کیا اور صبح ہونے سے پہلے پہلے اُن کے سر پر جا پہنچا۔

بنی اسرائیل کی تعداد بقول تورات علاوہ بچوں اور چوپاؤں کے چھ لاکھ تھی مگر پو پھٹنے کے وقت اُنھوں نے پیچھا پھر کر دیکھا تو فرعون کو سر پر پایا گھبرا کر کہنے لگے۔

کیا مصر میں قبریں نہ تھیں جو تو ہم کو وہاں سے مرنے کے لیے بیابان میں لے آیا ہے؟ تو نے ہم سے یہ کیا کیا کہ ہم کو مصر سے نکال لایا؟ کیا ہم تجھ سے مصر میں یہ بات نہ کہتے تھے کہ ہم کو رہنے دے کہ ہم مصریوں کی خدمت کریں؟ کیونکہ ہمارے لیے مصریوں کی خدمت کرنا بیابان میں مرنے سے بہتر ہوتا۔ (خروج باب۱۴ آیات ۱۱-۱۲)

غرقِ فرعون | حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے اُن کو تسلی دی اور فرمایا خوف نہ کرو خدا کا وعدہ سچا ہے وہ تم کو نجات دیگا اور تم ہی کامیاب ہوگے، اور پھر درگاہِ الٰہی میں دست بدعا ہوئے، وحیِ الٰہی نے موسیٰ کو حکم دیا کہ اپنی لاٹھی کو پانی پر مارو تاکہ پانی پھٹ کر بیچ میں راستہ نکل آئے۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے ایسا ہی کیا جب اُنھوں نے قلزم پر اپنا عصا مارا تو پانی پھٹ کر دونوں جانب دو پہاڑوں کی طرح کھڑا ہو گیا اور بیچ میں راستہ نکل آیا اور حضرتِ موسیٰ کے حکم سے تمام بنی اسرائیل اُس میں اُتر گئے اور خشک زمین کی طرح اُس سے پار ہو گئے، فرعون نے یہ دیکھا تو اپنی قوم سے مخاطب ہو کر کہنے لگا "دیکھا یہ میری کرشمہ سازی ہے کہ بنی اسرائیل کو تم جا پکڑو لہٰذا بڑھے چلو" چنانچہ فرعون اور اس کا تمام لشکر بنی اسرائیل کے پیچھے اسی راستہ پر اُتر لیے، جب بنی اسرائیل کا ہر فرد دوسرے کنارہ پر سلامتی کے ساتھ

پہنچ گیا تو پانی بحکم الٰہی پھر اپنی اصلی حالت پر آگیا اور فرعون اور اُس کا تمام لشکر جو ابھی درمیان ہی میں تھے غرق ہو گئے۔

جب فرعون غرق ہونے لگا اور ملائکہ عذاب سامنے نظر آنے لگے تو پکار کر کہنے لگا "میں اُسی ایک وحدہ لاشریک لہ ہستی پر ایمان لاتا ہوں جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں اور میں فرمانبرداروں میں سے ہوں" مگر یہ ایمان چونکہ حقیقی ایمان نہ تھا بلکہ گذشتہ فریب کاریوں کی طرح نجات حاصل کرنے کے لیے یہ بھی ایک مضطربانہ بات تھی اس لیے خدا کی طرف سے یہ جواب ملا۔

الآن وقد عصیت قبل — اب یہ کہہ رہا ہے حالانکہ اس سے پہلے جو اقرار کا وقت تھا اُس میں
وکنت من المفسدین۔ — انکار اور خلاف ہی کرتا رہا اور درحقیقت تو مفسدوں میں سے تھا۔

یعنی خدا کو خوب معلوم ہے کہ تو "مسلمین" میں سے نہیں بلکہ "مفسدین" میں سے ہے۔

درحقیقت فرعون کی یہ پکار ایسی پکار تھی جو ایمان لانے اور یقین حاصل کرنے کے لیے نہیں بلکہ عذابِ الٰہی کا مشاہدہ کرنے کے بعد اضطراری اور بے اختیارانہ حالت میں نکلتی ہے، اور مشاہدۂ عذاب کے وقت اس کی یہ صدائے "ایمان ویقین" حضرت موسیٰ کی اُس دعاء کا نتیجہ تھی جس کا ذکر گذشتہ صفحات میں پڑھ چکے ہو۔ یعنی

فلا یؤمنوا حتی یروا العذاب — پس یہ اُس وقت تک ایمان نہ لائیں جب تک اپنی ہلاکت
الالیم ہ قال قد اجیبت دعوتکما — اور عذاب کو آنکھوں سے نہ دیکھ لیں۔ اللہ تعالیٰ نے کہا "بلاشبہ
الآیۃ (یونس) — تم دونوں کی دعا قبول کر لی گئی۔

اس موقعہ پر فرعون کی پکار پر درگاہِ الٰہی سے یہ بھی جواب دیا گیا۔

الیوم ننجیك ببدنك لتکون — آج کے دن ہم تیرے جسم کو اُن لوگوں کے لیے جو تیرے پیچھے
لمن خلفك آیۃ (الآیۃ) — آنیوالے ہیں نجات دینگے کہ وہ (عبرت کا) نشان بنے۔

پس اگر گذشتہ "مصری مقالہ کا" مضمون صحیح ہے کہ منفتاح "رعمسیس ثانی" ہی فرعونِ موسیٰ تھا تب تو بے شبہ اُس کی نعش آج تک محفوظ ہے اور سمندر میں تھوڑی دیر غرق رہنے کی وجہ سے اس کی ناک کو مچھلی نے کھا لیا ہے اور آج وہ مصریات (ایجپٹالوجی) کے مصری عجائب خانہ میں تماشا گاہ خاص و عام ہے۔

اور بالفرض اگر یہ وہ فرعون نہیں ہے تب بھی آیت کا مطلب اپنی جگہ صحیح ہے۔ اس لیے کہ توراۃ میں تصریح ہے کہ بنی اسرائیل نے اپنی آنکھوں سے غرق شدہ مصریوں کی نعشوں کو کنارے پر پڑے ہوئے دیکھا تھا۔

اور اسرائیلیوں نے مصریوں کو سمندر کے کنارے مرے ہوئے پڑے دیکھا۔ (خروج باب ۱۴، آیت ۳۰)

فلق بحر | قرآنِ عزیز نے بنی اسرائیل کی روانگی اور فرعون کے غرق اور بنی اسرائیل کی نجات کے واقعہ کو بہت مختصر بیان کیا اور اُس کے صرف ضروری اجزاء ہی کا تذکرہ کیا ہے البتہ اُس سے متعلق عبرت و بصیرت اور موعظت کے معاملہ کو قدرے تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری ہے۔

وَلَقَدْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى ۙ اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْ فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا ۙ لَّا تَخٰفُ دَرَكًا وَّلَا تَخْشٰى ۝ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ بِجُنُوْدِهٖ فَغَشِيَهُمْ مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ ۝ وَاَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ وَمَا هَدٰى ۝ (طٰہٰ)	اور (پھر دیکھو) ہم نے موسیٰ پر وحی بھیجی تھی کہ (اب) میرے بندوں کو راتوں رات (مصر سے) نکال لے جا پھر سمندر میں اُن کے گذرنے کے لیے خشکی کی راہ نکال لے تجھے نہ تو تعاقب کرنے والوں سے اندیشہ ہوگا، نہ اور کسی طرح کا خطرہ پھر جب موسیٰ اپنی قوم کو لیکر نکل گیا، تو فرعون نے اپنے لشکر کے ساتھ اُس کا پیچھا کیا، پس پانی کا ریلا جیسا کچھ اُن پر چھانے والا تھا، چھا گیا (یعنی جو کچھ اُن پر گذرنی تھی گذر گئی) اور فرعون نے اپنی قوم پر راہِ (نجات) گم کر دی۔ اُنہیں سیدھی راہ نہیں دکھائی!

وَاَوْحَيْنَا اِلٰى مُوْسٰى اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْٓ
اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ۝ فَاَرْسَلَ فِرْعَوْنُ فِي
الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ۝ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ
لَشِرْذِمَةٌ قَلِيْلُوْنَ ۝ وَاِنَّهُمْ لَنَا
لَغَآئِظُوْنَ ۝ وَاِنَّا لَجَمِيْعٌ حٰذِرُوْنَ
فَاَخْرَجْنٰهُمْ مِّنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۝
وَّكُنُوْزٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ ۝ كَذٰلِكَ وَاَوْرَثْنٰهَا
بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۝ فَاَتْبَعُوْهُمْ مُّشْرِقِيْنَ ۝
فَلَمَّا تَرَآءَ الْجَمْعٰنِ قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰٓى
اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ ۝ قَالَ كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِيَ
رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ ۝ فَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى
اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ ۭ فَانْفَلَقَ
فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ ۝
وَاَزْلَفْنَا ثَمَّ الْاٰخَرِيْنَ ۝ وَاَنْجَيْنَا مُوْسٰى
وَمَنْ مَّعَهٗٓ اَجْمَعِيْنَ ۝ ثُمَّ اَغْرَقْنَا
الْاٰخَرِيْنَ ۝ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا
كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ وَاِنَّ رَبَّكَ
لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝ (شعراء)

اور حکم بھیجا ہم نے موسیٰ کو کہ رات کو لے نکل میرے
بندوں کو البتہ تمہارا پیچھا کرینگے۔ پھر بھیجے فرعون نے شہروں
میں نقیب۔ یہ لوگ جو ہیں سو ایک جماعت ہے تھوڑی
سی۔ اور وہ مقرر ہم سے دل جلے ہوئے ہیں۔ اور ہم سارے
اُن سے خطرہ رکھتے ہیں۔ پھر نکال باہر کیا ہم نے اُن کو
باغوں اور چشموں سے۔ اور خزانوں اور مکانوں
سے اسی طرح اور ہاتھ لگا دیں ہم نے یہ چیزیں بنی اسرائیل
کے۔ پھر پیچھے پڑے اُن کے سورج نکلنے کے وقت۔ پھر
جب مقابل ہوئیں دونوں فوجیں کہنے لگے موسیٰ کے لوگ
ہم تو پکڑے گئے۔ کہا ہرگز نہیں میرے ساتھ ہے میرا
رب وہ مجھ کو راہ بتائیگا۔ پھر حکم بھیجا ہم نے موسیٰ کو کہ مار
اپنے عصا سے دریا کو پھر دریا پھٹ گیا تو ہو گئی ہر ایک
پھانک جیسے بڑا پہاڑ۔ اور پاس پہنچا دیا ہم نے اُسی جگہ
دوسروں کو اور بچا دیا ہم نے موسیٰ کو اور جو لوگ تھے
اُس کے ساتھ سب کو۔ پھر ڈبا دیا ہم نے اُن دوسروں
کو۔ اس چیز میں ایک نشانی ہے اور نہیں تھے بہت
لوگ اُن میں ماننے والے۔ اور تیرا رب وہی ہے زبردست
رحم والا۔

فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِي

بالآخر ہم نے (ان کی بدعملیوں پر) ُانہیں سزا دی یعنی اس

الیمّ بانّھم کذّبوا بایٰتنا و
کانوا عنھا غٰفلین ۝ واورثنا
القوم الذین کانوا یستضعفون
مشارق الارض ومغاربھا التی
بٰرکنا فیھا ط وتمّت کلمت ربّک
الحسنٰی علٰی بنی اسرآءیل ۵
بما صبروا ط ودمّرنا ما کان
یصنع فرعون وقومہ وما
کانوا یعرشون ۝ (اعراف)

جرم کی پاداش میں کہ ہماری نشانیاں جھٹلائیں اور ان کی طرف سے غافل رہے، اُنھیں سمندر میں غرق کر دیا، اور جس قوم کو کمزور و حقیر خیال کرتے تھے، اسی کو ملک کے تمام پورب کا اور اس کے مغربی حصوں کا کہ ہماری بخشی ہوئی برکت سے مالا مال ہے وارث کر دیا۔ اور اس طرح (اے پیغمبر!) تیرے پروردگار کا فرمانِ پسندیدہ بنی اسرائیل کے حق میں پورا ہوا کہ (ہمت و ثبات کے ساتھ) جمے رہے تھے اور فرعون اور اُس کا گروہ (اپنی طاقت و شوکت کے لیے) جو کچھ بناتا رہا تھا اور جو کچھ (عمارتوں کی) بلندیاں اُٹھائی تھیں، وہ سب درہم برہم کر دیں!

وجاوزنا ببنی اسرآءیل البحر
فاتبعھم فرعون وجنودہ بغیا
وعدوا ط حتّٰی اذآ ادرکہ الغرق
قال اٰمنت انّہ لآ الٰہ الّا
الذی اٰمنت بہ بنوا اسرآءیل
وانا من المسلمین ۝ آٰلئٰن وقد
عصیت قبل وکنت من
المفسدین ۝ فالیوم ننجیک
ببدنک لتکون لمن خلفک
اٰیۃ وانّ کثیرا من الناس

اور پھر ایسا ہوا کہ ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر کے پار اُتار دیا۔ یہ دیکھ کر فرعون اور اُس کے لشکر نے پیچھا کیا مقصود یہ تھا کہ ظلم و شرارت کریں۔ لیکن جب حالت یہاں تک پہنچ گئی کہ فرعون سمندر میں غرق ہونے لگا، تو اُس وقت پکار اُٹھا "میں یقین کرتا ہوں کہ اس ہستی کے سوا کوئی معبود نہیں جس پر بنی اسرائیل ایمان رکھتے ہیں، اور میں بھی اسی کے فرمانبرداروں میں ہوں!" (ہم نے کہا) "ہاں، اب تو ایمان لایا، حالانکہ پہلے برابر نافرمانی کرتا رہا، اور تو دنیا کے مفسد انسانوں میں سے ایک (بڑا ہی) مفسد تھا" پس آج ہم ایسا کریں گے کہ تیرے جسم کو (سمندر کی موجوں سے) بچا لیں گے، تاکہ اُن لوگوں کے لیے جو تیرے بعد آنے والے ہیں (قدرتِ حق

عَنْ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ ۝
کی ایک نشانی ہو، اور اکثر انسان ایسے ہیں جو ہماری نشانیوں

(یونس)
کی طرف سے یک قلم غافل رہتے ہیں۔

وَاسْتَكْبَرَ هُوَ وَجُنُوْدُهٗ فِي الْاَرْضِ
اور بڑائی کرنے لگے وہ اور اُس کے لشکر ملک میں

بِغَيْرِ الْحَقِّ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اِلَيْنَا لَا
ناحق اور سمجھے کہ وہ ہماری طرف پھر کر نہ آئینگے پھر

يُرْجَعُوْنَ ۝ فَاَخَذْنٰهُ وَجُنُوْدَهٗ
پکڑا ہم نے اُس کو اور اُس کے لشکروں کو پھر پھینک

فَنَبَذْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ
دیا ہم نے اُن کو دریا میں سو دیکھ لے کیسا ہوا انجام

عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ۝ (قصص)
گنہگاروں کا۔

وَلَقَدْ فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ فِرْعَوْنَ وَ
اور جانچ چکے ہیں ہم اُن سے پہلے فرعون کی قوم کو اور آیا

جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ كَرِيْمٌ ۝ اَنْ اَدُّوْٓا
اُن کے پاس رسول عزت والا کہ حوالہ کرو میرے بندے

اِلَيَّ عِبَادَ اللّٰهِ ۭ اِنِّىْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ۝
خدا کے تمہارے پاس آیا ہوں بھیجا ہوا معتبر۔ اور یہ کہ سرکشی

وَّاَنْ لَّا تَعْلُوْا عَلَى اللّٰهِ ۚ اِنِّىْٓ اٰتِيْكُمْ
نہ کرو اللہ کے مقابل میں لایا ہوں تمہارے پاس سند

بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝ وَاِنِّىْ عُذْتُ بِرَبِّيْ
کھلی ہوئی۔ اور میں پناہ لے چکا ہوں اپنے رب اور

وَرَبِّكُمْ اَنْ تَرْجُمُوْنِ ۝ وَاِنْ لَّمْ
تمہارے رب کی اس بات سے کہ تم مجھ کو سنگسار کرو۔ اور

تُؤْمِنُوْا لِيْ فَاعْتَزِلُوْنِ ۝ فَدَعَا رَبَّهٗٓ
اگر تم نہیں یقین کرتے مجھ پر تو مجھ سے پرے ہو جاؤ۔ پھر

اَنَّ هٰٓؤُلَاۗءِ قَوْمٌ مُّجْرِمُوْنَ ۝ فَاَسْرِ
دعا کی اپنے رب سے کہ یہ لوگ گنہگار ہیں" پھر لے نکل

بِعِبَادِيْ لَيْلًا اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ۝
رات میں میرے بندوں کو البتہ تمہارا پیچھا کرینگے۔ اور

وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا ۭ اِنَّهُمْ جُنْدٌ
چھوڑ جا دریا کو تھما ہوا البتہ وہ لشکر ڈوبنے والے ہیں۔ بہت

مُّغْرَقُوْنَ ۝ كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّ
سے چھوڑ گئے باغ اور چشمے اور کھیتیاں اور گھر

عُيُوْنٍ ۝ وَّزُرُوْعٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ ۝
عمدہ۔

وَّنَعْمَةٍ كَانُوْا فِيْهَا فٰكِهِيْنَ ۝ كَذٰلِكَ
وَاَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ۝ فَمَا بَكَتْ
عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ وَمَا كَانُوْا
مُنْظَرِيْنَ ۝ وَلَقَدْ نَجَّيْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ
مِنَ الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ ۝ مِنْ فِرْعَوْنَ
اِنَّهٗ كَانَ عَالِيًا مِّنَ الْمُسْرِفِيْنَ ۝

اور آرام کا سامان جس میں باتیں بنایا کرتے تھے، یونہی
ہوا۔ اور وہ سب ہاتھ لگا دیا ہم نے ایک دوسری قوم
کے۔ پھر نہ رویا اُن پر آسمان اور زمین اور نہ ملی اُن
کو ڈھیل۔ اور ہم نے بچا نکالا بنی اسرائیل کو
ذلت کی مصیبت سے، جو فرعون کی طرف سے تھی
بیشک وہ تھا چڑھ رہا حد سے بڑھ جانے والا۔

(دُخان)

فَاَرَادَ اَنْ يَّسْتَفِزَّهُمْ مِّنَ الْاَرْضِ
فَاَغْرَقْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ جَمِيْعًا ۝ وَّ
قُلْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ لِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ
اسْكُنُوا الْاَرْضَ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ
الْاٰخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِيْفًا ۝ (بنی اسرائیل)

پھر چاہا کہ بنی اسرائیل کو چین نہ دے اُس زمین
میں پھر ڈبا دیا ہم نے اُس کو اور اُس کے ساتھ والوں
کو سب کو۔ اور کہا ہم نے اُس کے پیچھے آباد رہو تم
زمین میں پھر جب آئیگا وعدہ آخرت کا لے
آئینگے ہم تم کو سمیٹ کر۔

وَفِيْ مُوْسٰٓى اِذْ اَرْسَلْنٰهُ اِلٰى فِرْعَوْنَ
بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝ فَتَوَلّٰى بِرُكْنِهٖ وَ
قَالَ سٰحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ ۝ فَاَخَذْنٰهُ وَ
جُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ وَهُوَ
مُلِيْمٌ ۝ (الذٰریٰت)

اور نشانی ہے موسیٰ کے حال میں جب بھیجا ہم نے اُس
کو فرعون کے پاس، دے کر کھلی سند۔ پھر اُس نے
مُنہ موڑ لیا اپنے زور پر اور بولا یہ جادوگر ہے یا دیوانہ۔
پھر پکڑا ہم نے اُس کو اور اُس کے لشکروں کو پھر پھینک
دیا اُن کو دریا میں اور اُس پر لگا الزام۔

البتہ تورات نے بیان کردہ واقعات کے علاوہ اور بھی بہت کچھ تفصیلات بیان کی ہیں، اور
بنی اسرائیل کے کوچ اور پڑاؤ کے اکثر مقامات کے نام بھی بتائے ہیں جو موجودہ مصریوں کے لیے نامعلوم ہیں

توراۃ کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ فرعون اور اس کی قوم پر جب خدا کی بھیجی ہوئی آفات کا سلسلہ جاری ہوگیا اور موسیٰ کے ارشاد کے مطابق یکے بعد دیگرے "نشانات" کا ظہور ہونے لگا تو اُس نے حضرتِ موسیٰ کو بُلاکر کہا کہ بنی اسرائیل کو مصر سے نکال لیجا، مگر اُن کے چوپائے اور پالتو جانور یہیں چھوڑنے ہونگے، حضرت موسیٰ نے اس شرط کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا اور فرمایا کہ ایک جانور بھی تو روکنے کا حق نہیں رکھتا، تب فرعون غضبناک ہوکر کہنے لگا کہ اب بنی اسرائیل نہ جا سکینگے اور تو اب میرے سامنے کبھی نہ آنا ورنہ میرے ہاتھ سے مارا جائیگا۔ حضرت موسیٰ نے فرمایا کہ یہ تو نے ٹھیک کہا اب میں کبھی تیرے سامنے نہ آؤنگا، میرے خدا کا یہی فیصلہ ہے اور اُس نے مجھ کو بتا دیا ہے کہ تجھ پر اور تیری قوم پر ایسی سخت آفت آئیگی کہ تیرا اور کسی مصری کا پہلوٹھا زندہ نہیں رہیگا۔

موسیٰ (علیہ السلام) فرعون سے یہ گفتگو کرکے دربار سے باہر نکل آئے، اور پھر بنی اسرائیل سے یہ فرمایا کہ خداوند خدا کا ارشاد ہے کہ فرعون کا دل سخت ہوگیا ہے وہ اب تم کو یہاں سے اُس وقت تک نہ جانے دیگا جب تک مزید نشان نہ دیکھ لے کہ جس سے تمام مصریوں میں کہرام مچ جائے، اگر تم کو تیاری کرلینی چاہیے کہ مصر سے نکلنے کا وقت آپہنچا، اور خدائے تعالیٰ نے موسیٰ (علیہ السلام) کے ذریعہ بنی اسرائیل کو نکلنے سے پہلے قربانی اور عید فسح کا بھی حکم دیا اور اُس کا طریقہ اور شرائط بھی بتادیں، موسیٰؑ نے اُن سے یہ بھی کہا کہ اپنی عورتوں سے کہو کہ وہ مصری عورتوں کے پاس جائیں اور اُن سے عید کے لیے سونے اور چاندی کے زیور اور قیمتی پارچات مستعار مانگ لائیں، اور مصری عورتوں نے آخر اُن کو زیورات دیدیے۔ پھر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ایک رات کو فرعون سے لے کر معمولی مصری کا پہلوٹھا مرگیا اور تمام گھرانوں میں کہرام مچ گیا، یہ دیکھ کر مصری فرعون کے پاس دوڑے آئے اور اُس کو مجبور کیا کہ اسی وقت تمام بنی اسرائیل کو مصر سے نکال دو تاکہ یہ نحوست یہاں سے دور ہو، ہم پر یہ سب آفتیں ان ہی کی بدولت آتی رہتی ہیں۔

تب فرعون نے حضرتِ موسیٰ سے کہا کہ اسی وقت تم سب یہاں سے نکل جاؤ اور اپنے جانوروں
مویشیوں، اور سب سامان کو بھی ساتھ لے جاؤ۔ جب بنی اسرائیل رعمسیس (جشن) کے شہر سے
نکلے تو بچوں اور جانوروں کے علاوہ وہ سب چھ لاکھ تھے۔ اور جب وہ نکلے تو مصریوں کے زیورات
کو بھی واپس نہ کرسکے اور مصریوں نے بھی مطالبہ نہ کیا۔

جب بنی اسرائیل نے جنگل کی راہ لی تو اب فرعون اور اُس کے سرداروں کو اپنے
حکم پر سخت افسوس ہوا۔ اور اُنھوں نے آپس میں کہا کہ ہم نے مفت میں ایسے اچھے چاکر اور غلام
ہاتھ سے کھو دیے اور فرعون نے حکم دیا کہ فوراً سردار، مصری نوجوان، اور فوج کو تیاری کا حکم دو
اور وہ کروفر کے ساتھ رتھوں میں سوار ہو کر نکل کھڑے ہوئے اور بنی اسرائیل کا تعاقب کیا۔

بنی اسرائیل رعمسیس سے سکات اور وہاں سے ایتام اور پھر مڑکر مجدال اور بحر احمر
کے درمیان فی ہیخروت کے پاس بعل صفون کے سامنے خیمہ زن ہو چکے تھے، بنی اسرائیل کے
اس پورے سفر میں خدا اُن کے ساتھ رہا اور وہ نورانی ستون کی تجلّی کے ساتھ رات میں بھی
اُن کی راہنمائی کرتا اور دن میں بھی آگے آگے چلتا، غرض صبح کی پو پھٹ رہی تھی کہ فرعون نے
سمندر کے کنارے بنی اسرائیل کو آلیا۔ اُنھوں نے پیچھا پھر کر دیکھا اور فرعون کو لاؤ لشکر کے ساتھ
اپنے قریب پایا تو بددل اور خائف ہو کر حضرت موسیٰ سے جھگڑا کرنے لگے، حضرت موسیٰ نے اُن
کو بہت کچھ تسلّی و تشفّی دی اور بتایا کہ تمہارے دشمن ہلاک ہونگے اور تم سلامتی و عافیت کے ساتھ
نجات پاؤ گے۔ اور پھر دربارِ خداوندی میں مناجات کرنے لگے۔

اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ تو کیوں مجھ سے فریاد کر رہا ہے۔ بنی اسرائیل سے کہو کہ وہ آگے بڑھیں اور
تو اپنی لاٹھی اُٹھا کر اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھا اور اسے دو حصّے کر، اور بنی اسرائیل سمندر کے بیچ میں سے
خشک زمین پر چل کر نکل جائینگے . . . . پھر موسیٰ نے اپنا ہاتھ سمندر کے

اوپر بڑھایا اور خداوند نے رات بھر تند پوربی آندھی چلا کر اور سمندر کو پیچھے ہٹا کر اُسے خشک زمین بنا دیا اور پانی دو حصے ہو گیا اور بنی اسرائیل سمندر کے بیچ میں سے خشک زمین پر چل کر نکل گئے۔

. . . . اور خداوند نے سمندر کے بیچ ہی میں مصریوں کو تہ و بالا کر دیا اور پانی پلٹ کر آیا اور اُس نے رتھوں اور سواروں اور فرعون کے سارے لشکر کو جو اسرائیلیوں کا پیچھا کرتا ہوا سمندر میں گیا تھا غرق کر دیا۔ اور ایک بھی اُن میں سے باقی نہ چھوڑا۔ پھر بنی اسرائیل سمندر کے بیچ میں خشک زمین پر چل کر نکل گئے اور پانی اُن کے داہنے اور بائیں ہاتھ دیواروں کی طرح رہا۔

. . . . اور اسرائیلیوں نے وہ بڑی قدرت جو خداوند نے مصریوں پر ظاہر کی دیکھی اور وہ لوگ خداوند سے ڈرے اور خداوند پر اور اُس کے بندے موسیٰ پر ایمان لائے[1]

توراۃ کی ان تفصیلات میں اگرچہ بہت زیادہ رطب ویابس اور دور از کار باتیں بھی ضمناً آگئی ہیں مگر وہ اور قرآنِ عزیز دونوں اس بارہ میں ہم آہنگ ہیں کہ خدائے تعالیٰ نے فرعون اور اُس کی قہرمانیت کے مظالم سے موسیٰ اور بنی اسرائیل کو ایک عظیم الشان نشان (معجزہ) کے ذریعہ نجات دی۔ قرآنِ عزیز کہتا ہے کہ یہ معجزہ اس طرح ظاہر ہوا کہ خدا کے حکم سے موسیٰ (علیہ السلام) نے قلزم پر لاٹھی ماری اور دریا کا پانی بیچ میں خشکی دے کر دونوں جانب پہاڑ کی طرح کھڑا ہو گیا۔

فانفلق فکان کل فرق	پس (دریا) پھٹ گیا پھر ہر ایک جانب ایک
کالطود العظیم ۝	بڑے پہاڑ کی مانند ہو گئی۔
واذ فرقنا بکم البحر فانجینٰکم و	اور جب ہم نے ٹکڑے کر دیا تمہارے لیے سمندر پس نجات دی
اغرقنا آل فرعون وانتم تنظرون	ہم نے تم کو اور غرق کر دیا فرعون کے لوگوں کو اور تم دیکھ
(بقرہ)	رہے تھے۔

اور توراۃ بھی اسی کی تائید کرتی ہے چنانچہ اُس میں مذکور ہے۔

[1] خروج باب ۱۴ آیت ۱۵-۳۱۔

تو اپنی لاٹھی اُٹھا کر اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھا اور اُسے دو حصّے کر۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور پانی اُن کے دائیں اور بائیں دیوار کی طرح رہا۔

البتہ توراۃ میں یہ اضافہ اور ہے کہ "رات بھر تُند پوربی ہوا چلا کر اور سمندر کو پیچھے ہٹا کر اُسے خشک زمین بنا دیا" سو اوّل تو توراۃ کی تحریف اور مختلف سنین کے مختلف تراجم کے پیشِ نظر تاریخی اور مذہبی دونوں حیثیتوں سے قرآنِ عزیز کے بیان ہی کو قابلِ اعتماد سمجھا جائیگا، کیونکہ وہ باتفاق دوست و دشمن ہر قسم کی تحریف و تبدیل اور اضافہ و ترمیم سے محفوظ ہے۔

لا یأتیہ الباطلُ من بین یدیہ ولا من خلفہ تنزیلٌ من حکیمٍ حمید — اس پر باطل کا کسی جانب سے گذر نہیں نہ سامنے سے اور نہ پیچھے سے وہ اُتارا ہوا ہے اُس ہستی کی جانب سے جو حکمت والا، خوبیوں والا ہے۔

علاوہ ازیں اس اضافہ کی تطبیق کی بہترین صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ موسیٰ کے ہاتھ بڑھا کر عصا چلانے سے اول دریا کے دو حصّے ہو گئے اور دونوں جانب پانی کھڑا ہو گیا اور پھر لاکھوں انسانوں نے جب اُس کے درمیان سے گذرنا شروع کیا تو زمین کی نمی اور تری کو خشک کرنے کے لیے برابر پوربی تند ہوا چلتی رہی تاکہ بچہ سے بوڑھے تک اور انسان سے حیوان تک کسی کو بھی گذرنے میں زحمت و تکلیف نہ اُٹھانی پڑے۔

بدقسمتی سے مسلمانوں میں بعض ایسے افراد بھی ہیں جو "علم" کے نام سے مذہب کے ہر مسئلہ کو "ادیات" ہی تک محدود دیکھنا چاہتے ہیں اور اس لیے وہ خدا کے دیے ہوئے اُن نشانات (معجزات) کا بھی انکار کرتے ہیں جو انبیاء و رسل علیہم الصلوٰۃ والسلام کی صداقت کی تائید اور دلیل میں ظہور پذیر ہوتے ہیں اُن کے انکار کے وہی معنی ہیں جو گذشتہ صفحات پر معجزہ کی بحث میں زیرِ بحث آ چکے ہیں یعنی وہ خدا کے کسی فعل کو بھی کسی حالت میں اس محسوس اور مادی دنیا کے اسباب و علل سے مستثنیٰ سمجھنے کو تیار نہیں ہیں اور دراصل اُن کے اس الحاد و زندقہ

کی بنیاد اساس مغربی اور یورپی الحاد پر قائم کی گئی ہے اور اُس سے مرعوبیت کے نتائج میں سے یہ ایک لازمی نتیجہ ہے۔

پس منجملہ دوسرے مقامات کے اُنہوں نے اس مقام پر بھی یہ کوشش کی ہے کہ کسی طرح "غرقِ فرعون" کا یہ واقعہ روحانی معجزہ سے نکل کر مادّی اسباب و علل کے تحت میں آجائے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی دنیوی ترقی کے لیے سرگرم عمل ہستی سید احمد خاں صاحب (مرحوم) بھی علوم عربیہ اور علوم دینیہ سے ناواقفیت کے باوجود مسطورۂ بالا عقیدہ کی ترویج میں پیش پیش ہیں، غالباً اس طرح وہ یورپ کی موجودہ زندگی کے ساتھ اسلام کو مطابق کرنا چاہتے تھے مگر مادیت کا یہ چولا چونکہ اُس کے قد پر راست نہ آیا اس لیے اُنہوں نے چولے کی ترمیم کے بجائے اسلام کے نقشہ اور قد و قامت میں ترمیم شروع کر دی مگر اُس میں وہ کامیاب نہ ہو سکے۔

بے شبہ اسلام ایک ایسا روحانی مذہب ہے جو روحانیت کی ترقی کے ساتھ ساتھ دنیوی زندگی میں بھی انسان کے عروج اور فلاح و بہبود کا کفیل ہے اور اس لیے ہر زمانہ کے علوم و فنون کی ترقی اس کی آغوش میں پلتی اور اُس میں جذب ہوتی رہی اور علم و حکمت ہمیشہ اُس کے سایۂ عاطفت میں نشو و نما پاتے رہے لیکن "مادی علوم" کی حدود "مادیات و مشاہدات اور محسوسات سے آگے کسی حال میں متجاوز نہیں ہو سکتیں اور آج کی سائنس اور کل کا فلسفہ دونوں اس کا اقرار کرتے ہیں کہ ہماری حدود محسوسات سے پرے نہیں ہیں یعنی محسوسات و مادیات کی دیوار کے پیچھے کیا ہے؟ وہ اس سے لاعلمی تو ظاہر کرتے ہیں مگر اُن کا انکار نہیں کرتے۔

پس اسلام کا یہ دعویٰ ہے کہ گذشتہ اور موجودہ زمانہ میں جب کبھی علوم "نظریوں" اور "تھیوریز" سے آگے بڑھ کر محسوس اور مشاہدہ کی حد تک پہنچے ہیں تو ایک مسئلہ بھی ایسا نہیں ملتا کہ وہ اسلام کے اصول سے ٹکراتا ہو یا اسلام میں اُس کا انکار پایا جاتا ہو اور جب تک علمی نظریوں اور تھیوریوں میں آئے دن تبدیلیاں ہوتی رہتی ہوں اور علمی تحقیقات ایک جگہ چھوڑتی اور دوسری جگہ بناتی رہتی ہوں تو اسلام کو

اُن کے مطابق کرنے کی سعی عبث ہے۔ کیونکہ مشاہدہ کی صد پر پہنچنے کے بعد بے شبہ اُن کا فیصلہ قرآن کے فیصلہ سے ایک انچہ بھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔

البتہ اسلام یا مذہبِ حق چند ایسے امور کا بھی اقرار کراتا ہے جو ان مادیات کی دنیا سے پرے کی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں، مثلاً آخرت، حشر و نشر، جنت، جہنم، ملائکہ، وحی، نبوت، اور معجزہ۔ مگر اس شرط کے ساتھ کہ اُن میں سے کوئی امر بھی خلافِ عقل یعنی عقل کی نگاہ میں ناممکن اور محال نہیں ہے لیکن عقل کے لیے اُس کی کُنہ اور حقیقت کا ادراک صرف اُسی قدر ہو سکتا ہے جس قدر کہ مذہب نے اپنے علم یقین (وحی الٰہی) کے ذریعہ اُس کو بتا دیا ہے۔ اور ان باتوں کے سمجھنے کے لیے وحی کے سوائے عقل کے پاس اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔

بہرحال سید احمد خاں صاحب نے تفسیر احمدی میں اس مقام کی تفسیر یہ فرمائی ہے کہ غرقِ فرعون اور نجاتِ بنی اسرائیل کا یہ واقعہ معجزہ نہ تھا بلکہ عام دنیوی سلسلۂ اسباب و علل کے ماتحت بحر کے مد و جزر (جوار بھاٹا) سے تعلق رکھتا ہے۔ یعنی صورتِ حال یہ پیش آئی کہ جس وقت بنی اسرائیل نے قلزم کو عبور کیا تھا اُس وقت اُس کا پانی سمٹا ہوا تھا اور پیچھے کو ہٹ کر اُس نے جزر اختیار کر رکھا تھا، فرعون نے جب بنی اسرائیل کو اس آسانی سے پار ہوتے دیکھا تو اُس نے بھی اپنے لشکر کو داخل ہو جانے کا حکم دے دیا مگر بنی اسرائیل پار ہو چکے تھے اور فرعونی لشکر ابھی دریا کی خشکی پر چل ہی رہا تھا کہ اُس کے "مد" اور آگے بڑھنے کا وقت آپہنچا اور فرعون اور اُس کے لشکر کو اتنی بھی مہلت نہ ملی کہ وہ آگے بڑھ سکیں یا پیچھے ہٹ سکیں اور سب غرق ہو گئے۔

سید صاحب نے اپنے اس مزعومہ خیال کے مطابق بنی اسرائیل کے عبور کے متعلق ایک نقشہ بھی دیا ہے جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بنی اسرائیل نے قلزم کے شمالی دہانہ پر جا کر اُس کو عبور کیا ہے۔

مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ قرآنِ عزیز کی تصریحات اس کا قطعی انکار کرتی ہیں، اور سید صاحب کی بات کسی طرح بنائے نہیں بنتی۔

اس بات کا فیصلہ تو قطعی ناممکن ہے کہ خاص وہ مقام متعین کیا جاسکے کہ جس سے بنی اسرائیل گذرے اور دریا کو عبور کر گئے کیونکہ اس سلسلہ میں گذشتہ تاریخ کا پرانا ذخیرہ تورات ہے مگر اُس کے بیان کردہ مقامات موجودہ نسل کے لیے نامعلوم اسماء کے علاوہ کچھ نہیں ہیں۔

البتہ قرآن اور تورات کی مشترک تصریحات و نصوص سے یہ قطعی متعین کیا جاسکتا ہے کہ بنی اسرائیل نے "بحرِ قلزم" کے کسی کنارہ اور دہانہ سے عبور کیا یا درمیانی کسی حصہ سے؟

اس کے لیے ایک مرتبہ نقشہ میں اُس حصہ پر نظر ڈالیے جہاں بحرِ احمر (قلزم یا ریڈ سی) واقع ہے۔ دراصل یہ بحرِ عرب کی ایک شاخ ہے جس کے مشرق میں سرزمینِ عرب واقع ہے، اور مغرب میں مصر۔ شمال میں اس کی دو شاخیں ہوگئی ہیں ایک شاخ (خلیج عقبہ) جزیرہ نمائے سینا کے مشرق میں اور دوسری (خلیج سویز) اس کے مغرب میں واقع ہے، یہ دوسری شاخ پہلی سے بڑی ہے اور شمال میں دور تک چلی گئی ہے۔ بنی اسرائیل اسی کے درمیان سے گذرے ہیں۔ اُس شاخ کے شمالی دہانہ کے سامنے ایک اور سمندر واقع ہے جس کا نام بحرِ روم ہے اور بحرِ روم اور بحرِ احمر کے اس شمالی دہانہ کے درمیان تھوڑا سا خشکی کا حصہ ہے، یہی وہ راستہ تھا جہاں سے مصر سے فلسطین اور کنعان جانے والے کو "بحرِ احمر" عبور کرنا نہیں پڑتا تھا۔ اور اُس زمانہ میں یہ راہ قریب کی راہ سمجھی جاتی تھی اور بنی اسرائیل نے بحکم الٰہی یہ راہ اختیار نہیں کی تھی۔ اب اسی خشک زمین کو کھود کر بحرِ احمر (ریڈ سی) کو بحرِ روم سے ملا دیا گیا ہے اور اس ٹکڑے کا نام نہر سوئز ہے۔ اور "ریڈ سی" کے شمالی دہانہ پر سویز کے نام سے ایک شہر آباد ہے، جو مصر کی بندرگاہ شمار ہوتا ہے۔

اب اس کے بعد قرآنِ عزیز کی سورۂ بقرہ اور سورۂ شعراء کی اُن آیات پر پھر ایک مرتبہ

غور کرنا چاہیے جو اس سلسلہ کی تصریحات پیش کرتی ہیں۔ ان آیات میں دو باتوں کا صاف صاف تذکرہ موجود ہے۔ ایک "فلق یا فرقِ بحر" یعنی دریا کا پھٹنا یا اُس کو پھاڑ دینا، اور دوسرے دونوں جانب پانی کا پہاڑ کی طرح کھڑا ہو جانا اور درمیان میں راستہ پیدا ہو جانا "فکان کل فرق کالطود العظیم"

عربی لغت میں "فرق" کے معنی دو ٹکڑے کر کے جُدا کر دینے کے آتے ہیں خصوصاً "بحر" کی نسبت کے ساتھ چنانچہ کتبِ لغت میں ہے "فَرَقَ البحراى فَلَقَہٗ" سر کی مانگ کو بھی "فرق" اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ سر کے بالوں کو دو حصوں میں تقسیم کر کے بیچ میں نکالی جاتی ہے۔ اور "فلق" کے متعلق اس طرح مذکور ہے "فلق الشی ۔ شقّہ وانفلق ۔ انشق ۔ یعنی اُس نے فلاں شے کو ٹکڑے کر دیا اور وہ ٹکڑے ہو گئی" اسی لیے "فالق" اُس درار کو کہتے ہیں جو پتھر کے درمیان میں ہو جاتی ہے اسی طرح "طود" کے معنی بڑے پہاڑ کے ہیں "الطود ۔ الجبل العظیم" پس ان لغوی تصریحات کے بعد اِن ہر دو آیات کا صاف اور سادہ مطلب یہ ہوا کہ دریا کا پانی یقیناً دو ٹکڑے ہو گیا اور وہ دونوں جانب دو کھڑے ہوئے پہاڑ کی طرح بن گیا اور درمیان میں راستہ پیدا ہو گیا، اور یہ اُسی وقت ممکن ہے کہ بنی اسرائیل نے دریا کے ایسے حصہ سے عبور کیا ہو جو دہانہ اور کنارہ کے سامنے کا حصہ نہ ہو بلکہ پانی کا ایسا حصہ ہو جو درمیان سے پھٹ کر دو حصے بن سکتا ہو، دوسرے الفاظ میں یوں کہہ دیجیے کہ قرآنِ عزیز صاف صاف اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ بنی اسرائیل خشکی کی راہ سے قلزم کے دہانہ یا کنارے سے نہیں گذرے تھے بلکہ دریا کے کسی درمیانی حصہ کو عبور کر کے میدانِ سینا میں پہنچے تھے، اور یہ ظاہر ہے کہ "مد و جزر" (جوار بھاٹا) طولانی حصہ میں دہانہ کی جانب ہوا کرتا ہے، عرض میں اس طرح کبھی بھی نہیں ہوتا کہ پانی دونوں جانب سمٹ جائے اور بیچ میں خشکی کی راہ پیدا ہو جائے لہٰذا خدائے تعالیٰ کے اس عظیم الشان "نشان" (معجزہ) کا انکار کرتے ہوئے

اس کو روزمرہ کے مادّی اسباب کے نیچے لانے کی سعی کرنا قرآنی تصریحات کے بالکل خلاف اور اُس کی تحریف کے مرادف ہے۔

نیز توراۃ نے بنی اسرائیل کے اس عبور کے واقعہ میں "بحرِ احمر" کے جن مشرقی اور مغربی کناروں کے مقامات کا ذکر کیا ہے اور اس عبور کے متعلق جو تصریحات بیان کی ہیں اُن سے بھی یہی واضح ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کا یہ عبور دہانہ پر سے نہیں تھا بلکہ شمال مغرب کے درمیانی حصّہ سے ہوا تھا جیسا کہ عنقریب نقشہ سے واضح ہو جائیگا۔

بعض مغرب زدہ "ملحدوں" نے اس مقام پر جب کسی طرح انکارِ معجزہ کی بات بنتی نہ دیکھی تو توراۃ کے اس فقرہ کا سہارا لیا۔

اور خداوند نے رات بھر تند پوربی آندھی چلاکر اور سمندر کو پیچھے ہٹاکر اُسے خشک زمین بنا دیا،
اور پانی دو حصے ہو گیا اور بنی اسرائیل سمندر کے بیچ میں سے خشک زمین پر چل کر نکل گئے۔

وہ کہتے ہیں کہ اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ یہ "خشک زمین" دریا کے بیچ میں نکل آئی تھی تو بھی یہ معجزہ نہ تھا بلکہ رات بھر خشک ہوا کے چلنے سے دونوں جانب پانی بستہ برف کی طرح ہو گیا تھا اور بیچ میں خشک راستہ بن گیا تھا، مگر جب فرعون کی باری آئی تو آفتاب کی تمازت نے بستہ برف کو پگھلا دیا اور پانی اصل حالت پر آگیا اور مصری غرق ہو گئے۔

سو اس کے متعلق نجار مصری نے خوب کہا ہے کہ اگر بالفرض ان کی اس باطل تاویل کو تسلیم بھی کر لیا جائے تب بھی "یہ معجزہ" ہوا اس لیے کہ سمندروں کے وجود سے لے کر آج تک کسی جگہ یہ ثابت نہیں ہے کہ اس طرح ہوا چل کر ان کے درمیان میں خشک راہ بنا دیتی ہو، علمِ تاریخ اور طبیعات دونوں اس قسم کے واقعہ سے یکسر خالی ہیں۔

پس "عام مادی علل و اسباب سے جُدا" اگر ہوا کا یہ عمل صرف حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل

کی نجات اور فرعون اور اُس کے لشکر کے غرق ہی کے لیے مخصوص تھا اور مخصوص رہا تو پھر یہ "معجزہ" نہیں تو اور کیا ہے؟

بہر حال قرآنِ عزیز صراحت کرتا ہے کہ بحرِ قلزم میں غرقِ فرعون اور نجات موسیٰ کا یہ واقعہ موسیٰ علیہ السلام کی تائید میں ایک عظیم الشان معجزہ تھا اور اگر کائنات کی کوئی شہادت بھی اس واقعہ کے اعجاز میں موجود نہ ہوتی تب بھی ہمارے لیے "وحی الٰہی" کا یہ فیصلہ ایک ناطق فیصلہ ہے اور مومن کا ایمان دور از کار تاویلات سے جُدا اصل حقیقت ہی کے ساتھ وابستہ ہے۔ اور ہمارا یقین ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی صداقت کے لیے یہ ایسا عظیم "معجزہ" تھا جس نے تمام مادّی قہرمانیت اور سامانِ استبدادیت کو ایک لمحہ میں شکست دے کر مظلوم قوم کو ظالم قوم کے پنجہ سے رستگاری دلائی[1]

"واللہ علیٰ کل شیٔ قدیر"

وانجینا موسیٰ ومن معہ اجمعین	اور ہم نے موسیٰ اور اُس کے تمام ساتھیوں کو نجات دی پھر
ثم اغرقنا الاٰخرین ۝ انّ فی ذٰلك	دوسروں کو (یعنی اُن کے دشمنوں کو) غرق کر دیا، بلاشبہ اس
لاٰیۃً وما کان اکثرھم مؤمنین ۝	واقعہ میں (خدا کا زبردست) نشان (معجزہ) ہے اور اکثر اُن کے ایمان
وانّ ربك لھو العزیز الرحیم ۝ (شعراء)	نہیں لاتے اور اقرار نہیں کرتے، اور بلاشبہ تیرا رب ہی (سب پر)

[illegible]

اس واقعہ کی تفصیلات کے بعد منسلکہ نقشہ کو سامنے رکھنے سے بیان کردہ حقائق بخوبی واضح ہو سکتے ہیں اور منکرین معجزہ نے اس واقعہ کے حقائق پر پردہ ڈالنے کے لیے جو باطل تاویلات کی ہیں اُن کی حقیقت اچھی طرح منکشف ہو جاتی ہے۔

---

[1] نجار کہتے ہیں کہ غرقِ فرعون اور عبورِ بنی اسرائیل کی جگہ آج متعین اور منضبط نہیں ہے کہ ٹھیک ٹھیک اُس جگہ کو بتایا جا سکے۔ البتہ عام طور پر یہ مشہور ہے کہ یہ جگہ وہ ہے جو آج "برکۃ فرعون" (فرعون کے پانی میں بیٹھ جانے کی جگہ) کے نام سے مشہور ہے مگر یہ صحیح نہیں ہے اس لیے کہ یہ بحرِ احمر کی بندرگاہ سویز سے بہت دور ہے۔ مثلاً اگر جہاز شام کے وقت سویز سے روانہ ہو تو آدھی رات کے بعد اس مقام پر پہنچیگا، لہذا یہ مقام وہ جگہ ہرگز نہیں ہے۔ (بقیہ بر صفحہ ۴۷۱)

فرعون، قومِ فرعون اور عذابِ قیامت

فرعون اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کا یہ واقعہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے بلکہ حق و باطل کے معرکوں میں ایک عظیم الشان معرکہ ہے، اور ایک جانب غرور و نخوت جبر و ظلم اور فرعونیت و انانیت کی ذلت و رسوائی کا اور دوسری جانب مظلومیت، خدا پرستی اور صبر و استقامت کی فتح و کامرانی کا عجیب و غریب مرقع، اس لیے خدائے تعالیٰ نے فرعون اور قومِ فرعون کی ہلاکتِ دنیوی کے بعد عبرت و بصیرت کے لیے اس طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ اس قسم کے لوگوں کے لیے آخرت اور سرمدی و ابدی زندگی میں کس قدر سخت عذاب اور خدا کی پھٹکار کے کیسے عبرتناک سامان مہیا ہیں تاکہ سلیم اور صالح طبائع اور نیک نہاد و نیک سرشت ہستیاں ان کا مطالعہ کریں اور ان اعمالِ زشت سے خود کو بھی بچائیں اور دوسروں کو بھی بچنے کی ترغیب دیں۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا	اور (یہی ہو چکا ہے کہ) ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیوں اور واضح سند
وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۙ اِلٰى فِرْعَوْنَ	کے ساتھ بھیجا تھا، فرعون اور اُس کے سرداروں کی طرف،
وَمَلَا۟ئِهٖ فَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ فِرْعَوْنَ ۚ	مگر وہ فرعون کی بات پر چلے، اور فرعون کی بات راست
وَمَآ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ ۝	بازی کی بات نہ تھی۔
يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ	قیامت کے دن وہ اپنی قوم کے آگے آگے ہوگا (جس طرح دنیا
فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ ۭ وَبِئْسَ الْوِرْدُ	میں گمراہی کے لیے ہوا) اور انہیں دوزخ میں پہنچائیگا تو دیکھو کیا
الْمَوْرُوْدُ ۝ وَاُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهٖ لَعْنَةً	ہی بُری جگہ ہے جہاں وہ پہنچ کر رہے! اور اس دنیا میں بھی لعنت

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۷۰) بلکہ میرا خیال یہ ہے کہ اُس زمانہ میں "قلزم" کی خلیج جو خلیج سویز کے نام سے مشہور رہے بحر روم کے قریب تک پھیلتی چلی گئی تھی اور اُس سے بہت نزدیک تھی لہذا بنی اسرائیل کے عبور کی جگہ وہ ہوسکتی ہے جو آج "عیونِ موسیٰ" کے نام سے مشہور ہے اور جو شمال مشرق میں واقع ہے۔

اس وقت میرے پاس محمد رفعت کا اطلس (اٹلس) موجود ہے اُس میں عبورِ بنی اسرائیل کے لیے جو خط کھینچ کر دکھلائے ہیں وہ بتاتے ہیں کہ یہ عبور سویز اور بحیرہ مرہ کے درمیان ہوا ہے۔ اور "عیونِ موسیٰ" بھی یہیں شمال مشرق میں واقع ہے (قصص الانبیاء ص ۳۴۱-۳۴۲)

وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ ۝ (ہود) اُن کے پیچھے لگی (کہ اُن کا ذکر کبھی پسندیدگی کے ساتھ نہیں کیا جاتا) اور قیامت میں بھی (کہ عذابِ آخرت کے مستحق ہوئے) تو دیکھو کیا ہی بُرا صلہ ہے جو اُن کے حصہ میں آیا۔

وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ لَا يُنْصَرُوْنَ ۝ اور کیا ہم نے اُن کو پیشوا کہ بلاتے ہیں دوزخ کی طرف اور قیامت کے دن اُن کو مدد نہ ملیگی۔

وَاَتْبَعْنٰهُمْ فِىْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ هُمْ مِّنَ الْمَقْبُوْحِيْنَ ۝ (قصص) اور پیچھے رکھ دی ہم نے اُن پر اس دنیا میں پھٹکار اور قیامت کے دن اُن پر بُرائی ہے۔

وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ ۚ اور اُلٹ پڑا فرعون والوں پر بُری طرح کا عذاب۔ وہ

اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ۚ وہ آگ ہے کہ دکھلا دیتے ہیں اُن کو صبح اور شام۔ اور

وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۚ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ جس دن قائم ہوگی قیامت حکم ہوگا داخل کرو فرعون

فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ۝ (الی آخر الآیہ) (مومن) والوں کو سخت سے سخت عذاب میں۔

اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ ۙ طَعَامُ الْاَثِيْمِ ۚ مقرر درخت سیہنڈ کا کھانا ہے گنہگار کا جیسے پگھلا ہوا تانبا،

كَالْمُهْلِ ۚ يَغْلِىْ فِى الْبُطُوْنِ ۙ كَغَلْىِ کھولتا ہے پیٹوں میں۔ جیسے کھولتا پانی۔ پکڑو اس کو اور

الْحَمِيْمِ ۭ خُذُوْهُ فَاعْتِلُوْهُ اِلٰى سَوَآءِ دھکیل کر لیجاؤ بیچوں بیچ دوزخ کے۔ پھر ڈالو اس

الْجَحِيْمِ ۖ ثُمَّ صُبُّوْا فَوْقَ رَاْسِهٖ کے سر پر پانی کا عذاب۔ اس کو چکھ تو ہی ہے

مِنْ عَذَابِ الْحَمِيْمِ ۭ ذُقْ ۚ اِنَّكَ بڑا عزت والا سردار۔ یہ وہی ہے جس کے متعلق تم دھوکے

اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ ۝ اِنَّ هٰذَا میں پڑے تھے۔

مَا كُنْتُمْ بِهٖ تَمْتَرُوْنَ ۝ (دخان)

(کتبہ عبدالقیوم الخطاط مرادآبادی)